سہ ماہی

جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء

انتساب

عالمی

سرونج

ISSN - 2348-5035

دیپک بدکی نمبر

ڈاکٹر سیفی سرونجی
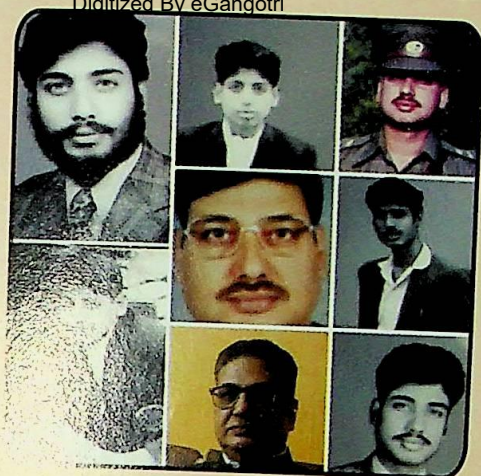
دیپک بدکی ماضی کے آئینے میں۔

ایک یادگار تصویر میں دائیں سے دیپک بدکی سابق صدر جمہوریہ ہند عزت مآب جناب آر وینکٹ رمن اور جناب بالا کرشنن کے ساتھ۔
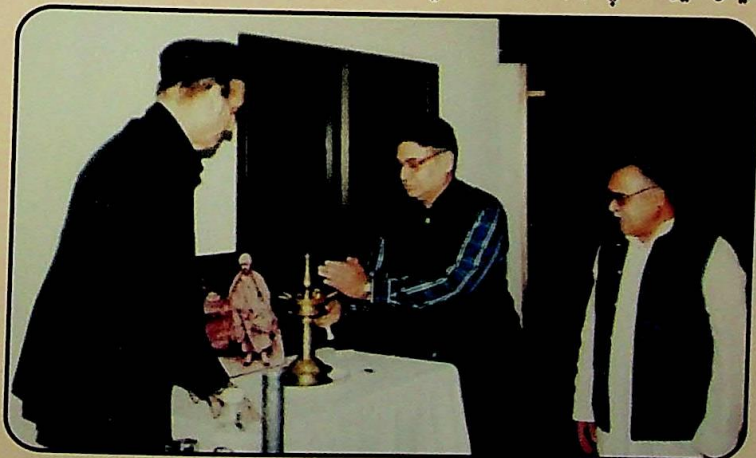
جموں کاشمیر کے سابق گورنر ڈاکٹر کرن سنگھ کے ساتھ دیپک بدکی ایک پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے۔

ISSN:-2348-5035

اشاعت کا ۳۴ رواں سال

شمارہ نمبر۔۱۰۳

اگست تا ستمبر ۲۰۱۶ء

(ویپک بدکی نمبر)

سہ ماہی

انتساب عالمی سرونج

سرپرست

انل اگروال

ترتیب

ڈاکٹر سیفی سرونجی

Mb. 9425641777

بیرون ممالک کے سرپرست

کنیڈا

ناصر بغدادی

امریکہ

پروین شیر

انگلینڈ

گلشن کھنہ

پاکستان

سید معراج جامی

مسعود تنہا

ابوظہبی

یعقوب تصور

جرمنی

سرور ظہیر

مدیر

آفاق سیفی

Mb: 9977955000

زرفاقت

ہندوستان

فی شمارہ چار شمارے

100 روپے 400 روپے

اس شمارے کی قیمت 300 روپے

برطانیہ

-/5 پونڈ -/20 پونڈ

یورپ

-/4 یورو -/16 یورو

امریکہ

-/15 ڈالر -/60 ڈالر

سعودی عرب

-/20 ریال -/80 ریال

عرب امارات

20 درہم 80 درہم

رابطہ: سیفی لائبریری، سرونج (ایم۔پی۔) ۴۶۴۲۲۸

Saifi library Sironj.(M. P.) INDIA.464228

email : saifi.sironji2015@gmail . com

فہرست

(دیپک بدکی نمبر)

تبصرے:

☆☆☆

فہرست

اپنی بات

--ڈاکٹر سیفی سرونجی

آج سے پندرہ سال قبل 'انتساب' نے دیپک بُدکی صاحب کی شخصیت اور فن پر ایک سو صفحات کا خصوصی گوشہ شائع کیا تھا جو ان کے شایانِ شان تو نہیں تھا تاہم ایک ادنیٰ سی کوشش ضرور تھی۔ وہ جس مرتبے کے افسانہ نگار اور ادیب ہیں مذکورہ گوشے کے توسط سے اس کا پورا احاطہ نہیں کر سکے لیکن اس وقت ہم یہ فیصلہ ضرور کر چکے تھے کہ ان کی زندگی اور ادبی کارناموں پر آئندہ 'انتساب' کا ضخیم نمبر ضرور نکالیں گے۔

اس درمیان دیپک بُدکی صاحب کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ افسانوی مجموعوں کے علاوہ ان کی کئی تنقیدی و تحقیقی مضامین اور تبصروں کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ ایک بڑے افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک نقاد بھی ہیں۔ عالمی ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں تنقیدی شعور اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ وہ اپنے ہر افسانے میں اپنی علمیت اور تنقیدی بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ زندگی کی تلخیوں کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں کہانی پن اور کردار سازی کے فن میں مہارت دیکھنے کو ملتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ دیپک بُدکی افسانے کے فن، اس کی ٹیکنیک اور زبان و بیان پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ان کے افسانوں کا قاری زیادہ تر پڑھا لکھا طبقہ ہوتا ہے۔ کئی زبانوں پر مہارت رکھنے کی وجہ سے ان کے افسانوں میں ایک گہری فکر اور معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ دوسری جانب چنانچہ ان کی ساری کوششیں عصر حاضر کے ادیبوں اور مسائل پر مرکوز رہتی ہیں، انھوں نے اپنی تنقیدی مضامین و تبصروں کی کتابوں کے نام میں بھی 'عصری' کا سابقہ جوڑ

رکھا ہے جیسے 'عصری تحریریں'، 'عصری شعور' اور 'عصری تقاضے'۔ ان کے افسانوں کے پہلے استاد تو وہ خود ہیں کہ وہ ایک اچھے نقاد بھی ہیں پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ان کا تنقیدی شعور اتنا بیدار ہے تو اپنا محاسبہ کیوں نہ کریں گے۔

دیپک بُدکی ہمیشہ سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں اور جب لکھتے ہیں تو ان کی ہر کہانی شاہکار کہانی کا روپ دھارن کرتی ہے۔ سینکڑوں افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں دیپک بُدکی صاحب نے ادبی دنیا میں اپنے لیے ایک الگ اور منفرد مقام بنایا ہے۔ حالانکہ وہ جس مقام و مرتبے پر فائز ہیں اس کو دیکھتے ہوئے انھیں وہ صلہ نہیں ملا جس کے کہ وہ مستحق ہیں۔ یہ میرا خیال ہے۔ ویسے ان کے نزدیک ایوارڈ وغیرہ ملنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور نہ وہ ان کے لیے کوئی کوشش کرتے ہیں۔ پھر ادبی دنیا میں کبھی کبھی جو نا انصافیاں ہوتی ہیں یا ہوتی رہی ہیں اس کا شکار وہ بھی ہوئے ہیں۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ اب تک ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ انھیں نہیں ملا گو مجھے اس بات کا احساس ہے کہ انعام و اکرام ادب کا پیمانہ نہیں ہوتا۔ بہر حال ہماری یہ حقیری کوشش یقیناً دیپک بُدکی کے مقام و مرتبے کا تعین کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

☆☆☆☆☆
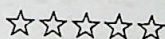
حیات نامہ: دیپک بُدکی

نام :دیپک کمار بُدکی　　　قلمی نام :دیپک بُدکی

پیدائش :۱۵ر فروری ۱۹۵۰ء بمقام سرینگر، جموں وکشمیر (انڈیا)

رھائش: ۲-۱۰-اے، ایس جی امپریشن، سیکٹر۴-بی، وسُندھرا، غازی آباد-۲۰۱۰۱۲

ای میل آئی ڈی deepak.budki@gmail.com

ٹیلی فون 91-9868271199

تعلیم: ایم ایس سی (بوٹنی)، بی ایڈ (کشمیر یونیورسٹی)؛ ادیبِ ماہر (جامعہ اردو علی گڑھ)

ایسوسی ایٹ، انشورنس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا، ممبئ؛ گریجویٹ، نیشنل ڈیفنس کالج، دہلی

تحقیقی مقالہ (نیشنل ڈیفنس کالج ndc کے لیے) :

Genesis of Kashmir Problem and Article 370

پیشہ: ۱۹۷۶ء تا ۲۰۱۰ء انڈین پوسٹل سروسز میں آفیسر رہا، آخرش ممبر، پوسٹل سروسز بورڈ، محکمہ ڈاک، نئی دہلی (ایڈیشنل سیکریٹری، گورنمنٹ آف انڈیا) کے عہدے سے سبکدوش ہوا۔ اس دوران ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۸ء تک آرمی پوسٹل سروس میں ڈیپوٹیشن پر رہا اور لیفٹنٹ کرنل کی رینک پا کر اپنے محکمے میں لوٹ آیا۔ اس سے قبل ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۶ء تک جموں و کشمیر ہینڈی کرافٹس (سیلز اینڈ ایکسپورٹس) کارپوریشن کی اکائی کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں بحیثیت منیجر اور پھر سٹیٹسٹکل و ریویو افسر کے کام کیا۔

علاوہ ازیں سرینگر کشمیر سے شائع ہونے والے چند اخبارات، جہان نو، نوجیون، عقاب، اور ہمارا کشمیر کے ساتھ مختصر مدت کے لیے بحیثیت کارٹونسٹ اور کالم نویس وابستہ رہا۔ ہفتہ وار 'عقاب' کے ساتھ سال بھر بطور جائنٹ ایڈیٹر منسلک رہا۔

دوردرشن، سرینگر اور آل انڈیا ریڈیو کی یووانی اور جنرل سروس کے پروگراموں خاص کر مباحثوں میں شرکت کی اور کچھ پروگراموں میں بطور اینکر کام کیا۔ اس کے علاوہ چند کوئز پروگراموں میں بطور کوئز ماسٹر کے کام کیا۔

ادبی کارنامے: ۱۹۷۰ء میں پہلا افسانہ 'سلمیٰ' کے نام سے ہمدرد سرینگر میں شائع ہوا۔ ۱۹۷۸ء میں قلم تخلیقی تعطل کا شکار ہوگیا۔ البتہ ۱۹۹۶ء سے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ آج تک ایک سو سے زائد افسانے تحریر کیے ہیں جو ہندوستان، پاکستان اور دیگر مغربی ممالک کے معتبر رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کئی افسانے ہندی، کشمیری، گوجری (پہاڑی)، انگریزی، مراٹھی اور تیلگو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ ایک افسانہ دوردرشن پر بھی ٹیلی وائز ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً ۵۵ر تنقیدی مضامین اور ۲۵۰ر کتابوں پر تبصرے قلم بند کیے ہیں۔ کافی عرصے تک اردو ترقی بورڈ نئی دہلی کے ہفتہ روزہ 'ہماری زبان' نئی دہلی کے لیے مختلف کتابوں پر تبصرے رقم کرتا رہا۔

تصانیف: افسانوی مجموعے۔

۱) ادھورے چہرے [اشاعت اول ۱۹۹۹ء اشاعت دوم ۲۰۰۵ء، اشاعت سوم ۲۰۱۴ء]؛ ہندی ایڈیشن [۲۰۰۵ء]

۲) چنار کے پنجے [اشاعت اول ۲۰۰۵ء، اشاعت دوم ۲۰۱۴ء]؛ ہندی ایڈیشن [۲۰۱۰ء]

۳) زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی [۲۰۰۷ء]

۴) ریزہ ریزہ حیات [۲۰۱۰ء]

۵) روح کا کرب [۲۰۱۵ء]

۶) مٹھی بھر ریت (افسانچے) [۲۰۱۵ء]

تنقیدی مضامین و تبصرے۔

۱)عصری تحریریں[۲۰۰۶ء]

۲)عصری شعور[۲۰۰۹ء]

۳)عصری تقاضے[۲۰۱۳ء]

۴)عصری تناظر [زیرطبع]

۵)اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار[زیرطبع]

بلاگ: انٹرنیٹ پر دو ذاتی بلاگ چل رہے ہیں؛

i)deepakbudki.com ii)budki.blogspot.in

سیمناروں اور ورکشاپوں میں شرکت:

۱)'برصغیر میں اردو زبان وادب۔کل آج اور کل'[اگست ۲۰۰۷ء]، کشمیر یونیورسٹی کے زیر اہتمام سہ روزہ سیمنار میں شرکت کی۔سیمنار میں مقالہ 'جموں وکشمیر میں اردو افسانہ' پڑھا۔

۲)'اردو کا سیکولر مزاج'[مارچ ۲۰۰۸ء]، سنٹر آف پروفیشنل سٹڈیز ان اردو، جموں یونیورسٹی کے زیر اہتمام دو روزہ سیمنار میں شرکت کی۔اس سیمنار میں 'جموں وکشمیر کے افسانوی ادب میں قومی یکجہتی کے عناصر' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔

۳)'جموں وکشمیر میں اردو، ماضی، حال اور مستقبل' [جنوری ۲۰۰۹ء]، سنٹر آف پروفیشنل سٹڈیز ان اردو، جموں یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام دو روزہ سیمنار میں شرکت کی۔اس سیمنار میں 'کشمیر میں اردو۔ ماضی، حال اور مستقبل' کے عنوان سے پیپر پڑھا۔

رسالوں کے خصوصی گوشے:

(۱)شاعر ممبئی ستمبر ۲۰۰۴ء، (۲)انتساب سرونج ۲۰۰۶ء، (۳)اسباق پونے جولائی ۲۰۰۷ء

قلم کار پر تحقیق:

۱)'دیپک بدکی کی افسانہ نگاری' - مقالہ نگار ڈاکٹر جاوید اقبال شاہ۔ برائے ایم فل، جموں یونیورسٹی۔ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

۲)'دیپک بدکی کے افسانوں میں نسوانی کردار'- مقالہ نگار محمد امین نجار۔ برائے ایم فِل شعبہ اردو، سکول آف ہیومنٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد ۵۰۰۰۴۶، آندھرا پردیش

۳)'دیپک بدکی کے تخلیقی افکار کا تنقیدی مطالعہ'- مقالہ نگار ڈاکٹر شیخ صفیہ بانو اختر حسین۔ ایم ایس یونیورسٹی، بروڈہ، گجرات کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ۲۰۱۵ء میں تفویض ہوگئی۔

قلم کار پر تحریر کی گئی کتابیں:

۱)' **دیپک بدکی کی افسانہ نگاری**'۔ڈاکٹر جاوید اقبال شاہ، مصنف کی ایم فِل کی تھیسز کا کتابی روپ ۲۰۰۹ میں شائع ہوا۔

۲)' **ورق ورق آئینہ: دیپک بدکی -شخصیت اور فن**'- پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری۔ اشاعت ۲۰۰۹ء

انعامات و اعزازات :

انٹرنیشنل فرینڈشپ سوسائٹی کی جانب سے شری بی این سنگھ، سابقہ گورنر آسام اور تامل ناڑو نے ۲۰۰۹ء میں راشٹریہ گورو سمان سے نوازا۔

علاوہ ازیں آندھرا اکادمی نے ۲۰۰۷ء میں اعزاز اور سد بھاونا منچ سرونج نے کالیداس سمان سے نوازا۔

دیگر مشاغل: ۱) ڈرائنگ، پینٹنگ اور کارٹوننگ ۲) باغبانی

☆☆☆☆☆

دیپک بُدکی سے سیفی سرونجی کی بات چیت

--ڈاکٹر سیفی سرونجی

س ۱) آپ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیے۔

ج ۱) میرا جنم محلہ کرالہ ٹینگ، وازہ پورہ، مہاراج گنج، سرینگر کشمیر میں ۱۵ر فروری ۲۰۱۵ء کو ہوا۔ عام طور پر یہ علاقہ 'وازہ پورہ' کے نام ہی سے مشہور تھا۔ یہاں مسلم طباخوں کی، جن کو مقامی زبان میں 'وازہ' کہتے ہیں، اکثریت ہے، اس لیے اس محلے کا نام 'وازہ پورہ' پڑا ہے۔ کشمیری پکوان (وازہ وان) دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ڈوگرہ حکومت کے دوران مہاراج گنج ہول سیل مارکیٹ ہوا کرتا تھا جہاں کھتریوں کی دکانوں کے سبب ہمیشہ چہل پہل رہتی تھی۔ آزادی کے بعد اس مارکیٹ کی رونق آہستہ آہستہ ختم ہوگئی۔

پاس ہی میں ایک جبری سکول ہوا کرتا تھا جہاں میری تعلیم کا آغاز ہوا۔ دراصل مہاراجہ ہری سنگھ نے مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے کی غرض سے جبری تعلیم شروع کی تھی۔ ان سکولوں میں بچوں کو زبردستی لاکر تعلیم دی جاتی تھی۔ عمارتوں کی خستہ حالت اور عدم سہولیات کی وجہ سے انھیں مقامی لوگ حقارتاً 'جبری زٹ' کے نام سے بلاتے تھے۔ جھر جھر دیواریں، ہر سو گرد، دھول اور مٹی، گندے ٹاٹ، میز نہ کرسیاں۔ طلبہ زمین پر بیٹھ کر پڑھائی کرتے تھے۔ مگر اساتذہ مخلص اور فرض شناس تھے جو وصف آج کل کے اساتذہ میں مفقود ہے۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر محمد یٰسین صاحب بہت ہی نیک اور پارسا آدمی تھے۔ تعلیم مفت تھی پھر بھی سکول والے دو تانبے کے پیسے (ان دنوں ایک روپے میں ۶۴ پیسے ہوا کرتے تھے) طالب علموں سے وصول کیا کرتے تھے جن سے وہ بلیک بورڈ، چاک، ڈسٹر، چارٹ وغیرہ خرید لیتے تھے۔ اس کے برعکس مہینے میں ایک دو بار ریڈ کراس کا سوکھا دودھ مل جاتا تھا جس کی قیمت اس زمانے میں دو تین آنے ہوا کرتی تھی۔ چونکہ کشمیری لوگ دودھ والی نمکین چائے پینے کے عادی ہیں اس لیے یہ سوکھا دودھ گھر میں چائے بنانے کے کام آجاتا تھا۔ غرض یہ کہ طلبہ ہر حال میں فائدے میں رہتے تھے۔ لکھائی تختیوں پر کی جاتی تھی جن پر نرسل کے قلم اور کھریا مٹی سے لکھا جاتا تھا۔ پانچویں تک اسی سکول میں تعلیم پائی اور بنیادی

حساب اور انگریزی واردو کے حروف تہجی سے واقفیت حاصل کی۔

ثانوی تعلیم کے لیے نزدیک ہی ہمدانیہ ہائر سیکنڈری سکول، نوا کدل میں داخلہ لیا۔ وہاں چھٹی سے اٹھویں تک تعلیم حاصل کی۔ اردو کے بدلے ہندی اختیاری مضمون لے لیا اور اس طرح اردو سے ناتا ٹوٹ گیا۔ سائنس اسٹوڈنٹ ہونے کے سبب ذریعہ تعلیم انگریزی بن گیا۔۱۹۶۲ء میں آٹھویں کے سالانہ امتحانات سے کچھ روز پہلے والدہ کا سورگباش ہوگیا۔ جیسے تیسے امتحان میں کامیابی حاصل کرلی۔ پتاجی کی بڑی آرزو تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اچھے سکول میں ڈال دے۔ اس لیے ہمت کر کے آخر کار انھوں نے مجھے ڈی اے وی ہائر سیکنڈری سکول، امیرا کدل بھیج دیا۔ یہاں کا اسٹینڈارڈ بہت ہی اونچا تھا، اس لیے مجھے خود کو وہاں ایڈجسٹ کرنے میں کافی دقتیں پیش آئیں خاص کر ہندی کے حوالے سے۔ دوسرے یہ کہ سکول گھر سے چار پانچ کلومیٹر کی دوری پر تھا اس لیے روزانہ سائیکل پر جانا پڑتا تھا۔ اس سکول میں شمبو ناتھ کاچرو صاحب نے، جو ہر فن مولا استاد تھے، مجھے بہت متاثر کیا۔ ان کی وجہ سے میں زندگی میں کافی نڈر اور بے باک بن گیا۔

گیارہویں کے بعد سری پرتاپ کالج سرینگر میں داخلہ لیا جہاں سے میں نے علم نباتات میں بی ایس سی (آنرس) پاس کیا۔ یہاں بھی بوٹنی کے ایک پُر خلوص، سادہ لوح، قناعت پسند اور مہربان پروفیسر بشیر صاحب نے میری رہنمائی کی۔ اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے ایم ایس سی (باٹنی) کی ڈگری حاصل کر کے، پھر گاندھی کالج سے بی ایڈ کا امتحان کامیاب کرلیا۔ میری تازہ کتاب 'عصری تقاضے' مذکورہ بالا تینوں اساتذہ کے نام منسوب ہے۔

حال آنکہ میں نے بنیادی تعلیم کے دوران اردو سیکھ لی تھی مگر تسلسل نہ رہنے کے باعث سب کچھ بھول گیا تھا۔ بی ایس سی (آنرس) کے آخری مرحلے میں پھپیرے بھائی کی موت واقع ہوئی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی تحریک دی۔ اسی روز رات بھر ایک ڈرامہ 'بندھن' اور کچھ اشعار لکھ ڈالے جو بعد میں تلف ہوگئے۔ اس وقت مجھے ہندی، اردو یا انگریزی کسی بھی زبان پر قدرت نہیں تھی۔ سو تینوں زبانوں کے رسم الخط اور الفاظ استعمال کیے۔ نتیجے میں مجھے اپنی اس خامی کا احساس ہوا۔ اس لیے اورینٹل ایوننگ سکول میں، جو ایم پی سکول سرینگر میں سکول بند ہونے کے بعد چلتا

تھا، اردو سیکھ لی اور جامعہ علی گڑھ کے ادیب اور ادیب ماہر کے امتحانات ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء میں بالترتیب کامیاب کیے۔ اسی دوران میں نے ایک جانب افسانہ نگاری شروع کی اور دوسری جانب میر راجپوری کے اخبار 'جہان نو' میں کارٹون بنانے لگا۔ بعد میں 'نوجیون'، 'عقاب' اور 'ہمارا کشمیر' میں بھی میرے کچھ کارٹون چھپتے رہے۔ پہلے پہل کارٹونوں پر دیپک کی نسبت سے 'ہجو' نام لکھتا رہا مگر یہ زیادہ دیر نہیں چلا۔ اپریل ۱۹۷۱ء میں نوکری ملی اور چنڈی گڑھ تعینات ہوا جس کے سبب ادیب کامل کا امتحان رہ گیا۔ ۷۵-۱۹۷۲ء کا دور خرافاتی دور رہا مگر ۱۹۷۵ء میں جب آنکھ کھلی تو بہت پچھتاوا ہوا۔ اس لیے انڈین سول سروسز کے امتحانات کی تیاری کر لی اور آخر کار انڈین پوسٹل سروس میں الاٹ ہوا۔

س۲) آپ کا پہلا افسانہ کس سن میں اور کون سے رسالے میں شائع ہوا؟

ج۲) ۱۹۷۰ء میں جب میں گاندھی کالج سرینگر میں بی ایڈ کورس کر رہا تھا، کالج میں گورونانک کی تعلیمات پر ایک ڈبیٹ منعقد ہوا جس میں میں نے شرکت کی۔ حالانکہ سب سے زیادہ واہ واہی میں نے بٹور لی اور ہال تالیوں کی گونج سے گونجتا رہا پھر بھی انعام کسی اور کو دیا گیا۔ اس واقعے کے زیر اثر میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر پہلا افسانہ تحریر کیا۔ بے صبری اتنی تھی کہ افسانے کو عنوان دیے بغیر ہی دوڑتا ہوا اخبار میں چھپوانے کے لیے نکل پڑا۔ اخبار 'آفتاب' کے گیٹ تک پہنچ کر بھی کوئی عنوان نہیں سوجھا اس لیے افسانے کی ہیروئن 'سلمیٰ' کا نام لکھ ڈالا۔ مدیر روزنامہ 'آفتاب' نے ایک دو مہینے کے اندر شائع کرنے کا یقین دلایا مگر میرے اتاولے پن نے مجھے روزنامہ 'ہمدرد' کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے آمادہ کیا۔ افسانہ چار روز کے بعد روزنامہ 'ہمدرد' میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی قلعہ فتح کیا ہو۔ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس کے بعد متواتر افسانے لکھتا رہا اور مقامی اخباروں میں شائع ہوتا رہا۔ ۷۴-۱۹۷۳ء کے دوران ہفتہ وار 'عقاب' میں بطور جائنٹ اڈیٹر کے کام کیا اور کئی متنازع مضامین و کالم رقم کیے۔ چونکہ میں ان دنوں جموں و کشمیر ہینڈی کرافٹس (سیلز اینڈ ایکسپورٹس) کارپوریشن کے یونٹ کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں ملازم تھا اس لیے 'ڈی کے سنتوش' کے فرضی نام سے لکھتا تھا۔ ۱۹۷۸ء کے بعد ادبی تعطل کا شکار ہو گیا۔ اس کے چند اسباب یوں تھے۔ میں جو کچھ بھی لکھتا تھا اس میں موجودہ نظام کے خلاف احتجاج اور بغاوت کی بو آتی تھی۔ چنانچہ نوکری بہت اچھی مل گئی تھی، اس لیے اس کے ساتھ کھلواڑ

کرنا مجھ جیسے غریب آدمی کے لیے ناممکن تھا۔ دوسرے یہ کہ پروبیشن کے دوران میں نے لکھنؤ میں اپنے افسر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو اپنے چند افسانے پڑھنے کے لیے دیے تا کہ ان کی رائے جان سکوں۔ ان کی سرد مہری نے دل شکستہ کر دیا۔ میں نے سوچا کہ فارمل تعلیم کی کمی کے سبب شاید میرے افسانوں میں وہ پختگی نہیں ہوگی جو ان میں ہونی چاہیے۔ اس لیے میں نے مزید لکھنے کا ارادہ ترک کرلیا۔ یہاں میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں فاروقی صاحب کی دل سے قدر کرتا ہوں اور ان کی تبحر علمی سے بہت متاثر ہوں۔ اردو ادب کو ان جیسے ادیبوں کی سخت ضرورت ہے۔ ۱۹۹۶ء میں حالات نے ایسی کروٹ لی کہ مجھے دوبارہ ہاتھ میں قلم اٹھانے کے لیے مجبور ہونا پڑا اور تب سے آج تک مسلسل افسانے، مضامین اور تبصرے لکھ رہا ہوں۔

س ۳) کشمیر میں آپ کے نزدیک کون کون سے افسانہ نگار اہم ہیں؟

ج ۳) دراصل ہم لفظ کشمیر کو ریاست جموں و کشمیر کے مخفف کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس ریاست میں موجودہ دور میں کئی افسانہ نگار فعال ہیں جن میں سے نور شاہ، ویریندر پٹواری، عمر مجید مرحوم، آنند لہر، دیپک کنول، ترنم ریاض اور غلام نبی شاہد نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ ان کے فن پر میں نے سیر حاصل مضامین بھی رقم کیے ہیں جو میری کتابوں میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، بلراج بخشی، وحشی سعید ساحل اور زاہد مختار نے بھی افسانہ نگاری میں کافی یوگدان دیا ہے۔

س ۴) آپ نے افسانوں کے علاوہ کبھی کوئی ناول بھی لکھا ہے؟

ج ۴) نہیں، میرا کوئی ناول ابھی تک منظر عام پر نہیں آچکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں عجلت پسند اور تلوّن مزاج آدمی ہوں۔ یہاں تو جٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہے۔ مجھے ناول نگاری مغز ماری لگتی ہے۔ نہ تو میرے پاس اتنی ہمت ہے اور نہ ہی صبر و شکیب۔ ہاں اتنا عرض کرتا چلوں کہ ناول کے ایک دو پلاٹ ذہن میں محفوظ ہیں مگر ہمت نہیں جٹا پا رہا ہوں۔ دیکھیے مستقبل میں کبھی موڈ بنتا ہے تو شاید بات بن جائے...!

س ۵) فکشن سے متعلق آپ تنقید سے مطمئن ہیں؟

ج ۵) مطمئن........! یہ تو لاکھ ٹکے کی بات کہی آپ نے۔ سیفی صاحب، اردو میں فکشن کا

نقاد ہے کہاں؟ جس سے دیکھو شاعری پر اپنی ساری توانائی صرف کر رہا ہے کیونکہ اس میں محنت کم اور فائدہ زیادہ ہے۔تنقید و تحقیق نگار زیادہ تر کلاسیکی ادیبوں جیسے میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اس سے انھیں اپنی شناخت قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔اس کے علاوہ اردو میں عجیب سی گروہ بندی ہے۔نقاد کتاب اٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لیتا ہے کہ قلم کار اس کے گروپ میں شامل ہے یا نہیں۔پورا دیوان ایک دو گھنٹے میں پڑھ ڈالا اور اپنی رائے کا اظہار کر لیا۔انگریزی لٹریچر سے واقفیت ہو تو سونے پر سہاگا۔اس کے حوالہ جات دے کر اپنی دھاک بٹھا لی۔ناشاعروں کو شاعر بنا لیا اور اعلیٰ شاعروں کو نظر انداز کر لیا۔

البتہ فکشن میں چند ایک نقادوں مثلاً وارث علوی، قمر رئیس، محمد حسن، جعفر رضا، وہاب اشرفی وغیرہ نے بڑی عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ایک اور حقیقت جو سامنے آئی ہے وہ یہ کہ موجودہ دور میں تنقید و تحقیق کا کام اب جامعات کی ملکیت بن چکا ہے، ڈگریاں لینے کی خاطر طلبہ سے اپنے دوستانہ دائرے میں شامل ہم عصر افسانہ نگاروں یا ناول نگاروں پر کام کروایا جاتا ہے۔جب سے 'کٹ اینڈ پیسٹ' تکنالوجی کا چلن ہوا ہے، یہ کام بہت ہی آسان ہو چکا ہے اور اس طرح جامعات میں ہر سال کئی مقالے تھاپے جاتے ہیں جن کی کوالٹی کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔

س۶) آج کل تنقید کے نام پر جو گروپ بندیاں چل رہی ہیں اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج۶) پہلے یہ بتایئے کہ آپ کس گروہ میں شامل ہیں؟ گوپی چند نارنگ گروپ میں یا پھر شمس الرحمٰن گروپ میں تا کہ میں کوئی ایسی بات نہ کروں جو آپ کو ناگوار گزرے۔مجھے ایک قصہ یاد آیا۔میں نے جب دوسرا افسانوی مجموعہ ترتیب دیا تھا تو اس کی اشاعت کے لیے استعارہ پبلی کیشنز سے رجوع کیا تھا۔ان کا جواب تھا کہ ۲۹ ہزار کے عوض نہ صرف میرا مجموعہ چھپ جائے گا بلکہ گوپی چند نارنگ سے اس پر پیش لفظ بھی لکھوایا جائے گا۔مجھے حیرت ہوئی کیونکہ یہ بات تو میں نے کبھی سوچی بھی نہ تھی کہ ادب کا بھی تجارتی کرن ہو چکا ہے اور مارکیٹ میں اس کے بھی اپنے دلال دستیاب ہیں۔بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اب تو پیش لفظ لکھنے اور خوشنما تبصرے لکھنے کے لیے بھی نامور لوگ محنتانہ مانگتے ہیں۔

میں ادب کے ارتقائی سفر کے خلاف نہیں ہوں۔اردو ادب میں ہر تحریک کا اپنا یوگدان رہا ہے

۔البتہ میں اس رویے کے خلاف ہوں کہ آپ کسی اور نظریے کی مثبت باتوں کو سمجھنے اور ان کے ساتھ اتفاق کرنے کو تیار نہیں اور ان کی ہر بات کو یک قلم مسترد کرتے ہیں۔ادب کا یہ رجحان بہت ہی نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔

س ۷) آپ افسانوں کے علاوہ آج کل مضامین اور تبصرے بھی خوب لکھ رہے ہیں۔ آپ کے اندر ایک بڑا نقاد چھپا ہے۔یہ بات اکثر لوگوں نے لکھی ہے۔

ج ۷) تبصرہ نگاری کی جانب میں اتفاق سے راغب ہوا۔ بہت سال پہلے ف س اعجاز، مدیر 'انشاء' نے اپنی ایک کتاب بھیجی تھی اور اس پر میری رائے مانگی تھی۔ میں نے کتاب کا مطالعہ کیا اور پھر اپنے تاثرات قلم بند کیے۔رہنمائی کے لیے میں نے ہرچرن چاولہ کے وہ تاثرات سامنے رکھے جو انھوں نے میرے افسانوی مجموعے 'ادھورے چہرے' پر رقم کیے تھے۔میرے تاثرات انشاء میں بطور تبصرہ چھپ گئے اور پھر یہ سلسلہ جاری رہا۔یوں بھی مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق تو ہے ہی پھر سوچا کیوں نہ اپنے تاثرات بھی قلم بند کرتا چلوں۔میں نے تقریباً تین سو کتابوں پر تبصرے لکھے ہیں اور چالیس سے زیادہ مضامین رقم کیے ہیں۔یہاں پر یہ لکھنا ضروری ہے کہ میں نے جتنے بھی تنقیدی مضامین و تبصرے رقم کیے ہیں وہ سب کے سب ہم عصر ادیبوں کی کاوشوں پر ہیں کیونکہ جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے ان ادیبوں کو نقاد اور مبصر نظر انداز کررہے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ میں کوئی پیشہ ور تنقید نگار نہیں ہوں۔ یہ کام میں شوقیہ کرتا ہوں۔میں کتابوں کو سرسری پڑھ کر ان پر تبصرے نہیں کرتا بلکہ ان کو اول تا آخر پڑھ لیتا ہوں اور اس کے بعد ہی ان پر اپنے تاثرات قلم بند کرتا ہوں۔اردو کے سکڑتے دائرے کو دیکھ کر میری یہ شعوری کوشش رہتی ہے کہ میں قاری کو کتاب کی مثبت خصوصیات سے آگاہ کروں اور رائٹر و قاری کے درمیان پُل بنا سکوں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں کتاب کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرتا ہوں۔ان کی نشاندہی کرنا میرا فرض بنتا ہے لیکن میں بال کی کھال اتارنے سے گریز کرتا ہوں کیونکہ تبصرہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔

جہاں تک میرے اندر نقاد چھپے رہنے کی بات ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہر ذی حس ادیب کے اندر ایک نقاد چھپا ہوتا ہے۔تبھی تو وہ مشاہدہ اور مطالعہ کرتے وقت ہر شے اور ہر کردار کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے،

جانچتا ہے اور پرکھتا ہے اور پھر کسوٹی پر پرکھ کر ہی اسے اپنی تخلیق میں پیش کرتا ہے۔

س ۸) اب تک آپ کی کتنی کتابیں چھپ چکی ہیں؟

ج ۸) اب تک میری نو کتابیں چھپ چکی ہیں اور مزید دو کتابیں اشاعت کے مراحل سے گزر رہی ہیں۔ دو کتابوں کے کئی اردو ایڈیشن اور ہندی ایڈیشن بھی چھپ چکے ہیں۔ تفصیل یوں ہے:

افسانوں کے مجموعے :

۱) ادھورے چہرے (پہلا ایڈیشن ۱۹۹۹ء، دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۵ء، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء؛ ہندی ایڈیشن ۲۰۰۵ء)

۲) چنار کے پنجے (پہلا ایڈیشن ۲۰۰۵ء، دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء؛ ہندی ایڈیشن ۲۰۱۱ء)

۳) زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (۲۰۰۷ء)

۴) ریزہ ریزہ حیات (۲۰۱۰ء)

۵) روح کا کرب (۲۰۱۶ء)

افسانچوں کا مجموعہ:

۶) مٹھی بھر ریت (۲۰۱۶ء)

تنقیدی مضامین و تبصرے:

۷) عصری تحریریں (۲۰۰۷ء)

۸) عصری شعور (۲۰۰۹ء)

۹) عصری تقاضے (۲۰۱۳ء)

زیر طبع :

۱۰) عصری تناظر

۱۱) اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار

س ۹) آپ کی کہانیوں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ کس زبان میں؟

ج ۹) جی ہاں۔ میری کئی کہانیوں کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں جیسے ہندی

: بٹی ہوئی عورت [سریتا دہلی]، کینچلی [سند پٹنہ]، ڈرفٹ وُڈ اور کالا گلاب [سرس سلِل دہلی]، اچانک [کوشر سماچار، روپ کی شوبھا دہلی] ایک نہتے مکان کا ریپ [کوشر سماچار]، مخبر [کوشر سماچار]، سرحدیں [جن ستہ سالنامہ ۲۰۱۰ء]، کوؤں کی پورنماشی [کوشر سماچار]، مجموعے 'ادھورے چہرے' 'چنار کے پنجے' بھی ہندی میں چھپ چکے ہیں؛ انگریزی: مخبر {The Informer}، [کشمیر سینٹی نیل جموں، کشمیر نیوز نیٹ ورک آن لائن، شہجار آن لائن، میراث دہلی]؛ گھونسلا {The Nest} [شہجار آن لائن، میراث دہلی]؛ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی {At the Zebra Crossing} [جرنلزم ٹوڈے اڑیسہ، میراث دہلی]؛ کشمیری: اچانک [ہرموکھ بڈگام]، گھونسلا [واکھ دہلی]؛ تیلگو: اچانک [وِپُل آندھرا]، راکھ کا ڈھیر [روی وار وِشال آندھرا]، مخبر [پوڈو آن لائن]، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی [ایماتا ویب زین، وارتھا ڈیلی سنڈے میگزین]؛ اور مراٹھی: بدھ کی مسکراہٹ [ساہتیہ سوچی، پونے]۔

س ۱۰) آپ کہانی ایک بیٹھک میں مکمل کرتے ہیں ہیں یا کئی دن میں؟

ج ۱۰) یہ کہانی اور میرے موڈ پر منحصر ہوتا ہے۔ کئی کہانیاں تو ایک ہی نشست میں ختم ہوتی ہیں حالانکہ اس کے بعد انھیں کئی بار پھر سے پڑھنا پڑتا ہے تاکہ کوئی کسر باقی نہ رہے مگر اکثر کہانیاں لکھنے میں کئی دن لگتے ہیں۔ اس میں مصلحت بھی کام کرتی ہے۔ کہانی کو ایک بار لکھ کر اگر اس کو بار بار پڑھا جائے تو کبھی کبھی کچھ تبدیلیاں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دو ایک بار ایسا بھی ہوا کہ میں نے شائع ہونے کے لیے اپنی کہانیاں ایڈیٹر حضرات جیسے زبیر رضوی، ایڈیٹر ذہن جدید، گلزار جاوید، ایڈیٹر چہار سو اور اقبال حسن آزاد ایڈیٹر ثالث کو بھیج دیں مگر انھوں نے ان میں ایک آنچ کی کسر پائی اور لوٹا دیں۔ ان کی صلاح پر میں نے دو کہانیوں (حسرتوں کا مدفن، بستے کا بوجھ) کو از سر نو لکھ لیا مگر کہانی 'احتجاج' میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ کئی کہانیاں تو میرے دماغ میں برسوں دبی ہوئی چنگاریوں کی مانند سلگتی رہتی ہیں اور پھر جا کر صفحۂ قرطاس پر رقص کرنے لگتی ہیں۔

س ۱۱) آپ کو اب تک کتنے ایوارڈ مل چکے ہیں۔ اور نہیں تو کیوں نہیں؟

ج ۱۱) مجھے آج تک کوئی ایوارڈ نہیں ملا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں کسی ایوارڈ یا مالی امداد کے لیے اپنی کتابیں پیش نہیں کرتا۔ ایوارڈ پانے کے لیے گروہ بندی اور نیٹ ورکنگ کی ضرورت ہوتی ہے

اور مجھے یہ دوڑ دھوپ بالکل پسند نہیں۔ آج میری کتابیں دنیا کی کئی لائبریوں میں موجود ہیں۔ یہی کیا کم ایوارڈ ہے۔ البتہ یہ میری ناشکری ہوگی اگر میں یہ نہ کہوں کہ آندھرا اکیڈمی حیدرآباد اور سد بھاونا منچ، سرونج نے مجھے اعزاز بخشا جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔ اس کے علاوہ انڈیا فرینڈ شپ سوسائٹی نے مجھے میری دفتری اور ادبی صلاحیتوں کے مدِنظر ۲۰۰۹ء میں راشٹریہ گورو سمان سے نوازا اور یہ ایوارڈ جناب بی این سنگھ، سابقہ گورنر آسام اور تمل ناڈو کے دست مبارک سے دیا گیا۔

س۱۲) کوئی اہم واقعہ جسے آپ قارئین کو بتانا چاہیں۔

ج۱۲) یوں تو زندگی کا ہر لمحہ ایک نیا تجربہ بن کر سامنے آتا ہے۔ میں ان گنت ایسے واقعات اور حادثات سے گزر چکا ہوں جنھوں نے میری زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ ان واقعات کو میں نے وقتاً فوقتاً اپنے افسانوں اور افسانچوں میں بیان کیا ہے۔ ایک واقعہ تو خیر میں نے پہلے بھی سلطانہ مہر کو 'گفتنی' کے لیے لکھ کر بھیجا تھا اس لیے یہاں ایک اور واقعے کا ذکر کرتا ہوں۔ جن دنوں میں کشمیر میں سینئر سپرانٹینڈنٹ پوسٹ آفسز کے عہدے پر تھا میں نے کھنہ بل پوسٹ آفس کا اچانک معائنہ کر لیا اور ڈاک خانے کو بند پا کر وہاں کے پوسٹ ماسٹر کو معطل کر دیا۔ وہ اور اس کا والد میرے مشفق پھوپھا، جو ایک اصول پرست سیاستدان تھے اور میرے رہنما بھی، کے پاس پہنچ گئے اور منت سماجت کی۔ انھوں نے فوراً مجھے ٹیلیفون کیا۔

''دیپک جی، سنا ہے کل آپ کھنہ بل دورے پر گئے تھے اور وہاں ایک پوسٹ ماسٹر کو معطل کر دیا۔''

''جی ہاں، وہاں ڈاک خانہ بند تھا۔ اس لیے یہ کارروائی کرنی پڑی۔''

''پوسٹ ماسٹر اور اس کے پتا جی میرے پاس آئے ہیں۔ بہت نادم ہیں۔ اس کے پتا جی ہماری سیاسی پارٹی کے اہم رکن ہیں۔ میری درخواست ہے کہ آپ اس پر نظر ثانی کر لیں۔''

''انکل، نظر ثانی کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے البتہ پہلے آپ میری بات سن لیجیے۔ میں آپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ آپ کے بتائے ہوئے راستے کے عین مطابق ہے۔ میں آپ کو اپنا گورو مان کر آپ کی تعظیم کرتا ہوں۔ اگر میں اس آرڈر کو واپس لیتا ہوں تو میں

یہ سمجھنے کے لیے مجبور ہو جاؤں گا کہ آپ نے ساری عمر جو سبق مجھے دیا ہے وہ سب غلط تھا اور آپ کی کتھنی اور کرنی میں انتر ہے۔ نہیں تو وہ آرڈر اپنی جگہ رہے گا اور آپ کا مجسمہ جس کی میں پوجا کرتا ہوں، اپنی جگہ پر۔ آپ اس بات پر غور کرلیں اور پانچ منٹ کے بعد اپنے فیصلے سے مجھے آگاہ کرلیں۔''

''دیپک جی، میں سمجھ گیا۔ دراصل میں نے ایک ہی سائیڈ کا قصہ سنا تھا اور جلد بازی میں تمھیں ٹیلی فون کرلیا۔ مجھے یہ گماں بھی نہ تھا کہ میں نے تم جیسے مثالیت پسند اور اصول پرست آدمی تیار کیے ہیں۔ خیر تم جو جائز سمجھتے ہو وہی کرلو۔''

نتیجتاً اس پوسٹ ماسٹر پر تادیبی کارروائی اپنے انجام تک پہنچ گئی۔

س ۱۳) آپ کا پسندیدہ اور مشہور افسانہ آپ کی نظر میں کون سا ہے؟

ج ۱۳) یہ تو ایسی بات ہوئی کہ ایک ماں سے پوچھا جائے کہ تمھارا کون سا بچہ تمھیں سب سے زیادہ پسند ہے۔ خیر اس کے باوجود میں اپنے کچھ افسانوں کی نشاندہی کرسکتا ہوں جن پر مجھے فخر ہے۔ ایک نہتے مکان کا ریپ، ادھوری کہانی، گھونسلا، اماں، مخبر، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، چڑی کی بیگم اور ڈاگ ہاؤس۔ دو ایک کے بارے میں نقادوں کے مختصر تاثرات ذیل میں درج کرتا ہوں۔

☆ ایک نہتے مکان کا ریپ بے مثال افسانہ ہے۔..... یہ اردو میں اپنی نوعیت کا اچھوتا افسانہ ہے۔ (وارث علوی)

☆ میرا خیال ہے 'ادھوری کہانی' اس مجموعے کا سب سے اچھا افسانہ ہے اور اسے تمھارے بہترین افسانوں میں شمار کرنا چاہیے۔ (شمس الرحمن فاروقی)

☆ 'مخبر' مجھے بہت اچھی لگی۔...... یہ کہانیاں ہمیں آئینہ دکھاتی ہیں اور ان آئینوں میں اگر ہم اپنا بھیانک چہرہ دیکھنے کی اخلاقی جرأت پیدا کرلیں تو شاید ہمارے اعمال درست ہو جائیں گے۔'' (سلطانہ مہر)

☆☆☆☆☆

☆ ڈاکٹر سیفی سرونجی؛ انٹرویو: 'افسانہ نگار دیپک بدکی سے سیفی سرونجی کی بات چیت'؛ مطبوعہ: سہ ماہی 'انتساب عالمی' سرونج، جلد ۳، شمارہ ۳، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵ء، (پرانا شمارہ نمبر ۹۹

افسانہ نگار دیپک بُدکی سے ایک ملاقات

--محمد مصطفیٰ علی سروری

دیپک کمار بدکی سے بات چیت کے دوران ہم سے رہا نہ گیا اور ہم نے دریافت کرلیا کہ اردو زبان کو جب مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا تو پھر آپ کا اردو کے ساتھ تعلق کیسے ہے؟ اس سوال کے جواب میں اردو افسانہ نگار دیپک کمار بدکی نے کہا کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ اردو زبان کا بھی کوئی مذہب نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اتر پردیش جہاں ملک کے مسلمانوں کی خاصی تعداد آباد ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان مسلمانوں کو اردو نہیں آتی ہے بلکہ وہ لوگ ہندی میں عبور رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق جو لوگ کسی بھی زبان کو مذہب سے جوڑ دیتے ہیں وہ دراصل خود اپنی کم علمی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

دیپک کمار صاحب سے جب اردو زبان سیکھنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ پانچویں جماعت تک اسکول میں اردو ایک لازمی مضمون تھا۔ اس کے بعد ہندی میڈیم سے تعلیم کے سبب ان کا اردو سے تعلیمی تعلق ختم ہو گیا۔ پھر جب وہ ایم ایس سی (باٹنی) کر رہے تھے تب انھیں خیال آیا کہ وہ اگر اردو سیکھ لیں تو یہ ان کے کیریئر میں بھی کام آسکتی ہے۔ انھوں نے جامعہ علی گڑھ کے اردو امتحانات کامیاب کیے اور اردو شعر و ادب سے اپنا تعلق بدستور برقرار رکھا۔ دیپک کمار بُدکی کہتے ہیں کہ سیول سروسز کے امتحان میں شرکت ان کا دیرینہ خواب تھا۔ گریجویشن کی تکمیل کے بعد ہی انھوں نے اس ضمن میں محنت شروع کردی تھی اور جب پبلک سروس کمیشن (UPSC) نے سیول سروسز کے لیے اعلامیہ جاری کیا تو دیپک کمار بُدکی نے بھی درخواست داخل کی اور اپنے لیے جن تین مضامین کا انتخاب کیا ان میں باٹنی اور ہسٹری کے ساتھ تیسرا مضمون اردو کا تھا۔ جی ہاں! ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے دیپک کمار بدکی نے آئی اے ایس (سیول سروسز) کے امتحان میں شرکت کے لیے اردو زبان کو تین میں سے ایک مضمون کے طور پر منتخب کیا۔ دیپک کمار بُدکی کا یہ فیصلہ ان لوگوں کے منہ پر ایک طمانچے سے کم نہیں ہے جو یہ کہتے نہیں تھکتے کہ اردو زبان تو کب کی مر چکی ہے کب تک اس کا جنازہ اٹھائے پھریں گے یا یہ تجویز کہ

اردو زبان کی بقا کے لیے اردو کے رسم الخط کو تبدیل کر دیا جانا چاہیے۔ دیپک کمار بدکی نے یو پی ایس سی کے امتحانات میں اردو زبان کا انتخاب رسماً نہیں کیا بلکہ جب امتحانات کے نتائج سامنے آئے تو پتہ چلا کہ انھیں بوٹنی کے بعد دوسرے سب سے زیادہ نشانات اردو کے مضمون میں ہی ملے ہیں۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ کیمسٹری کے علاوہ ہندی اور انگریزی زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں تو انھوں نے اردو زبان میں ہی طبع آزمائی کرنے اور افسانے لکھنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ اس سوال کے جواب میں دیپک کمار بدکی نے کہا کہ اردو دراصل ان کے دل کی زبان ہے اور چونکہ وہ اپنی تحریروں میں اپنے دل کی بات رقم کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے اردو میں لکھنا شروع کیا۔ ان کے اس جواب کے درمیان مخل ہو کر جب ہم نے جاننا چاہا کہ کیا وہ جو کچھ لکھتے ہیں دل سے لکھتے ہیں تو تب انھوں نے برجستہ کہا کہ ہاں سارا معاملہ دل کا ہی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اردو میں لکھیں تو شاید زیادہ بہتر طریقے سے انصاف کر سکیں گے جہاں تک انگریزی زبان میں لکھنے کا سوال ہے تو اس کے متعلق انھوں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ کسی کانونٹ (Convent) تعلیمی ادارے کے فارغ نہیں ہیں۔ لیکن انگلش میں لکھ سکتے ہیں مگر شاید اپنے دل کی بات صحیح طریقے سے بیان نہیں کر پاتے تھے۔ اخبار سیاست کے قارئین کو یہاں یہ بات یاد دلانا بیجا نہ ہوگا کہ دیپک کمار بدکی کے افسانوں پر تبصرہ سیاست کے ادبی صفحات کی بھی عرصہ قبل ہی زینت بن چکے ہیں۔ جس کا وہ خود فخریہ اظہار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو دنیا نے مجھے بے حد سراہا ہے اور یہی ستائش میرے لیے کافی ہے۔ اگر میں کشمیری میں لکھتا تو میں اتنے زیادہ قارئین تک نہیں پہنچ پاتا۔ دنیا بھر میں پھیلے اردو قارئین کے حوالے سے انھوں نے بتلایا کہ ان کے افسانوں کو پڑھ کر ٹیکساس امریکہ کے رہنے والے ایک قاری نورامروہی نے، جو کہ لیدر کے بہت بڑے تاجر ہیں، جب رات کے ساڑھے بارہ بجے فون کر کے ان کی تحریروں کو سراہا تو اپنے ایک قاری کے سات سمندر پار سے آنے والے فون کال کو وصول کر کے ان کا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اعزاز میرے لیے کافی ہے۔ اردو زبان سے واقفیت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہر اردو جاننے والا فرد ادیب یا افسانہ نگار بن جائے، اردو کے ذریعہ آپ نے اپنا کیریئر بنایا پھر سیول سروسز اختیار کرنے کے باوجود اردو میں لکھنا کیسے شروع کیا اور ایسا خیال کیوں آیا؟ اس سوال پر دیپک کمار بدکی نے کہا کہ ۱۹۶۸ء میں میرے

ایک عزیز کی موت واقع ہوگئی تھی اور اس وقت میں نے پہلی مرتبہ اپنے احساسات کو قلم بند کیا اور یہیں سے میرے ادبی سفر کا آغاز ہوا۔ جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے اس افسانہ نگار نے بتلایا کہ کہ انھوں نے کشمیر سے تعلق کو اپنے ادبی سفر میں بھی نہیں توڑا۔ ان کی تحریروں میں وادی کے حالات اور واقعات کی بھی چھاپ ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے اپنی تحریروں میں عسکریت پسندی کے موضوع کو بھی جگہ دی اور اس وجہ سے پیدا ہونے والے واقعات اور حالات کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

ان کی بعض کہانیوں میں عام کشمیریوں کی حالت زار کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کی ایک کتاب کا موضوع بھی کشمیریوں کی زندگیوں سے جڑا ہوا ہے۔ 'چنار کے پنجے' ایسی ہی ایک کتاب ہے۔ عام طور پر لوگوں نے کشمیر کے حوالے سے صرف چنار کے درخت اور پتوں کے بارے میں سنا اور پڑھا ہوگا مگر دیپک کمار بدکی نے چنار کے پنجے میں عسکریت پسندی سے متاثرہ ریاست کی صورت حال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی ہی اور کہانیوں میں نہتے مکان کا ریپ، مخبر، شیر اور بکرا اور زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی بھی قابل ذکر ہے۔ اردو زبان میں کتابوں کی اشاعت پر خود اردو والوں کی رائے ایک نہیں ہے۔ ایک اہم رائے عام ہے کہ اردو زبان میں کتابیں چھاپنے کے لیے اردو ادیب اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹتا ہے، اس پس منظر میں دیپک کمار بدکی نے بتلایا کہ اردو ادیبوں کی موجودہ صورت حال کے خود اردو ادیب ہی ذمہ دار ہیں۔ جب کوئی ادیب اپنی کتاب شائع کرنے میں عجلت کا مظاہرہ کرتا ہے تب ہی ناشرین، رسالوں کے مالکان، اردو ایڈیٹران کو، پھر چاہے میگزین ہوں یا اخبارات، ان کے استحصال کا موقع مل جاتا ہے۔ ان کے مطابق آج اردو زبان میں لکھنے والے شاعروں، ادیبوں اور رائٹرس کو نہ تو کوئی میگزین ہی ان کی تخلیقات کے بدلے معاوضہ دیتا ہے اور نہ اخبارات انھیں پیسہ دیتے ہیں۔ دیپک کمار بدکی نے بڑا دلچسپ تجزیہ کیا کہ آپ ہندوستان بھر میں اردو کے بڑے بڑے ناشرین، پبلشرس اور ایڈیٹرس کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ دہلی جیسے شہروں میں بھی ان کے مکانات انتہائی پر تعیش اور سہولت بخش ہوتے ہیں۔ ان کی گاڑیاں ایک سے بڑھ کر ایک بڑی اور مہنگی ہوتی ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اگر اردو کی کوئی سرپرستی نہیں کر رہا ہے اور کوئی نہیں پڑھ رہا ہے تو پھر اردو ناشرین پبلشرس، اور اردو اخبارات کے ایڈیٹران کے ہاں اتنا سارا پیسہ کہاں سے آرہا ہے۔ خود اپنی ادبی تخلیقات کی مثال دیتے

ہوئے دیپک کمار بدکی نے واضح کر دیا کہ وہ اپنی کتابوں اور تخلیقات کے مسودہ کو ناشر کے حوالے کر کے کہتے ہیں کہ وہ انھیں زیورِ طباعت سے آراستہ کروانا چاہتے ہیں لیکن اپنی کتاب کی طباعت کے لیے وہ ایک روپیہ بھی نہیں دیں گے۔ دیپک کمار بُدکی کی تقریباً پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ بعض کتابوں کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور انھوں نے اپنی ایک بھی کتاب کی اشاعت کے لیے ناشر کو ایک پیسہ بھی نہیں دیا ۔ دنیا بھر سے انھیں مختلف قارئین کی رائے موصول ہوتی ہے۔ چار یا پانچ سو خطوط آ چکے ہیں۔ اردو زبان کے فروغ کے لیے انھوں نے مشورہ دیا کہ ہم اردو والے صرف حکومتی اسکیمات پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے طور پر بھی اقدامات کریں۔ خاص طور پر وہ لوگ جنھیں اردو کے سبب روزگار ملا ہوا ان پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی شخصی استطاعت میں کچھ کوشش کریں اور کچھ عملی اقدامات کریں۔

☆☆☆☆☆

☆ محمد مصطفیٰ علی سروری؛ 'افسانہ نگار دیپک بُدکی سے ایک ملاقات'؛ مطبوعہ بعنوان 'اردو ناشر اگر پیسہ نہیں بناتے تو ان کے گھر اتنے شاندار نہیں ہوتے'؛ اخبار روزنامہ سیاست حیدر آباد، بروز اتوار ۲۵ جنوری ۲۰۰۹ء

ادبی انٹرویو فورم پر آن لائن انٹرویو

نثار اعظم: آداب بدکی صاحب ۔ سوال یہ کہ کیا آپ کو لگتا ہے کہ افسانہ نگاری (کشمیری اور اردو) کا فن کشمیر میں دم توڑ رہا ہے ۔ اگر ہاں تو وجوہات کیا ہیں؟ جواب نفی میں ہوا تو دلیل دے کر ممنون فرمائیں۔

دیپک بدکی: ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کشمیر میں افسانہ نگار پہلے بھی کم پیدا ہوئے اور اب بھی۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں شاعری کی طرف قلم کاروں کا زیادہ رجحان رہا ہے۔ صرف ترقی پسند تحریک کے دوران افسانہ نگاری کی طرف ادیبوں نے دھیان دیا مگر جدیدیت کے آتے آتے وہ بھی ختم ہو گیا۔ کشمیر کے بارے میں اتنا کہنا ضروری ہے کہ انتہائی سیاست کاری کی وجہ سے قلم کار کھل کر نہیں لکھ پاتے ہیں۔ میں نے اس بارے میں اپنے مضمون 'ڈاکٹر برج پریمی کی افسانہ نگاری' میں لکھا تھا۔ کشمیر کے قلم کار زیادہ تر سرکاری نوکریاں کرتے ہیں، اس لیے موجودہ نظام کے خلاف لکھنے سے گریز کرتے ہیں۔

حسن اظہر: تجریدی اور علامتی افسانہ کی وضاحت کیجیے اور مثال کے لیے چند ایک افسانوں کا نام بھی بتائیے۔

دیپک بدکی: جدید تحریک نے جس افسانے کو جنم دیا اس کو محمود ہاشمی نے 'ذہنی فضا کی آمد' قرار دیا۔ اس میں تجریدی امیجری، تلازمۂ خیال اور اجتماعی لاشعور خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ کرشن چندر کی 'دو فرلانگ لمبی سڑک'، منٹو کی کہانی 'پھندنے' اس کی ابتدائی مثالیں ہیں۔ عزیز احمد کی 'مدن سینا اور صدیاں'، قرۃ العین حیدر کی 'سیتا ہرن' اور ممتاز شیریں کی 'میگھ ملہار' اور 'دیپک راگ' اجتماعی لاشعور کی کہانیوں کی مثالیں ہیں۔ اس تحریک کے مشہور نام یوں ہیں: قرۃ العین حیدر، جوگندر پال، غیاث احمد گدی، بلراج مین را، انور سجاد، رشید امجد، محمد منشا یاد، بلراج کومل، خالدہ حسن، سریندر پرکاش، احمد ہمیش، انور قمر۔ خصوصیات: خیال کی اکائی کا پھیلاؤ، عینیت پسندی کو خیر باد اور تجریدی (abstract) اظہار کو اپنانا، بیانیہ اسلوب

ترک کرنا، مکالمہ اندازِ تحریر کا غلبہ، خارجیت سے داخلیت کی طرف مراجعت، داخلی کرب کی عکاسی، افسانے کو شاعری کے نزدیک لانے کی کوشش، علامتوں (symbols) اور استعاروں (metaphor) کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کو قاری تک پہنچانا، ابہام سے گزر کر تجریدی افسانہ اور لایعنیت کی جانب جانا۔ چند مشہور افسانے: بلراج مین را کا 'ماچس'، 'وہ'، 'ریپ'، 'کمپوزیشن سیریز'، خالدہ حسن کی 'سواری'، احمد ہمیش کی 'مکھی'، 'دَرز میں گرا ہوا قلم'، انور قمر کا 'چوراہے پر ٹنگا ہوا آدمی'، گدی کا 'پرندے پکڑنے والی گاڑی' وغیرہ۔ میں نے بھی چند علامتی اور تجریدی کہانیاں لکھی ہیں جیسے 'جاگو'، 'گھونسلا'، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، 'احتجاج' وغیرہ۔

شہناز رشید: دیپک بدکی صاحب تسلیم۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہم نے زبانوں کو بھی مذہبوں اور عقیدوں کے خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ آپ میری بات ماشاءاللہ خوب سمجھتے ہیں۔ ایسے حالات میں آپ اردو زبان کی طرف کیوں اور کیسے آئے؟ نیز کیا آپ مانتے ہیں کہ ہندی کی نسبت اردو تخلیقی سطح پر امکانات سے بہت زیادہ لبریز ہے۔

دیپک بدکی: میں نے ایک فلم 'دیور' دیکھا تھا جس میں ہیروئن ہیرو سے سوال کرتی ہے کہ گلاب اچھا ہے یا چمیلی؟ وہ جواب دیتا ہے کہ باغ میں ہر قسم کے پھول ہوتے ہیں، کسی میں مہک ہوتی ہے اور کسی میں خوب صورتی، ہم ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتے ہیں۔ یہی بات زبانوں کی ہے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی ایک زبان کو فوقیت حاصل ہے وہ ہم تبھی کہہ سکتے ہیں جب ہم نے دوسری زبانیں بھی اسی انہماک سے پڑھی ہوں اور ان کا لٹریچر بھی پڑھا ہو۔ یہی بات مذاہب کے ساتھ بھی ہے۔ آچاریہ جے کرشنا مورتی کہتے ہیں کہ حیاتیاتی یا جینیاتی وراثت (Biological inheritance) کے ساتھ ہمیں سماجی وراثت (Social inheritance) بھی وراثت میں مل جاتی ہے اور اسی لیے ہمیں اپنا مذہب، اپنی زبان، اپنا کلچر اچھا لگتا ہے۔ دیکھا جائے تو لٹریچر میں سنسکرت اور عربی کا کافی یوگدان رہا ہے۔ موڈرن زمانے میں سب سے زیادہ یوگدان فرانسیسی کا رہا ہے جو یورپ کی زبانوں میں بہت ہی میٹھی مانی جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو کو ہندستانی زبانوں میں خاص مقام حاصل ہے مگر ہم دوسری زبانوں کو کم پایہ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً ڈرامہ صنف میں مراٹھی اور بنگالی کا کافی یوگدان رہا ہے۔ جہاں تک میرا سوال

ہے، میں ایک سائنس طالب علم تھا اور گھر میں کسی کو ادب کے ساتھ دور دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ بی ایس سی میں مجھے لکھنے کا شوق اچانک پیدا ہو گیا، اس لیے اورینٹل سکول (ایم پی سکول، سرینگر) میں اردو سیکھ لی اور پھر زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ جہاں تک اردو اور ہندی کے مستقبل کا سوال ہے، ہر زبان کی نشو ونما کے لیے کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لوگوں کا رجحان، روزگار کے امکانات، سرکار کی سرپرستی، اور ثقافتی بنیاد۔ ہندستان میں اردو سیاست کی نذر ہو گئی۔ میں نے اس بارے میں تفصیل سے اپنے مجموعے 'چنار کے پنجے' کے حرف اول میں لکھا ہے۔ یہ میرے بلاگ deepakbudki.com پر آپ کو مل سکتا ہے۔(http://deepakbudki.com/haraf-e-aghaz-preface-to-chinar)

سلیم سالک: بدکی صاحب۔ کیا وجوہات ہیں جب بھی کوئی نقاد اردو افسانوں کی بات کرتا ہے اور اس میں ایک طویل فہرست بھی ہوتی ہے لیکن ریاست کے افسانہ نگاروں کا کہیں ذکر نہیں ہوتا؟

دیپک بدکی: باوجودیکہ اس وقت جموں و کشمیر ہی ایک ایسی ریاست ہے جس میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے مگر یہاں کے ادیبوں کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ ہمیں یوپی اور بہار کے ادیب سیکنڈ کلاس ادیب مانتے ہیں۔ انھیں کشمیر تب ہی یاد آتا ہے جب انھیں کشمیر کی سیر کرنی ہوتی ہے۔ کشمیر سے ایک ہی نقاد ایسے نکلے جنھیں انٹرنیشنل سطح پر شناخت (Recognition) حاصل ہوئی مگر انھوں نے بھی اپنی تحریروں میں کسی کشمیری رائٹر کو اہمیت نہیں دی۔ ادب میں گروہی رجحان (Groupism) کافی کام کرتا ہے جیسے نارنگ کا گروپ،، فاروقی کا گروپ، اگر حامدی صاحب نے بھی کشمیری قلم کاروں کا ایک گروپ بنایا ہوتا تو شاید اچھا ہوتا۔ ہمیں اپنا ایک گروپ بنانا پڑے گا اور کشمیر یونیورسٹی اور اقبال انسٹی ٹیوٹ میں کشمیری اردو ادیبوں کو ترجیح دینی پڑے گی۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ ہم میں سے کئی ادیب پہلے تو اردو میں پوسٹ گریجویشن یا پی ایچ ڈی کرتے ہیں اور پھر کشمیری زبان کی طرف رجوع کرتے ہیں جس سے اردو کے وسائل کم ہو جاتے ہیں۔

شہناز رشید: میرا دوسرا سوال۔ ریاست جموں و کشمیر کے حوالے سے (منٹو، کرشن چندر اور ٹھاکر پونچھی جیسے کامیاب اور رجحان ساز افسانہ نگار اور ناول نگاروں کو ذہن میں رکھ کر) ہمارے تازہ ترین افسانے کی صورت حال کیا ہے۔ کیا آپ مانتے ہیں کہ ترقی پسند دور کا افسانہ نہ صرف انسانی سماج،

جذبات اور احساسات کی پر خلوص ترجمانی کرتا تھا، بلکہ فنی اور ہیئتی اعتبار سے بھی چست تھا۔ کیا ان تخلیقات کو محض نعرہ بازی اور ایک خاص فکر کا لاوڈ سپیکر کہنا ادبی استحصال نہیں ہے؟؟؟

دیپک بُدکی: منٹو اور کرشن چندر کو کشمیری کہنا اتنا ہی غلط ہے جتنا ہر گوبند کھرانا کو ہندستانی کہنا۔ منٹو پنجاب میں پلا بڑھا اور اس نے کبھی وادی میں قدم بھی نہ رکھا اور کرشن چندر بذات پنجابی تھا اور پونچھ میں چند برس پلا بڑھا۔ ٹھاکر پونچھی، رامانند ساگر وغیرہ کی بات الگ ہے۔ منٹو نے تو ترقی پسندی سے جلدی منہ موڑا، اس دور میں صرف تماشا اور نیا قانون اس کے قابل ذکر افسانے ہیں۔ کرشن چندر نے شہرت تو رومانی ترقی پسندی سے حاصل کی تھی جو اس کی مقبولیت کی وجہ بن گئی مگر پھر اس نے پروپگنڈا اور نعرہ بازی سے کام لیا اور 'ہونولولو کا راجکمار' جیسی کتابیں لکھنے لگے۔ ترقی پسند دور ہمارے ادب کا سنہری دور ہے۔ چونکہ ہمارے معاشرے میں وہ سب تبدیلیاں اور ذہنی ارتقا دیکھنے کو نہیں ملا جو مغرب میں دو عالمی جنگوں کے سبب وقوع پذیر ہوا اس لیے آج بھی جب پریم چند، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی وغیرہ کو پڑھتے ہیں تو ان کی معنویت کا احساس ہوتا ہے۔

فاروق رفیع آبادی: آداب بُدکی صاحب۔ آج کشمیر میں اردو افسانہ کہاں پر ہے؟ آپ کی مسیج نئی نسل کے افسانہ نگاروں کے لیے افسانہ کے حوالے سے۔

دیپک بُدکی: چنانچہ اردو کشمیر کی سرکاری زبان ہے، اس لیے اس زبان میں کافی کام ہوسکتا ہے اگر آدمی ہمت نہ ہارے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دو چار دن میں ہی ہمیں شہرت ملے اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازے۔ یہ ممکن نہیں۔ ہمیں خلوص کے ساتھ محنت کر کے کام کرنا پڑے گا۔ افسانے کی طرف وہ جائے جس کو اندر کی خلش (urge) ہو نہ کہ وہ جو شاعری نہیں کر سکے۔ افسانہ لکھنا ایک پیچیدہ فن ہے جس میں مہارت حاصل کرنا کافی لگن اور محنت چاہتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جو افسانہ نگاری کرنا چاہتا ہو وہ بے باک (Bold) ہونا چاہیے۔ To call a spade a Spade۔ پھر چاہے نوکری جائے یا جان، نہیں تو بہتر ہے کوئی اور پیشہ اختیار کرنا۔ فرانسیسی ادیب، مارکوئی دی ساد (Marquis de Sade)، جن کے نام پر سادیت یا اذیت کوشی لفظ ڈکشنری میں داخل ہوا ہے) رقم طراز ہیں:

"If like R............you only write what everybody knows and should

you, like him, give us four volumes per month, it is not worth the trouble of taking up your pen. Nobody is forcing you to accept the craft, but if you do undertake it, do it well. Above all do not adopt it as an aid to your existence. Your work will be the worse for your needs, to it you will transmit your weakness, it will have the pallor of hunger. Other occupations present themselves to you; make shoes and do not write books."

(Ides Sur les Romans, Marquis de Sade)

ترجمہ: اگر آر......کی طرح تم وہی کچھ لکھو جو لوگ پہلے ہی سے جانتے ہیں، اور اگر تم اسی کی طرح مہینے میں چار چار جلدیں شائع کرو پھر بھی ایسے ادیب کے لیے قلم اٹھانا میری نظر میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کوئی تمھیں یہ کام کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتا ہے مگر پھر بھی اگر تم اس پیشے کو اپنا رہے ہو، خدارا پھر اسے اچھی طرح نبھاؤ۔ اور پھر اس کو تم محض روٹی کمانے کا ذریعہ مت سمجھو۔ تمھارا کام تمھاری ضروریات کو مکمل نہیں کرسکتا ہے۔ تم اپنے کمزوریاں اور خود غرضیاں اپنے پیشے کو سونپ دوگے، اس پیشے میں تمھیں ہر لمحے بھوک اور افلاس تڑپائے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ کوئی اور روزگار چن لو، بہت سارے روزگار مل سکتے ہیں۔ خدارا جوتے بناو، کتابیں مت لکھو۔

(ادیسر لے رومانس: مارکوئی دی ساد)

شہناز رشید: بہت خوب دیپک بُدکی صاحب۔ آپ کے مطالعہ اور آپ کی نظر کو سلام۔ سلامت رہیں۔

مظفر عاظم: بُدکی صاحب میں مدت سے کشمیر سے باہر ہوں۔ آپ کی تصانیف مجھے یہاں میسر نہیں ہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ آپ پنجابی ہیں۔ پنجابی زبان وادب کے ساتھ اپنی دلچسپی اور تصانیف کے بارے میں کچھ بتانا چاہیں گے؟

دیپک بُدکی: میں کشمیری پنڈت ہوں، کشمیر میں پیدا ہوا، تعلیم ایم ایس سی، بی ایڈ تک حاصل کی اور پھر انڈین پوسٹل سروس میں ملازمت کی، جہاں سے ۲۰۱۰ء میں سبکدوش ہو چکا ہوں۔ اس درمیان ۹/ سال فوج میں بھی ڈیپوٹیشن پر رہا اور بحیثیت لیفٹیننٹ کرنل واپس اپنے محکمے میں چلا آیا۔ ہندستان کی کئی ریاستوں میں کام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے افسانوں میں آپ کو تنوع ملے گا۔ میرے افسانے آپ کو

میرے بلاگ deepakbudki.com پر مل سکتے ہیں، لنک اوپر دے چکا ہوں۔

سلیم سالک: ایک نو وارد افسانہ نگار کو کن باتوں کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیے۔

دیپک بُدکی: جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں نے اردو کی کوئی باضابطہ تعلیم (Formal Education) حاصل نہیں کی ہے۔ چینی زبان میں ایک کہاوت ہے۔ ''خوب پڑھو، کم بولو، اور لکھو اس سے بھی کم۔'' کسی بھی اردو کے طالب علم کو اگر افسانے لکھنے میں دلچسپی ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اساتذہ کے افسانوں کو پڑھے اور بار بار پڑھے اور ان افسانوں کو تنقیدی زاویے سے دیکھے (غرض 'مطالعہ' سب سے اہم ہے)۔ تب جا کر خود قلم اٹھالے۔ نقل نہ کرے بلکہ اپنا ایک منفرد اسلوب ڈھونڈے۔ دوسری اہم بات ہے 'مشاہدہ'۔ جب تک کوئی آدمی مشاہدہ نہیں کرتا وہ اچھا افسانہ نہیں لکھ سکتا۔ آج صبح ہی میں نے کہیں پر پڑھا کہ ایک افسانہ نگار نے بیسیوں بار ٹی بی ہسپتال کا مشاہدہ اس لیے کیا کیونکہ وہ ٹی بی مریضوں پر لکھنا چاہتا تھا۔ ہماری سب سے کمزور کڑی یہی ہے کہ ہم مشاہدہ نہیں کرتے۔ مثلاً ایک مثال دوں، ایک کشمیر کے قلم کار نے (نام نہیں لوں گا) لکھا ہے کہ کشمیر کے باغات میں گل لالہ، نرگس، یمبر زل اور بوگن ویلا کھلے تھے۔ پہلے تو کشمیر مین بوگن ویلا نہیں کھلتے اور دوسرے ان پھولوں میں سے کئی ایک ساتھ نہیں کھلتے۔

فاروق رفیع آبادی: جناب بُدکی صاحب، بالکل صحیح، آپ کا بہت بہت شکریہ۔

مظفر عاظم: شکریہ بُدکی صاحب مفصل جواب کے لیے۔ آپ کی کتابوں کی فہرست طویل ہے۔ کشمیر کے تعلق سے آپ کی کونسی کتاب یا افسانے پہلے پڑھنے کی کوشش کروں گا، کچھ نام بتانا چاہیں گے؟

دیپک بُدکی: حال آنکہ ادیب ایک ماں کی طرح ہوتا ہے اس کو اپنا ہر بچہ عزیز ہوتا ہے تاہم آپ میرے بلاگ پر یہ افسانے پہلے پڑھ سکتے ہیں۔ گھونسلا، اچانک، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، مخبر، ایک نہتے مکان کا ریپ (کشمیر کے حوالے سے)۔ دوسرے اہم افسانے یوں ہیں: ادھوری کہانی، ڈاکٹر آنٹی، مانگے کا اجالا، جاگو، احتجاج۔ میرا دوسرا بلاگ بھی ہے اس کا بھی لنک حاضر ہے۔

http://4.bp.blogspot.com/.../0NkEw.../s1600/Doctor+Aunty.gif

منیب الرحمٰن: بُدکی صاحب، افسانہ لکھنے کے اپنے پروسیس کے بارے میں جس قدر ممکن ہو

تفصیلاً بتائیں کہ افسانہ آپ کے ذہن میں کس طرح جنم لیتا ہے اور پھر کن مراحل سے گزرتا ہے۔ کیا آپ باضابطہ ہوم ورک کرتے ہیں کہ افسانے کا ڈھانچہ کیسے تیار کیا جائے اپنے کسی افسانے کے حوالے سے بات ہو تو اچھا۔

دیپک بدکی: افسانہ لکھنے کے کسی بندھے ٹکے اصول کا میں پابند نہیں۔ میں نے اپنے مجموعے 'ریزہ ریزہ حیات' کے حرف اول میں لکھا تھا، ''میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں کہانی نہیں لکھتا بلکہ کہانی مجھے لکھتی ہے کیونکہ مجھے پورا احساس ہے کہ قلم اٹھانے سے پہلے میرے ذہن کے پردے پر پلاٹ کی روپ ریکھا اور کرداروں کے خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ میرا ذہن کہانی کو جس سمت لے جانا چاہتا ہے، موڑ لیتا ہے۔ میری یہی شعوری کوشش رہتی ہے کہ کہانی نہ صرف پرتاثیر ہو بلکہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو۔ اس لیے مجھے یہ لکھنے میں کوئی باک نہیں کہ اپنی کہانیاں میں خود لکھتا ہوں اور ان میں کسی اور کا دخل نہیں ہوتا۔''
اب رہی کوئی مثال۔ جب کشمیر میں ۱۹۹۰ء مین مجھے آفس سرینگر سے جموں شفٹ کرنا پڑا تو جموں میں کوئی مناسب جگہ نہیں مل رہی تھی۔ جیسے تیسے ریلوے سٹیشن کے پاس اپنے ہی محکمے کی آر ایم ایس بلڈنگ میں آفس شروع کیا۔ میں نے جب وہاں اپنے لیے کمرہ مختص کیا تو کمرے میں چڑیا کا ایک گھونسلا دیکھا۔ میں نے اپنے صفائی کرمچاری کو حکم دیا کہ اس کو صاف کر دو مگر اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس میں چڑیا کے انڈے تھے۔ مجھے غصہ آیا کیونکہ ہم تو روز ہی انڈے کھاتے ہیں تو پھر اس میں کونسی نئی بات تھی۔ اس لیے خود ہی اس گھونسلے کو اتار کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر بعد میں جب میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تو دل میں ایک طوفان سا اٹھا۔ میں سوچنے لگا کہ ایک ملی ٹنٹ اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ اس کے پاس طاقت تھی اور میں نہتا تھا، سو اس نے مجھ کو گھر سے بے گھر کر دیا اور اب میرے پاس طاقت ہے اور چڑیا نہتی ہے تو میں نے اس کا آشیانہ تباہ کر دیا۔ مگر میں نے یہ افسانہ ۲۰۰۴ء میں لکھا یعنی ۱۴ سالوں کے بعد، تب تک میں نے گھونسلا، چڑیوں کے رہن سہن وغیرہ کے بارے میں مواد اور مناسب لفظیات اکٹھا کر لیں اور پھر افسانہ رقم کیا جو ماہنامہ شاعر ممبئی کے ستمبر ۲۰۰۴ء میں میرے گوشے کے تحت پہلی بار شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا۔

مظفر عاظم: بدکی صاحب، آج کی بزم میں بس ایک اور سوال۔ آپ کشمیری ہیں، کشمیر میں

رہے ہیں، کشمیریوں میں آپ کی خاص عزت ہے، یہ سب اچھی باتیں ہیں۔آپ نے کشمیر کے جمہور کی زبان، کشمیری اوراس کے ادب کی، اپنے طور پر کچھ واقفیت ضرور حاصل کی ہوگی، آپ اس بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے۔

دیپک بدکی: میرے بلاگ پر کشمیر کی تاریخ کے بارے میں انگریزی میں مضامین ملیں گے۔ کشمیر میرا مادر وطن ہے مگر بد قسمتی سے مجھے وہاں سے ہجرت کرنی پڑی اور اب دہلی کے پاس غازی آباد میں رہ رہا ہوں۔ کشمیر ہندو پاک کی سیاست کا 'قربانی کا بکرا' بن چکا ہے۔ایسا سیکولر کلچر میں نے سارے ملک میں کہیں نہیں دیکھا جیسا ہمارے کشمیر میں تھا۔مگر سیاست دانوں کی کارستانی کا کیا کیجیے۔اپنے اقتدار کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہوتے ہیں ۔خیر انسان ہجرتوں کا مارا ہے سو ہم بھی شامل ہوگئے۔اس حوالے سے میں نے ایک کہانی 'دس انچ زمین' لکھی ہے۔ایک اسّی سالہ سکھ نے، جس نے ۱۹۴۷ء میں ہجرت کا کرب جھیلا تھا، مجھے اس کہانی کے لیے بدھائی دی کیونکہ اس کو وہ دن یاد آئے جب دیکھتے ہی دیکھتے اپنا خون پرایا ہوگیا اور لہو کی ندیاں بہہ گئیں۔

مظفر عاظم: اس بزم میں تشریف لانے کے لیے، سلیقے سے اور کھلے دل سے سوالات کا جواب دینے کے لیے اور گھنٹوں ٹائپ کرتے رہنے کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ محفل اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔اس کے لیے سوالات پوچھنے والوں نے بھی ذہانت اور سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔(ارے ان میں تو میں بھی ہوں۔خودستائی!!) ان کی بھی داد دیتا ہوں۔

مشتاق مہدی: دیپک بدکی نے مختلف سوالوں کے جو جوابات دیے ہیں، ان میں دانشوری کی چمک اور سچائی کی خوشبو ہے۔یہ بھی ایک ننگا سچ ہے کہ کشمیر کے اردو ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ بھارتی پرنٹ میڈیا نے ہمیشہ ہی سوتیلی ماں کا سلوک کیا ہے۔وہ لوگ نیچ قسم کے احساس میں مبتلا ہیں۔

☆☆☆☆☆

☆انٹرویو: دیپک بدکی کا ادبی انٹرویو فورم پر آن لائن انٹرویو؛ شرکا: نثار اعظم، حسن اظہر، شہناز رشید، سلیم سالک، فاروق رفیع آبادی، مظفر عاظم، منیب الرحمن، مشتاق مہدی؛ مطبوعہ فیس بک

دیپک بُدکی- کچھ یادیں کچھ ملاقاتیں

--جمیل احمد جائسی

میری جناب دیپک بُدکی صاحب سے پہلی ملاقات جولائی ۱۹۷۶ء میں ہوٹل سوائے، مسوری میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے لال بہادر شاستری نیشنل اکیڈمی میں مرکزی سرکار کی ملازمت جوائن کر لی تھی۔ دیپک بُدکی صاحب نے انڈین پوسٹل سروس(I.Po.S) اور میں نے انڈین ریونیو سروس (I.R.S)۔ہم دونوں نے سول سروس کے امتحان میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے لیا تھا اور اچھے نمبر حاصل کیے تھے۔ دیپک بُدکی صاحب نے ۲۰۰ میں سے ۱۳۷ نمبر حاصل کیے تھے۔اس طرح سے اردو ہمارے درمیان دوستی کا ذریعہ بنی اور آج تک بنی ہوئی ہے۔

جناب دیپک بُدکی صاحب اکیڈمی کے سوشل اور ثقافتی زندگی میں بہت سرگرم رہتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کی کوششوں سے اکیڈمی کی میگزین کا اردو ایڈیشن منظر عام پر آیا تھا جس میں بدکی صاحب نے ایک افسانہ، ایک نظم اور اکیڈمی کی زندگی پر ایک پر اثر مضمون تحریر فرمائے تھے۔ جناب نے اس میں میری کچھ نظموں کو بھی جگہ دی تھی۔ایک اور بات یہاں تحریر میں لانے کے لائق ہے۔ اکیڈمی میں اس وقت ڈائریکٹر تھے جناب راجیشور پرشاد۔ آپ ایک منجھے ہوئے اور قابل آئی اے ایس افسر تھے اور کافی دنوں تک محترم لال بہادر شاستری کے ساتھ کام کر چکے تھے۔تہذیب اور رواداری اان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے زمانے میں سبھی علاقائی اور مذہبی تقاریب دھوم دھام سے منائی جاتی تھیں۔ ہماری ٹریننگ کے زمانے میں عید بڑی شان وشوکت سے منائی گئی اور عید کے فنکشن کے روح رواں تھے جناب دیپک بُدکی صاحب۔ جناب کی اس پہل اور کاوش کو کافی پسند کیا گیا اور بُدکی صاحب کی عزت میرے دل میں کافی بڑھ گئی جو اللہ کے کرم سے آج تک قائم ہے۔

نومبر ۱۹۷۶ء میں ہماری ٹریننگ مکمل ہوئی اور تمام افسران اپنے اپنے محکمے کی خاص ٹریننگ کے لیے جدا ہو گئے۔اور یوں ہوا کہ اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے ،کوئی یہاں گرا اور کوئی وہاں گرا۔۳۰

رہے ہیں، کشمیریوں میں آپ کی خاص عزت ہے، یہ سب اچھی باتیں ہیں۔آپ نے کشمیر کے جمہور کی زبان، کشمیری اوراس کے ادب کی، اپنے طور پر کچھ واقفیت ضرور حاصل کی ہوگی، آپ اس بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے۔

دیپک بدکی: میرے بلاگ پر کشمیر کی تاریخ کے بارے میں انگریزی میں مضامین ملیں گے۔ کشمیر میرا مادر وطن ہے مگر بد قسمتی سے مجھے وہاں سے ہجرت کرنی پڑی اور اب دہلی کے پاس غازی آباد میں رہ رہا ہوں۔ کشمیر ہندو پاک کی سیاست کا 'قربانی کا بکرا' بن چکا ہے۔ایسا سیکولر کلچر میں نے سارے ملک میں کہیں نہیں دیکھا جیسا ہمارے کشمیر میں تھا۔مگر سیاست دانوں کی کارستانی کا کیا کیجیے۔اپنے اقتدار کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ خیر انسان ہجرتوں کا مارا ہے سو ہم بھی شامل ہو گئے۔اس حوالے سے میں نے ایک کہانی 'دس انچ زمین' لکھی ہے۔ایک اسی سالہ سکھ نے، جس نے ۱۹۴۷ء میں ہجرت کا کرب جھیلا تھا، مجھے اس کہانی کے لیے بدھائی دی کیونکہ اس کو وہ دن یاد آئے جب دیکھتے ہی دیکھتے اپنا خون پرایا ہو گیا اور لہو کی ندیاں بہہ گئیں۔

مظفر عاظم: اس بزم میں تشریف لانے کے لیے، سلیقے سے اور کھلے دل سے سوالات کا جواب دینے کے لیے اور گھنٹوں ٹائپ کرتے رہنے کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ محفل اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔اس کے لیے سوالات پوچھنے والوں نے بھی ذہانت اور سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔(ارے ان میں تو میں بھی ہوں۔خود ستائی!!) ان کی بھی داد دیتا ہوں۔

مشتاق مہدی: دیپک بدکی نے مختلف سوالوں کے جو جوابات دیے ہیں، ان میں دانشوری کی چمک اور سچائی کی خوشبو ہے۔یہ بھی ایک ننگا سچ ہے کہ کشمیر کے اردو ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ بھارتی پرنٹ میڈیا نے ہمیشہ ہی سوتیلی ماں کا سلوک کیا ہے۔وہ لوگ نیچ قسم کے احساس میں مبتلا ہیں۔

☆☆☆☆☆

☆انٹرویو: دیپک بدکی کا ادبی انٹرویو فورم پر آن لائن انٹرویو؛ شرکا: نثار اعظم، حسن اظہر، شہناز رشید، سلیم سالک، فاروق رفیع آبادی، مظفر عاظم، منیب الرحمن، مشتاق مہدی؛ مطبوعہ فیس بک

دیپک بُدکی - کچھ یادیں کچھ ملاقاتیں

--جمیل احمد جائسی

میری جناب دیپک بُدکی صاحب سے پہلی ملاقات جولائی ۱۹۷۶ء میں ہوٹل سوائے، مسوری میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے لال بہادر شاستری نیشنل اکیڈمی میں مرکزی سرکار کی ملازمت جوائن کرلی تھی۔ دیپک بُدکی صاحب نے انڈین پوسٹل سروس(I.Po.S) اور میں نے انڈین ریونیو سروس (I.R.S)۔ہم دونوں نے سول سروس کے امتحان میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے لیا تھا اور اچھے نمبر حاصل کیے تھے۔ دیپک بُدکی صاحب نے ۲۰۰ میں سے ۱۳۷ نمبر حاصل کیے تھے۔اس طرح سے اردو ہمارے درمیان دوستی کا ذریعہ بنی اور آج تک بنی ہوئی ہے۔

جناب دیپک بُدکی صاحب اکیڈمی کے سوشل اور ثقافتی زندگی میں بہت سرگرم رہتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کی کوششوں سے اکیڈمی کی میگزین کا اردو ایڈیشن منظر عام پر آیا تھا جس میں بدکی صاحب نے ایک افسانہ، ایک نظم اور اکیڈمی کی زندگی پر ایک پر اثر مضمون تحریر فرمائے تھے۔ جناب نے اس میں میری کچھ نظموں کو بھی جگہ دی تھی۔ ایک اور بات یہاں تحریر میں لانے کے لائق ہے۔ اکیڈمی میں اس وقت ڈائریکٹر تھے جناب راجیشور پرشاد۔ آپ ایک منجھے ہوئے اور قابل آئی اے ایس افسر تھے اور کافی دنوں تک محترم لال بہادر شاستری کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ تہذیب اور رواداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے زمانے میں سبھی علاقائی اور مذہبی تقاریب دھوم دھام سے منائی جاتی تھیں۔ ہماری ٹریننگ کے زمانے میں عید بڑی شان وشوکت سے منائی گئی اور عید کے فنکشن کے روح رواں تھے جناب دیپک بُدکی صاحب۔ جناب کی اس پہل اور کاوش کو کافی پسند کیا گیا اور بُدکی صاحب کی عزت میرے دل میں کافی بڑھ گئی جو اللہ کے کرم سے آج تک قائم ہے۔

نومبر ۱۹۷۶ء میں ہماری ٹریننگ مکمل ہوئی اور تمام افسران اپنے اپنے محکمے کی خاص ٹریننگ کے لیے جدا ہو گئے۔ اور یوں ہوا کہ اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے، کوئی یہاں گرا اور کوئی وہاں گرا۔ ۳۰

سے ۳۵ سالوں تک ہم سبھی کام اور وقت کی چکی میں پستے رہے۔ ایک روز اتفاقاً جناب دیپک بُدکی صاحب کا نام مجھے فیس بک پر نظر آیا اور ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ دوبارہ چل پڑا۔

پچھلے ۳۵-۳۰ سالوں میں بُدکی صاحب نے زبردست بلندیاں حاصل کی ہیں اور اردو افسانہ نگاری میں ایک منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ کسی بھی ایسے شخص کے لیے جس کی مادری زبان اردو نہ ہو اور نہ ہی یہ زبان اس کا ذریعہ تعلیم رہی ہو، یہ ایک عظیم حصولیابی ہے۔ آپ کی مادری زبان کشمیری ہے لیکن اردو کو ایک اردوداں سے زیادہ عبور حاصل ہے۔

افسانہ نگار اپنے سماج اور ماحول کا بہترین عکاس ہوتا ہے۔ ایک شاعر کو اپنی بات چند لفظوں میں کہنے کی پابندی سے کئی دفعہ اپنے اصل مقصد سے ہٹنا پڑتا ہے لیکن ایک افسانہ نگار اپنے حالات، سماج اور کریکٹرس (کرداروں) کو تہ در تہ بہال کر دیتا ہے۔ اس کی تصویر حقیقت سے بھی بڑھ کر ہو جاتی ہے۔ جناب دیپک بُدکی صاحب میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ دیپک بُدکی صاحب کے افسانوں اور افسانچوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جنھیں ادبی دنیا میں کافی سراہا گیا ہے۔ افسانوں کے علاوہ آپ نے تنقیدی مضامین بھی تحریر فرمائے ہیں اور ان گنت کتابوں پر ریویو (تقریظ) بھی لکھے ہیں۔ آپ کے تخلیقات پر تحقیق کر کے دو طالب علموں نے یونیورسٹی آف حیدر آباد اور جموں یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگریاں حاصل کی ہیں جب کہ ایم ایس یونیورسٹی بروڈہ نے ایک طالب علم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ میرے شعری مجموعہ 'حرف تمنا' پر آپ نے انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کے رسالے 'ہماری زبان' میں اپنے قلم کا جادو دکھا کر مجھ جیسے نامعلوم شخص کو کافی عزت بخشی ہے۔

مجھے امید ہے کہ جناب دیپک بُدکی صاحب اپنے قلم کا جادو جگاتے رہیں گے اور اردو ادب کو نایاب اور بہترین افسانوں سے عروج کی طرف لے جائیں گے۔ حالانکہ جناب بُدکی صاحب کو خدا پہ یقین نہیں ہے لیکن میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ 'اللہ کرے زور قلم اور زیادہ'۔

☆☆☆☆☆
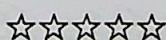
☆ مضمون نگار: جمیل احمد جائسی، آئی آر ایس، سابقہ چیف کمشنر انکم ٹیکس: اے ۲۳، سیکٹر ۳۵، نوئیڈا (یوپی)-۲۰۱۳۰۱

دیپک بُدکی: اپنی کہانیوں میں

--ڈاکٹر محبوب راہی

سن رکھا ہے کہ ہر سچا فن کار اپنے فن پاروں میں اپنی ذات اور شخصیت کے وسیلے سے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طور کلی یا جزوی طور پر جھلکتا ضرور ہے۔ صف اوّل کے ہم عصر افسانہ نگار دیپک بُدکی کو ذاتی اور شخصی طور پر بے حد قریب سے دیکھنے، برتنے اور پرکھنے کی سعادت اس وقت نصیب ہوئی جب مجھے جشن پرتپال سنگھ بیتاب کے تحت کل ہند مشاعرے میں شرکت کرنے کی غرض سے نذیر فتح پوری کے ساتھ جموں جانے کا موقع ملا۔ ہم حالانکہ اصولاً بیتاب صاحب اور کنوینز مشاعرہ عشاق کشتواڑی کے مہمان تھے لیکن پتہ نہیں اخلاقیات کے کس ضابطے کی رو سے دیپک بُدکی نے جوان دنوں ریاست جموں و کشمیر میں چیف پوسٹ ماسٹر جنرل کے اعلیٰ عہدے پر فائز اور جموں میں قیام پذیر تھے آبیل مجھے مار کی مصداق ہمارا تمام تر بار میزبانی اپنے سر لے لیا اور ریلوے سٹیشن سے بذریعہ کار اپنے وی آئی پی درجے کے گیسٹ ہاؤس میں پہنچانے (جہاں فتح پور کے ظفر اقبال ظفرؔ پہلے پہنچ چکے تھے) سے لے کر جموں سے واپسی تک تین شب و روز مہمان نواز کے بہانے لمحہ بہ لمحہ اپنی محبتوں سے کچھ اس طرح نوازا کہ بس شرابور کر دیا۔ گیسٹ ہاؤس میں اپنی ذاتی نگرانی میں اعلیٰ اور نفیس درجے کی اشیائے خورد ونوش کا کچھ ایسا شاہانہ اہتمام کیا کہ گویا کہ ہم کہیں کے وزیر، سفیر یا گورنر ہوں۔ اور پھر یہی نہیں کہ مہمان نوازی کا اس درجہ پرشکوہ اہتمام وانصرام کر کے اپنی فیاضانہ خوش انتظامی کو دور سے کھڑے داد طلب نظروں سے دیکھ رہے ہوں بلکہ موصوف شعوری طور پر کوشش بھی کرتے رہے کہ ہمارے دوران قیام جموں بیش سے بیش تر وقت ہمارے ساتھ گزاریں لہٰذا اپنے ڈیوٹی اوقات کے علاوہ (غالباً اپنی تمام سماجی مصروفیات ترک کر کے) اپنا کم و بیش سارا وقت موصوف نے ہمارے لیے وقف کر دیا حتیٰ کہ وقت نکال کر ایک آدھ بار اپنے گھر اور آفس بھی ہمیں لے گئے۔ اس دوران بُدکی صاحب کے جو ذاتی اور شخصی جوہر کھل کر سامنے آئے ان سے موصوف کی انسان دوستی، خوش طبعی، بلند اخلاقی، خوش گفتاری، شگفتگی، بے ساختگی، بذلہ سنجی، بے باکی حاضر جوابی کے ساتھ

ساتھ ہمہ موضوعاتی تبحر علمی نے مجھے ہر وقت عالم تحیر میں مبتلا کیا۔ میں کہ ایسے بھی اپنے اندر تاثر پذیری کا مادہ نسبتاً کچھ زیادہ ہی رکھتا ہوں بہر اعتبار بدکی صاحب کی مختلف اوصاف سے رچی بسی ذات اور ہمہ جہت جاذب نظر شخصیت سے اکتساب کردہ تاثرات کو فوری طور سے اپنے کسی مضمون میں اجمالاً بیان کر کے رہ گیا لیکن افسوس کہ مجھ سے اپنی ہمہ وقتی عدیم الفرصتی کے باعث اس تاثر پذیری کا کما حقہ حق ادا نہ ہو پایا جو کہ مجھ پر واجب تھا۔ میری شبانہ روز اینڈی بینڈی مصروفیات کی بدنظمی، بے اعتدالی یا بے ترتیبی کہہ لیجیے کہ دیپک بدکی صاحب کی عطا کردہ ان کی تصانیف کا سرسری مطالعہ کر کے نیز ان میں ان کی شخصیت کے اندر پوشیدہ اور ظاہر حسن اخلاق اور انسان دوستی کے عناصر تلاش کر جموں کے خوشگوار سفر کی پر بہار یادوں پر مشتمل کسی سفرنامے کے وسیلے سے اس کی نشاندہی بھی کر پایا جب کہ درجنوں سفرنامے لکھ چکا ہوں جو مختلف رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہونے کے بعد 'سفر ہے شرط' عنوان کے تحت کتابی شکل میں بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اب کہ اپنے آپ کو سمیٹ رہا ہوں، جی میں آئی کہ کیوں کہ کسی صورت دیپک بُدکی کے اپنے اوپر واجب الادا قرض کے بار سے اپنے آپ کو قدرے ہلکا کر لوں۔ اپنے اس ناقص منصوبے کی تکمیل کے لیے بُدکی صاحب سے ان کی تازہ تصنیف بھیجنے کی درخواست کی جسے اپنی اعلیٰ ظرفی کے زیر اثر فوری طور پر شرف قبولیت عطا کرتے ہوئے موصوف نے اپنی دو تازہ ترین تصانیف، پندرہ افسانوں پر مشتمل مجموعہ 'روح کا کرب' اور ایک سو چار افسانچوں کا مجموعہ 'مٹھی بھی ریت' ارسال فرما دیں۔ جن کے سرسری مطالعے کے بعد جیسا کہ اس مضمون کے آغاز میں فن اور فنکار کے مابین کسی نہ کسی حد تک امتزاج اور ہم آہنگی ہونے کے تعلق سے عرض کر چکا ہوں ایک استعجاب انگیز حسرت سے دوچار ہوا کہ دیپک بُدکی اپنے طویل یا مختصر بیشتر افسانوں میں اس کے بنیادی کردار کی صورت میں یا کسی ذیلی کردار یا محض مبصر یا تماشائی کی حیثیت سے کلی یا جزوی طور پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیوں کے پلاٹ ان کی زندگی کے حالات، ان کے گرد و پیش کے ماحول، ان کی ملازمتوں کے دوران درپیش واقعات و تجربات سے ماخوذ ہیں۔ مختصر یہ کہ ان افسانوں میں فن اور فن کار ہم آہنگی، باہم مناسبت اور مطابقت کی بنا پر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں جو دیپک بدکی کے ایک اچھے، سچے، زندہ اور تابندہ تخلیق کار ہونے کی روشن دلیل ہے۔ دراصل یہ ہم رنگیاں، ہم آہنگیاں، مماثلتیں اور

مطابقتیں محض اتفاقیہ ہرگز نہیں ہیں۔ دیپک بدکی نے بیشتر کہانیاں اپنے پیدائشی وطن سرزمین جموں و کشمیر سے اخذ کی ہیں، اپنے گردو پیش رونما ہونے والے حالات وواقعات کے تانوں بانوں سے ان کہانیوں کے کرداران کے جانے پہچانے، دیکھے بھالے اور زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر برتے برتائے ہوئے ہیں۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں بالخصوص 'ٹکڑوں میں بٹی زندگی' کا مرکزی کردار میکھلا کا محکمہ ڈاک و تار کی اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود پوسٹل کلرک سنت داس کو کرپٹ افسر شاہی کے غلط عتاب سے نیز جھوٹے کیس میں ملوث ایک پوسٹ ماسٹر کو بدعنوانی کے جھوٹے الزام سے اس کی خودکشی تک بچانہ پانا۔ انا ہزارے کی ٹوپی پہن کر ان کے عقیدت مندوں کا قدم بہ قدم بدعنوانیوں میں ملوث ہونا، کشمیری پنڈتوں کے مذہبی تعصب کی بنا پر جبری انخلا کے مسئلے پر 'کاگ پورنیما' کے وسیلے سے کرب کا اظہار، 'گونگے کیئر ٹیکر' رمضانا کا بوالہوس افسروں کی ہوس سے اپنی بیٹیوں کی عصمت بچانے کے لیے مستعفی ہوجانا، اپنی کہانیوں میں اپنے ناستک ہونے کا برملا بے باکانہ اظہار جس کی بہترین مثال ان کی کہانی 'زمین پھوٹ کر جو بھگوان نکلا'۔ بر خلاف اس کے سرورق کی کہانی 'روح کا کرب' میں اس عقیدے کی نفی کرتے ہوئے اس کے بنیادی کردار شوانگی کا عیش وعشرت کی سرمایہ دارانہ زندگی کے معمولات کو تج دے کر کسی آشرم میں جا بسنا اسکی مثال ہے۔

دیپک بُدکی کی ہر کہانی اپنے اندر بھرپور کہانی پن لیے ہوئے ہے۔ بغیر کسی پیچیدگی ژولیدگی اور علامتی گورکھ دھندے کے زبان کی سادگی اور بیان کی سلاست کے ساتھ ایک رواں دواں تسلسل اور خوشگوار اتار چڑھاو کے ساتھ ہر کہانی ابتدا سے اپنے انجام تک پہنچی ہے۔ اس کے باوجود موصوف نے چند کہانیاں اس درجہ دلکش اور سریع الفہم علامتی انداز میں لکھی ہیں جو اپنے اندر ترسیل کا کوئی مسئلہ نہیں رکھتیں۔ مثال کے لیے ان کی کہانی طفیلی بیل پیش کی جاسکتی ہے جو اپنے میزبان درخت سے لپٹ کر آہستہ آہستہ اس کا وجود ختم کر دیتی ہے اور اپنی شادابی برقرار رکھتی ہے۔ علامت کی تفہیم کے لیے ان لوگوں کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو اپنے محسنوں کا لہو چوس چوس کران کے وجود کے لیے مسلسل ایک مسئلہ بنے رہتے ہیں۔

بُدکی صاحب کے اپنی کہانیوں کے ساتھ اپنی ہم آہنگی برقرار رکھنے کے معاملے میں حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اعلیٰ سطحوں پر تعلیمی مراحل سے گزر کر پوسٹ ماسٹر جنرل، آرمی پوسٹل سروس میں لیفٹننٹ

کرنل، ممبر بورڈ وغیرہ کے اونچے سرکاری عہدوں پر فائز رہتے ہوئے موصوف چھ افسانوی مجموعوں، ادھورے چہرے، چنار کے پنجے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ریزہ ریزہ حیات، روح کا کرب اور مٹھی بھر ریت نیز تنقیدی و تجزیاتی مضامین اور تبصروں کے تین مجموعوں، عصری تحریریں، عصری شعور اور عصری تقاضے پر مشتمل اتنے وسیع، عمیق اور بسیط ادبی سرمائے کے لیے تخلیقی فراغتیں کیونکر حاصل کر پائے جبکہ ان کے سوانحی کوائف کی روشنی میں وہ ۱۹۷۸ء تا ۱۹۹۶ء عمر کے اٹھارہ ان برسوں میں جب انسان نسبتاً زیادہ فعال، پر جوش اور متحرک ہوتا ہے، قرطاس وقلم کے معاملے میں تعطل کا شکار رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مقامی اخبارات میں کارٹون سازی، کالم نویسی، ریڈیائی اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں شرکت۔ سیکڑوں افسانوں کی تخلیق جن کی ملکی اور غیر ملکی رسائل و جرائد میں مسلسل اشاعت۔ مختلف الموضوعات بے شمار کتابوں پر تبصروں کی 'ہماری زبان' میں اشاعت، مختلف سیمناروں اور ورکشاپوں میں شرکت، یہ تمام تر سرگرمیاں دیپک بُدکی مختلف میدان ہائے عمل میں مسلسل سرگرم کار ہونے کے روشن دلائل ہیں۔ یوں بھی ہوا کہ موصوف کی اس پر جوش فعالیت نیز مختلف محاذوں پر طول وطویل اور نمایاں خدمات کا ان کے شایان شان اعتراف بھی کیا گیا۔ شاعر، انتساب اور اسباق جیسے معیار و وقار کے حامل ادبی رسائل نے ان کی حیات و خدمات پر وقیع اور ضخیم خصوصی گوشے شائع کیے جن میں اردو کے نامور قلم کاروں کے اعترافی مضامین شامل ہیں۔ علاوہ ازیں موصوف کی افسانہ نگاری پر ڈاکٹر جاوید اقبال شاہ کا ایم فل کے لیے جموں یونیورسٹی کے تحت تحریر کردہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ نیز حیدرآباد یونیورسٹی کے محمد امین نجار 'دیپک بدکی کے افسانوں میں نسوانی کردار' اس موضوع پر ایم فل کے لیے مقالہ مکمل کر چکے ہیں۔ مزید برآں گجرات کی بروڈہ یونیورسٹی میں 'دیپک بُدکی کے تخلیقی افکار کا تنقیدی مطالعہ' اس موضوع پر شیخ صفیہ بانو پی ایچ ڈی کے لیے اپنا مقالہ پیش کر چکی ہیں۔ ان کے ماسوا دیپک بدکی کی شخصیت اور فن پر پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری کے مشترکہ ترتیب دئے ہوئے مضامین پر مبنی کتاب 'ورق ورق آئینہ' بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔ انٹرنیشنل فرینڈ شپ سوسائٹی کا راشٹریہ گوروسمان، آندھرا پردیش اکادمی کا اعزاز اور سدبھاونا منچ، سرونج کا کالیداس سمان یہ قابل صد فخر اعزازات ان تمام پر مستزاد ہیں۔ دیپک بُدکی اللہ کے وجود سے منکر ہونے کے باوصف اللہ کے نیک بندوں والی صفات

اپنے اندر رکھتے ہیں لہٰذا اللہ سے قدم بہ قدم انھیں اعزازات واکرامات سے نوازنے کی دعا پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

☆مضمون نگار: ڈاکٹر محبوب راہی، بارسی ٹاکلی، ضلع اکولہ، مہاراشٹر۔ موبائل 09421751064

==

☆ آپ کے افسانے گہرے مشاہدے اور انسانی رشتوں کو سمجھنے کے عمل میں کامیاب تخلیقی ترسیل کی منزل تک پہنچتے ہیں۔ آپ کے یہاں تجسیم کا عمل نہایت ملائمت سے تکمیل سے سرفراز ہوتا ہے۔

(بلراج کومل َ دھلی ، ۹/ اپریل)

☆ آپ تو ان دنوں اچھی تنقید بھی لکھ رہے ہیں اور کہانیاں تو آپ کی ہمیشہ ہی اچھوتی ہوتی ہیں۔

(پروفیسر قمر رئیس؛ دھلی، ۳۰ مارچ ۲۰۰۶ء)

☆ حقیقتیں حرف و معنی کے یک جان ہونے پر ہی اجاگر ہوتی ہیں اور منکشف بھی، اور آپ کے یہاں تخلیقی سطح کی کہانیوں میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

(عتیق احمد عتیق، مالیگاؤں ، ۲۸ مارچ ۲۰۰۶ء)

☆ ان افسانوں میں زندگی اور سماج کی کتنی نرم گرم حقیقتیں پنہاں ہیں۔ اس کا اندازہ اس کتاب کے پڑھنے سے ہی ہوتا ہے۔ انداز بیاں میں ایسی ندرت اور دلکشی ہے جو قاری کی توجہ بھٹکنے نہیں دیتی۔

(نامی انصاری ، کانپور؛ ۱۶ مئی ۲۰۰۶ء)

دیپک بُدکی کی افسانوی جہات

-'ریزہ ریزہ حیات' کے حوالے سے-

--ڈاکٹر ایم اے حق

دیپک بُدکی اردو افسانوی دنیا کا وہ منفرد نام ہے جو آج کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ لفظ 'منفرد' میں نے یوں ہی استعمال نہیں کیا ہے۔ میں ان کے افسانوں کی خصوصیات کے توسط سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ ان کی تخلیقات میں کون سی ایسی خوبیاں ہیں جو دوسرے افسانہ نویسوں میں نظر نہیں آتی ہیں یا بہت کم نظر آتی ہیں۔ میں نے ابھی ابھی دیپک بدکی کے افسانوی مجموعہ 'ریزہ ریزہ حیات' کا مطالعہ مکمل کیا ہے۔ اس مجموعہ میں ان کے جتنے بھی افسانے ہیں دو تین کو چھوڑ کر سارے افسانے ہمیں اندر تک ہلا دیتے ہیں بشرطیکہ قاری حساس ہو۔ اگر قاری ذی حس نہیں ہے تو اسے دیپک بدکی کے افسانے متاثر نہیں کریں گے۔ اسے لگے گا کہ انھوں نے بس کسی واقعہ کا یوں ہی ذکر کر دیا ہے۔

ویسے تو افسانے کے قاری کو ذہین ہونا ہی چاہیے لیکن دیپک بدکی کے افسانوں کو سمجھنے کے لیے ذہانت کے ساتھ ساتھ حساس ہونا بے حد ضروری ہے ورنہ بات سر کے اوپر سے گزر جائے گی۔ مثلاً ان کی کہانی 'ڈاکٹر آنٹی' کا آخری جملہ ''مجھے احساس ہوا کہ اس گھر سے روح ہی نکل چکی ہے۔'' اس ایک جملے میں دیپک جی نے کہانی کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ افسانے کو غور سے پڑھیں گے تو پائیں گے کہ جس ڈاکٹر آنٹی نے اپنی ساری زندگی موت کا سودا نہیں کیا، اناپ شناپ روپے نہیں کمائے، لوگوں کو زندگی بانٹی، روح دی اسی وجہ سے آج ان کی حالت نہایت خستہ ہے۔ 'سرابوں کا سفر' کا آخری جملہ ''ادھر پارلیمنٹ کے احاطے میں آلتی پالتی مار کر سکون سے بیٹھا ہوا مہاتما گاندھی کا مجسمہ بے صبری سے نئی نسل کے گاندھیوں کا انتظار کر رہا تھا۔'' 'لمحوں نے خطا کی ہے' کا اخری جملہ ''میں نے پدمنی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور پھر تردد میں ڈوبا ہوا گیلری سے باہر نکل آیا۔'' یہاں لفظ تردد کہانی کا حاصل ہے۔ اس لفظ نے مصنف کے احساس کم تری کو منظر عام پر لا دیا ہے۔ 'افلاس کا کوڑھ' کا آخری جملہ ''وہ بُلبُل کی مانند میرے سامنے چہک

رہا تھا۔ شاید 'بُلبُل سگریٹ کا اثر ابھی تک باقی تھا۔' نہایت Fantastic ہے۔ یہاں دو الفاظ 'بُلبُل سگریٹ' کے ذریعہ کہانی کار نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ نرمل سنگھ نے کسی دباؤ یا لالچ میں اپنی زندگی جمنا کے ساتھ نہیں گزاری ہے بلکہ خوشی خوشی اس رشتے کو قبول کیا ہے۔ 'کیبرے ڈانسر' کے اس جملے نے ''اچھا پرفل جی، اب اجازت دیجیے۔ آپ کی چائے کی عادت ابھی تک نہیں گئی۔'' نے ذہین اور حساس قارئین کو اندر تک جھنجھوڑ دیا ہے۔ چائے کی عادت الفاظ میں مصنف نے بڑی خوبصورتی سے یہ عیاں کر دیا ہے کہ کہانی کا ہیرو اس کیبرے ڈانسر سے اتنے ہی فاصلے پر رہا جتنا وہ پہلی ملاقات کے وقت تھا جبکہ کیبرے ڈانسر کی یہ باطنی خواہش رہی کہ کاش! وہ چائے کے علاوہ بھی کچھ لے یعنی اس کی جانب پیش رفت کرے۔ آج کل ایسے افسانے بہت کم لکھے جا رہے ہیں۔

میں یہ بات نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس مجموعہ میں دیپک بدکی نے اپنی زندگی میں رونما ہونے والے مختلف واقعات کو ہی کہانی کا روپ دیا ہے۔ بھلے ہی کہیں وہ امن، کہیں راجیو، کہیں پرفل، کہیں سدرشن، کہیں کیلاش، کہیں سریندر وغیرہ ہوں لیکن اصل میں وہ دیپک بدکی ہی ہیں۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ دیپک بدکی محکمہ پوسٹل سروسز میں ایک اعلیٰ حاکم رہ کر ریٹائر ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں اس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ یہاں کچھ مثالیں پیش کر رہا ہوں۔

☆ ''دو سال پہلے میں نے سول سروسز کا امتحان پاس کر لیا اور اب یہاں سینئر سپرانٹنڈنٹ پوسٹ آفسز کے عہدے پر تعینات ہوں۔'' (افلاس کا کوڑھ)

☆ ''چھتیس سال کی نوکری کے بعد آج میں ڈاک خانہ کی ملازمت سے ریٹائر ہو رہا ہوں۔ میں نے پہلی بار سرینگر میں سینئر سپرانٹنڈنٹ کا چارج لیا تھا۔'' (جزیرے پیار کے)

☆ ''میں سُدرشن بھان، انڈین سول سروسز پروبیشنر....'' (وفا کی خوشبو)

☆ ''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں آرمی پوسٹل سروسز سنٹر کامٹی میں تربیت پا رہا تھا...'' (لمحوں نے خطا کی ہے)

☆ ''میں ان دنوں لال بہادر شاستری اکادمی آف ایڈمنسٹریشن مصوری میں تربیت پا رہا تھا۔'' (کیبرے ڈانسر)

یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ دیپک بدکی ناستک ہیں۔ 'یادوں کی مہک' میں وہ فرماتے ہیں۔ ''میں ناستک ہوں اور ذات پات کے بندھنوں میں یقین نہیں رکھتا۔'' دیپک بدکی نے بی ایڈ پاس کیا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں ''میں نے بھی اسی کالج سے دو سال پہلے بی ایڈ پاس کیا تھا۔ (میں ساری کی ساری تمھاری)

'ریزہ ریزہ حیات' کی تمام کہانیوں کو پڑھنے پر دیپک بدکی کی زندگی سے چمٹی تین باتوں کو میں نے اخذ کیا ہے۔

-- پہلی بات ماں کی کمی کا احساس ہے اور وہ بھی بہت شدّت کے ساتھ۔ اس مجموعہ میں صرف تین ضعیف اور ادھیڑ عمر کی عورتوں کے کردار پیش کیے گئے ہیں اور تینوں کرداروں میں انھیں اپنی ماں کی شبیہ نظر آئی ہے۔ 'ڈاکٹر آنٹی' میں وہ کملا دیوی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔ ''میں پہلی ہی ملاقات میں اس کی شخصیت سے مرغوب ہو گیا اور اس میں 'اپنی کھوئی ہوئی' ماں ڈھونڈ نے لگا۔'' 'درد کا جنگل' میں فرماتے ہیں۔ ''بیٹی سے زیادہ میں ماں سے پیار کرتا تھا جو رحم دلی اور ہمدردی کی مورت تھی۔ اس کی شبیہ میں مجھے اپنی 'کھوئی ہوئی ماں' یاد آتی تھی'' اور 'میں ساری کی ساری تمھاری' میں بھی رقم طراز ہیں ''جس آنٹی نے مجھے بیٹے کا رتبہ دیا، جس کی صورت میں مجھے اپنی 'کھوئی ہوئی ماں' نظر آئی، اس آنٹی کو میں دھوکہ کیسے دے سکتا ہوں۔'' دیکھا آپ نے ان کی تینوں تحریروں میں 'کھوئی ہوئی ماں' کا تذکرہ ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ماں کی رفاقت انھیں بہت کم دن نصیب ہوئی ہے۔

-- دوسری اہم بات انھیں کوفی یا چائے پینے کا جنون کی حد تک شوق ہے، وہ اپنی بیشتر کہانیوں میں کوفی یا چائے کا آرڈر دیتے یا پیتے نظر آتے ہیں۔

-- تیسری سب سے مخصوص بات جس کو انھوں نے بولڈلی ایکسپٹ (Boldly accept) کیا ہے، وہ ہے ان کا دل پھینک انداز۔ جب بھی ان کے سامنے کوئی خوبصورت یا دل کو لبھانے والی لڑکی یا عورت آتی ہے تو وہ اپنے آپ کو اسے راہ و رسم بڑھانے سے روک نہیں پاتے ہیں۔ وہ اسے تہہ دل سے اپنانا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے وہ اس عورت یا لڑکی پر کوئی دباؤ نہیں ڈالتے ہیں یا زور زبردستی نہیں کرتے ہیں۔ ان کے دل میں کوئی کدورت پیدا نہیں ہوتی ہے یا کسی قسم کے انتقام کا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا

ہے۔وہ بڑے اطمینان سے ہاتھ جھاڑ کر آگے بڑھ جانے والے انسان ہیں۔ بھلے ہی ان کا دل اندر اندر روتا رہتا ہے۔

میں نے بہت کم مصنفوں میں ایسی بولڈنیس (Boldness) دیکھی ہے۔اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں کا تذکرہ زیادہ تر غیر ملکی تخلیق کاروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔

دیپک بدکی کے لکھنے کا اسٹائل نرالا ہوتا ہے اور بڑی رغبت سے ان کے افسانے پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے۔وہ مناسب جملوں کا استعمال نہایت چابکدستی سے کرتے ہیں اور موقع محل کے مطابق انگریزی الفاظ کی بھی مدد لیتے ہیں جو ماحول میں حقیقی پن پیدا کرنے میں بہت ہی کامیاب ہے۔

ان کے زیر نظر مجموعہ میں کچھ افسانے شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں جیسے 'ڈاکٹر آنٹی'، 'بدھ کی مسکراہٹ'، 'دس انچ زمین'، 'سرابوں کا سفر'، 'ریزہ ریزہ حیات'، اور 'ٹھنڈی آگ'۔ بہت اچھی کہانیوں میں 'افلاس کا کوڑھ'، 'لمحوں نے خطا کی ہے'، 'جزیرے پیار کے'، 'میں ساری کی ساری تمھاری'، 'پروٹوکول'، 'کبھی ہم سے سنا ہوتا'، 'کیبرے ڈانسر' اور 'یادوں کی مہک' ہیں۔'لذت خلوت' اور 'اندھے خوابوں کا عذاب' نارمل کہانیاں لگیں جبکہ 'درد کا جنگل' اور 'وفا کی خوشبو' کوئی خاص متاثر نہیں کر سکیں۔

افسانوں کے سارے عنوانات پسند آئے۔صرف 'ٹھنڈی آگ' کا عنوان مجھے مناسب نہیں لگا۔اس عنوان سے کہانی کا اختتام پتہ چل جاتا ہے اور مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔

آخر میں میرے رائے یہ ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ صاحب ذوق حضرات کو ضرور کرنا چاہیے اور خاص کر ان لوگوں کو جو دیپک بدکی پر تحقیق کر رہے ہیں یا ان کو قریب سے جاننا چاہتے ہیں کیونکہ تازہ مجموعہ 'ریزہ ریزہ حیات'.........جی ہاں یہ ہے دیپک بدکی کی کائنات۔

☆☆☆☆☆

☆مضمون نگار: ڈاکٹر ایم اے حق، حق منزل، گوش کمپاؤنڈ، سنٹرل سٹریٹ، ہند پیڑھی، رانچی-۸۳۴۰۰۱ [جھارکھنڈ]؛ مطبوعہ بعنوان 'افسانوں کا بادشاہ- دیپک بدکی؛ بحوالہ کتاب: ریزہ ریزہ حیات؛ مصنف دیپک بدکی؛ ناشر: میزان پبلشرز، بٹہ مالو، سرینگر کشمیر-۱۹۰۰۰۹

دیپک بُدکی کی کہانیاں-ایک سرسری جائزہ

--ڈاکٹر سیفی سرونجی

آج سے پچیس تیس سال پہلے بھوپال کے ایک سیمنار میں ڈاکٹر قمر رئیس نے ایک بات کہی تھی کہ بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ گاندھی جی کے ذہن میں آزادی کی تحریک منشی پریم چند کی کہانیاں پڑھ کر پیدا ہوئی تھی اور گاندھی جی نے دیش کی غریبی اور کسانوں کی شکستہ حالت جگہ جگہ جاکر دیکھی تھی، کہ پتہ نہیں اس دیش میں کتنے ہلکوا ایسے موجود ہیں جنھیں کمبل تک نصیب نہیں ہوتا، یہ سچ ہے کہ آج پریم چند والے مسائل نہیں ہیں، اور آج کا کسان خوش حال ہے، لیکن دوسرے بہت سے مسائل پیدا ہوئے ہیں اور آج کا افسانہ نگار اپنے آس پاس بکھرے ہوئے انھیں مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتا ہے اور وہ موضوعات فرقہ وارانہ فسادات کے مسائل، انسانیت اور زندگی کی بے سکونی قدم قدم پر زندگی سے جڑے سیکڑوں مسائل ہیں، جو آج کے فن کار کو درپیش ہیں حالانکہ افسانے کا بہترین دور ترقی پسند تحریک کا ہی دور تھا، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ آج کہانی اچھی نہیں لکھی جارہی ہے، سچائی تو یہ ہے کہ آج بھی کہانی بہت اچھی لکھی جارہی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ترقی پسندوں کے یہاں موضوعات محدود تھے، آج مسائل زیادہ ہیں، اس لیے کہانی کے موضوعات بھی زیادہ ہیں، اور جب مسائل زیادہ ہوں گے تو ظاہر ہے کہ کہانی کے موضوعات میں بھی تبدیلی آئے گی، نئی کہانیوں سے متعلق مشرف عالم ذوقی لکھتے ہیں:

> ''آج کی کہانیوں میں ایک صدی کے خاتمے کا درد ہے، تو نئی صدی کی شروعات پر تشویش اور تفکر بھی، ان کہانیوں میں ایک مسئلہ ہندوستان ہے، تو نگاہیں چین، امریکہ، روس پر بھی جمی ہیں، نیا فن کار جانتا ہے، آنکھیں کھولے بغیر سیاسی بصیرت کے بغیر وہ اپنے افسانے کو نقطہ عروج تک نہیں پہنچا سکتا، وہ آج کا افسانہ نگار ہے کمپوٹر عہد میں پیدا ہوا افسانہ نگار، اس کا تیر قلم دور تک نشانہ مارتا ہے، وہ عجلت میں نہیں ہے، وہ سمجھ

سمجھ کر قدم آگے بڑھا رہا ہے قطار مت دیکھیے ، اس قطار میں کتنے کم لوگ ہیں، منٹو،

بیدی، کرشن چندر، عصمت کے بعد جب قطار بہت لمبی تھی ، ہم نے کیا تیر مار لیا تھا،

لمبی قطار والوں کے پاس اچھی کہانی کے نام پر گنتی کی ایک کہانی مشکل سے ملتی تھی اور

ان چھوٹی قطار والوں کے پاس کئی نئی کہانیاں ہیں۔''

بلاشبہ آج کے کہانی کار کے پاس سیاسی بصیرت بھی ہے، شعور بھی ہے اور کہانی کے فن پر عبور بھی اسے حاصل ہے۔ دیپک بدکی نئی کہانی کا ایک معتبر نام ہے۔ ان کے ہم عصروں میں یوں تو سلام بن رزاق، مشرف عالم ذوقی ، دیپک کنول ، نعیم کوثر ، ساجد رشید، سید محمد اشرف، انجم عثمانی وغیرہ جیسے کہانی کاروں کی پوری ٹیم موجود ہے، جو اچھی کہانیاں لکھ رہے ہیں، لیکن کہانی کار کی تمام کہانیاں کچھ اچھی نہیں ہوتیں، ان کے یہاں ایک ایک دو دو کہانیاں ہی ایسی ہیں، جو ادب میں زندہ رہیں گی۔ یہاں میں کسی کو کسی پر فوقت نہیں دے رہا، نہ کہانیوں کا موازنہ کرنا میرا مقصد ہے، بلکہ جس طرح ہر شاعر کا قاری اور اس کے پڑھنے سننے والا ہوتا ہے، اسی طرح ہر کہانی کار کے قاری کا حلقہ بھی جدا ہوتا ہے۔ کسی کو کہانی میں کردار سازی پسند آتی ہے، کسی کو سیکس، کسی کو المیہ کہانی پسند ہے، تو کسی کو علامتی اور کوئی موضوعات پر دھیان دیتا ہے۔ اسی طرح ہر لکھنے والے کا انداز بھی جدا ہوتا ہے۔ چند اچھی کہانیوں کی فہرست اس طرح ہے، شوکت حیات 'گنبد کے کبوتر'، یٰسین احمد کی 'یہ کیا جگہ ہے' انجم عثمانی کی 'شہر گریہ کا مکیں' خورشید اکرم 'قصہ ایک بے لطف شام کا' ساجد رشید 'نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی' مقدر حمید کی 'جلترنگ' شموئل احمد کی 'ندی' اسی طرح سلام بن رزاق ، طارق چھتاری، حسین الحق ، انور خان ، عبدالصمد ، انور قمر کے چند افسانے بہت مشہور ہوئے۔

دیپک بُدکی کے یہاں موضوعات مختلف ہیں، اور تجربات و مشاہدات بھی، اس لیے کہ وہ ایک بڑے عہدے پر فائز رہے ہیں، دنیا کے مختلف ممالک اور شہروں کا دورہ کیا ہے، اب ظاہر ہے کہ ہر کہانی کار کردار بھی وہیں سے چنتا ہے، جس ماحول میں وہ رہتا ہے، مثلاً نعیم کوثر جب کہانی لکھیں گے تو ان کے کردار بھوپال کے پٹیوں پر بیٹھنے والے یا پان کی دکان پر بیٹھنے والے ہوں گے، نعیم کوثر کی کہانی 'اقرار نامہ' جو زندگی سے جڑی ایک بڑی کہانی ہے، اسی طرح نئی کہانیوں میں جن کا تذکرہ ہوا، اقبال مجید متوسط طبقہ

سے کردار لیتے ہیں اور دیپک بُدکی پڑھے لکھے اور آسودہ طبقے کی بات کریں گے۔ دیپک بُدکی کا ایک افسانہ چند سال پہلے پاکستان کے مشہور رسالے 'ادب لطیف' میں پڑھا تھا۔ 'دشت وحشت'۔ اس کہانی میں ایک مالدار گھرانے کی ایک اسمارٹ لڑکی امرت کور کا کردار ہے، جو بچپن ہی سے ضدی اور مردوں کے مقابلے میں خود کو زیادہ طاقتور تصور کرتی ہے، دن رات شراب پینا اور آوارہ گردی کرنا اس کی عادت میں ہے، اتفاق سے اس کی شادی ہو جاتی ہے، لیکن وہ اپنی عادت نہیں بدلتی، کلکٹر کے عہدے پر ہونے کی وجہ سے اور بھی شوہر کو حقیر سمجھتی ہے، لیکن اس کا اثر اسی کے دونوں بچوں پر پڑتا ہے کہ وہ دن رات میاں بیوی کی تکرار سے تنگ آکر ایک سیاح بن جاتا ہے، لڑکی کہیں اور کام میں لگ جاتی ہے، تنگ آکر شوہر بھی چلا جاتا ہے، تب اسے تنہائی کا احساس ہوتا ہے، لیکن اب وقت گزر چکا ہوتا ہے، کوئی اس کا حال پوچھنے والا نہیں ہوتا، آخر ایک دن مر جاتی ہے اور تین دن تک لاش اسی کے گھر میں پڑی رہتی ہے۔ اس کہانی کا اختتام اتنا عبرتناک ہے کہ قاری بہت دیر تک سکتہ کے عالم میں رہتا ہے۔ اسی طرح ان کی کہانی 'زیبرا کراسنگ پر تنہا آدمی' ہے، اور پھر 'ادھورے چہرے' اور دیگر کہانیاں ہیں۔

دیپک بُدکی کے پاس کہانی کہنے کا نہ صرف بہترین طریقہ ہے، بلکہ یہ بڑی خوبی ہے کہ انھیں کہانی پر اتنا عبور حاصل ہے کہ جہاں سے چاہیں کہانی شروع کر دیتے ہیں اور جہاں چاہیں اس کا اختتام۔ باتوں باتوں میں اچھی کہانی لکھنے کے فن سے وہ خوب آشنا ہیں۔ اب 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' کو ہی لے لیجیے، کہانی کتنے خوبصورت اور سادہ لفظوں میں شروع کرتے ہیں:

> ''سڑک پار کروں یا نہ کروں، وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا، گاڑیوں کا کارواں رکنے کا نام بھی نہیں لے رہا تھا، اصول کے مطابق زیبرا کراسنگ پر گاڑیوں کی رفتار خود بخود دھیمی ہونی چاہیے، اور وقت ضرورت ان کو رُک بھی جانا چاہیے، تاکہ پیدل چلنے والے مسافر سڑک پار کر سکیں۔''

اس کہانی میں دیپک بدکی صاحب نے بڑے شہروں کے ٹرافک اور کسی اجنبی آدمی کے لیے کراسنگ کے دوران جس کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ ساری کیفیت سانچوں میں اس طرح ڈھال دیا ہے، کہ پڑھتے وقت ہی کراسنگ کے تصور سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور پھر اس کا کراسنگ سے پہلے

اس حادثے کو یاد کرنا، جس کے تصور سے ہی وہ کانپ اٹھتا ہے، کیسے اس کا جوان بیٹا بیچ چوراہے پر کراسنگ پار کرنے کے دوران تڑپ تڑپ کر مرجاتا ہے، ویسے کہانی پڑھیے تو کراسنگ اب اتنا بڑا مسئلہ نہیں رہا، کہ ہر شہر میں اب ٹرافک اتنا ہوگیا ہے کہ لوگ عادی ہوگئے ہیں، بڑے شہروں کی بات تو دوسری ہے، کہ جہاں کچھ اصول بھی ہیں، لیکن اب تو چھوٹے شہروں میں بھی موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کی قطاریں نظر آنے لگی ہیں، لیکن جس کا کوئی عزیز ان حادثوں میں مرجائے، اس کی کیفیت کیا ہوگی، وہ اس کہانی کے ایک ایک جملے سے اجاگر ہوتی ہے اور گھوم پھر کر دیپک بدکی کی کہانیوں میں کسی نہ کسی روپ میں ان کا جنت نما وطن کشمیر آجاتا ہے، جو کبھی ہندوستان کی جنت کہلاتا تھا، جہاں کے پہاڑ، سرسبز باغات، خوش نما تالاب، جھیلیں، سیاحوں کی نگاہوں کا مرکز ہوا کرتی تھیں، لیکن اب وہی شہر آگ اور شعلے اگل رہا ہے، ہر شخص بے سکونی اور خوف میں مبتلا ہے، کہ پتہ نہیں وہ کب مرجائے، کب اس کا گھر اجڑ جائے، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' بھی اسی وادی کا رہنے والا ہے، اور اب وہ اپنا خوبصورت گھر چھوڑ کر وطن سے دور دوسروں کے رحم وکرم پر زندگی گزار رہا ہے، اس پر اس کا جوان بیٹا کراسنگ کے دوران مرجاتا ہے، وہ مشکل سے سڑک پار کرتا ہے، لیکن اتنا خوفزدہ ہے کہ سڑک پار کرتے ہی دم توڑ دیتا ہے۔

اسی طرح دیپک بُدکی کی دیگر کہانیوں میں کشمیر میں دہشت گردی اور انسانیت سوز مظالم سے جڑی کہانیاں موجود ہیں، یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں کھل کر دہشت گردی کی بات نہیں کرتے، بلکہ اسے اپنی تخلیقی توانائی اور فن سے کہانی کا روپ علامتوں اور استعاروں کے ذریعے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کہانی کو پڑھ کر نہ صرف پورا پس منظر سامنے آجاتا ہے، بلکہ قاری کو ایک گہری سوچ وفکر میں مبتلا کردیتا ہے، جیسے ان کی ایک کہانی 'گھونسلہ' ہے۔ یوں تو اس کہانی میں انھوں نے چڑیا چڑے کو علامت بنا کر پیش کیا ہے، لیکن صحیح معنوں میں یہ ایک ایسی دردناک کہانی بن گئی ہے، کہ کہانی کے اختتام پر پڑھنے والا اگر پتھر دل بھی ہو تو پگھل جائے۔ وہ ایک نئے شہر میں آئے ہیں، آفس کی صفائی کے بعد ان کے کمرے میں کرسیاں اور دیوار پر گاندھی جی کی تصویر، سامنے کھڑکی کا ٹوٹا ہوا شیشہ ہے، جو چڑیا چڑا کی بیٹھک بھی ہے اور راستہ بھی ہے، وہ روز دیکھتے ہیں کہ کس طرح وہ چڑیا ایک ایک تنکا اکٹھا کرکے گاندھی جی کی تصویر کے پیچھے اپنی گھونسلہ بناتی ہے، اور چڑا اس کی مدد کرتا ہے، کئی دن میں اس کا گھونسلہ بنتا ہے، اسی

درمیان ایک ہفتہ کی چھٹیاں ہو جاتی ہیں، اور وہ کمرہ بند کر کے چلے جاتے ہیں، لیکن ایک ہفتہ کے بعد جب واپس آتے ہیں، تو کمرے میں اس قدر گندگی دیکھ نوکر پر خفا ہوتے ہیں، کہ چڑیوں کی یہ ساری گندگی فوراً پھینکو، لیکن گھونسلہ میں انڈا دیکھ کر نوکر انکار کرتا ہے، تو وہ خود غصے میں آ کر اس کے انڈے اور گھونسلہ باہر پھینک دیتے ہیں، یہ سب کرنے کے بعد چڑیا چڑے کی جو کیفیت دیپک بُدکی صاحب نے بیان کی ہے، وہ ایک بڑے کہانی کار کا بڑا کارنامہ ہے، کہ چڑیا بار بار گاندھی جی کی تصویر دیکھتی ہے، بار بار اپنے آشیانے کی جگہ عجیب نگاہوں سے دیکھتی ہے، اِدھر اڑتی ہے کبھی اُدھر، کبھی ٹوٹے ہوئے شیشے پر بیٹھ جاتی ہے، آخر اتنا بے چین ہوتی ہے کہ بار بار اڑتے ہوئے پنکھے سے کٹ کر دم توڑ دیتی ہے، تھوڑی دیر کے بعد چڑا آتا ہے، تو اپنی محبوبہ کو مرا ہوا دیکھ کر دم بخود رہ جاتا ہے، چاروں طرف طواف کرتا ہے، اور پھر آشیانہ دیکھتا ہے، وہاں بھی اسے کچھ نظر نہیں آتا، اور پھر دور کہیں خلاؤں میں اڑتا چلا جاتا ہے۔ اس کہانی کا انجام دیکھ کر ایک دم دل کو جھٹکا لگتا ہے اور پورے کشمیر کا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے کہ آج کا انسان کتنا بے رحم اور سنگ دل ہو گیا ہے، سیکڑوں گھروں کو اجاڑ کر قہقہہ لگاتا ہے، اور پوری دنیا دیکھتی ہے، لیکن کسی کی آنکھ نم نہیں ہوتی، کب تک آشیانے اجڑتے رہیں گے۔ ابوالکلام آزاد کی غبار خاطر کے بعد یہ پہلی ایسی کہانی پڑھی ہے جو چڑیا چڑے کے حوالے سے ایک شاہکار کہانی کا درجہ رکھتی ہے اور یہ دیپک بُدکی صاحب کی پرواز فکر کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔

☆☆☆☆☆
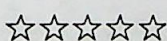
☆ مضمون نگار: ڈاکٹر سیفی سرونجی، ایڈیٹر انتساب، سرونج؛ زیر سلسلہ وار عنوان 'ترقی پسند تحریک کے بعد اردو افسانہ - قسط نمبر ۶'، سہ ماہی انتساب شمارہ نمبر ۷۲؛ ص ۹-۱۳

دیپک بُدکی کے عکس ریز افسانے
-'روح کا کرب' کے حوالے سے-

--ڈاکٹر رینو بہل

داستان، کہانی، افسانہ فنونِ لطیفہ کی وہ صنف ہے جس نے وقت کے ساتھ صرف اپنی چال، اپنی صورت بدلی ہے ورنہ روح اس کی وہی ہے۔اس صنف نے ہر دور، ہر ملک، ہر قوم اور ہر عمر کے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔افسانے کی مقبولیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ اس میں زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ہر تخلیق اپنے تخلیق کار کا آئینہ ہوتی ہے اور ہر افسانہ نگار جانے انجانے اپنے افسانوں میں کہیں نہ کہیں چھپا رہتا ہے۔کبھی وہ اپنی ذات سے جڑے واقعات، جذبات، حالات کہانی کے کرداروں کے ذریعے کہتا ہے تو کبھی اس کے گرد و پیش اسے اس حد تک متاثر کرتے ہیں کہ وہ ان واقعات، ان کرداروں کو قلم بند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی آدھی ادھوری خواہشیں، ادھورے خواب، ادھورے ارمان اپنے کرداروں کے ذریعے پالینا چاہتا ہے۔انسان کی زندگی خود ایک کہانی کی کتاب ہے اور جیسے جیسے عمر کے پڑاو پار ہوتے ہیں، ویسے ویسے تجربے اور مشاہدے میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔دیپک بُدکی صاحب نے اپنے اسی تجربے اور مشاہدے کو دلچسپ انداز میں تراش کر افسانوں کی شکل میں قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔ان کے پہلے چار افسانوی مجموعے،'ادھورے چہرے'،'چنار کے پنجے'، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' اور'ریزہ ریزہ حیات' کی طرح ان کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ'روح کا کرب' پوری آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔اس مجموعے میں اُنیس کہانیاں شامل ہیں اور انھیں پڑھ کر بُدکی صاحب کی شخصیت، ان کے زندگی کے تجربات پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں۔

بُدکی صاحب اپنے آبائی وطن کشمیر سے دور رہ کر بھی دور نہیں ہیں۔ذہنی اور روحانی طور سے جُڑے ہوئے ہیں۔تبھی تو ان کے افسانوں میں اپنی مٹی سے بچھڑنے کا درد قاری کو محسوس ہوتا ہے۔'کاگ پورنیما' میں انھیں اپنے وطن کشمیر میں گزاری زندگی یاد آتی ہے اور وہاں کے رسم و رواج بھی جنھیں ان کی

آئندہ نسل جانتی بھی نہیں۔ انسان اور پرندوں کی ایک سی مجبوریاں بتاتے ہیں اور بڑی خوبصورتی سے ایک ہی سطر میں اپنا درد کہے جاتے ہیں:-

''مجھے احساس ہوا کہ پیٹ انسان کو ہی نہیں بلکہ پرندوں کو بھی ہجرت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ (ص۲۲)

کوئی بھی شخص اپنی مٹی سے خوشی خوشی جدا نہیں ہونا چاہتا، اس کی لاچاریاں اسے مجبور کر دیتی ہیں۔ اسی طرح 'طلسمی عینک' میں وادی کی بدحالی دیکھ کر اسے بہتر بنانے کے خواب طلسمی عینک کے ذریعے دیکھتے ہیں۔

اشتراکی خاندان کے چلن کے سبب بزرگوں کی دیکھ بھال اور ان کی تنہائی کا ایک بہت بڑا مسئلہ سامنے آیا ہے اور 'بستے کا بوجھ' ڈھلتی عمر میں بچوں سے دور تنہا رہنے کے خوف کو بیان کرتا ہے۔ 'ڈاگ ہاؤس' بھی اسی مسئلے پر رقم کی گئی دلچسپ کہانی ہے۔ گھر والوں کو کہیں باہر جانا ہوتا ہے کچھ دنوں کے لیے تو وہ اپنے کتے کو ڈاگ ہاؤس میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور پھر ایسا بھی وقت آتا ہے کہ گھر کا بزرگ جب کہیں آ جا نہیں سکتا تو ڈاگ کی طرح ہی اسے بھی اولڈ ایج ہوم میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اس وقت اس بزرگ کو کتے کی تکلیف کا احساس شدّت سے ہوتا ہے۔ 'ڈاگ ہاؤس' اس مجموعہ کی سب سے بہترین کہانی ہے۔ آج کے دور کی عکاسی بہت دلچسپ انداز سے کی گئی ہے۔

'روح کا کرب' ایک ایسی خودسر لڑکی کی کہانی ہے جو والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے باعث لاڈ پیار میں نرگسیت، خود مطلبی کا بیج اس کے اندر بو دیتے ہیں۔ نوکری کے بعد وہ خود مختار ہو جاتی ہے اور ایک بار محبت میں دھوکہ کھانے کے بعد وہ شادی نہیں کرتی۔ بڑھتی عمر کے ساتھ تنہائی، اکیلے پن کے اندھیروں میں ڈوبتی جاتی ہے اور آخر میں اپنی ساری دولت آشرم کے نام کر کے وہیں رہنے لگتی ہے۔

بُد کی صاحب کو نوکری کے دوران ملک کے مختلف حصوں میں پوسٹنگ ہوتی رہی اور طرح طرح کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ہر صوبے کے اپنے رسم و رواج، الگ بولی، الگ رہن سہن، الگ طرح کا کھانا۔ معلومات کا جو ذخیرہ ان کے پاس جمع ہوا تھا وہ انھوں نے افسانوں میں ڈھال کر قارئین تک پہنچا دیا۔ افسانہ 'پراویڈنٹ فنڈ' میں تریپورا، اروناچل پردیش، میگھالیہ اور ناگالینڈ کے متعلق جانکاری دیتے

ہیں۔تریپورا کے بارے میں بتاتے ہیں کہ:

''اس مٹی میں کٹھل، لیچی اور اناناس وافر مقدار میں پیدا ہوتے ہیں اور ٹرکوں میں بھر بھر کر بنگلہ دیش تک پہنچائے جاتے ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے کٹھل بطور سبزی کھائی تھی مگر یہاں آ کر پہلی بار معلوم ہوا کہ یہ پھل پک کر آم کی مانند لذیذ اور خوشبودار بن جاتا ہے۔ (ص ۷-۱۰۶)

اس طرح وہ کہانی میں وہاں کی علاقائی جانکاری بھی دیتے ہیں۔ ملازمت کے مسائل سے جڑے کئی قصوں، کئی موضوعوں پر انھوں نے افسانے لکھے ہیں جس میں 'پراویڈنٹ فنڈ' اور 'یونین لیڈر' بھی شامل ہیں۔

'انٹرویو' ایک طرف بے روزگاری کے مسئلے پر بات کرتا ہے تو ساتھ میں مردوں کی نفسیات کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ کس طرح بورڈ کے ممبران کی توجہ بے چارے انٹرویو دینے آئے لڑکے کے جواب پر کم اور عورت کی سرگرمیوں پر زیادہ ہوتی ہے اور اس بے چارے کو کہنا پڑتا ہے کہ:

''میرا انٹرویو ایک حسین عورت کی نذر ہو گیا۔'' (ص ۱۱۸)

طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے ان کا۔ 'جھوٹا سچ' بھی ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کرتا ہے جو اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے دوسروں کو روندتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔

یادوں کے پٹارے سے وہ بچپن کا قصہ بھی بیان کرتے ہیں۔ افسانہ 'ترنڈ' میں خوف اور ڈر سے سہمے لوگوں کے حالات کا بخوبی بیان ہے۔ جب خوف دل میں ہو تو بلّی بھی شیر لگنے لگتی ہے اور وہ تو بچپن کا معصوم زمانہ تھا، بن ماں کے تین بچے خوف کے سائے میں بیٹھے تھے۔ کہانی کا ایک جملہ دل پر اثر کر گیا:

''بے کس ولاچار وہ میری جانب بار بار دیکھ رہی تھی۔ حالانکہ میں اسے چھوٹا تھا مگر تھا تو مرد ذات۔'' (ص ۸۳)

ملک میں دو بڑے مسئلے، جنھوں نے ایک طرف تو دیش کو کھوکھلا کر دیا اور دوسری طرف امن بھنگ کیا ہے۔ وہ ہے کرپشن اور آرکشن۔ دونوں ہی خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ بدکی صاحب نے ریزرویشن کے مسئلے کو بہت اچھے سے 'ٹکڑوں میں بٹی زندگی' میں بیان کیا ہے۔ آئے دن جو دھرم کے نام پر

انسان کو فراموش کر کے مندر مسجد بن رہے ہیں اس کی جگہ سب کو برابری کا مقام دینا زیادہ مناسب ہے۔

ذات پات کی لعنت نیچے طبقے کے لوگوں کو اٹھنے نہیں دیتی اور جو اٹھ کر کسی مقام پر پہنچ جاتے ہیں وہ اپنا ماضی بھول کر آگے دیکھتے ہیں اور اپنے قبیلے اور اپنی جاتی کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ یہ کہانی میکھلا کی ہے جو ایسے ہی قبیلے سے اٹھ کر اونچے عہدے پر پہنچ جاتی ہے اور آخر میں اپنے لوگوں کی راہ نمائی کے لیے اور ان کی مدد کے لیے سرکاری نوکری چھوڑ کر NGO شروع کر دیتی ہے۔

'میں انا ہوں' میں ملک میں ہر قدم پر کرپشن کا بول بالا نظر آتا ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ ملک کی حالت بدلے، کرپشن ختم ہو مگر خود کو بدلنا نہیں چاہتے۔ صرف ترچھی ٹوپی پہن لینے سے کرپشن نہیں مٹ سکتی۔ ایسی منزل کو پانے کے لیے سب کو بدلنا ہوگا اور یہ راستہ چھوڑنا ہوگا۔

غرض یہ کہ دیپک بُدکی صاحب نے عام زندگی سے جڑے مسائل، معاشرے میں پھیلی بدامنی اور ملک کو کھوکھلا کرتی کرپشن جیسی بیماریوں کو 'روح کا کرب' کا موضوع بنایا ہے اور با مقصد افسانوی مجموعہ قارئین تک پہنچایا ہے۔ افسانے نہ ہی مختصر ہیں اور نہ ہی بیجا طوالت کا شکار۔ مناسب بات مناسب الفاظ اور مناسب ڈھنگ سے بیان کی ہے، جو اس مجموعہ کی خوبی ہے۔ زبان عام فہم اور سلیس، کردار ہمارے ارد گرد گھومتے ہوئے، نہ تشبیہوں اور نہ ہی علامتوں کا سہارا لیا ہے، بات صاف اور سیدھی بیان کی ہے کہ قاری کو سمجھنے میں کوئی الجھن پیش نہ آئے۔ ۱۳۸ر صفحات پر مشتمل یہ انیس کہانیاں یقیناً آپ کے دل پر دستک دیں گی۔ کہانیوں کے کرداروں کی روح پر چھائے کرب کو کچھ حد تک سکون ضرور ملے گا۔

بُدکی صاحب کو اس با مقصد دلچسپ مجموعہ کی اشاعت پر ڈھیر ساری شبھ کامنائیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

☆☆☆☆☆

☆ مضمون نگار: ڈاکٹر رینو بہل، ۱۵۰۵، سیکٹر ۴۹ بی، چنڈی گڑھ؛ کتاب 'روح کا کرب'؛ مصنف: دیپک بُدکی؛ ناشر: میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر-۹؛ سن اشاعت: ۲۰۱۵ء؛ ضخامت: ۱۳۸ر صفحات؛ قیمت: ۳۰۰ر روپے

نئی تکنیک، نئے موضوعات اور دیپک بُدکی کے افسانے

--محمد غالب نشتر

ہم عصر افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا فنی جائزہ لیا جائے تو کئی اہم نام ابھر کر سامنے آتے ہیں جنھوں نے موضوعات و مسائل کی سطح پر اپنی صلاحیتوں کا سِکّہ منوایا ہے اور نئی تکنیک کے سہارے افسانے کی صنف کو مالا مال کیا ہے۔ اس فہرست میں دیپک بُدکی کا نام بھی شامل ہے جو گزشتہ بیس سال سے اپنے قلم کی جولانیوں سے اردو ادب کو مالا مال کر رہے ہیں۔

مابعد جدید افسانہ نگاروں میں دیپک بدکی کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۵ر فروری ۱۹۵۰ء کو سری نگر میں پیدا ہوئے۔ کشمیر سے ہی بی ایڈ اور ایم ایس سی (بوٹنی) کی اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں کئی شہروں کی سیاحت کی اور فکشن رائٹنگ کے لئے مواد اکٹھا کرتے رہے۔ ستر کی دہائی میں افسانہ نویسی شروع کی مگر کچھ سال بعد ہی تخلیقی تعطل کا شکار ہوئے، پھر ۱۹۹۶ء سے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ ان کے افسانوں کے پانچ مجموعے اشاعت سے ہمکنار ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ 'ادھورے چہرے' 1999ء میں، دوسرا 'چنار کے پنجے' 2005ء میں، تیسرا 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' 2007ء میں، چوتھا مجموعہ 'ریزہ ریزہ حیات' 2001 میں اور تازہ مجموعہ 'روح کا کرب' 2015ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ علاوہ ازیں 'مٹھی بھر دھوپ' کے عنوان سے 2015ء میں افسانچوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ افسانہ نویسی کے علاوہ تنقید و تبصروں کے میدان میں بھی انہوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ 'عصری تحریریں'، 'عصری شعور' اور 'عصری تقاضے' جیسی اہم تصانیف اسی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

دیپک بُدکی کا اختصاص اس لیے بھی قائم ہے کہ انھوں نے اسلوب و تکنیک کے ماسوا موضوعات کی سطح پر کئی اہم افسانے رقم کیے ہیں۔ مثلاً کشمیر کے پس منظر میں ان کے کئی افسانے ہیں۔ وجہ اس کی صاف ہے، کہ کشمیر سے ان کا براہ راست تعلق رہا ہے۔ انھوں نے وہاں کے مسائل کو

قریب سے دیکھا ہے۔ بُد کی صاحب کے افسانوں میں کشمیر دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا کشمیر وہ ہے جو ۱۹۹۰ء سے پہلے کا ہے۔ اس حوالے سے 'اچانک'، 'شیر اور بکرا' اور 'اداس لمحوں کا کرب' قابل ذکر افسانے ہیں۔ اسی طرح سے ۱۹۹۰ء کے بعد کے کشمیر کا کرب، مسائل اور صورتحال کو ان کے چند افسانوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس قبیل کے افسانوں میں 'گھونسلا'، 'ایک نہتے مکان کا ریپ'، 'وفادار کتا'، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، 'کاگ پور نیما' اور 'سفید کراس' کو رکھا جا سکتا ہے۔ دونوں قبیل کے افسانوں کو پڑھ کر کشمیر کے منظر کو صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ دیپک بُد کی کے افسانوی موضوعات میں وہ معاشرہ بھی سامنے آتا ہے جو دو حصوں میں منقسم ہو چکا ہے جہاں رشتوں کا کرب ہے، دو نسلوں کا تصادم ہے، خانگی زندگی کے مسائل ہیں اور پرانی قدروں کا زوال ہے۔ یہ وہی مسئلہ ہے جس سے آج کا معاشرہ نبرد آزما ہے اور اقدار کا نوحے کا طلسم پھیل چکا ہے۔ 'ڈاگ ہاؤس'، 'ٹکروں میں بٹی زندگی'، 'دو گز زمین'، 'ڈاکٹر آنٹی'، 'بٹی ہوئی عورت'، 'رشتوں کا درد' اور 'ادھورے چہرے' جیسے افسانوں میں یہ صورتحال پوری طرح جلوہ گر ہے اور نیا معاشرہ قوموں کی تہذیب کو نگلنے کے لیے بے چین ہے۔ جنس بھی بُد کی کے افسانوں میں ایک خاص صورتحال کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ محض تفنن طبع کے لیے ایسے واقعات بیان نہیں کرتے بلکہ ایک خاص مسئلے کو سامنے رکھ کر کہانی خلق کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جنسی افسانوں میں لذتیت نہیں ہوتی، وہ اس نکتے کو ایسے بیان کرتے ہیں کہ کوئی خاص سانحہ معلوم نہیں ہوتا لیکن قاری پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے اور افسانہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ دیپک بُد کی کا یہ وہ فنی اختصاص ہے جس سے وہ ہم عصروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چند نمائندہ افسانوں کو بنیاد بنا کر بات کی جائے تاکہ قاری کا فن پارے سے براہ راست رابطہ قائم ہو سکے۔

دیپک بُد کی کے اہم افسانوں میں 'ڈاگ ہاؤس' کو کئی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے جس میں حیوانِ ناطق اور حیوان غیر ناطق کی پُر اسرار زندگی کے اُن لمحات کا محاصرہ کیا ہے جن میں وہ اپنے رشتے داروں سے دور رہ کر ایسے مقام پر زندگی کی سانسیں لے رہے ہوتے ہیں جن مقامات کو اولڈ ایج ہوم یا ڈاگ ہاؤس سے موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ کہانی کے شروع میں دیپک بُد کی نے بھیڑیے اور کتے کی حکایت کے سہارے کہانی کے سرے کو آگے بڑھایا ہے جہاں کتا یا کتے جیسی قسمت والے چرند پرند کسی کے ماتحت

ہوتے ہیں، انہیں ہر طرح کی سہولتیں میسر ہوتی ہیں لیکن وہ 'آزادی' والی کیفیت سے سرشار نہیں ہوتے۔ کہانی کار کو ایسے پالتو جانوروں سے ہمدردی ہونے کے ناطے وہ کسی کی زندگی کو تباہ نہیں کرنا چاہتا اسی لیے وہ اپنے گھر میں کتے پالنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ملازمت سے سبکدوشی، ضعیف العمری کی مشکلات اور اپنی اولاد کے سامنے اپنی خواہشات کو مارنے کی بہ دولت اپنے بیٹے کے ذریعہ لائے گئے کتے کی خطرناک نسل کو گھر میں پالنے سے منع نہیں کر پاتا اور وہ خود اُس کے یعنی ٹائیگر سے مانوس ہوتا چلا جاتا ہے۔ پوری فیملی کے لیے پریشانی اُس وقت آن پڑتی ہے جب انہیں شادی کی تقریب میں ہفتہ دس روز کے لیے دوسرے شہر جانا ہوتا ہے اور ٹائیگر کی دیکھ ریکھ کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے لیکن جلد ہی اس مسئلے کا حل بھی تلاش کر لیا جاتا ہے اور ٹائیگر کو ڈاگ ہاؤس کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ کئی سالوں تک یہ روز وشب کی تکرار کے بعد ٹائیگر کی موت واقع ہو جاتی ہے اور ضعیف العمر شخص اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ چلنے پھرنے سے معذور ہے اور اس دفعہ بھی شادی کی تقریب درپیش ہے اور گھر میں چلے گئے حاشیے کے شخص کو 'اسپیشل کیئر اولڈ ایج ہوم' کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ کہانی کے آخر میں گھر والوں کے رویّے کو دیکھتے ہوئے انسان اور حیوان کی تفریق مٹ جاتی ہے اور یہ نشان امتیاز قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کتے اور انسان میں کسے تقدم حاصل ہے، دراصل یہی کہانی کا اصل نکتہ ہے جو قاری کو چونکا دیتا ہے۔ اس کہانی میں دیپک بُدکی نے نئے زمانے کے فیشن زدہ ماحول، پوسٹ کولونیل ایج اور مغرب پرستی پر سخت تنقید کی ہے اور نئی ترجیحات پر ضرب کاری کی ہے۔

مہاجرت کے حوالے سے اردو ادب میں فکشن کی دنیا مالا مال ہے۔ ناول وافسانے میں اس حوالے سے بے تحاشا فن پارہ تخلیق کیا گیا ہے۔ ان تحریروں میں ہر ہر گوشے پر مختلف زاویے سے لکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ مہاجرت کا کرب محسوس کرنا ہو تو عبداللہ حسین اور انتظار حسین کی تحریروں کا مطالعہ کیجیے۔ مہاجرت کے بعد ہونے والی ذہنی کشمکش کو محسوس کرنا ہو تو رام لعل، رتن سنگھ، رضیہ سجاد ظہیر وغیرہ کی کہانیوں کو نظر کے سامنے رکھیے، تمام نکات روشن ہوتے چلے جائیں گے۔ دیپک بدکی نے کہانی 'کاگ پورنیما' میں مہاجرت کو الگ زاویے سے دیکھا ہے اور کامیابی سے برتا ہے۔ اس کہانی کا راوی بھی سابقہ کہانی 'ڈاگ ہاؤس' کی طرح ملازمت سے سبکدوش ہو چکا ہے، اپنے آپ کو حاشیے کا ایک غیر ضروری فرد تصور کرتا ہے

اوراس کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اُس کا غم شیئر کر سکے تکنیکی لحاظ سے فرق یہ ہے کہ سابقہ کہانی حال سے مستقبل کی جانب رواں ہے اور اس کہانی میں کردار/راوی فلیش بیک میں چلا جاتا ہے اور کہانی کے اختتام پر حال میں دوبارہ طلوع ہوتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار کیلاش پنڈت جو بہ ذات راوی بھی ہے اور واحد حاضر کی تکنیک میں کہانی سنا رہا ہے۔ کاگ پورنیا یا کوؤں کی پورنمائشی یعنی کوؤں کی استقبالیہ دعوت کے ذریعہ مہاجرت کا کرب بیان کرتا ہے اور اپنی ذات کے کرب کو بھی اس میں شامل کر لیتا ہے۔ ہندو مائتھولوجی کے مطابق اس رسم یا تقریب کا اہتمام کوؤں کے لیے کیا جاتا ہے کہ ایک روایت کے مطابق ہر سال سائبیریا اور روس کے دیگر شمالی علاقوں سے مہاجر کوّے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں میلوں مسافت طے کر کے ہندوستان آتے ہیں اور ہندو مذہب سے عقیدت رکھنے والے ان کوؤں کی سواگت میں یہ تہوار مناتے ہیں۔ اسی رسم کو دیکھتے ہوئے راوی یہ محسوس کرتا ہے کہ پیٹ انسان کو ہی نہیں بلکہ پرندوں کو بھی ہجرت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ کیلاش پنڈت مہاجرت کے تحفے کو بیان کرتے ہوئے اپنے پوتے سَنی کے سامنے پرمغز تقریر کرڈالتا ہے:

> ''انسان بھی ہجرتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پیٹ کی خاطر ......! تحفظ کی خاطر......! مذہب کی خاطر......! یہ تو اس کی بیھمی وراثت ہے۔ روزگار کی خاطر ہزاروں لاکھوں لوگ اپنی جڑوں سے اکھڑ جاتے ہیں۔ کئی کسانوں کو کام کرنے کے لیے شہر جانا پڑتا ہے۔ وہ صرف بوائی اور فصل کاٹنے کے سمے گاؤں لوٹ آتے ہیں۔ زلزلے، سیلاب اور سوکھے جیسے قدرتی حادثات کے سبب لوگوں کو عارضی طور پر اپنی دھرتی چھوڑنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔''

راوی کی شخصیت بھی انسانی انتہاپسندی کے باعث مہاجرت کے کرب سے دوچار ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ پرانے مکان میں اپنے بچپن کو ڈھونڈنے جاتا ہے اور گھر کی چھت پر کھوئے بچپن کو نہارتا ہے جو اَب سراب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندو مائتھولوجی اور مہاجرت کو موضوع بنا کر

دیپک بُد کی نے کہانی کو فن کاری کے ساتھ بنا ہے۔ ہند و متھ سے استفادہ کرتے ہوئے ایک اور اہم کہانی 'رشتوں کا درد' ہے جس میں افسانہ نگار نے عورت کو موضوع بنا کر مختلف شیڈس دکھائے ہیں، ساتھ ہی نئے عہد میں ہونے والی تبدیلیوں اور جدید کاری کے دام میں عیاریوں کی نقاب کشائی بھی کی ہے۔

نئے زمانے کی چیرہ دستیوں، سفاکیت اور بے راہ روی کا بھرپور محاسبہ دیپک بُد کی نے کیا ہے۔ ان کے کئی افسانے اس پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ ایسے افسانوں میں بُد کی نے جڑوں کی طرف بھی مراجعت کی ہے۔ اس ضمن میں ان کے دو افسانوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ 'ڈاکٹر آنٹی' اور 'کینچلی'۔ 'کینچلی' میں ایک ایسی عورت کا ذکر ہے جس کے آباو اجداد مغلیہ سلطنت کے عہد میں باثروت لوگوں میں تھے۔ تقسیم کے بعد اُن کا خاندان منتشر ہوا تو معاشی حالات دگرگوں ہوئے۔ اب وہی عورت لوگوں کے آگے دست دراز کرتی ہے اور اسے کسی بھی طرح کی جھجھک محسوس نہیں ہوتی۔ اسی طرح 'ڈاکٹر آنٹی' کی کملا دیوی، جس کے اردگرد کہانی گھومتی ہے۔ اس کا خاندان بھی تقسیم کے المیے کا شکار ہوتا ہے اور بعد میں حالات سنبھلے تو معاشرتی تشدد انہیں آدبوچتا ہے۔ ڈاکٹر آنٹی کی موت واقع ہوتی ہے تو اُن کے بھائی بہن ڈرے سہمے اَب گھر سے بھی باہر نہیں نکلتے اور شہر میں پھیلی بدامنی کا شکوہ کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے احتجاج یا Protest ہے جو عوام کے سامنے نہ کر کے آپ ہی آپ کرتے ہیں اور دل کا غبار نکالتے ہیں۔ اسی طرح دیپک بدکی نے کہانی 'بٹی ہوئی عورت' میں صنفِ نازک یعنی عورت کے موضوع کو نہایت فن کاری سے اجاگر کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ موضوع ناول کا متقاضی ہے کیوں کہ اس افسانے میں تین کہانیاں ایک ساتھ چلتی ہیں اور تینوں کہانیوں میں الگ الگ بحث ہے۔ سب سے پہلے تو اپنی مرضی سے شادی کرنے والی عورتوں کا انجام ہے تو دوسری طرف کم سن لڑکیوں میں پیش آنے والے خدشات کا بھی ذکر ہے ساتھ نظامِ عدلیہ پر سخت تنقید ہے۔ پوری کہانی کا لب لباب بہر حال بٹی ہوئی عورت ہے جو کسی نہ کسی طور پر مرد ذات کی ہوس کا شکار ہے۔ کہانی شروع ہوتی ہے لاجونتی کی شادی سے، جسے شیکھر گھر والوں کی مخالفت کے باوجود گھر لاتا ہے لیکن سہاگ رات ہی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ لاجونتی اس فن میں نئی نہیں ہے بلکہ ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے تو شیکھر پریشان ہو اُٹھتا ہے۔ لاجونتی کا ماضی بڑا کربناک ہے۔ جوانی کے عالم میں کئی لوگوں نے اس کا استحصال کیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو گناہ سے تائب ہونے کی کوشش کرتی

لیکن لاجو کو موقع بہ موقع اس دلدل میں کودنے کی شدید خواہش ہوتی رہتی ہے۔ منہ میں خون لگی شیرنی کو تو خون ہی چاہئے کے موافق۔ افسانہ نگار مبالغہ سے کام لیتے ہوئے لاجونتی کے جوبن کر تعریف کچھ اس طرح سے کرتا ہے:

> ''گھڑی کی ٹک ٹک چڑھتی جوانی کا الارم بن گئی۔ ادھر رنگت کھل اٹھی ادھر خرام میں لچک پیدا ہوگئی۔ آنکھیں چمکنے لگیں اور امبیا جیسی چھاتیاں پھولنے لگیں۔ شروع شروع میں خالی چولی ہی سے کام چل جاتا تھا مگر جوں ہی بھاری لٹکتی ہوئی گھنٹیوں کے جھولنے کا احساس ہوا تو انہیں انگیا کے کٹوروں میں سمیٹ لینا پڑا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ انگیا میں چھاتیاں مزید نمایاں ہوگئیں''۔

پہلے تو رشتے داروں نے لاجو کا استعمال کیا بعد میں دوسرے لوگوں نے۔ اس کے بعد تو ایک تانتا سا لگ گیا اور لاجو کی عادت بگڑتی چلی گئی۔ اس افسانے کا عنوان تو بٹی ہوئی عورت ہے لیکن مزید کرید کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مختلف خانوں میں منقسم ہونے کے باوجود لاجو فائدے میں ہے اور شیکھر خسارے میں۔ عورت کے پاس تو ہزار تیر ہیں جس پر چاہے نشانہ لگا کر زخمی کردے۔ لاجو کے پاس وجے کمار ہے اور بھی کئی سارے مرد ہیں جب کہ شیکھر کے پاس فقط لاجونتی ہے۔ وہ بھی بٹی ہوئی۔ کہانی میں پلاٹ پر توجہ دی جائے تو معلوم ہوگا کہ دیپک بُدکی نے سمندر کو کوزے میں بند کردیا ہے۔

دیپک بدکی افسانوں کا کینوس وسیع ہے۔ ان کی کہانیوں میں ظاہری حسن کے پرستار کی واضح مثالیں بھی ہیں جہاں ایک لڑکا حسین لڑکی کو دیکھ کر اپنا دل دے بیٹھتا ہے لیکن اسے پتا چلتا ہے کہ لڑکی اپاہج ہے تو خوابوں کا محل مسمار ہو جاتا ہے۔ افسانہ 'ڈائننگ ٹیبل' اس کی واضح مثال ہے۔ ان کی کہانیوں میں میاں بیوی کے مابین ذہنی ناہمواری کا بھی بیان ہے۔ سماج کا کھوکھلا پن بھی ہے اور معاشرے کی زبوں حالی بھی۔ دیپک بُدکی نے تمام موضوعات کے ساتھ جنس کے موضوع پر بھی کئی کہانیاں لکھی ہیں جن میں 'ڈرفٹ وڈ'، 'ادھ کھلی'، 'بٹی ہوئی عورت' اور نہ جانے کتنے ہی افسانے ہیں جن میں یہ صورت نمایاں ہے۔ 'ڈرفٹ وڈ' ایک الگ ذائقے کی کہانی ہے جو انسانی نفسیات کی داخلی کیفیت پر مبنی ہے۔ جنس کا

موضوع ہمارے ذہنوں پر آتے ہی مرد عورت کے ناجائز تعلقات کا خاکہ تیار ہوتا ہے اور ذہن میں کوئی خاص کرید پیدا نہیں ہوتی لیکن جنس کا عمل کسی ایسے پاک رشتے سے استوار ہو جائے جن کی جانب ذہن مائل ہی نہ ہو تو طبیعت میں بھونچال آجاتا ہے، معاشرے کی زبوں حالی پر شرم آنے لگتی ہے اور سماج کی ننگی حقیقت واضح ہونے لگتی ہے۔ اس کہانی میں کرنل کول اپنی بیٹی سے رشتے استوار کرتا ہے جس کا اسے احساس ہی نہیں ہوتا بلکہ غیر شعوری طور پر یہ عمل انجام تک پہنچتا ہے۔ کرنل لکڑی کے بے معنی ٹکڑوں کو حسن عطا کرتا ہے اور اس عمل میں وہ طاق ہے۔ یہی عمل وہ اپنی بیٹی کے ساتھ بھی دہراتا ہے۔ سرد راتوں میں دونوں ایک ہی بستر پر سوتے ہیں، سمن، باپ کے ہاتھ چمٹ کر سوتی، انہی دنوں اس کے جسم میں تبدیلی آنے لگتی ہے اور اس کے حواس خمسہ وقت سے پہلے ہی بیدار ہونے لگتے ہیں۔ اوائل شب میں کرنل کول سمن کے بدن پر اپنے ہاتھ پھیرتا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگلیوں کی یہ کھوج بہت آگے نکل جاتی۔ دونوں ایک دوسرے پر کوئی اعتراض نہیں کرتے اور یہ مفاہمت بڑی معنی خیز لگتی۔ افسانہ نگار کا بیان:

> "سمن کا ردِّ عمل کچھ عجیب سا تھا۔ ایسی صورت میں عام طور
> پر لڑکیاں اپنے آپ سے حقارت کرتی ہیں اور پستی کی گہرائیوں میں
> گر جاتی ہیں مگر وہ اپنے مغموم دل کو قہقہوں کے پھاہے لگاتی رہی۔
> جسمانی قربتوں سے اپنے مضروب روح کو جھوٹی تسلیاں دیتی رہی
> اور مردوں کو آلۂ کار بنا کر اپنی زندگی ہموار کرتی چلی گئی"۔

بچپن کی باتیں سمن کو اور اس کے خدوخال کو پختہ بنا دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کالج میں داخلے کے بعد اس کے کئی معاشقے شروع ہوتے ہیں۔ تتلیوں کی طرح گلوں سے رس چوسنے کا ہنر اس نے سیکھ لیا ہے، ابدی رشتے پر اس کا یقین نہیں۔ ماڈل بننے کی خواہش نے اسے کئی لوگوں کے بستر گرم کرنے پڑے لیکن نتیجہ لا حاصل رہا۔ اس افسانے میں دیپک بُدکی نے ایک باپ کی جنسی ناآسودگی کی جانب اشارہ کیا ہے اور بیٹی کی بے راہ روی کی جانب بھی، جس کا سہرا باپ کے ہی سر جاتا ہے۔

دیپک بُدکی کے افسانوں میں اگر موضوعات کا احاطہ کیا جائے تو سب سے اہم موضوع

رشتوں کی پامالی کے منہدم ہونے کا المیہ اور نئے زمانے کی بدسلوکی پر طنز سب سے نمایاں ہے۔ وہ ہمارے زندہ سماج میں پنپنے والی ان تمام برائیوں کا احاطہ کرتے ہیں جن کی جڑیں پرانے زمانے سے پیوست ہو چکی ہیں۔ سماج کا ایک فرد ان تمام برائیوں کو قلع قمع کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے کئی دشمنان پیدا ہو جاتے ہیں، اسے دھمکیاں دیتے ہیں محض اس وجہ سے کہ برائیوں کا خاتمہ نہ ہو اور ان کا کام چلتا رہے۔

کہانی 'ٹکڑوں میں بٹی ہوئی زندگی' ریزرویشن سے شروع ہو کر ماضی سے پیوست ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کا اہم کردار 'میکھلا' ایک کرسچن سکول سے تعلیم یافتہ عورت ہے جو ریزرویشن کی وجہ سے انڈین سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہو کر خوش وخرم اپنی زندگی گزار رہی ہے لیکن ماضی کی کچھ باتیں اسے کچوکے لگاتی ہے مثلاً کارتک سے اس کا معاشقہ اور کارتک کے گھر والوں کا میکھلا کو اپنی بہو بنانے سے صاف انکار کر دینا (کہ وہ نچلی ذات سے تعلق رکھتی ہے)، پوسٹل کلرک سنت داس پہ خواہ مخواہ گھپلے کا الزام لگا کر دس سالوں کے لیے ملازمت سے معذول کر دینا وغیرہ۔ یہاں افسانہ نگار یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ فقط اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ریزرویشن کے باوجود اعلا کرسیوں پر دوبے، چوبے، مشرا، ترپاٹھی، سکسینہ اور سنہا وغیرہ ہی براجمان ہیں جو نچلی ذات کو اور اقلیت کو آگے بڑھنے کا کوئی موقع نہیں دیتے۔ خدانخواستہ اگر کوئی اعلا مقام پر پہنچ بھی جائے تو وہ ایمانداری برتنے لگتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جب کوئی اقلیتی ذات کا فرد بڑے عہدے پر فائز ہوتا ہے تو وہ سیکولر بن جاتا ہے اور جب کوئی اکثریتی ذات کا شخص بڑے رتبے پر براجمان ہوتا ہے تو وہ کمیونل ہو جاتا ہے۔ یہی باتیں سوچتے ہوئے میکھلا ماضی کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتی ہے:

> "یہ بھید بھاؤ ہمارا ورثہ ہے۔ درونا چاریہ نے اکلویہ کا انگوٹھا اس لیے کٹوایا تھا کہ اس کے کھشتری شاگرد کو قبائل ذات سے منہ کی نہ کھانی پڑے۔ بھگوان رام نے شبری کے ہاتھ کے بیر تو کھا لیے مگر اس کی اور اس جیسے لوگوں کی حالت سدھار نہیں پایا۔ آج بھی ہماری ذہنیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ ریزرویشن کے باوجود دُوبے، چوبے، مشرا، ترپاٹھی، سکسینہ اور سنہا اعلا کرسیوں پر

براجمان ہیں۔"

یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ تمام باتوں کو غلط ثابت کرنے کے لیے دفتر پہنچ کر والنٹری ریٹائرمنٹ لے کر اقلیتی قبیلوں میں تعلیم کو فروغ دینے کی ٹھان لیتی ہے اور این جی او قائم کرتی ہے۔ کہانی اپنے خوش گوار انجام کو اس وقت پہنچتی ہے جب میکھلا، منیلا فلپائن سے ریمون میگ سیسے ایوارڈ حاصل کر کے دہلی کے اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے باہر نکلتی ہے اور ایئر پورٹ پر اس کا انٹرویو لینے والے لوگوں میں روزنامہ وائس آف انڈیا کا ایسوسیٹ ایڈیٹر کارتک اگروال بھی انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب میکھلا کا سر خوشی اور غرور سے اونچا ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح 'ادھوری کہانی' جزیشن گیپ کی کہانی ہے جہاں ایک بوڑھا شخص، جو دادا کی صورت میں پورے خاندان کے لیے وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ بوڑھا شخص اپنی زندگی کے تجربات سے لوگوں کو فیض پہنچانا چاہتا ہے لیکن اس کی بات سننے کے لیے فرصت ہی نہیں سوائے اس پوتے کے، جسے دادا کی ہر بات پیاری لگتی ہے۔ پوتے کے علاوہ اگر کسی کو ان کے کمرے میں مجبوری سے جانا بھی پڑتا تو وہ پہلے ہی ماں سے طے کرا کے آتا کہ دو چار منٹ کے اندر ہی اس کو چائے پینے کے بہانے بلا لیا جائے تاکہ اس بڈھے کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرنا پڑے۔ نئی صدی میں جزیشن گیپ کے حوالے سے کئی اچھی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ یہ موضوع اس لیے بھی اہم ہے کہ پورا معاشرہ اس دلدل میں پھنستا چلا جا رہا ہے اور لوگوں کو فرار کی صورت کوئی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ جس سے ان حادثات کا ازالہ کر سکیں۔ دیپک بُدکی نے اس طرح کے موضوع اور کئی دوسرے مسائل کو مدنظر رکھ کر کئی اہم کہانیاں رقم کی ہیں۔ ان کا یہ سفر جاری ہے اور کئی اہم موضوعات ان کے سامنے صف باندھے کھڑے ہیں۔ اردو ادب کو ابھی بھی ان کی شاہکار تخلیق کا انتظار ہے۔

☆☆☆☆☆

☆مضمون نگار: محمد غالب نشتر، لین نمبر ۳، ستار کالونی، باریاتو، رانچی-۸۳۴۰۰۹ (جھارکھنڈ)

ایک جذباتی اور بولڈ افسانہ نگار۔ دیپک بدکی

۔'روح کا کرب' کے پس منظر میں۔

--ڈاکٹر ایم۔اے۔حق

دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری کے تین سب سے اہم ستون اُن کی بے باکی، سماج کے مختلف طبقوں میں پنپ رہے شب وروز کے واقعات کی صحیح عکّاسی اور قریبی دوستوں، ملنے جلنے والوں ورشتہ داروں کے خفیف سے خفیف ردِّ عمل پر بے حد باریک بینی سے جذباتی اعترافات اُن کی کہانیوں میں محلول نظر آتی ہیں۔ ہم اور آپ جن باتوں کو بے حد معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، دیپک بدکی کی چشم تجزیہ اُن میں پنہاں سچائیوں کی پرتوں کو کرید کر اپنے جذباتی کردار کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

دیپک بدکی کے افسانوی مجموعہ 'روح کا کرب' کا مطالعہ میں نے خود سے نہیں کیا ہے، بلکہ اُن کی کہانیوں کے دلچسپ اور تجسس کو جگا دینے والے آغازی جملوں نے مجھے اُن کی ساری کہانیوں کو پڑھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ آج مصروفیت سے بھرپور زندگی میں اس طرح سے کہانیوں کے مطالعہ پر اکسانا بھی ادب کی ایک بہترین خدمت ہے۔

کچھ مثالیں حاضر ہیں:

(۱) ''ریزرویشن؟'' وہ سوچنے لگی ''ریزرویشن نہیں ہوتی تو میں اس مقام تک کیسے پہنچ پاتی'' (ٹکڑوں میں بٹی زندگی)

(۲) ''کیلاش پنڈت بہت بے چین ہو رہا تھا۔ اُسے بچپن کا ایک قصہ یاد آ رہا تھا جسے وہ اپنے پوتے کو سنانے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ (کاگ پورنیا)

(۳) ''ڈیڈی میرا بستہ اُٹھا لیجئے۔ بہت بھاری ہے۔'' (بستے کا بوجھ)

(۴) والدین کو مٹی دینے کے تُرت بعد بیٹوں میں تناتنی بڑھ گئی۔'' (الم آشنا دل)

قارئین جب مندرجہ بالا شروعات کو پڑھتا ہے تو اُن میں مزید آگے پڑھنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ میں نے بہت سارے بڑے افسانہ نگاروں کی کہانیوں کو پڑھنے سے اس لئے گریز کیا ہے کہ اُن کی شروعات نہایت ہی غیر دلچسپ اور روکھے سوکھے الفاظ سے ہوتی ہے۔

مجموعے کا نام 'روح کا کرب' دیپک بدکی نے محض اس لئے نہیں رکھ دیا ہے کہ اُس میں ایک کہانی کا عنوان 'روح کا کرب' ہے جیسا کہ یہ عام ادبی فیشن ہے۔ دراصل 'روح کا کرب' میں مصنف نے ایسی کہانیاں پیش کی ہیں جو آپ کی روح تک کو جھنجھوڑ دینے کی قوت رکھتی ہیں۔

عموماً افسانوں کے ایسے عنوانات پسند نہیں کئے جاتے جن سے کہانیوں کے کلائمکس قبل از وقت ظاہر ہو جاتے ہیں۔ دیپک بدکی نے کہانی میں عنوان کی موزونیت کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس مجموعے میں دو کو چھوڑ کر اُن کے سارے عنوانات مجھے پسند آئے۔ 'زمین پھوٹ کر جو بھگوان نکلا' اور 'زندگی سوچ کر اُداس ہو گیا میں' کی جگہ دوسرے ٹائیٹل ہوتے تو بہتر تھا۔

اُن کی بیشتر کہانیوں میں اُن کی اپنی ذاتی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ اس مجموعے میں بھی اُن کی زیادہ تر کہانیاں اُن سے وابستہ بلکہ اُن کی سروس لائف سے جڑے تجربات سے بھرے پڑے ہیں۔ 'ڈاگ ہاؤس'، 'زمین پھوٹ کر جو بھگوان نکلا'، 'پراویڈنٹ فنڈ'، 'یونین لیڈر'، 'انٹرویو' وغیرہ ایسی ہی کہانیاں ہیں۔

دیپک بدکی کے افسانوں میں انفرادیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس مجموعے میں بھی اُن کی کہانی 'کاگ پورنیما' کا ٹاپک سب سے جُدا ہے۔ سائبیریا اور روس کے دیگر علاقوں سے ہجرت کر کے ہندوستان آنے والے کالے کوے کی تفصیلات کے حوالے سے ایک بہت ہی جذباتی مسئلے کی جانب ہمارا دھیان مرکوز کیا ہے۔ 'بے نسب ورثے کا وجود' میں ایک بے یار و مددگار شخص کی زندگی کے آخری لمحات کی بے مثال عکاسی کی ہے جو ایڈز جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گیا ہے۔ 'پراویڈنٹ فنڈ' جیسا نادر موضوع ملازمت پیشہ افراد کی بہتری کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ زندگی کے آخری ایام میں اپنے عزیزوں کی بے اعتنائی انسان کو جذباتی تازیانے لگاتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات نہایت خوبصورتی کے ساتھ دیپک بدکی نے 'ڈاگ ہاؤس' میں پیش کیا ہے۔

ازدواجی زندگی کی تلخیوں کے اختتام پر قارئین کو تجزیے کی دعوت دیتی ہوئی کہانی ہے 'حسرتوں کا مدفن'۔ 'طفیلی بیل' میں دوسروں پر منحصر زندگی یعنی Parasitism کی خصوصیات کو بڑی کامیابی سے بیان کیا گیا ہے۔

دیپک بدکی کو کہانی کہنے کا صحیح ہُنر آتا ہے۔ وہ نوعیت کے مطابق اور کرداروں کے منہ میں وہی الفاظ ڈالتے ہیں جو اُن سے میل کھاتا ہے اور عام فہم ہے۔ آپ بھی دیکھیں:

(۱) ''دفتر پہنچتے ہی اُس نے والنٹری ریٹائرمنٹ کے لئے اپنی درخواست اعلیٰ افسر کو بھیج دی''

''نائیس ٹو میٹ یو''،

''تنگ آکر ایک معتوب پوسٹ ماسٹر شیڈیول کاسٹ کمشنر کو چٹھیوں پر چٹھیاں لکھتا رہا۔''

''میں آپ سے سہمت ہوں۔ دراصل ان جاتیوں کا شوشن ہزاروں سالوں سے کیا جارہا ہے۔'' (ٹکڑوں میں بٹی زندگی)

(۲) ''والدین کو مٹی دینے کے تُرت بعد بیٹوں میں تناتنی بڑھ گئی'' (الم آشنا دل)

(۳) ''کیسی بات کرتی ہو جی! کوئی شیولنگ کو پھینکنے کی دُساہس کرسکتا ہے کیا؟'' (زمین پھوٹ کر جو بھگوان نکلا)

(۴) ''تم سنگھرش کرو''،

''بھرشٹاچار مٹانا ہے'' (میں انا ہوں)

لیکن ایک دو جگہوں پر مصنف سے کچھ چُوک بھی ہوئی ہے۔ ''اوہ تو یہ بات ہے امیں بھی حیران تھا کہ تُم لوٹتے سمئے اتنی ''خشمگیں'' کیوں نظر آرہی تھی۔'' یہ مکالمہ ایک شوہر نے اپنی دھارمک پتنی سے کہا ہے، جو میری نظر میں پتنی کے بیک گراؤنڈ کی مناسبت سے میل نہیں کھاتا ہے۔

لگتا ہے کہ دیپک بدکی کے تحت الشعور میں اُن کی ملازمت کے دنوں کی یاد کچھ اس طرح سے گھر کرگئی ہے کہ اُن کے زیادہ تر افسانوں میں سوانحی عکس نظر آتا ہے۔ اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اُن کی

کہانیوں میں حقیقت نگاری درآ گئی ہے۔ فنی پہلو یہ ہے کہ کہیں کہیں اس سے بوریت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ اپنی شناخت پوشیدہ رکھ کر بھی دوسرے کرداروں کے توسط سے اپنی بات کہہ سکتے ہیں۔

'روح کا کرب' میں صرف دو کہانیوں 'الم آشنا دل' اور 'تُرنذ' نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ کیوں کہ 'الم آشنا دل' ایک سیدھی سپاٹ کہانی کا اظہاریہ ہے جس میں ایک چھوٹے بھائی کی جانب سے ایسے بڑے بھائی کی مدد کا ذکر ہے جو اپنے اچھے دنوں میں اُسے (اپنے چھوٹے بھائی کو) گھر سے بے دخل کر دیا تھا اور 'تُرنذ' کہانی سے زیادہ ایک واقعہ نظر آتا ہے۔ لیکن ان چھوٹی موٹی کمیوں کے باوجود مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں بلا جھجک یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ دیپک بدکی عام فہم زبان اور دلچسپ انداز میں منفرد ٹاپک پیش کرنے والا ایک بولڈ اور جذباتی افسانہ نگار ہے۔

☆☆☆☆☆

☆ مضمون نگار: ڈاکٹر ایم اے حق، حق منزل، گوش کمپاؤنڈ، سنٹرل سٹریٹ، ہند پیڑھی، رانچی -۸۳۴۰۰۱ [جھارکھنڈ]

===

دیپک بُدکی- ایک حقیقت پسند قلم کار

--ڈاکٹر پریمی رومانی

دیپک بُدکی اردو افسانے کے مرد میدان ہیں۔ اگرچہ انھوں نے تحقیق وتنقید کے ساتھ ساتھ تبصرہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی اور بعض عمدہ طنزیہ مضامین بھی لکھے لیکن بنیادی طور پر وہ ایک باصلاحیت افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا سر آغاز کالم نگاری سے کیا، وہ ایک زمانے میں کارٹون اور اسکیچ بنانے سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ ایک افسانہ نگار ہیں اور نثر کی اسی لطیف صنف کی آبیاری کرنے میں مصروف ہیں۔ دیپک کے چھ افسانوی مجموعے تا دمِ تحریر منظر عام پر آچکے ہیں۔ جن میں 'ادھورے چہرے'، 'چنار کے پنجے'، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' اور 'ریزہ ریزہ حیات' کے نام لے جا سکتے ہیں۔ 'روح کا کرب' اور 'مٹھی بھر ریت' ان کے دو تازہ افسانوی مجموعے ہیں جو ۲۰۱۵ء میں یکے بعد دیگرے منصۂ شہود پر آئے۔ 'ادھورے چہرے' سے 'مٹھی بھر ریت' تک آتے آتے دیپک نے لمبی مسافت طے کی۔ اس دوران انھیں بے پناہ کرب وانتشار سے گزرنا پڑا۔ بے چینی، بے بسی، لاچاری اور مجبوری ان کا مقدر بن گئی۔ انھیں ان جانی ڈگر پر بھٹکنا پڑا جہاں سراب کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس درد وکرب، محرومی و لاچاری، بے کسی و بے چینی نے ان کے فن کو مہمیز عطا کی۔ ان کے خیالات میں تازگی وتوانائی پیدا ہوگئی اور وہ اپنے اندر کا درد کھُل کر صفحۂ قرطاس پر اتارنے لگے۔ ان کے افسانے اسی درد وکرب کا کھلا ثبوت ہیں۔

'روح کا کرب' دیپک بُدکی کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے۔ یہ افسانے اپنے خیالات کی بوقلمونی اور تجربات کی وسعت سے اپنا جواب نہیں رکھتے اور مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ افسانے برصغیر کے صفِ اوّل کے جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ 'ٹکڑوں میں بٹی زندگی'، 'بستے کا بوجھ'، 'طلسمی عینک'، 'روح کا کرب' اور 'حسرتوں کا مدفن' جیسے افسانوں میں موجودہ دور کے انسان کے درد وکرب کا بھرپور اظہار کیا گیا ہے۔ یہ افسانے ان کے سابقہ یادوں کی بازگشت ہیں

جن میں سماجی ماحول کی عکاسی بھی ملتی ہے اور اقتصادی بدحالی کو بھی بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن یہ تمام افسانے حقیقت پر مبنی ہیں۔ دیپک کے فن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پہلے اس ماحول کا بھرپور جائزہ لیتے ہیں جس میں ایک انسان پلتا بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے اور پھر تجربات کو اپنے خیالات کی بھٹی میں تپا کر اپنے الفاظ کے تانے بانے سے زندگی بخش دینے کا گُر بخوبی جانتے ہیں۔ اس ضمن میں اُن کے افسانوں کے یہ اقتباسات پیش کیے جاسکتے ہیں:

☆ ''میڈم اب میں ریٹائرمنٹ کے قریب ہوں سپریم کورٹ نے بھی مجھے بری کردیا ہے۔ اس کے باوجود مجھے وقت وقت پر جو ترقی ملنی چاہیے تھی، آج تک نہیں ملی اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ملا۔ اس دوران میں میری بیوی سورگباش ہوگئی۔ ایک لڑکا تھا وہ بھی بھگوان کو پیارا ہوگیا۔ اب آپ پوچھ رہی ہیں کہ اس وقت میں تمھارے لیے کیا کرسکتی ہوں۔ بھلا آپ ہی بتائیے کہ اب آپ کیا کرسکتی ہیں؟ مگر سچ کہتا ہوں کہ آج مجھے پہلی بار تسکین اور اطمینان حاصل ہوا۔ معلوم ہے کیوں؟ کم سے کم اتنے برسوں کے بعد ایک افسر تو ایسی ملی جس نے میری پوری کہانی سن لی اور میرے ساتھ ہمدردی جتائی۔'' اپنی کہانی سناتے ہوئے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

(ص ۱٦)

☆ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں ٹائیگر کے ساتھ مانوس ہوتا چلا گیا۔ اب وہ پہلی سی کدورت دل میں نہیں رہ گئی تھی۔ جب بھی میں گھر میں ہوتا وہ میری ٹانگوں کے ساتھ چمٹا بیٹھا رہتا۔ بارہا میرے بستر کے اوپر بھی براجمان ہوجاتا۔ ایسی اپنائیت میں نے انسانوں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اب ہمارے کنبے کا فرد بن چکا تھا۔

(ص ۳۸)

دیپک کے افسانے 'طلسمی عینک'، 'کاگ پورنیما'، 'ترند'، 'یونین لیڈر'، 'ڈاگ ہاؤس' خالص کشمیر رنگ کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں دیپک کے اصلی جوہر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سرینگر میں پلے بڑھے اور پروان چڑھے۔ انھوں نے ان تمام حالات کا جائزہ لیا تھا جو کشمیر میں کشمیری پنڈتوں کا مقدر بن گئے تھے۔ انھوں نے اپنے بعض افسانوں میں اُس روایتی بھائی چارے اور امن و آشتی

کو بھی یاد کیا ہے جو صدیوں سے کشمیر میں پلا آرہا تھا لیکن جس کا عکس اب دور دور تک نظر نہیں آتا ہے۔ان جذبات کا تاثر دیپک کے اس چھوٹے مگر معنی خیز اقتباس میں نظر آتا ہے۔اپنے افسانوں کے مجموعے 'روح کا کرب میں لکھتے ہیں:

''میں سن ۲۰۱۰ء میں نوکری سے سبکدوش ہوا۔ ایسا لگتا ہے جیسے زندگی کی گاڑی خطرناک ٹریفک جام میں پھنس چکی ہے۔نہ آگے بڑھتی ہے اور نہ پیچھے ہٹ پاتی ہے ۔ممکن ہے اگر میں کشمیر میں اقامت پذیر ہوتا اور جبری ہجرت کا شکار نہ ہوا ہوتا شاید ایسے حالات سے دوچار نہ ہو ہونا پڑتا۔'' (روح کا کرب۔ص ۱۱)

لفظ 'جبری ہجرت' ایک علامت ہے، دہشت گردی کی، مار دھاڑ کی، آگ اور خون کی جس کا شکار ہم ۱۹۹۰ء میں ہوئے اور جس کا درد ہم صدیوں تک محسوس کرتے رہیں گے۔ان کے افسانوں میں صدیوں سے منائے جانے والے وہ رسم ورواج، تیوہار اور میلوں کے عکس صاف طور پر نظر آتا ہے۔جواب ہمارے دلوں میں یاد بن کر رہ گئے ہیں۔ایسے افسانوں میں 'کاگ پورنیما' کا نام نمایاں طور پر لیا جا سکتا ہے ۔'ترنڈ'، 'یونین لیڈر'، اور 'طلسمی عینک' بھی سیاسی اور سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ کشمیر کے درد کو پیش کرتے ہیں۔ یہ افسانے حقیقت پر مبنی ہیں۔ دیپک کا کمال یہ ہے کہ وہ حقائق کو پیش کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔وہ کہانیوں میں فرضی قصوں سے رنگ آمیزی نہیں کرتے ہیں بلکہ ان خیالات، جذبات اور تاثرات کی عکاسی کرنے میں رطب اللسان ہیں جن سے وہ گزر چکے ہیں۔ یہ اقتباس ان حقائق کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے جن کا خمیازہ ہم گذشتہ تیس سال سے بھگت رہے ہیں۔

''ہاں بیٹے......ان دنوں ہر سال سائبیریا اور روس کے دیگر شمالی علاقوں سے مہاجر کوّے ہزاروں لاکھوں میلوں کی مسافت طے کر کے یہاں چلے آتے ہیں۔ہم ان کی سواگت کے لیے یہ تیوہار مناتے ہیں۔تم باہر جا کر دیکھ لو۔آج کل تمھیں چھتوں پر...دیواروں پر......پیڑوں پر......غرض ہر جگہ کالے کلوٹے کوّے نظر آئیں گے جو چونچ سے دُم تک کوئلے کی مانند سیاہ ہوتے ہیں۔'' (افسانہ 'کاگ پورنیما')

دراصل 'کاگ پورنیما' وطن سے دہشت کے ذریعے سے ہم کو بے وطن کرنے کی علامت ہے

جس کو ہم صدیوں سے سہتے آئے ہیں۔ جس کی وضاحت دیپک نے اسی افسانے میں درج ذیل اقتباس میں کیا ہے:

"بیٹے ہمیں بھی پچیس برس پہلے انسانی انتہا پسندی کے باعث وادی سے باہر ہجرت کرنا پڑی۔ چونکہ ہماری آبادی آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ اس لیے ہم نے وادی کو خیر باد کہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ وہاں رہے ہوتے تو شاید اب تک نیست و نابود ہو چکے ہوتے۔ تھے بھی کتنے! تین چار لاکھ ہی کی تو آبادی تھی۔

(روح کا کرب ص ۲۵)

اس افسانے میں ایک انسان کے درد و کرب کو جس طرح سے بیان کیا گیا ہے وہ قابل داد ہے.

دیپک بُدکی کے فن میں ایک خصوصی بات یہ پائی جاتی ہے کہ ان کے افسانے آلودگی سے پاک ہیں۔ انھوں نے بے مطلب قصے رقم نہیں کیے اور نہ ہی داستاں طرازی کی ہے بلکہ انھوں نے اپنے خیالات نہایت ہی شستہ اور سلیس زبان میں بیان کیے ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلسل اور مربوط کہانیوں کو جنم دینے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ ان کے ہاں کہانی میں کہانی پن کا رنگ بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔ جو ان کے فن کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ 'روح کا کرب' میں کئی ایسے افسانے ہیں جن میں یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم ملتی ہیں اور یہ کیا کم اہم ہے۔

'مٹھی بھر ریت' دیپک کے افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے ۱۰۴ افسانچے ہیں جو گونا گوں موضوعات پر دال ہیں۔ اس کے پیش لفظ میں دیپک بُدکی لکھتے ہیں کہ "افسانچے میں زندگی کے کسی مختصر ترین واقع کی عکاسی ہوتی ہے اور یہ فرض کیا جاتا ہے کہ قاری اس کے پس منظر کا قیاس خود ہی لگا سکے گا۔" اس اقتباس کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر ہم دیپک کے افسانچوں کا جائزہ لیں گے تو یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ ان افسانچوں میں اختصار کے پہلو کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی بھی ملتی ہے اور پلاٹ بھی۔ ہر ایک افسانچہ آغاز سے انجام تک رواں دواں چلتا ہے اور جوں جوں قاری آگے بڑھتا ہے تو معنی کی پرتیں خود بہ خود کھل جاتی ہیں۔ اور آخر پر ذہن میں ایک الگ تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔

ان افسانچوں میں جن تجربات کی عکاسی کی گئی ہے وہ آج کل کے انسان کے درد و کرب کا

احاطہ کرتے ہیں۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سماجی، سیاسی اور دنیاوی واقعات کو مختصر الفاظ میں پیش کرنا کتنا دشوار گزار مرحلہ ہے۔لیکن دیپک نے ان افسانچوں میں اپنے تجربات سے بات میں سے بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔چاہے وہ عورتوں پر اتیاچار کی داستاں ہو یا مفلسی اور غربت کی آگ میں جھلسا ہوا انسان، جنگ کی تباہ کاریاں ہوں یا دیس کے اندر آتنک پھیلانے کے واقعات، عشق و محبت کی تب و تاب ہو یا رشوت خور افسروں اور چاپلوس لیڈروں کی داستان، دیپک کا قلم رواں دواں چلتا ہے۔ان کے افسانچے 'نیکی'، 'انصاف'، 'مزدور رکشا'، 'خودکشی'، 'گمشدہ کی تلاش'، 'ایک اور انقلاب'، 'زلزلہ'، 'ثبوت'، 'ہم سفر'، 'انتخاب' وغیرہ اسی قبیل کے افسانچے ہیں جن میں موجودہ دور کے انسان کی بے راہ روی، لاچاری، مجبوری، تلخی، اور بے انصافی آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔

دیپک کے بعض افسانچے مثلاً 'ثبوت'، 'زلزلہ'، 'جرم'، 'صندوقچہ' وغیرہ کا مطالعہ کرنے سے اردو کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے 'سیاہ حاشیے' کی یاد تازہ ہوتی ہے۔دیپک منٹو سے متاثر نظر آتے ہیں۔منٹو کے ساتھ ساتھ انھوں نے جوگندر پال، عظیم راہی، رونق جمال، مقصود الٰہی شیخ وغیرہ کا بھی مطالعہ کیا ہے۔'مٹھی بھر ریت' میں بعض ایسے افسانچے بھی ملتے ہیں جنھوں نے طوالت کا راستہ اختیار کیا ہے۔دیپک کشمیر میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے لیکن ملازمت کے دوران انھیں ملک کے دور دراز مقامات پر قیام کرنے کا موقع ملا۔اور دوسری جانب سائنس کے طالب علم ہونے کی وجہ سے وہ تجربات اور انکشافات کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔اسی لیے ان کے بعض افسانچوں میں کشمیر سے باہر کا ذکر بھی ملتا ہے۔

الغرض 'مٹھی بھر ریت' دیپک بُدکی کا ایک ایسا افسانچوں کا مجموعہ ہے جو اس صنف میں آگے چلنے والوں کی راہیں استوار کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆
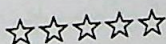
☆مضمون نگار: ڈاکٹر پریمی رومانی، ۱۸۰۶-ڈی، اساوری نانڈیڈ سٹی، سنگھڈھ روڑ، پونے-۴۱۱۰۴۱؛ بحوالہ تصانیف: 'روح کا کرب' (افسانوی مجموعہ) اور 'مٹھی بھر ریت' (افسانچوں کا مجموعہ) مصنف: دیپک بُدکی، ناشر: میزان پبلشرز، بٹہ مالو، سرینگر کشمیر-۱۹۰۰۰۹

وقارادب دیپک بُدکی

--رونق جمال

یوں تو سیکڑوں ادیب اردو زبان وادب کی خدمت کررہے ہیں لیکن منشی پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، جوگندر پال، رتن سنگھ، رام پرکاش کپوراور دیپک بُدکی جیسے اردو زبان وادب کے بے لوث خادم جس طرح اردو زبان وادب کی خدمت کرتے آئے ہیں بے نظیر ہے۔ میں ان خادمانِ اردو کا دل کی عمیق گہرائیوں سے احترام کرتا ہوں۔ ان کے اردو زبان سے پیاراور اردو زبان کی آبیاری کے جذبے کوسلام کرتا ہوں۔ سہ ماہی انتساب کے مدیرڈاکٹرسیفی سرونجی دیپک بُدکی پرخصوصی شمارہ شائع کرنے کی تیاریوں میں مشغول ہیں اور مجھ پر دیپک بُدکی کے فن پر خاکہ رقم کرنے کا حکم صادر کردیا گیا ہے۔

گذشتہ پچیس سالوں سے دیپک بُدکی کی تخلیقات میرے مطالعے میں ہے۔دیپک بُدکی کی تخلیقات کو میں نے 'دربھنگہ ٹائمز' سے لے کر 'انتساب' تک کے صفحات پر کئی مرتبہ پڑھا ہے۔اس کے علاوہ دیپک بُدکی کے افسانوں کے پانچ مجموعے، افسانچوں کا ایک مجموعہ، تنقیدی مضامین وتبصروں کے تین مجموعے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ 'دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری' کے عنوان سے جاوید اقبال شاہ کی تصنیف آئی ہے۔ 'ورق ورق آئینہ' کے عنوان سے دیپک بُدکی کی شخصیت اور فن پر پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری کی عرق ریزی کا شاہکار بھی منظر عام پر آیا ہے۔اس وقت میرے سامنے دیپک بُدکی کے افسانوں کا مجموعہ 'ریزہ ریزہ حیات' اور افسانچوں کا مجموعہ 'مٹھی بھر ریت' ہے۔ میں نے دونوں مجموعوں کا بغور مطالعہ کیا ہے اور سیر یاب ہوا ہوں۔لیکن خاکہ رقم کرنے کے مقصد سے میں نے 'ریزہ ریزہ حیات' کو دوبارہ پڑھ کر ابھی ابھی رکھا ہے۔اس لیے نہیں کہ یہ مجموعہ پہلی بار میری سمجھ میں نہ آیا ہو۔!! دوسری بار تو میں نے یہ تجربہ کرنے کے لیے 'ریزہ ریزہ حیات' کو پڑھا کہ کیا یہ کہانیاں میرے اندر وہی ابال دوبارہ پیدا کرسکتی ہیں جو میں نے پہلی بار محسوس کیا تھا تو معلوم ہوا کہ اگر یہ کہانیاں بار

بار پڑھی جائیں تو ہر بار پہلے سے زیادہ فرحت پہنچائیں گی جو قاری کے ذہن کو منور کردیتی ہیں۔ یہ کہانیاں کوزے میں طوفان نہیں بلکہ گہرے سمندر میں بھرپور اُتھل پتھل کرنے والی کہانیاں ہیں۔

کہانی 'ریزہ ریزہ حیات' میں کشمیر میں جاری دہشت گردی کی داستان نہایت ہی خوبصورتی سے بیان کی گئی ہے۔ ہر واقعہ، ہر جملہ، ہر منظر کشمیر کے بدتر حالات کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ کشمیر میں کرم چند جیسے کتنے انسان ہوں گے جنھوں نے اپنے ماضی کو، اپنے آپ کو بھلا کر حالات سے سمجھوتہ کرلیا ہوگا اور زندگی کو ڈھو رہے ہوں گے۔ بوجھ کو ڈھونا آسان ہے لیکن زندگی کو ڈھونا نہایت دشوار کام ہے۔ 'ریزہ ریزہ حیات' میں دیپک بُدکی نے اس دشوار کام کو نہایت سادہ سلیس زبان میں روانی سے پیش کیا ہے۔

دیپک بُدکی کی کہانیوں میں کشمیر اور کشمیریت بھرپور ہوتی ہے، چاہے پھر وہ منظر کشی میں ہو، چاہے جملوں میں ہو یا کلچر میں، دیپک بُدکی کہیں بھی کشمیر کی خوبصورتی اور کشمیر کے کلچر کو اجاگر کرنے سے چوکتے نہیں ہیں۔ دیپک بُدکی کے یہاں جنس کا استعمال بڑی شائستگی سے ہوتا ہے۔ وہ اپنی بات کہہ کر اس خوبصورتی سے آگے نکل جاتے ہیں کہ قاری کے ذہن پر ذرا بھی بار نہیں ہوتا۔ کہانی 'ڈاکٹر آنٹی'، وفا کی خوشبو' اور 'لذت خلوت' میری اس سوچ کی بھرپور تصدیق کرتے ہیں۔ 'کبھی ہم سے سنا ہوتا' میں میاں بیوی کے تعلقات میں کھٹاس اور کشیدگی کو نہایت عمدہ طریقے سے بیان کرکے ایک شاندار کہانی رقم کی گئی ہے۔ مرد کی بے چارگی کو دیپک بُدکی نے جس انداز میں بیان کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ کہانی 'سرابوں کا سفر' میں سیاسی شخصیتوں کی پریشانیوں، الجھنوں اور کشمکش سے نہایت خوبصورتی سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ 'سرابوں کا سفر' کا یہ ایک جملہ سیاست دانوں کی قلعی کھول کر رکھ دیتا ہے۔

> ''تم سچ کہتے ہو پریشانیوں کا کوئی انت نہیں ہوتا، باہر سے یہ سب سیاست دان کتنے خوش نظر آتے ہیں مگر ان کی ذاتی زندگی میں جھانکو تو حیرت ہوتی ہے۔ کسی کی بیٹی بھاگ گئی ہے اور کسی کی بہو زہر کھالیتی ہے، کسی کا بیٹا نشہ کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے اور کسی کا بھائی غنڈہ گردی کی پاداش میں جیل کی ہوا کھاتا ہے۔''

کہانی 'دس انچ زمین' میں دکھایا گیا ہے کہ پڑوسیوں کے بیچ دراڑ پڑ جائے تو اس کو پاٹنا ناممکن

ہوتا ہے۔ پڑوسی کا رشتہ ہوتا ہی ایسا نازک ہے کہ وہ بے وجہ قائم ہو جاتا ہے اور ذرا سی بات پر ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے اور دشمنی کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ 'ڈاکٹر آنٹی' آج کے حالات، آج کی فیشن پرستی اور آزادیٔ نسواں کی کہانی ہے۔ آج ہر ڈاکٹر اپنی تجوری کو بھرنے کے لیے قانون، انسانیت اور قدرت کو طاق میں رکھ کر روپئے بٹورنے میں لگا ہوا ہے لیکن ڈاکٹر آنٹی ایک سخت اصول پسند اور ایماندار ڈاکٹر ہے۔ 'ڈاکٹر آنٹی' کا یہ ایک جملہ ان کے کردار کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔

> ''سی دس گرل......! ابھی اسکول چھوڑا بھی نہیں ہے کہ پیٹ میں بچہ لیے گھوم
> رہی ہے اور پھر مجھے روپئے کا لالچ دے رہی ہے۔ جیسے روپیوں سے سب کچھ
> خریدا جا سکتا ہے۔''

افسانوں کے بعد بات کرتے ہیں دیپک بُدکی کے افسانچوں کی! آج افسانچہ برصغیر میں توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ ہر اخبار، ہر رسالے میں افسانچے قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں ہر طرح سے کامیاب ہیں تو ہر کوئی افسانچہ نگاری کی کوشش کرتا نظر آ رہا ہے کیونکہ غزل یا نظم کی طرح تھوڑی سی جگہ میں اخبار یا رسالے میں نام شائع ہو جاتا ہے۔ لیکن دیپک بُدکی کا شمار ان افسانچہ نگاروں میں نہیں ہوتا بلکہ دیپک بُدکی کا شمار ان افسانچہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے افسانچے کو ادب میں مقام دلانے میں انتھک محنت کی ہے۔ دیپک بُدکی کا نام جوگندر پال کی امامت والی افسانچہ نگاروں کی پہلی صف میں شمار کیا جاتا ہے۔ دیپک بُدکی نے خالص افسانچے لکھے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ میں نے ان کے سیکڑوں افسانچے رسائل میں پڑھے ہیں اور محظوظ بھی ہوا ہوں۔ فی الحال میرے سامنے ان کے افسانچوں کا مجموعہ 'مٹھی بھر ریت' ہے۔ جس میں ان کے ایک سو چار افسانچے شامل ہیں۔ 'سپاس نامہ' کے عنوان سے کتاب میں مضمون شامل کر کے انھوں نے تمام افسانچوں کی اشاعت کی فہرست شائع کی ہے کہ کب، کہاں اور کس اخبار یا رسالے میں کون سا افسانچہ شائع ہوا ہے۔ 'سپاس نامے' کے ایک اقتباس میں انھوں نے نہایت بے باکی سے یہ سطریں رقم کی ہیں۔

> ''مذکورہ بالا رسائل و اخبارات کے مدیروں کا میں تہہ دل سے سپاس گزار
> ہوں کہ انھوں نے میرے افسانچوں کو اپنے موقر رسالوں اور اخباروں میں

بار پڑھی جائیں تو ہر بار پہلے سے زیادہ فرحت بخشیں گی اور قاری کے ذہن کو منور کر دیتی ہیں۔ یہ کہانیاں کوزے میں طوفان نہیں بلکہ گہرے سمندر میں بھرپور اُتھل پتھل کرنے والی کہانیاں ہیں۔

کہانی 'ریزہ ریزہ حیات' میں کشمیر میں جاری دہشت گردی کی داستان نہایت ہی خوبصورتی سے بیان کی گئی ہے۔ ہر واقعہ، ہر جملہ، ہر منظر کشمیر کے بدتر حالات کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ کشمیر میں کرم چند جیسے کتنے انسان ہوں گے جنھوں نے اپنے ماضی کو، اپنے آپ کو بھلا کر حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہوگا اور زندگی کو ڈھو رہے ہوں گے۔ بوجھ کو ڈھونا آسان ہے لیکن زندگی کو ڈھونا نہایت دشوار کام ہے۔ 'ریزہ ریزہ حیات' میں دیپک بُدکی نے اس دشوار کام کو نہایت سادہ سلیس زبان میں روانی سے پیش کیا ہے۔

دیپک بُدکی کی کہانیوں میں کشمیر اور کشمیریت بھرپور ہوتی ہے، چاہے پھر وہ منظر کشی میں ہو، چاہے جملوں میں ہو یا کلچر میں، دیپک بُدکی کہیں بھی کشمیر کی خوبصورتی اور کشمیر کے کلچر کو اجاگر کرنے سے چوکتے نہیں ہیں۔ دیپک بُدکی کے یہاں جنس کا استعمال بڑی شائستگی سے ہوتا ہے۔ وہ اپنی بات کہہ کر اس خوبصورتی سے آگے نکل جاتے ہیں کہ قاری کے ذہن پر ذرا بھی بار نہیں ہوتا۔ کہانی 'ڈاکٹر آنٹی'، وفا کی خوشبو' اور 'لذت خلوت' میری اس سوچ کی بھرپور تصدیق کرتے ہیں۔ 'کبھی ہم سے سنا ہوتا' میں میاں بیوی کے تعلقات میں کھٹاس اور کشیدگی کو نہایت عمدہ طریقے سے بیان کر کے ایک شاندار کہانی رقم کی گئی ہے۔ مرد کی بے چارگی کو دیپک بُدکی نے جس انداز میں بیان کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ کہانی 'سرابوں کا سفر' میں سیاسی شخصیتوں کی پریشانیوں، الجھنوں اور کشمکش سے نہایت خوبصورتی سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ 'سرابوں کا سفر' کا یہ ایک جملہ سیاست دانوں کی قلعی کھول کر رکھ دیتا ہے۔

> ''تم سچ کہتے ہو پریشانیوں کا کوئی انت نہیں ہوتا، باہر سے یہ سب سیاست دان کتنے خوش نظر آتے ہیں مگر ان کی ذاتی زندگی میں جھانکو تو حیرت ہوتی ہے۔ کسی کی بیٹی بھاگ گئی ہے اور کسی کی بہو زہر کھا لیتی ہے، کسی کا بیٹا نشہ کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے اور کسی کا بھائی غنڈہ گردی کی پاداش میں جیل کی ہوا کھاتا ہے۔''

کہانی 'دس انچ زمین' میں دکھایا گیا ہے کہ پڑوسیوں کے بیچ دراڑ پڑ جائے تو اس کو پاٹنا ناممکن

ہوتا ہے۔ پڑوسی کا رشتہ ہوتا ہی ایسا نازک ہے کہ وہ بے وجہ قائم ہو جاتا ہے اور ذرا سی بات پر ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے اور دشمنی کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ 'ڈاکٹر آنٹی' آج کے حالات، آج کی فیشن پرستی اور آزادئ نسواں کی کہانی ہے۔ آج ہر ڈاکٹر اپنی تجوری کو بھرنے کے لیے قانون، انسانیت اور قدرت کو طاق میں رکھ کر روپئے بٹورنے میں لگا ہوا ہے لیکن ڈاکٹر آنٹی ایک سخت اصول پسند اور ایماندار ڈاکٹر ہے۔ 'ڈاکٹر آنٹی' کا یہ ایک جملہ ان کے کردار کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔

> ''سی دس گرل......! ابھی اسکول چھوڑا بھی نہیں ہے کہ پیٹ میں بچہ لیے گھوم رہی ہے اور پھر مجھے روپئے کا لالچ دے رہی ہے۔ جیسے روپیوں سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔''

افسانوں کے بعد بات کرتے ہیں دیپک بُدکی کے افسانچوں کی! آج افسانچہ برصغیر میں توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ ہر اخبار، ہر رسالے میں افسانچے قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں ہر طرح سے کامیاب ہیں تو ہر کوئی افسانچہ نگاری کی کوشش کرتا نظر آ رہا ہے کیونکہ غزل یا نظم کی طرح تھوڑی سی جگہ میں اخبار یا رسالے میں نام شائع ہو جاتا ہے۔ لیکن دیپک بُدکی کا شمار ان افسانچہ نگاروں میں نہیں ہوتا بلکہ دیپک بُدکی کا شمار ان افسانچہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے افسانچے کو ادب میں مقام دلانے میں انتھک محنت کی ہے۔ دیپک بُدکی کا نام جوگندر پال کی امامت والی افسانچہ نگاروں کی پہلی صف میں شمار کیا جاتا ہے۔ دیپک بُدکی نے خالص افسانچے لکھے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ میں نے ان کے سیکڑوں افسانچے رسائل میں پڑھے ہیں اور محظوظ بھی ہوا ہوں۔ فی الحال میرے سامنے ان کے افسانچوں کا مجموعہ 'مٹھی بھر ریت' ہے جس میں ان کے ایک سو چار افسانچے شامل ہیں۔ 'سپاس نامہ' کے عنوان سے کتاب میں مضمون شامل کر کے انھوں نے تمام افسانچوں کی اشاعت کی فہرست شائع کی ہے کہ کب، کہاں اور کس اخبار یا رسالے میں کون سا افسانچہ شائع ہوا ہے۔ 'سپاس نامے' کے ایک اقتباس میں انھوں نے نہایت بے باکی سے یہ سطریں رقم کی ہیں۔

> ''مذکورہ بالا رسائل و اخبارات کے مدیروں کا میں تہہ دل سے سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے میرے افسانچوں کو اپنے موقر رسالوں اور اخباروں میں

شائع کیا۔ اس کے علاوہ ان ادیبوں اور قارئین کا بھی میں شکریہ ادا کرتا

ہوں جنھوں نے خاکسار کی کوششوں کو سراہا اور نہ صرف اپنی قیمتی آرا سے

نوازا بلکہ چند غلطیوں کی جانب اشارہ بھی کیا۔"

دیپک بُدکی کے افسانچوں میں زندگی کی سچائیاں پوشیدہ ہیں۔ بڑے بڑے مسئلوں کو انھوں نے نہایت فنکارانہ انداز میں افسانچوں میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ دیپک بُدکی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ افسانچے کو خوب سمجھتے ہیں اور افسانچے کی حدوں کو کبھی پار نہیں کرتے۔ کبھی کسی افسانچے کو لطیفہ، فکر پارہ، روایت یا قول نہیں بننے دیتے۔ افسانچے کے دائرے میں رہ کر وہ اپنا مقصد پورا کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'مٹھی بھر ریت' میں شامل ایک افسانچہ 'سوال' پیش کر رہا ہوں۔ جس کے مطالعے کے بعد دیپک بُدکی کی فنی صلاحیتوں کو سمجھنے میں ذرا دیر نہیں لگے گی اور آگے میرے لکھنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔ ملاحظہ فرمائیں:-

افسانچہ

سوال

ٹرین میں سفر کے دوران ایک مسافر دوسرے مسافر کو یہ سمجھا رہا تھا کہ نافرمانی کے سبب آدم کو بہشت سے نکالا گیا۔

اپنی دھرتی سے اکھڑی ہوئی ذیابیطس سے مرجھائی ہوئی ایک کشمیری پنڈتانی، جو اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھی لگ رہی تھی، ان کی باتوں کو غور سے سن رہی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے پتی ناتھ جی سے بار بار ایک ہی سوال پوچھنے لگی۔

مانا آدم سے گناہ سرزد ہوا تھا لیکن ہم کس گناہ کی پاداش میں اپنی جنت سے محروم کر دیے گئے؟"

☆☆☆☆☆

☆ مضمون نگار: رونق جمال؛ کائنات اسٹریٹ، نمبر ۹ نیو آدرش نگر، دُرگ ۴۹۰۰۰۱ (چھتیس گڑھ)؛ موبائل

09981072672

دیپک بُدکی کے چار افسانے

--ایم مُبین

☆کئی گاندھی اور

نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی، سچ اور جھوٹ، عیاری مکاری اور سادہ لوحی بے لوثی، مفاد پرستی اور خدمت خلق ایسے جذبات ہیں جو ازل سے انسان کے ساتھ ساتھ ہیں۔ یہ انسانوں کی فطرت میں بسے ہیں اور جو انسان ان میں سے اچھائیوں کو اپناتا ہے بھلے ہی وہ زندگی میں کامیاب انسان نہ بنتا ہو اور محرومیوں کا شکار رہتا ہو لیکن وہ دنیا کے لوگوں کے ذہنوں پر ایک عکس، ایک اثر ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی اس کی ایک زندہ جاوید مثال ہے۔

گاندھی جی جو ایک تاریخ ہی نہیں ایک فلسفہ بن گئے ہیں۔ آج بھی ان کے اصولوں پر عمل کرنا ہر سچا انسان اپنا دھرم سمجھتا ہے۔ دیپک بُدکی کا یہ افسانہ 'کئی گاندھی اور' اسی پس منظر میں لکھا گیا ایک افسانہ ہے۔ اس افسانے کا کینوس زمانی لحاظ سے بہت وسیع ہے۔ جہد آزادی کے دور سے اس افسانے کا آغاز ہوتا ہے اور آج کے دور پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس مختصر سے افسانے میں دیپک بُدکی نے نہ صرف آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے ماحول، افکار، احساسات اور لوگوں کی طرز فکر کی عکاسی کی ہے بلکہ اس افسانے میں کئی واقعات اور کئی کردار بھی ہیں۔ اس وجہ سے یہ افسانہ ایک بہت وسیع پس منظر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور ان تمام واقعات میں افسانے کے مرکزی کردار ہری رام کے ذریعے کہیں کہیں افسانہ نگار کے اپنے افکار بڑی خوبصورتی سے دراندازی کرتے رہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے افسانہ نگار افسانے کے ذریعے ایک تلخ حقیقت بیان کر رہا ہے اور آج کے سیاسی نظام اور اس کے جبر کے خلاف کہیں کہیں تو احتجاج کر رہا ہے، کہیں کہیں افسانوں میں جملوں کا استعمال کر کے اس نظام پر حملہ بھی کر رہا ہے اور آخر میں ایسا محسوس ہوتا ہے افسانہ نگار نے اس جبر کے نظام کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

یہ ایک ایسے آدمی ہری رام کی کہانی ہے جس کا آبائی پیشہ نائی کا تھا اور اس پیشہ میں وراثت کی طور پر پیشہ اور کام کے منتقل ہونے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے ہری رام نے بھی معمولی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنا آبائی پیشہ اپنالیا ہے۔ لیکن اس پیشہ میں کام کرتے ہوئے ایک ذی ہوش فرد کی طرح وہ اپنے اردگرد ہونے والی سماجی اور سیاسی تبدیلیوں سے نہ صرف واقف ہے بلکہ وہ ان کا اثر بھی لیتا ہے۔ آزادی کی تحریک جاری ہے۔ گاندھی جی نہ صرف ساری ہندستانی قوم بلکہ ظلم و جبر سے نجات حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنے والی تمام قوموں کے لیے مشعل راہ بنے ہوئے تھے۔ ہری رام بھی گاندھی جی کے افکار سے متاثر ہو کر نہ صرف ان کے افکار کو اپناتا ہے بلکہ ان پر عمل کرتے ہوئے اپنے بیٹوں کو اپنا آبائی پیشہ سکھانے کے بجائے اعلیٰ تعلیم دلاتا ہے اور آزادی کی تحریک میں حصہ لیتا ہے۔ اس تحریک میں اس کا ایک بیٹا انگریزوں کی مار کھا کر شہید ہو جاتا ہے۔ دوسرا بیٹا اپنی سرکاری نوکری چھوڑ کر انگریزوں کے خلاف قومی لڑائی میں شامل ہو جاتا ہے لیکن ہری رام کو اس بات کا دکھ ہے کہ اس نے گاندھیائی اصولوں کو اپنانے کے بجائے تشدّد کا راستہ اختیار کیا ہے۔ جب کہ ہری رام کی نظر میں عدم تشدد ایک موثر ذریعہ احتجاج ہے۔ تشدد کی راہ پر ایک دن وہ گھر سے چلا جاتا ہے اور پھر اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں مل پاتی ہے۔ اُڑتی اُڑتی خبریں آتی رہتی ہیں کہ وہ انگریزوں کے خلاف پر تشدد تحریک چلانے والے تشدد پسندوں کے ساتھ ساتھ ہے۔ ہری رام کو اس بات کی خوشی ہے کہ اس کا بیٹا آزادی کی لڑائی لڑ رہا ہے لیکن وہ اس بات پر ناخوش ہے کہ اس نے گاندھی جی کے عدم تشدد کے راستے کے بجائے تشدد کا راستہ اپنایا ہے۔

آزادی آتی ہے۔ آزادی ملنے کے بعد ایک نیا نظام حکومت ملک میں اپنایا جاتا ہے۔ لیکن اس نئے نظام حکومت میں سب سے زیادہ گاندھیائی اصولوں کو پامال کیا جاتا ہے۔ جنھوں نے قوم کے لیے قربانیاں دیں، جو آزادی کی لڑائی میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ انھوں نے اس لڑائی میں اپنا سب کچھ گنوایا، آج ان کی حیثیت معمولی انسانوں سی رہ گئی ہے کیونکہ وہ مخلص تھے۔ انھوں نے یہ ساری قربانیاں بے لوث جذبے کے تحت دی تھیں۔ ان کے پیچھے ان کا اپنا کوئی ذاتی مفاد نہیں تھا۔ وہ آج بھی اپنے اسی جذبے کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ لیکن عیار، مکار، فریبی، بددیانت، بدطینت لوگ آگے آرہے ہیں اور وہ اپنی خیالی قربانیوں کی جھوٹی داستانیں دہرا کر آزادی کی دین میں زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کر

رہے ہیں۔اور اپنے مفاد کے لیے ہر اصول اور روایت کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔ ہری رام کیونکہ ان لوگوں میں شامل نہیں ہے اس لیے وہ چپ چاپ یہ سب دیکھتا ہے، وہ ان میں شامل نہیں ہوتا ہے بلکہ اپنے اصولوں پر ڈٹا رہتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسے تو کچھ ہاتھ نہیں آتا۔اس کا ساتھ دینے والے دوسرے لوگ بھی اس کے خیمے سے نکل کر ان نئے ابن الوقتوں کے خیموں میں پہنچ جاتے ہیں۔لیکن ہری رام پھر بھی مطمئن ہے، وہ اپنے اصولوں کا دامن نہیں چھوڑتا ہے نہ اپنی قربانیوں کا صلہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے وہی خدمت خلق کے کاموں میں بے لوثی سے لگا رہتا ہے۔لیکن ایک دن اس پر اس وقت قیامت ٹوٹ پڑتی ہے جب مقامی لیڈر اس کی دکان پر بلڈوزر چلا کر شاپنگ مال بنانے کا قدم اٹھاتا ہے۔وہ اس کے خلاف بھوک ہڑتال کرتا ہے لیکن اس کی اس بھوک ہڑتال میں اس سیاسی لیڈر کی قوت، اثر اور رسوخ سے لوگ ہری رام کا ساتھ نہیں دیتے اور کترا کر نکل جاتے ہیں اور اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب اس سیاسی لیڈر لکشمن سنگھ کے غنڈے اسے مارتے ہیں اور ادھ مرا کر کے مندر کی سیڑھیوں پر ڈال دیتے ہیں تب بھی اس غنڈہ گردی کے خلاف کوئی اس کا ساتھ نہیں دیتا ہے۔ بلکہ پولیس خود کوئی قدم اٹھانے کے لیے اس کا ساتھ نہیں دیتی۔

اس وقت ہری روم ٹوٹ جاتا ہے اور اسے پہلی بار محسوس ہوتا ہے کہ اس نے جو ملک کے لیے قربانیاں دیں اس کے صلہ میں آج کوئی بھی اس کی مدد کرنے کو تیار نہیں ہے۔ یہ اسے ایک عجیب صلہ ملا ہے اور وہ اپنی بیمار کمزور بیوی کے ساتھ شہر چھوڑ کر تیرتھ یاترا پر نکل جاتا ہے۔اس طرح سے لکشمن سنگھ اور اس کے تیار کیے نظام کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ ہری رام کی یہ خود سپردگی اس کی حد سے زیادہ بے بسی کو ظاہر نہیں کرتی ہے بلکہ اسے ایک کمزور کردار بنا دیتی ہے اور افسانے کے اختتام کو کمزور کر دیتی ہے۔کیا اچھا ہوتا دیپک بُدکی اس افسانے کا اختتام ہری رام کے فرار کے بجائے کسی جارحانہ قدم کے ذریعے اس نظام پر ایک وار کی صورت میں کرتے تو افسانہ روایتی انداز کا نہ بن کر اپنے اندر ایک نیا پن پیدا کر دیتا۔

☆زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی

آج دنیا کے سامنے دہشت گردی، اقتصادی بحران، کساد بازاری کے ساتھ ساتھ جس ایک سب سے بڑے مسئلے کا سامنا ہے وہ دنیا کے ہر ملک میں موجود ہے......وہ مسئلہ ہے تارکین وطن کا....!

تارکینِ وطن سے مراد رفیوجی، شرنارتھی اور مہاجر ہیں۔ یہ کئی معنوں میں ہیں۔ ایک ملک سے دوسرے ملک روزی روٹی کی تلاش میں جانے والے لوگ تو تارکین وطن کہلاتے ہی ہیں لیکن سب سے بڑی شرم ناک بات یہ ہے کہ ایک ہی ملک میں ایک علاقے سے دوسرے علاقہ میں ہجرت کر کے جانے والے لوگوں کا شمار بھی انھی رفیوجیوں، شرنارتھیوں اور مہاجروں میں ہونے لگا ہے اور وہ لوگ بھی اپنے مسائل سے دوچار ہیں جو عام طور پر دیگر ممالک میں بسنے والے تارکین وطن کے سامنے درپیش ہیں۔ آج اپنے ہی ملک میں دوسرے علاقوں سے روزی روٹی کی تلاش میں کسی مجبوری کے تحت آئے لوگوں کو رفیوجی قرار دیا جارہا ہے اور ان کے ساتھ شرنارتھیوں کا سا سلوک کیا جارہا ہے۔ دیپک بُدکی نے یہ افسانہ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' اسی مسئلے کے پس منظر میں لکھا ہے۔

دیپک بُدکی کا تعلق کشمیر سے ہے اور کشمیر کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ آج اس مسئلہ سے نبرد آزما ہے۔ وادیٔ کشمیر کی آبادی کا ایک اہم جزو سمجھے جانے والے کشمیری پنڈتوں کی ایک بڑی تعداد دہشت گردی کے ماحول سے گھبرا کر یا دہشت گردوں کے خوف سے یا دہشت گردوں کی کارروائیوں سے کشمیر کی وادی کو چھوڑ کر جموں یا ملک کے دوسرے حصوں میں منتقل ہوگئے ہیں اور وہ اپنے ہی ملک میں رفیوجیوں کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ کسی مجبوری کے تحت یا روزی روٹی کی تلاش میں ہی اپنے وطن کو ترک کر کے کسی دوسرے مقام پر بود و باش اختیار کرتے ہوئے وہاں ایک نئی زندگی کی شروعات کرنا اور اس شروعات کے لیے جد و جہد کرنا ایک کربناک اور مسائل بھرا عمل ہے۔ ایسے لوگوں کو قدم قدم پر مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اپنے وجود کی بقا کے لیے ایک جنگ کرنی پڑتی ہے۔ اپنی شناخت اور اہمیت جتانے کے لیے کڑی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' ایسے ہی ایک کشمیری پنڈت کی کہانی ہے جو اپنے خاندان کے ساتھ اپنا گھر بار چھوڑنے کے لیے مجبور ہوا تھا اور اب ایک دوسرے علاقے میں ایک معمولی خیمے میں اپنے خاندان کے ساتھ رہ رہا ہے۔ اس کے پاس اپنا اور اپنے خاندان کے گزر بسر کرنے کا ذریعہ نہیں ہے۔ اس کے لیے سب کچھ سرکار کی طرف سے ملنے والا وہ ماہانہ وظیفہ ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے اسے میلوں پیدل سفر کرنا پڑتا ہے اور سینکڑوں لال فیتہ شاہوں کی جھڑکیاں سننے کے بعد جو اسے ملتا ہے اس میں مشکل سے اسے دو وقت کی روٹی مل پاتی ہے تو بھلا اس کی دیگر ضروریات زندگی کہاں سے

پوری ہوں گی۔ کہاں تو وہ شاہانہ ٹھاٹ سے زندگی گزارتا تھا اور کہاں آج وہ محتاجوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

وہ سڑک پار کرنے کے لیے ایک سڑک کے زیبرا کراسنگ پر کھڑا ہے جس پر دونوں طرف سے سواریاں تیزی سے آجا رہی ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے نہ توان کی رفتار کم ہو رہی ہے اور نہ وہ رک رہی ہیں کہ وہ اس زیبرا کراسنگ کو کراس کر سکے۔ اس بوڑھے کو خوف ہے کہ اگر ایسی حالت میں اس نے زیبرا کراسنگ کراس کرنے کی کوشش کی تو وہ کسی تیز رفتار سواری سے ٹکرا جائے گا اور اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا جس طرح گذشتہ دنوں روڈ کراس کرتے ہوئے ایک ٹرک نے اس کے جواں سال بیٹے کو کچل دیا تھا اور اس سے اس کے بیٹے کی موت واقع ہوگئی تھی۔ اس کے دل میں بھی یہی خوف ہے کہ اگر یہ سواریاں نہ رکیں اور اس نے زیبرا کراسنگ پار کرنے کی کوشش کی تو وہ اسی طرح حادثے کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں پہونچ سکتا ہے جس طرح اس کا جوان بیٹا موت کے آغوش میں پہونچ گیا تھا۔ دراصل دیپک بُدکی نے اس افسانے میں 'زیبرا کراسنگ' کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس افسانے کو جب قاری پڑھنا شروع کرتا ہے تو اسے یہ زیبرا کراسنگ ایک معمولی سا مقام محسوس ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وہ افسانہ پڑھتا ہے اور اس کے سامنے اس کشمیری پنڈت کی زندگی واضح ہوتی ہے وہ 'زیبرا کراسنگ' ایک علامت بن کر ابھرتی ہے اور اپنے ساتھ مفہوموں کا ایک سیلاب لے کر آتی ہے۔ افسانہ مکمل کرنے کے بعد قاری کے ذہن میں 'زیبرا کراسنگ' کی علامت اور اس سے وابستہ تمام باتیں اور واقعات مکمل طور پر کھل جاتے ہیں۔

وہ پنڈت اس زیبرا کراسنگ کو پار کرنا چاہتا ہے لیکن وہ چاہ کر بھی پار نہیں کر پا رہا ہے۔ اس کے دل میں ایک خوف ہے اگر اس نے اس کراسنگ کو پار کرنے کی کوشش کی تو وہ کسی حادثے کا شکار ہو جائے گا اور اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ اسی خوف سے وہ گھنٹوں اس کراسنگ کو پار نہیں کر پاتا ہے اور آخر میں جب خیریت و عافیت سے کسی طرح کراسنگ کو پار کر کے سڑک کی دوسری طرف جانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ 'زیبرا کراسنگ' اس کے لیے اور اس جیسے لاکھوں رفیوجیوں کے لیے امید و بیم، دہشت، خوف، استحصال، جبر، حسرت و یاس، جذبات و احساسات کی ایک

علامت ہے۔ وہ اپنے ماضی میں اسی کراسنگ کو کراس کر کے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنا جو سب کچھ وادی میں چھوڑ دیا ہے۔ یہ کراسنگ انھیں ایک امید دلا رہی ہے کہ وہ اس کراسنگ کو پار کرنے کے بعد اسے دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں، وہاں ایک بار پھر وہ عزت سے جی سکتے ہیں۔ لیکن زیبرا کراسنگ پر گاڑیوں کے رک جانے یا دھیمے ہونے کا اصول ہونے کے باوجود گاڑیوں کا نہ رکنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اصولوں کی آج کوئی اہمیت نہیں ہے، نہ کوئی ان کی پرواہ کرتا ہے نہ ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان اصولوں کو توڑا جا رہا ہے پامال کیا جا رہا ہے اس بات کا کسی کو احساس نہیں ہے کہ اگر وہ زیبرا کراسنگ پر رک جائیں یا دھیمے ہو جائیں تو وہ سینکڑوں لوگ اس کراسنگ کو پار کر سکتے ہیں جو ان کی سواریوں کے رکنے یا دھیمے ہونے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ اس ایک علامت کے ذریعے دیپک بُدکی نے کشمیر کے ان پنڈتوں کے سب سے سنگین مسئلے کو بڑی خوبصورتی سے پیش کر دیا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے گھروں کو جانا چاہتے ہیں لیکن ان کو وہاں واپس لے جانے کے لیے کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی ہے۔ جو بھی اس کو کراس کرنے کی کوشش کرے گا ممکن ہے مارا جائے (پنڈت کے بیٹے کی موت کا واقعہ)۔ اس لیے کراسنگ کراس کرنے میں خطرہ ہے اور اگر کوئی اسے کراس کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو اسے اپنے علاقہ میں اس کی زندگی کے تحفظ کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ آخر میں کراسنگ پار کرنے کے بعد بھی اس رفیوجی کشمیری پنڈت کی موت یہ واضح کرتی ہے۔

اس افسانے کی یہ خوبی ہے کہ دیپک بُدکی نے اس افسانے میں نہ کسی پر الزام لگایا ہے، نہ متعلقہ واقعات کو پیش کر کے نفرت کی خلیج کو بڑھانے کی کوشش کی ہے نہ اس کے حل کرنے پر کسی کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ بلکہ بڑی خوبصورتی سے قارئین کے سامنے ان رفیوجیوں کا درد پیش کر دیا ہے۔

☆شیر اور بکرا

سیاست کسی خاص نظریہ کی پیروی، کسی فرد سے جذباتی وابستگی، کسی خاص طبقے سے تعلق رکھنے پر دل میں احساس برتری کا جذبہ اور دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنے کی سوچیں کبھی کبھی کتنی سنگین صورت حال پیدا کر دیتی ہے اور کس طرح وہ انسانوں کو ان کے دلوں کے، ان کے درمیان کے ازلی رشتوں کو بانٹنے کی کوشش کرتی ہے، دیپک بُدکی نے اپنے افسانے 'شیر اور بکرا' میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

عنوان کے لحاظ سے دیپک بُدکی کا یہ افسانہ قارئین کو کسی بچوں کی کہانی کا تصور دیتا ہے۔ یا پھر قارئین 'شیر اور بکرا' عنوان کے تحت کسی علامتی افسانے کی توقع رکھتے ہوئے اس افسانے کو پڑھتے ہیں کہ ممکن ہے دیپک بُدکی نے پنچ تنتر یا اسپ کی کہانیوں میں سے کسی کہانی سے متاثر ہو کر شیر اور بکرے کو علامت بنا کر کوئی علامتی افسانہ لکھا ہوگا۔ لیکن یہ افسانہ واضح اور صاف ہے۔ اس افسانے میں نہ تو کوئی علامت پیش کی گئی ہے نہ کسی علامت کا سہارا لیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس افسانے میں پہلی بار ایک ایسا موضوع دیپک بُدکی نے پیش کیا ہے جو اردو افسانے کے لیے بالکل نیا ہے اور افسانہ نگار نے اس افسانے کے کینوس کو کافی وسیع پیمانے پر برتا ہے اور اس افسانے میں پہلی بار ایسا پس منظر اور واقعات پیش کیے ہیں جس سے اردو زبان کے قارئین ابھی تک نابلد تھے۔ انھوں نے اس افسانے کے ذریعے پہلی بار قارئین پر یہ واضح کیا ہے کہ کشمیر میں دہشت گردی کا مسئلہ تو ہے، دہشت گردی کا شکار لاکھوں لوگ ہوئے ہیں اور لاکھوں لوگ اس سے متاثر ہو کر خوف بھری زندگی جی رہے ہیں لیکن کشمیر میں سیاسی نظریات، رجحانات، پیروی اور افکار نے دو ایسے گروہوں کو جنم دیا ہے جو 'شیر' اور 'بکرا' کہلاتے ہیں، جو ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ان کے آئے دن کے اس ٹکراؤ کی وجہ سے کشمیر کے عام انسانوں کی زندگی تو متاثر ہوتی ہے لیکن سب سے زیادہ وہ غریب غربا ہوتے ہیں جن کا تعلق ان دو گروہوں سے ہے۔

یہ دونوں گروپ شیخ محمد عبداللہ اور مولوی یوسف شاہ کے سیاسی حامیوں کے ہیں جو شیر اور بکرا کہلاتے ہیں اور آئے دن ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں ، ان کے درمیان شادی بیاہ کے رشتوں کا قائم ہونا تو دور، یہ لوگ ایک دوسرے کا وجود بھی اپنے اپنے علاقوں میں برداشت نہیں کرتے۔ اور آئے دن کسی نہ کسی وجہ سے ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔

اس افسانے کے مرکزی کردار اسمال (اسماعیل) اور فاطی (فاطمہ) ہیں جو میاں بیوی ہیں اور سب سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ان دونوں کا تعلق 'شیر' اور 'بکرا' گروپوں سے ہے۔ ان واقعات کے پس منظر میں دیپک بُدکی نے ایک بڑی ہی خوبصورت رومانی کہانی بُنی ہے۔ جس میں رومان تو کم ہے زندگی کی حقیقتیں اور مسائل زیادہ ہیں۔ اس افسانے میں کشمیر کے نچلے درجہ کے لوگوں کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی

علامت ہے۔ وہ اپنے ماضی میں اسی کراسنگ کو کراس کر کے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنا جو سب کچھ وادی میں چھوڑ دیا ہے۔ یہ کراسنگ انھیں ایک امید دلا رہی ہے کہ وہ اس کراسنگ کو پار کرنے کے بعد اسے دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں، وہاں ایک بار پھر وہ عزت سے جی سکتے ہیں۔ لیکن زیبرا کراسنگ پر گاڑیوں کے رک جانے یا دھیمے ہونے کا اصول ہونے کے باوجود گاڑیوں کا نہ رکنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اصولوں کی آج کوئی اہمیت نہیں ہے، نہ کوئی ان کی پرواہ کرتا ہے نہ ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان اصولوں کو توڑا جا رہا ہے پامال کیا جا رہا ہے اس بات کا کسی کو احساس نہیں ہے کہ اگر وہ زیبرا کراسنگ پر رک جائیں یا دھیمے ہو جائیں تو وہ سینکڑوں لوگ اس کراسنگ کو پار کر سکتے ہیں جو ان کی سواریوں کے رکنے یا دھیمے ہونے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ اس ایک علامت کے ذریعے دیپک بُدکی نے کشمیر کے ان پنڈتوں کے سب سے سنگین مسئلے کو بڑی خوبصورتی سے پیش کر دیا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے گھروں کو جانا چاہتے ہیں لیکن ان کو وہاں واپس لے جانے کے لیے کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی ہے۔ جو بھی اس کو کراس کرنے کی کوشش کرے گا ممکن ہے مارا جائے (پنڈت کے بیٹے کی موت کا واقعہ)۔ اس لیے کراسنگ کراس کرنے میں خطرہ ہے اور اگر کوئی اسے کراس کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو اسے اپنے علاقہ میں اس کی زندگی کے تحفظ کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ آخر میں کراسنگ پار کرنے کے بعد بھی اس رفیوجی کشمیری پنڈت کی موت یہ واضح کرتی ہے۔

اس افسانے کی یہ خوبی ہے کہ دیپک بُدکی نے اس افسانے میں نہ کسی پر الزام لگایا ہے، نہ متعلقہ واقعات کو پیش کر کے نفرت کی خلیج کو بڑھانے کی کوشش کی ہے نہ اس کے حل کرنے پر کسی کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ بلکہ بڑی خوبصورتی سے قارئین کے سامنے ان رفیوجیوں کا درد پیش کر دیا ہے۔

☆شیر اور بکرا

سیاست کسی خاص نظریہ کی پیروی، کسی فرد سے جذباتی وابستگی، کسی خاص طبقے سے تعلق رکھنے پر دل میں احساس برتری کا جذبہ اور دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنے کی سوچیں کبھی کبھی کتنی سنگین صورت حال پیدا کر دیتی ہے اور کس طرح وہ انسانوں کو ان کے دلوں کے، ان کے درمیان کے ازلی رشتوں کو بانٹنے کی کوشش کرتی ہے، دیپک بُدکی نے اپنے افسانے 'شیر اور بکرا' میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

عنوان کے لحاظ سے دیپک بُدکی کا یہ افسانہ قارئین کو کسی بچوں کی کہانی کا تصور دیتا ہے۔ یا پھر

قارئین 'شیر اور بکرا' عنوان کے تحت کسی علامتی افسانے کی توقع رکھتے ہوئے اس افسانے کو پڑھتے ہیں کہ
ممکن ہے دیپک بُدکی نے پنچ تنتر یا اسپ کی کہانیوں میں سے کسی کہانی سے متاثر ہوکر شیر اور بکرے کو
علامت بنا کر کوئی علامتی افسانہ لکھا ہوگا۔ لیکن یہ افسانہ واضح اور صاف ہے۔ اس افسانے میں نہ تو کوئی
علامت پیش کی گئی ہے نہ کسی علامت کا سہارا لیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس افسانے میں پہلی بار ایک
ایسا موضوع دیپک بُدکی نے پیش کیا ہے جو اردو افسانے کے لیے بالکل نیا ہے اور افسانہ نگار نے اس
افسانے کے کینوس کو کافی وسیع پیمانے پر برتا ہے اور اس افسانے میں پہلی بار ایسا پس منظر اور واقعات پیش
کیے ہیں جس سے اردو زبان کے قارئین ابھی تک نابلد تھے۔ انھوں نے اس افسانے کے ذریعے پہلی بار
قارئین پر یہ واضح کیا ہے کہ کشمیر میں دہشت گردی کا مسئلہ تو ہے، دہشت گردی کا شکار لاکھوں لوگ ہوئے
ہیں اور لاکھوں لوگ اس سے متاثر ہوکر خوف بھری زندگی جی رہے ہیں لیکن کشمیر میں سیاسی نظریات،
رجحانات، پیروی اور افکار نے دو ایسے گروہوں کو جنم دیا ہے جو 'شیر' اور 'بکرا' کہلاتے ہیں، جو ایک دوسرے
کے جانی دشمن ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ان کے آئے دن کے اس ٹکراؤ کی
وجہ سے کشمیر کے عام انسانوں کی زندگی تو متاثر ہوتی ہے لیکن سب سے زیادہ وہ غریب غربا ہوتے ہیں جن
کا تعلق ان دو گروہوں سے ہے۔

یہ دونوں گروپ شیخ محمد عبداللہ اور مولوی یوسف شاہ کے سیاسی حامیوں کے ہیں جو شیر اور بکرا
کہلاتے ہیں اور آئے دن ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں
، ان کے درمیان شادی بیاہ کے رشتوں کا قائم ہونا تو دور، یہ لوگ ایک دوسرے کا وجود بھی اپنے اپنے
علاقوں میں برداشت نہیں کرتے۔ اور آئے دن کسی نہ کسی وجہ سے ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔
اس افسانے کے مرکزی کردار اسمال (اسماعیل) اور فاطی (فاطمہ) ہیں جو میاں بیوی ہیں اور سب سے
زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ان دونوں کا تعلق 'شیر' اور 'بکرا' گروپوں سے ہے۔ ان واقعات کے پس
منظر میں دیپک بُدکی نے ایک بڑی ہی خوبصورت رومانی کہانی بُنی ہے۔ جس میں رومان تو کم ہے زندگی
کی حقیقتیں اور مسائل زیادہ ہیں۔ اس افسانے میں کشمیر کے نچلے درجہ کے لوگوں کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی

ہے اور اسے بڑی خوبصورت، دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

افسانے کے دونوں کردار 'اسمال' اور 'فاطی' کے کرداروں کو دیپک بُدکی نے بہت اچھی طرح عکاسی کی ہے۔ اسمال اور فاطی کی ملاقات دونوں گروپوں کے ٹکراؤ کے دوران ہوئی تھی جب فاطی، جس کا تعلق 'بکرا' گروپ سے تھا، کے گھر والوں اور اس کے گھر کو ایک تصادم میں 'شیر' گروپ کے لوگوں نے جلا دیا تھا۔ اس آگ میں فاطی کا سارا خاندان جل مرا تھا مگر کسی طرح اسمال نے فاطی کو اس بات کی پرواہ کیے بنا آگ سے بچا لیا تھا کہ اس کا تعلق دشمن فرقے سے ہے۔ اور بعد میں اپنے خاندان والوں کی مخالفت کے باوجود اس سے شادی بھی کر لی تھی۔ اور فاطی کے لیے اس نے اپنے گھر والوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ دونوں خوش خوش ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ان کی چار بیٹیاں تھیں۔ ان کی زندگی اچھی طرح گزر رہی تھی، ان کی زندگی میں کوئی تناؤ یا ٹکراؤ نہیں تھا۔ لیکن جب بھی شہر میں شیر اور بکرا گروپ آپس میں ٹکراتے پورے شہر میں ایک تناؤ پھیل جاتا اور سارے شہر کی روزمرہ کی زندگی متاثر ہوتی۔ شہر میں کرفیو لگ جاتا اور کئی دنوں تک کرفیو جاری رہتا۔ کرفیو کے دوران اسمال جو تانگہ چلاتا تھا جس میں ایک گھوڑا 'نواب' جتا ہوتا ہے، تانگہ چلانے کے لیے شہر نہیں جا پاتا تھا۔ اس کی روزی بند ہو جاتی تھی۔ اس وجہ سے اس کے خاندان والوں پر بھوکوں مرنے کی نوبت آ جاتی تھی۔ فاطی کو بچوں کو بھوک سے مرتا دیکھا نہیں جاتا تھا، وہ اسمال کو کوئی کام کرنے یا تانگہ لے کر شہر جانے کے لیے کہتی تو اسمال اس کے مخالف گروپ والوں کو اس کی روزی چھیننے کا موردالزام قرار دے کر انہیں اور فاطی کو ان سے تعلقات رکھنے کی وجہ سے گالیاں دیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس بات پر فاطی کو جانوروں کی طرح مارتا بھی تھا اور گھر سے نکال دیتا تھا۔ مجبوراً فاطی اپنے بچوں کو لے کر اپنی بہن کے گھر چلی جاتی تھی۔ جب شہر میں حالات معمول پر آ جاتے اور اسمال کا تانگہ چالو ہو جاتا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا اور وہ جا کر فاطی کو منت سماجت کر کے منا کر واپس گھر لے آتا تھا۔ اسی دوران ایک دن پتہ چلتا ہے کہ فاطی کے دونوں گردے بے کار ہو گئے ہیں۔ اگر فوراً ایک گردہ نہیں لگایا گیا تو فاطی کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ فاطی کی زندگی بچانے کے لیے اسمال اسے اپنا ایک گردہ دینے کو تیار ہو جاتا ہے لیکن اس کے لیے پچیس ہزار کا خرچ ہے جو اس کے پاس نہیں ہے۔ آخر وہ اپنی بیوی کی جان بچانے کے لیے اپنی جان سے زیادہ پیارے گھوڑے 'نواب' کو پچیس ہزار روپے میں فروخت کر کے فاطی کا

آپریشن کرا کر اس کے جسم میں اپنا گردہ لگوا کر اس کی جان بچا کر اپنی محبت کا ثبوت دیتا ہے۔

بظاہر یہ ایک رومانی دلچسپ کہانی ہے لیکن اس کے پس منظر میں دیپک بُدکی نے جس سیاسی ٹکراؤ کی عکاسی کرتے ہوئے اس ٹکراؤ پر جو طنز کرتے ہوئے اس سے پیدا ہونے والی جس صورت حال کا موثر طریقے سے عکاسی کی ہے یہ افسانے کا سب سے خوبصورت پہلو ہے۔ کشمیر کے پس منظر میں کرشن چندر نے تو کئی رومانی افسانے لکھے ہیں لیکن کشمیر کے سیاسی پس منظر میں اتنا خوبصورت افسانہ شاید ہی کسی نے لکھا ہو۔ جس میں کشمیر کے نچلے طبقہ کی اتنی موثر طریقے سے عکاسی کی گئی ہو۔ اسمال اور فاطی کی کردار نگاری بھی اس افسانے کا ایک خوبصورت پہلو ہے۔

☆دو گز زمین

دنیا میں بڑھ رہی علاقہ پرستی، مذہبی تنگ نظری، مذہبی عصبیت، مذہب کے نام پر غنڈہ گردی، ظلم و جبر کسی سے چھپا نہیں ہے۔ ہر ذی فہم حساس شخص اس کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ ناپسند بھی کرتا ہے۔ اسے علم ہے اس کے نام پر ہمیشہ معصوم بے گناہوں کو نشانہ بنایا گیا ہے اور بنایا جاتا ہے۔ دیپک بُدکی نے بھی اپنے اس افسانے 'دو گز زمین' میں انھی باتوں کے پس منظر کو ابھارا ہے اور ان باتوں کو بین السطور بیان کر کے آخر میں قارئین کے ذہن میں کئی سلگتے سوالات چھوڑ دیئے ہیں۔

یہ افسانہ ملک کے شمال مشرقی علاقہ خاص کر آسام کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ شروع سے آسام ایسے مسائل میں گھرا رہا ہے جو صرف آسام کی حد تک محدود ہوتے ہیں۔ ملک کے دوسرے حصوں میں ان کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا ہے۔ لیکن وہ باتیں، واقعات اگر آسام تک محدود رہی بھی ہیں تو ان کے اثرات آسام کے لوگوں کی زندگیوں پر پڑے ہیں۔ آسام کی بوڈو تحریک سے جو بعد میں دہشت گردی کا روپ اختیار کر گئی یا بنگلہ دیشیوں کے نام پر 'آسو' جیسی پارٹیوں کی تحریک ہو، ہندو مسلمان عیسائیوں کا آپسی ٹکراؤ ہو یا پھر علاقائی غیر علاقائی کے نام پر پھیلی منافرت۔ اس افسانے کا راوی ایک کیپٹن اکھلیش نامی ایک شخص ہے جو فوج میں کیپٹن تو رہ چکا ہے لیکن اب پوسٹل ڈپارٹمنٹ سے وابستہ ہے۔

یہ کردار خود افسانہ نگار سے کافی ملتا جلتا ہے کیونکہ دونوں کرداروں میں خاصی مماثلت ہے۔ دیپک بُدکی بھی فوج میں رہ چکے ہیں اور فوج میں خدمات دینے کے بعد انھوں نے انڈین پوسٹل سروس

واپس جوائن کی اور اس میں ترقی کرتے ہوئے اس سروس کے اعلیٰ عہدے پوسٹ ماسٹر جنرل کے پوسٹ پر فائز ہوئے۔ اس سروس کے دوران انھیں پورے ملک کو دیکھنے کا موقع ملا۔ کیونکہ یہ ایسی سروس تھی جس کی وجہ سے ان کے تبادلے ملک کے ہر حصے میں ہوتے رہتے تھے۔ اس طرح انھیں نہ صرف پورے ملک کو دیکھنے کا موقع ملا بلکہ ملک میں بسنے والے طرح طرح کے لوگوں اور ان کی تہذیبوں کو بھی جاننے کا موقع ملا۔ انھوں نے ملک کے مختلف حصوں اور علاقوں کی زندگی یا طرز معاشرت کو کافی قریب سے دیکھا بلکہ ان کے مسائل کو بھی انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس لیے ممکن ہے اس افسانے کے خیالی راوی کیپٹن اکھلیش خود دیپک بُدکی ہو اور انھیں آسام میں اپنی سروس کے دوران اس افسانے کے مرکزی کردار 'تارا دیوی گرنگ' سے ملنے کا اتفاق ہوا ہو۔ انھوں نے اس کی زندگی کو کافی قریب سے دیکھا ہو۔ اس کے مسائل اور درد کو جانا ہو۔ اور ان تمام باتوں سے متاثر ہو کر انھوں نے اس افسانے کی مرکزی کردار 'تارا' کی زندگی کو اس افسانے 'دوگز زمین' میں ڈھال دیا ہو۔ یہ افسانہ 'تارا دیوی' کی زندگی اور اس کی زندگی کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔

راوی سے اس کی ملاقات پوسٹل سروس کے ٹینس کے مقابلوں میں ہوتی ہے اور وہ راوی کو اس مقابلے میں شریک ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ اس طرح ان دونوں کو ایک دوسرے کو نہ صرف جاننے کا موقع ملتا ہے بلکہ ایک دوسرے کے قریب آنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ تارا ایک شادی شدہ عورت ہے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ اس کا شوہر ٹرانسپورٹ کا بزنس کرتا تھا اور وہ خود اکاونٹنٹ جنرل کے آفس میں کلرک تھی۔ تارا نسلاً نیپالی تھی۔ ان کے نام بھی ہندو تھے اور دیگر باتیں بھی ہندوؤں سے ملتی جلتی تھیں۔

لیکن دراصل وہ عیسائی تھی۔ تارا کی تعلیم عیسائی ننوں کے درمیان ہوئی تھی۔ اس لیے انھوں نے تارا کو بھی ننوں کی زندگی کی نہ صرف باتیں بتائی تھیں بلکہ اس کے دماغ میں یہ باتیں بٹھا دی تھیں کہ کس طرح ننوں کی طرح رہا جائے، جنس سے دور رہا جائے اور اپنے جذبات پر قابو رکھا جائے۔ راوی کو اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ تارا شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی ننوں کے تمام اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے راہبانہ زندگی گزار رہی ہے۔ جب کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کے دو بچے ہیں لیکن وہ راہبانہ اصولوں کی پابندی کرتی ہے جس کی وجہ سے اس کی زندگی بے رونق ہے۔ پہلی بار افسانہ نگار نے اس موضوع پر نہ

صرف کھل کر بحث کی ہے بلکہ کئی ایسے گوشوں کو بھی آشکار کیا ہے جو عام آدمی یا قارئین سے اب تک نہاں ہیں۔راوی تارا کو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے راہبہ نہیں۔اس لیے وہ راہبانہ زندگی گزارنے کے بجائے شادی شدہ زندگی گزارے۔اور اس کے ان مشوروں سے تارا کی زندگی میں سچ مچ انقلابی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور اس کی بے رونق زندگی میں بہار آجاتی ہے۔

پھر عرصہ کے بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ تارا نے شیلانگ (میگھالیہ) چھوڑ دیا ہے اور وہ اب گوہاٹی (آسام) میں رہنے لگی ہے۔جب کہ اسے شیلانگ سے بہت پیار تھا۔بھلے ہی وہ نیپالی نسل سے تعلق رکھتی ہو لیکن اس کی پیدائش شیلانگ میں ہوئی تھی اور اسے اپنے پیارے شہر شیلانگ کو چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔روبرو ملاقات پر تارا راوی کو شیلانگ سے گوہاٹی منتقل ہونے کی وجہ بتاتی ہے کہ گزشتہ پندرہ سالوں میں کھاسیوں اور نیپالیوں کے درمیان نہ صرف کشیدگی بڑھی بلکہ ان کے درمیان کئی بار فسادات بھی ہوگئے۔کھاسیوں نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے بندوق کا سہارا لیا اور کئی معصوم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور یہ نفرت اس قدر بڑھی کہ اس کا شکار تارا کے والد کی لاش کو ہونا پڑا۔

تارا کے والد کو اس لیے قبرستان میں دفنایا نہیں گیا کہ وہ کھاسی نہیں تھے۔اس قبرستان پر صرف کھاسیوں کا حق تھا، نیپالی لوگ وہاں دفن نہیں ہوسکتے تھے۔بھلے وہ عیسائی ہو۔عیسائی مذہب جس میں ظاہراً کوئی تفریق نہیں ہوتی ہے۔لیکن اپنے مفاد کے لیے وہاں بھی تفریق پیدا کردی گئی تھی اور تارا کے والد کو دفن کرنے کے لیے شیلانگ سے گوہاٹی لے جانا پڑا تھا۔اس بات سے تارا اتنی دل برداشتہ ہوئی تھی کہ اس نے شیلانگ چھوڑ کر گوہاٹی میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔کیونکہ شیلانگ میں اس کے والد کے دفن کے لیے دو گز زمین بھی نہیں مل سکی تھی۔

☆☆☆☆☆

☆مضمون نگار ایم مبین، ۳۰۳، کلاسک پلازہ، تین بتی، بھیونڈی، ضلع تھانے-۴۲۱۳۰۲؛ مطبوعہ: سہ ماہی تکمیل بھیونڈی، جلد ۲۲، شمارہ ۸۸-۸۷ (جولائی تا دسمبر ۲۰۰۹ء؛ ص ۱۴۰)

سائنس اور مذہب، سوال، صندوقچہ ،لکشمی کا سواگت، شناخت، گمشدہ کی تلاش، ہار جیت، نیلامی، پردہ فاش، متروک، راون، کورٹ مارشل، نصیحت اور عریاں تصویریں وغیرہ شامل ہیں جو قاری کو تاثر کی دنیا میں گم کر دیتے ہیں۔ٹائٹل افسانچہ 'مٹھی بھر ریت' محبت اور ملازمت کا خوبصورت امتزاج ہے۔نوکری نہیں ملی تو چھوکری بھی نہیں ملی کے مصداق افسانچہ کے آخری جملہ کا طنز جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ جملہ دیکھیے۔ ''نوکری نہیں ملی تو بھیک کیوں نہیں مانگتے۔'' واقعی آج کل سب سے آسان نوکری بھیک مانگنا بن گیا ہے۔افسانچہ 'ساگون کا پیڑ' میں آخری جملہ کے بعد شعر کی گنجائش نہیں تھی کہ افسانہ ہو یا افسانچہ شعر کبھی بھی تاثر کو بڑھاوا نہیں دیتا ہے۔

ان کے کئی افسانے وافسانچے پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے دیپک بُد کی ناستک رہے ہوں کہ انھوں نے کئی جگہ آستک اور آستھا والوں پر کڑی چوٹ کی ہے۔شاید اس کی وجہ یہی رہی ہو کہ آج کل کے لوگوں کے قول وفعل میں بڑا تضاد آ گیا ہے۔دیپک بُد کی نے اپنے ایک افسانچے 'زمین زہر اگلتی ہے' میں کردار کے ذریعے جو کہلوایا کہ:

> ''مجھے انسان کی روشن خیالی پر پورا بھروسہ ہے۔وہ ایک روز اپنی بھلائی کے بارے میں ضرور سوچنا شروع کر دے گا۔'' (ص ۱۶۷)

شاید یہی ان کے نزدیک انسان کا اصل مذہب ہے۔

غرض 'مٹھی بھر ریت' میں دیپک بُد کی نے افسانچوں کی ایک ایسی بزم نو سجادی ہے جو اپنے قاری سے اپنے استقبال کی منتظر ہے۔البتہ ان افسانچوں میں کہیں کہیں ایک آنچ کی کسر ضرور محسوس ہوتی ہے۔اگر وہ ذرا اور اختصار سے کام لیتے ان کے تاثر کی شدت میں مزید اضافہ ہو جاتا کہ افسانچہ میں ایک خاص کساؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔خاص طور سے افسانچہ کی آخری سطر، جو اس کا کلائمیکس ہوتی ہے ،ڈرامائی کیفیت کے تاثر کی ایک ایسی شدت چاہتی ہے جو قاری کے ذہن میں دھماکہ کر دے اور اس کیفیت کے لیے اختصار کا ایجاز اس کا لازمی گُر ہے۔اس لیے افسانچوں میں اشاراتی انداز لازمی ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ ان کے پاس زیادہ تر وضاحتی انداز ہے جو افسانے کے لیے نہایت موزوں اور مناسب ہے لیکن یہاں اس کی گنجائش کم کم ہے۔دراصل دیپک بدکی نے بقول خود ان کے انگریزی نثر پاروں کے

تتبع میں کئی نثر پارے بھی ان افسانچوں میں شامل کر دیئے ہیں۔ جن میں فکر پاروں کی کیفیت زیادہ ملتی ہے کہ ان میں کہانی سے زیادہ فکر وخیال کو اہمیت دی گئی ہے۔ اور اس کے جواز میں وہ کتاب کے پیش لفظ میں یوں رقم طراز ہے کہ:

''میں نے کچھ افسانچوں میں چند افسانوی عناصر کو عمداً نظر انداز کیا ہے۔ کیونکہ میں کسی فارم کا قیدی بننا پسند نہیں کرتا۔ ان نثر پاروں میں افسانچوں کی مبادیات کے بدلے فکر وخیال کو ترجیح دی گئی ہے۔'' (ص ۲۰)

اس خصوص میں میرا ان سے یہ التماس ہے کہ وہ بھلے ہی کسی فارم کا قیدی نہ بنیں لیکن افسانچے کو اس کے فارم میں ہی رہنے دیں کہ یہ اس کے مستقبل کے حق میں بہتر رہے گا۔ کہ ابھی افسانچے کو بطور صنف اپنی تسلیم شدہ حیثیت کو مزید بہتر طور پر پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے مخالفین اس قسم کے سقم کے باعث اس کی صنفی حیثیت کو مشکوک بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ جس کے سدباب کے لیے دیپک بدکی جیسے اچھے افسانچہ نگاروں کا مزید تعاون اور توجہ کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اسی لئے میں ان کی توجہ اس سمت بھی مرکوز کرنا لازمی سمجھتا ہوں کہ ان کے بعض افسانچوں میں طنز ذرا لطیف انداز میں در آیا ہے جو بقول افسانچہ نگار ''ظریفانہ انداز افسانچے کو مزید تقویت بخشتا ہے'' جبکہ وہ خود لکھتے ہیں۔ ''مگر یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ افسانچہ لطیفہ گوئی یا دلجوئی کا سامان نہ ہو جائے۔'' اس لحاظ سے میری نظر میں افسانچہ میں ظریفانہ انداز کی گنجائش بالکل نہیں ہے کہ اس طور پر افسانچہ کا لطیفہ سے قریب ہو جانے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا طنز کی کاٹ ہی فنی طور پر افسانچہ کو اعتبار کی زندگی عطا کرتی ہے۔ آخر میں بقول دیپک بدکی اس حقیقت سے پوری طرح اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ:

''جہاں تک افسانچے کی مقبولیت کا سوال ہے اس حقیقت سے آنکھ چرانا مشکل ہے کہ ہم میں سے بیشتر افسانہ نگار اس صنف کو بطور فیشن یا تفریح اپناتے رہے ہیں۔ اگر افسانہ نگار اس صنف پر سچے من سے فوکس کریں اور اس کو بحیثیت سنجیدہ صنف کے اپنا لیں تو کوئی مضائقہ نہیں کہ افسانچہ آنے والے دور میں مقبول ترین صنف کا درجہ حاصل کر سکے۔'' (افسانچے کا مستقبل؛ ص ۲۲)

اپنا قاری کہاں تلاش کرے جو اس کے ناولوں یا طویل کہانیوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے کی زحمت اٹھائے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب تخلیق کار ہی ایک دوسرے کے قاری ہیں۔

اکیسویں صدی کی شروعات میں چند افسانہ نگاروں کی پارکھی نظروں نے زندگی کی برق رفتاری اور دنیا کی روز بہ روز بدلتی ضروریات کو بھانپ لیا۔ انھوں نے قاری کی وقت کی تنگی کو بھی محسوس کیا۔ اس لیے افسانے کو افسانچے میں قلب ماہیت کرنے کا بیڑا اٹھالیا۔ ایسے چند افسانہ نگاروں میں نور شاہ رونق جمال، عظیم راہی، نذیر فتح پوری، ایم اے حق، ڈاکٹر بلند اقبال، مقصود الٰہی شیخ، صابر فخر الدین اور دیپک بُدکی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ دیپک بُدکی اردو افسانہ نگاروں کا جانا پہچانا نام ہے۔ ان کے اب تک پانچ افسانوں کے مجموعے، 'ادھورے چہرے'، 'چنار کے پنجے'، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، 'ریزہ ریزہ حیات' اور 'روح کا کرب' شائع ہو کر مقبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ 'مٹھی بھر ریت' ان کے افسانچوں کا مجموعہ ہے جو مارچ ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں ۱۰۴ افسانچے ہیں۔ میں نے ان تمام افسانچوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ دیپک بُدکی ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں لہٰذا انھیں افسانچہ کی تکنیک کو برتنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ظاہر ہے کہ جو ٹیلر ماسٹر 'سوٹ' سینے میں مہارت رکھتا ہو اسے 'ہاف پینٹ' سینے میں کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔

دیپک بُدکی محکمہ ڈاک (انڈین پوسٹل سروسز) میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے ہیں۔ اپنی نوکری کے سلسلے میں انھیں ہندوستان کے مختلف علاقوں اور شہروں میں رہنے، وہاں کے جغرافیہ اور حالات کو دیکھنے و سمجھنے کا بھرپور موقع ملا جس کے سبب ان کا تجربہ وسیع اور مشاہدہ عمیق ہو گیا۔ الگ الگ علاقوں کی کثیر الثقافتی زندگی کو قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کی ہی وجہ ہے کہ ان کے افسانچوں میں موضوعات کا تنوع اور واقعات کی رنگارنگی موجود ہے جو ان کی افسانچہ نگاری کی سب سے بڑی خوبی بن گئی ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو، کوئی کردار، کوئی مسئلہ، کوئی جذبہ ایسا نہیں ہے جسے انھوں نے افسانچے میں نہ ڈھالا ہو۔ اور اس کا ثبوت مجموعہ میں شامل افسانچوں کی فہرست ہے۔ جس کے محض عنوانات پڑھتے ہی ہمیں افسانہ نگار کی وسیع النظری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

دیپک بُدکی نے اپنے افسانوں میں سماج میں پھیلی بدعنوانی، بے ایمانی، ناانصافی، حق تلفی کو

اکثر اپنا نشانہ بنایا ہے۔ بدعنوانی اور بے ایمانی کو نشانہ بنا کر 'بالائی یافت' اور 'ٹارگیٹ' عنوان سے لکھے گئے افسانچوں میں ہمیں اپنے اطراف کے کئی لوگوں کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جو اپنے ضمیر کو بیچنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ 'شعلۂ بے تاب' اسی ظاہردار سماج میں پل رہے ایک جوان بیٹے کی بے تاب اور بے قابو امنگوں کا اظہار ہے۔ اسی طرح 'تصویر' میں انھوں نے ایک خاتون کی اپنے شوہر کی بدچلنی پر نظر اندازی کا دبیز پردہ ڈال کر شوہر پرست بیوی ہونے کا دلکش انداز میں افسانچہ تحریر کیا ہے۔

چونکہ دیپک بُدکی انڈین پوسٹل سروسز میں اپنی نوکری کے دوران کچھ عرصہ تک فوج میں بھی رہے ہیں۔ ان دونوں محکموں سے متعلق واقعات کو انھوں نے افسانچوں میں برتا ہے۔ فوجی زندگی کی جھلک ہمیں 'وسعت نظر' میں دکھائی دیتی ہے تو محکمہ ڈاک سے متعلق افسانچہ 'ڈاک خانے کی ملازمت' میں ایک ایماندار پوسٹ ماسٹر کے کام کو نہایت جذباتی اور پُر اثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ 'صندوقچہ' ایک شوہر کے اپنی بیوی کے تئیں جذبات اور لازوال محبت کا اظہار ہے۔ افسانچہ نگار نے عصر حاضر میں تعلیم یافتہ اور باصلاحیت مگر مفلوک الحال نوجوان کے ساتھ ناانصافی، حق تلفی اور استحصال کی عکاسی 'صندل کا پیڑ' میں خود کلامی کا انداز اختیار کر کے کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دیپک بُدکی کا تعلق چونکہ کشمیر سے ہے اس لیے انھوں نے کشمیر کے موجودہ حالات کو بھی اپنے افسانچوں میں پورے کرب و درد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً 'چور سپاہی'، 'یادوں کے سائے' وغیرہ۔ افسانچہ نگار نے 'سوال' میں کشمیری پنڈتوں کی ہجرت کو پوری شدّت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے موجودہ جمہوری نظام پر بھی زبردست ضرب کاری کی ہے جس میں انھوں نے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاتھوں ظلم و جبر اور استحصال کیے جانے کو بڑے موثر انداز سے اجاگر کیا ہے۔ افسانچے 'ووٹ'، 'سیکولرازم' اور 'ذہنی بیڑیاں' اس کی غمازی کرتے ہیں۔

منٹو کی طرح جنسیات اور نفسیات بھی دیپک بُدکی کے پسندیدہ موضوعات رہے ہیں۔ حالانکہ وہ منٹو کے قد کو تو نہیں پہنچے مگر جنسی نفسیات، ذہنی الجھنوں اور لاچاری، مجبوری و مفلسی کے سبب کی گئی جسم فروشی کو انھوں نے پوری سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ 'ہار جیت' اس کی عمدہ مثال ہے۔ 'انتظار' اور 'تلاش اس لمس کا' خوبصورت نفسیاتی افسانچے ہیں۔

ہمارے ملک کی یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جنھیں شہریت کا شعور (Civic

(Sense چھوکر بھی نہیں گزرتا۔ دیکھنے میں آتا ہے کہ بازار اور رہائشی مکانوں کی دیواروں پر اکثر لکھا رہتا ہے کہ 'یہاں پیشاب کرنا سخت منع ہے' یا یہ کہ 'تھوکنا منع ہے'، مگر پھر بھی ایک عام ہندوستانی کی سوچ ایسی بن گئی ہے کہ جس بات کا جتنا منع کیا جائے اس کو کرنے میں وہ اتنا ہی فخر سمجھتا ہے اور اس میں لذت محسوس کرتا ہے۔ سرِ عام شائستگی اور خوش سلیقگی کی کھلی اڑانے میں اسے مزہ آتا ہے۔ 'ممنوع راستہ' اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سبھی جانتے ہیں کہ دیپک بُدکی ناستک ہیں۔ ان کی مذہب سے بیزاری بیشتر افسانوں میں جا بہ جا پائی جاتی ہے جو مذہبی لوگوں کوناک چڑھانے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ عموماً لوگ اپنے دہر یہ نظریے کو آستکوں کے بیچ کھلے عام شئیر Share نہیں کرتے۔ 'کس کو دوش دوں'، 'ریل گاڑی'، 'زلزلہ'، جرم'، 'چمتکار'، 'پہلا کلون'، 'سائنس اور مذہب' اسی قبیلے کے افسانچے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ کچھ افسانچوں نے مجھے مایوس کیا۔ ایسا لگتا ہے کچھ افسانچے محض بھرتی کے افسانچے ہیں ۔ چند افسانچے کسی مفکر کا قول بن کر رہ گئے ہیں۔ جیسے 'سچ کی تلاش'، وغیرہ۔ دوسرے یہ کہ کچھ افسانچوں میں Climax میں جان نہیں ہے۔ افسانچہ کی آخری سطر میں افسانہ نگار واقعہ کی پوری وضاحت کرتا نظر آتا ہے۔ جس سے افسانچہ محض ایک رپورٹ یا خبر بن کر رہ جاتا ہے، افسانچہ نہیں بن پاتا۔ کتاب کے پیش لفظ میں دیپک بُدکی نے خود افسانچے میں suspense کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ ایک تو افسانچہ ویسے ہی مختصر اور پھر اس میں تحیر Suspense یا U-turn بھی نہ ہو تو قاری کے پاس سوچنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کی مثال میں 'انصاف'، 'ایمانداری کا بھوت' وغیرہ افسانچوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

بہر حال ہمیں اس بات کی داد تو دینا پڑے گی کہ دیپک بُدکی نے افسانچوں میں بھر پور زندگی کے بے شمار موضوعات کا خوبصورتی کے ساتھ احاطہ کیا ہے جو ان کے کامیاب افسانچہ نگار ہونے کی دلیل ہے۔ جب بھی افسانہ نگاری کے باب میں افسانچہ کا ذکر آئے گا، دیپک بُدکی وہاں اپنی منفرد شناخت کے ساتھ موجود رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

☆ مضمون نگار: محمود ملک؛ ۲/۲۸؛ بارہ محل، بھوپال، موبائیل 09977555800

دیپک بدکی بحیثیت افسانچہ نگار

--محمد متین ندوی

دیپک بدکی دور حاضر کے ان نمائندہ افسانہ نگاروں اور افسانچہ نگاروں میں سے ایک ہیں، جن کی تخلیقات رسائل میں اہتمام سے چھپتی اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ان کی نو (۹) کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوکر مقبول ہوچکی ہیں۔ وہ افسانے بھی لکھتے ہیں، افسانچے بھی اور تنقید بھی جس پر ان کی کتابیں شاہد ہیں۔وہ ایک صحافی، ادیب اور افسانہ نگار کی حیثیت سے تو شہرت رکھتے ہی ہیں مزید وہ ایک کامیاب کارٹونسٹ بھی ہیں۔ان کی افسانہ نگاری پر نوجوان نقادوں سے لے کر شمس الرحمن فاروقی جیسے معتبر نقادوں نے بھی لکھا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی صاحب ان کے ایک افسانہ ''ادھوری کہانی'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے 'ادھوری کہانی' اس مجموعے کا سب سے اچھا افسانہ ہے اور اسے تمھارے بہترین افسانوں میں شمار کرنا چاہیے۔
(شمس الرحمن فاروقی)

ویسے تو ان کے سبھی افسانے اچھے ہوتے ہیں لیکن بطور خاص ان کے چند افسانے ایسے ہیں، جن پر انھیں خود بھی ناز ہے۔جیسے 'ایک نہتے مکان کا ریپ'، 'ادھوری کہانی'، 'گھونسلا'، 'اماں'، 'مخبر'، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، 'چڑی کی بیگم' اور 'ڈاگ ہاؤس'۔

دور حاضر میں افسانچے نے وہ مقبولیت حاصل کی ہے جو کہ نئی اصناف کے حصہ میں عام طور پر نہیں آتی۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آج کے انسان کے پاس وقت کی بہت قلت ہے اور پھر تفریح اور دلچسپی کی طرح طرح کی چیزیں ایجاد ہوچکی ہیں، ٹی وی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، فیس بک واٹس اپ، جن میں آج کا انسان بطور خاص نئی نسل الجھی ہوئی ہے۔ بہت سے لوگوں کی سوچ یہ بھی ہوتی ہے کہ کتابیں پڑھنے میں کون اپنے آپ کو تھکائے، بٹن آن کیجئے اور دنیا کی سیر کیجئے۔ایسے میں کون پڑھنے کی زحمت برداشت

کرے، اور اگر کسی کو پڑھنا بھی ہے تو وہ طویل طویل کہانیوں کے بجائے مختصر کہانیوں اور افسانچوں سے ہی لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ گذشتہ چند سالوں میں افسانچہ کو بہت ہی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ شاید وقت کی اہمیت اور مصروف زندگی کے پیش نظر ہی دیپک بُدکی صاحب افسانے لکھتے لکھتے افسانچہ بھی لکھنے لگے اور جس طریقہ سے انھوں نے افسانے کی دنیا میں اپنی پہچان بنائی تھی اسی طرح سے وہ افسانچہ نگاری میں بھی اپنی پہچان بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

اس وقت میرے سامنے ان کی نئی کتاب 'مٹھی بھر ریت' ہے جو ایک سو چار افسانچوں پر مشتمل ہے۔ جس پر مجھے اس وقت گفتگو کرنی ہے۔ جس طریقہ سے وہ ایک نمائندہ افسانہ نگار ہیں اسی طریقہ سے ان کے افسانچے بھی انفرادیت کے حامل ہوتے ہیں، جن میں عصری حسیت نمایاں ہے۔ ان کے یہاں زندگی کے مسائل اور ان کے گہرے تجربات اور مشاہدات موجود ہیں۔ زبان و بیان پر تو انھیں قدرت حاصل ہے ہی ساتھ ہی وہ اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ کیا بیان کرنا ہے اور کس طریقہ سے کرنا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک افسانچہ پیش کر دیا جائے:

نیکی

"نیکی کر دریا میں ڈال۔

نیکی دو قسم کی ہوتی ہے۔

اَدھ مرے زہریلے سانپ کو دودھ پلا کر پھر سے تندرست و توانا بنا دے۔ وہ کبھی نہ کبھی اس کا اجر ضرور دے گا۔ بھلے کی امید مت رکھنا کیونکہ یہ اس کی خصلت میں شامل ہی نہیں۔ البتہ بہت ممکن ہے کہ وہ مستقبل میں تمھیں یا تمھارے بال بچوں کو ضرور ڈس لے گا۔

دوسری قسم کی نیکی بھی ہوتی ہے۔ سانپ کو کچل کر اپنے بال بچوں کو بچا لے۔"

یہ افسانچہ دلچسپ بھی ہے اور نصیحت آمیز بھی۔ افسانچہ میں زہریلا سانپ حقیقت بھی ہو سکتا ہے اور استعارہ بھی۔ اس لئے کہ ہر وہ انسان جس کی فطرت میں دوسروں کو تکلیف پہچانا شامل ہے وہ بھی حکماً اور استعارۃً سانپ کی فہرست میں شامل ہے۔ مذکورہ کتاب میں اس طرح کے ہی نہیں بلکہ اس سے

بھی زیادہ دلچسپ افسانچے موجود ہیں۔مزید ایک افسانہ پیش ہے، جو دیپک بدکی صاحب کو بے حد پسند ہے، جسے میں نے ان کی زبانی بھی سنا ہے،سیفی سرونجی نے جب ایک شام دیپک بدکی کے نام رکھی تھی تو اس پروگرام میں انھوں نے تین افسانے سنائے تھے، ایک 'نیکی'، دوسرا 'سچ کی تلاش' اور تیسرا 'لکشمی کا سواگت'۔علاوہ ازیں ایک افسانہ سنایا تھا جس کا عنوان تھا 'ایک انقلابی کی سرگذشت'۔چونکہ اس وقت افسانچے پر لکھ رہا ہوں، اس لئے افسانہ پر کوئی بات نہیں کرنی۔ایک افسانچہ 'نیکی' پیش کیا جا چکا ہے، دوسرا افسانچہ 'سچ کی تلاش' دیکھئے:

سچ کی تلاش

''تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ہاتھ میں جو صحیفہ ہے، وہ آخری سچ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرے مصحف سے بڑا سچ اور کوئی نہیں۔

تمہارے سچ اور میرے سچ کے درمیان کتنا تضاد ہے۔''

دیپک بدکی صاحب کا یہ افسانچہ اس قدر معنی خیز ہے کہ اس پر ایک مضمون ہی نہیں بلکہ ایک کتاب بھی لکھی جا سکتی ہے۔دور حاضر کا یہ ایسا سچ ہے جو بہت سے مسائل ہی نہیں مصائب کو بھی جنم دیتا ہے۔ہر ایک شخص اپنی بات، اپنی کتاب، اپنی تنظیم، اپنے اصول ونظریات اور اپنے خیالات کو سچ سمجھتا ہے، اور دوسروں کی بات اور ان کے اصول ونظریات، طرز حیات اور فلسفہ حیات وممات کو غلط تصور کرتا ہے۔اسی پس منظر میں دیپک بدکی کا یہ افسانہ لکھا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

☆مضمون نگار: محمد متین ندوی؛ مدرسہ ریاض المدارس سرونج- 464228(ایم.پی) Mb:9926438319

مٹھی بھر ریت۔ایک جائزہ

--ڈاکٹر ظفر سرونجی

گونگے، بہرے، بے رنگ کورے کاغذوں پر زندگی کے نئے رنگ بھرنا، زندگی کو زندگی کی طرح روشن کر دینا، بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑتی بھاگتی زندگی کے حالات، خوبصورت پرندوں کی شکل میں لفظ بہ لفظ پھڑ پھڑاتے ہوئے لفظوں میں قید کر دینا شانِ دیپک بدکی ہے۔ان کا قلم روشنی کی چھوٹی سی چھوٹی کرن کو بھی پورے سورج میں بدلنے کا ہنر جانتا ہے۔ایک اچھا اور سچا قلم کار سماج وقوم میں پھیلی ہوئی برائیوں کو صرف اجاگر ہی نہیں کرتا بلکہ اس کا سلوشن بھی پیش کرتا ہے اور اس سلوشن (عقدہ کشائی) کو جو بھی قلم کار جتنے زبردست اور منفرد انداز سے اپنی تحریروں میں پیش کرتا ہے، وہ اتنا ہی مقبول عام فنکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔میں جانتا ہوں میرے یہ سب افکار وخیالات دیپک بدکی کی شخصیت کے آگے بہت چھوٹے اور حقیر ہیں، کیونکہ دیپک بدکی کا شمار تو دنیا کے مقبول ترین فنکاروں میں پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔

افسانچوں کا مجموعہ 'مٹھی بھر ریت' ڈاکٹر سیفی سرونجی کی محبت کے ساتھ مجھے ملا۔یہاں میں یہ بھی لکھتا چلوں کہ سیفی سرونجی کے ہاتھ صرف اسی کتاب کو چھوتے ہیں جس میں کچھ وزن ہوتا ہے، اس لئے اکثر میں سیفی صاحب کی دی ہوئی کوئی بھی کتاب زیادہ تر ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالتا ہوں۔بس یہی عمل میں نے 'مٹھی بھر ریت' کے ساتھ کیا۔پہلے تو دیپک بُدکی صاحب مجھے اس کتاب کے حوالے سے منٹو کے قائل نظر آئے مگر جیسے جیسے میں کتاب کو آگے دیکھتا گیا، ان کے افسانچے پڑھتا گیا ویسے ویسے ان کی فکر میرے اوپر حاوی ہو کر مجھے ایسی دنیا میں لے گئی، جہاں دور دور تک نہ منٹو تھا، نہ شیکسپیئر اور نہ خلیل جبران۔یہ دنیا صرف اور صرف دیپک بدکی کی تھی، جس میں سارے رنگ ان کے اپنے تھے، جس کی وادیوں کا ہر لال پیلا پرندہ چیخ چیخ کر دیپک بدکی کی انفرادیت کا اعلان کر رہا تھا۔

یوں تو ادبی دنیا میں منی کہانیاں اور افسانچوں کی ایک باڑھ سی آئی ہوئی ہے، جو ایک بھیڑ چال

کی سی شکل اختیار کرتی جارہی ہے مگر اس صنف میں گنے چنے فنکار ہی کامیاب نظر آتے ہیں، ان میں ایک بڑا نام دیپک بُدکی کا بھی ہے، جس نے شارٹ اسٹوری اور افسانچوں کی دنیا میں اپنی زبردست موجودگی درج کرائی ہے۔ کچھ افسانچے پیش کرتا ہوں:

افسانچہ نیکی

نیکی کر دریا میں ڈال۔

نیکی دو قسم کی ہوتی ہے۔

ادھ مرے زہریلے سانپ کو دودھ پلا کر پھر سے تندرست و توانا بنا دے، وہ کبھی نہ کبھی اس کا اجر ضرور دے گا، بھلے کی امید مت رکھنا، کیونکہ یہ اس کی خصلت میں شامل ہی نہیں ہے۔ البتہ بہت ممکن ہے کہ وہ مستقبل میں تمہیں یا تمہارے بال بچوں کو ضرور ڈس لے گا۔

دوسری قسم کی نیکی بھی ہوتی ہے، سانپ کو کچل کر اپنے بال بچوں کو بچالے۔''

دیپک بدکی اپنی تحریروں میں بہت زیادہ نکیلے لفظوں سے کام نہیں لیتے مگر یہ ان کے فکشن کی بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ قاری کے دل و دماغ پر گہری خراشیں چھوڑ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر افسانچہ 'سائنس اور مذہب'۔

افسانچہ سائنس اور مذہب

'' کلاس میں استاد نے طالب علم سے پوچھا۔'' سائنس اور مذہب میں کیا فرق ہے؟''

سبھی طلبہ سوچ میں پڑ گئے، راجن نے جواب دینے کی غرض سے اپنا داہنا ہاتھ اٹھالیا۔

جونہی استاد کی نظر راجن پر پڑی، وہ بول اٹھا۔'' ہاں راجن بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

'' سر، سائنس میں تازہ ترین کتاب صحیح اور معتبر مانی جاتی ہے جبکہ مذہب میں سب سے پرانی کتاب مستند مانی جاتی ہے۔''

کہیں کہیں دیپک بُدکی کی تحریریں بہت مہنگی انگریزی شراب کی طرح ہوتی ہیں، پینے والوں کو تو ان کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کچھ پیا ہے مگر دوسرے دن سے چڑھتی ہے تو تین چار دن تک اس کا خمار اترنے کا نام ہی نہیں لیتا، یہ خوبی ہر قلم کار میں نہیں پائی جاتی۔

پیش لفظ میں دیپک بُد کی خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں نے کچھ افسانچوں میں چند افسانوی عناصر کو عمداً نظر انداز کیا ہے کیونکہ میں کسی فارم کا قیدی بننا پسند نہیں کرتا۔ان نثر پاروں میں افسانچوں کی مبادیات کے بدلے فکر و خیال کو ترجیح دی گئی ہے۔''

سچ تو یہ ہے کہ افسانچوں کی دنیا جو ابھی بہت کم سن ہے، اس میں ڈھیروں خون جگر ملانے یا پلانے کی ضرورت ہے، چاہے وہ جوگیندر پال ہوں، نذیر فتح پوری، عظیم راہی، یا پھر رونق جمال، کسی بھی مصنف کو مقبول عام ہونے کے لئے قلم کاروں کے ادبی قد کی ضرورت نہیں پڑتی، عوام الناس جس صنف کو سر آنکھوں پر بٹھا لے وہی مشہور اور مقبول عام ہوتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ افسانچوں کا مستقبل بھی روشن ہے۔اگر آنے والے وقت نے افسانچوں سے وفا کی تو دیپک بُد کی ایک بڑا میل کا پتھر ثابت ہوں گے۔

☆☆☆☆☆
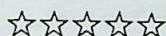
☆مضمون نگار: ڈاکٹر ظفر سرونجی Mb.8871953841

اختصار پسند ناقد دیپک بدکی کا تنقیدی شعور

--نذیرؔ فتح پوری

دیپک بدکی بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں۔افسانہ نگار بھی ایسے جنہوں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔اپنی طبیعت، موڈ اور مزاج کے لحاظ سے افسانے لکھے اور اپنی شناخت قائم کی۔افسانہ وہی کامیاب ہوتا ہے جو براہِ راست زندگی سے بات کرتا ہے انسانی جذبات کی عکاسی کرتا ہے اور اپنے عصر کی تصویر پیش کرتا ہے۔دیپک بدکی کے افسانے ایسی ہی خصوصیات کے حامل ہیں۔

افسانہ نگاری کے پیچھے پیچھے دیپک بدکی نے اپنے تنقیدی شعور کا احساس بھی دلایا۔بے شمار کتابوں پر تبصرے لکھے، تفصیلی مضامین لکھے اور سیر حاصل تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا۔جن کتابوں پر بدکی نے لکھا، ان میں شاعری، افسانہ اور ادبی مضامین کی کتابیں شامل ہیں۔کچھ ادبی رسائل پر بھی آپ نے ناقدانہ نظر ڈالی اور اپنی رائے قائم کر کے اس کا بر ملا اظہار بھی کیا۔آپ جب تک سرکاری ملازمت میں رہے اپنی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کے بعد جو وقت ہاتھ لگتا وہ مطالعہ کی جھولی میں ڈال دیتے اور نتیجے میں افسانوں کی کہکشاں سے اپنی تنہائیوں کے آسمان روشن کرتے۔جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو اپنی پوری توجہ ادب لکھنے اور ادب کا مطالعہ کرنے میں صرف کرنے لگے۔جس کے نتیجے میں افسانوں کے پانچ مجموعے، افسانچوں کا ایک مجموعہ اور ادبی مضامین اور تبصروں کی تین کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آ گئیں۔اور اہلِ فکر و نظر سے داد و تحسین حاصل کرنے کا موجب قرار پائیں۔

آپ کی افسانہ نگاری پر بہت سے تنقیدی اور تبصراتی مضامین لکھے گئے۔مختصر رائے بھی بہت سے صاحبانِ فکر و نظر نے لکھی۔ماہنامہ شاعر ممبئی، سہ ماہی انتساب، سرونج اور سہ ماہی اسباق پونے جیسے معیاری ادبی رسائل میں آپ کے فکر و فن پر خصوصی اشاعتیں عمل میں آئیں۔اس طرح آپ کے افسانوی فن کو جانچا اور پرکھا گیا۔اور فن کی کسوٹی سے گزارا گیا۔جس طرح کوئی حتمی حکم صادر نہیں کرسکتا کہ

افسانہ اس طرح لکھا جائے، شاعری ایسے کی جائے اس طرح کوئی یہ بھی حکم صادر نہیں کر سکتا کہ تنقید اس طرح لکھی جائے، یا اس طرح نہ لکھی جائے۔ جس ذہن میں جس طرح کا ترازو آویزاں ہوتا ہے، وہ ذہن اسی معیار و مزاج کے پیمانے سے کسی تخلیق کو جانچتا اور پرکھتا ہے۔ اس کی خوبیوں کو تسلیم کرتا ہے اور کمیوں کو نشان زد کرتا ہے۔ ناقد کھرا اور سچا ہو تو اس کی گفتگو رہنما اصولوں کی پاسدار ہو سکتی ہے۔ جو ناقد حاسد ہوتا ہے وہ کسی بھی تخلیق کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔

کسی نے کہا تھا کہ ایک ناکام شاعر ہی ایک کامیاب ناقد بن سکتا ہے۔ لیکن یہ کوئی قاعدہ نہیں۔ دیپک بدکی ایک کامیاب افسانہ نگار کے ساتھ ہی تخلیقی فن پاروں پر ناقدانہ اظہار خیال کرنے میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ دیکھا جائے تو کوئی بھی فن پارہ زندگی کی تنقید پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ بعض لوگ خوبصورت شاہ کاروں پر تنقید کر دیتے ہیں اس کی مثال ساحر لدھیانوی کی نظم 'تاج محل' ہے۔ لیکن تاج محل پر ساحر نے ناقدانہ نہیں بلکہ حاسدانہ نظر ڈالی ہے۔ اس نے خود کا مقابلہ شاہ جہاں سے کیا ہے اور اپنی جس معشوقہ کو کہیں اور ملنے کی تنبیہ کی ہے وہ ممتاز محل سے کسی طرح کم نہ تھی۔

دیپک بدکی نے صاف اور شفاف نظروں سے اپنے ہم عصر اہلِ قلم کی تخلیقات پر مطالعاتی نظر ڈالی ہے۔ ایسا کرتے وقت انھوں نے اپنے تخلیقی احساس کو حسد سے جدا رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں حسد کی چنگاریوں سے محفوظ رہیں۔

دیپک بدکی کے مختصر تنقیدی مضامین و تبصروں کی کتاب 'عصری تحریریں' عنوان سے منظر پر آئی تھی۔ اس کتاب میں جتنی بھی تحریریں ہیں کھلی فضا میں سانس لینے والے ایک صاحبِ نظر فنکار کے مخلصانہ کردار کی عکاسی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے لکھا ہے۔

> ''دیپک بدکی عارفانہ نظر سے تخلیق کا ادراک کرتے ہیں اور ربط باہمی سے نقطۂ اتصال کا لمحہ فراہم کرتے ہیں جس میں منطق ہے۔ متبادلات ہیں اور معروضی تجزیے اور توجیہہ ہیں۔'' (سہ ماہی اسباق۔ گوشہ دیپک بدکی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ جلد ۲۷)

یہ عارفانہ نظر کیا ہے؟ فن کے عرفان اور ذات کے عرفان میں کیا واضح فرق ہے؟ معرفت کے حاصل ہوتی ہے؟ قلم کی زبان کب عارفانہ تحریریں صفحۂ قرطاس پر بکھیرتی ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب

دیپک بدکی کی 'عصری تحریریں' میں مل جاتے ہیں۔

ویریندر پٹواری دیپک بدکی کے ہم عصر افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ دونوں کا تعلق جموں کشمیر سے ہے۔ ویریندر پٹواری کے فنِ افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے دیپک بدکی نے لکھا ہے۔

''ویریندر پٹواری جس دور میں لکھتے رہے وہ جدیدیت کا دور تھا۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ ان کی کہانیوں میں علامتی اظہار ہو۔ ان کی کہانیاں ہندو اساطیری ادب سے استفادہ کرتی ہیں۔ پرانوں اور پنچ تنتروں سے انہوں نے کئی تلمیحات اپنی کہانیوں میں پیش کی ہیں۔ گوتم بدھ کی زندگی اور تعلیمات سے وہ خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ بدھ امن اور شانتی کے پیغامبر رہے ہیں۔ ان کے یہاں علامتوں، کنایوں اور استعاروں کی کثرت ہے مگر اس کے باجود وہ ترسیل کے المیے کا شکار نہیں ہوئے۔ ان کا بیانیہ سیدھا قاری کے ذہن میں گھر کر جاتا ہے۔ ویریندر پٹواری کی زبان سلیس بامحاورہ اور ٹکسالی ہے۔ حالانکہ انہوں نے مکالمے سے بہت کم کام لیا ہے تاہم ان کا بیانیہ چست اور بلاواسطہ ہے۔ ان کی کہانیاں مختصر ہوتی ہیں جن میں مقصدیت صاف جھلکتی ہے'' ('بے چین لمحوں کا تنہا مسافر- ویریندر پٹواری')

یہ تحریر کسی عارفِ ادب کی ہی ہوسکتی ہے۔ تنقید کا یہ بھی ایک فن ہے کہ گنتی کی چند سطور میں ناقد اپنی گراں قدر رائے کا وسیع پیمانے پر اظہار کردے۔ مناظر عاشق لکھتے ہیں کہ۔

''ان کی تنقید اظہار و ابلاغ کی راہ سے تخلیق کے سربستہ راز کا پردہ اٹھاتی ہے اور قطرے کو گہر بناتی ہے۔'' (اسباق گوشہ۔ دیپک بدکی)

قطرے کو گہر بنانا ہر کس و ناقص کے بس کا کام نہیں۔ لفظوں کی فنکاری، اظہار کی جادوگری اور ذہن کا طلسماتی انداز ہی قطرے کو گہر بنانے میں معاونت کرتے ہیں۔ مانک ٹالا کے افسانوی فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے دیپک بدکی رقم طراز ہیں۔

''مانک ٹالا کے کردار سیدھے سادے ہیں۔ ان میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں ہے۔ یہ کردار ہر جگہ، ہر موڑ پر مل سکتے ہیں۔ یہ کردار ان کے دیکھے بھالے ہیں۔''

ایم۔ مبین نے لکھا ہے کہ ''پانچ جملوں میں دیپک بدکی نے مانک ٹالا کی افسانہ نگاری کے فن

کی تشریح کردی۔''

یہ بات میرے علم میں نہیں کہ دیپک بدکی کی مانک ٹالا سے کبھی ملاقات ہوئی ہو، جو لوگ مانک ٹالا سے مل چکے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مانک ٹالا خود سیدھے سادے انسان تھے۔ ان کی زندگی میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ گویا یہی عارفانہ نظر ہے جو تخلیق سے تخلیق کار کی شخصیت کو تلاش کر لیتی ہے۔

وارث علوی نے لکھا تھا کہ ''آج کا فن کار سماج سے کیوں کٹا ہوا ہے۔'' دراصل فن کار سماج سے کٹا ہوا نہیں ہے بلکہ سماج نے فن کار کو عضوِ معطل سمجھ کر الگ کر دیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج سماج کے سرمایہ داروں کے دروازوں پر کوئی فطری فنکار کورنش بجالانے کے لیے حاضری نہیں دیتا۔ دوسری طرف سرمایہ دار بھی کسی فن کار کی طرف متوجہ کب ہوتے ہیں۔ ایسے فنکاروں کی دلجوئی، حوصلہ افزائی اور قدردانی کا فریضہ بھی کوئی دوسرا فنکار ہی ادا کرتا ہے۔ یہ کام جن اہلِ قلم نے انجام دیا ہے۔ ان میں دیپک بدکی کا نام بھی اہم ہے۔ ویریندر پٹواری نے ایک جگہ لکھا ہے۔

''راقم الحروف پر دو مضامین لکھ کر مضمون نگار (دیپک بدکی) نے میرے کئی خیر خواہ نقادوں کو غلط ثابت کرنے میں میری مدد کی ہے۔''

دیکھا آپ نے خلوص کا اثر؟ ایک اہم معاصر افسانہ نگار پر جب نقادوں نے منفی انداز کی تنقیدی تحریر لکھی تو دیپک بدکی نے اس کا دفع کیا۔ اور دو مضامین اس کی حمایت میں لکھے، یہ کوئی بھائی بند والی حمایت نہیں تھی بلکہ مدلل اور باحوالہ گفتگو کر کے دیپک بدکی نے اپنی حمایت کا علم بلند کیا۔

رفیق شاہین جیسے ادیب نے بھی دیپک بدکی کو ''آسمان تنقید کا درخشاں ستارہ'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ رفیق شاہین نے لکھا ہے۔

''انہوں نے میر و سودا اور ذوق و غالب کو صرف نظر کرتے ہوئے محض عصرِ حاضر کے قلمکاروں کو ہی قابلِ اعتنا سمجھا ہے گرچہ یہ کام خاصہ پُر خطر ہے۔ جو نقاد کو بدظنی اور بدگمانی کے خارزار میں بھی الجھا سکتا ہے۔'' (ورق ورق آئینہ۔ صفحہ نمبر ۲۰۵)

لیکن میں اسے قلم کی جسارت اور قلم کار کی خود اعتمادی پر محمول کرتا ہوں۔ ایسے حالات میں جہاں ہماری تنقید میرؔ اور غالبؔ سے شروع ہو کر اقبالؔ اور فراقؔ پر ختم ہو جاتی ہے۔ وہاں ان تمام سکۂ رائج

الادب ناموں کو قطعی فراموش کر کے عصری اور تازہ کار صلاحیتوں کو اپنا موضوع بنانا اور ان کے فکر و فن پر مدلل بحث کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے دکھانا بڑا حوصلہ چاہتا ہے۔ بات پھر اسی خود اعتمادی کی آ جاتی ہے جو کمزور شانے ہوتے ہیں وہ بڑی طاقتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن دیپک بدکی صرف اپنی ہی صلاحیتوں پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وارث علوی نے ایسے ہی بے باک اور جیالے لوگوں کے لیے لکھا ہے۔

> ''وقت کے ہر لمحے پر اس کا احتجاج نقش ہوتا ہے اور..... چاہے..... وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے۔ وہ مقدر سے ٹکراتا ہے۔ اور مشینوں کی کلائی مروڑتا ہے۔ وہ جب فراری بنتا ہے تو اس کا فرار بھی بتاتا ہے کہ وہ کن چیزوں سے اور کیوں رسیاں تڑاتا ہے۔''
> (بتخانہ چین۔ صفحہ نمبر ۱۵۱)

وارث علوی نے یہ بات جدید فنکار کے تعلق سے لکھی ہے۔ دیپک بدکی بھی جدید فنکاروں کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پوری طرح روایت سے بغاوت کی ہے۔ اپنے زاویے خود تیار کیے ہیں۔ اپنے سانچے خود بنائے ہیں۔ وہ اپنے پیروں سے اپنی تیار کردہ راہ پر چلے ہیں۔ بیساکھیوں کی طرف انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ لاشعور کی بھول بھلیوں میں کھو کر اپنے شعور کو ڈرائنگ روم کی زینت نہیں بناتے۔ بلکہ ساری آرائش وزیبائش علم وادراک کے بل پر کرتے ہیں۔ دیپک بدکی کے بے باک قلم کی بے لاگ جھلک اس اقتباس میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

> ''برج پریمی کے افسانوں میں کئی کمزوریاں نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانوں پر مارکسی فلسفے کی جو چھاپ ہے اس کی ترسیل کے لیے انھیں ترقی یافتہ صنعتی معاشرے میں اپنے کردار ڈھونڈنے پڑتے ہیں یا پھر ایسے جاگیردارنہ نظام میں جہاں غریب اور مظلوم کسانوں پر ظلم ڈھایا جارہا ہو۔ کشمیر صنعتی شہر نہیں اور ۱۹۴۷ میں آزادی کے فوراً بعد یہاں زمینی قانون نافذ کیا گیا۔ اس لیے ان کے کردار کشمیر کی فضا سے میل نہیں کھاتے۔ پریمی نے کئی جگہ کشمیری الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ اچھا ہوتا کہ وہ اردو کے قاری کو ان الفاظ کے معنی سمجھا دیتے۔ برج پریمی کے آخری افسانوں میں منٹو کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں بھی ان کی شریف النفسی اور ان کے ماحول کی قدامت

پسندی آڑے آتی۔ (عصری تحریریں)

ظاہر ہے برج پریمی جموں کشمیر کے ایک بزرگ نقاد اور افسانہ نگار تھے۔ دیپک بدکی نے نہایت ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے برج پریمی کے افسانوں کی تکنیکی کمزوری کی نشان دہی کی ہے۔ جہاں تک ان کے منٹو جیسے افسانہ نگار سے متاثر ہونے کا سوال ہے۔ یہ بہت زیادہ قابلِ گرفت بات نہیں ہے۔ برج پریمی کا شمار ان ناقدوں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے سب سے پہلے منٹو کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔ اور منٹو شناسی میں معتبر قرار پائے۔

گلزار جتنے شاعر ہیں اتنے ہی افسانہ نگار ہیں جتنے افسانہ نگار ہیں اتنے ہی فلم میکر ہیں۔ اس طرح گلزار کی پوری زندگی فن اور فنکاروں کے درمیان گزری ہے۔ بہت پہلے گلزار کے افسانوی مجموعے ''دھواں'' پر جب ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ تفویض ہوا تب ان کے خلاف کئی آوازیں اٹھیں۔ اور ان کے ایوارڈ کو جانب داری کا نام دیا گیا۔ ایم مبین لکھتے ہیں۔

> ''گلزار صاحب کی تحریروں پر قلم اٹھاتے وقت بڑے بڑے قلم کاروں کے قلم کانپتے ہیں لیکن دیپک بدکی نے بڑی بے باکی سے ان پر نہ صرف قلم اٹھایا ہے بلکہ ان کے فن کی خامیوں کو بھی پیش کیا ہے۔'' (حوالہ ورق ورق آئینہ صفحہ نمبر ۲۱۸)

گلزار کی افسانوی کہکشاں پر اظہار خیال کرتے ہوئے دیپک بدکی نے لکھا ہے:-

> افسانہ 'دھواں' ہمارے معاشرے پر تیکھا طنز ہے۔ جس میں مذہب کے نام پر مُردوں کی حرمت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ جب کہ زندوں کو جلایا جاتا ہے۔ افسانے میں گاؤں کا چودھری جو انسان دوست اور سچا مسلمان ہوتا ہے۔ یہ وصیت کرتا ہے کہ اس کی لاش کو جلا کر راکھ گاؤں کے کھیتوں پر بکھیری جانی چاہیے۔ اس کی وفا شعار بیوی اس کی وصیت کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی ہے مگر گاؤں کے مسلم مولوی اور ہندو پنڈت دونوں اس کی مخالفت کرتے ہیں اور رات کے اندھیرے میں زبردستی اس کی لاش کو گاڑ دیتے ہیں۔ جب کہ اس کی مسلمان بیوی کو مکان سمیت زندہ جلاتے ہیں۔''
>
> (عصری تحریریں)

گلزار کی ایک کہانی مائیکل انجیلو پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے دیپک بدکی نے افسانہ نگار کی ایک

تاریخی غلطی کی نشاندہی بھی کی ہے۔اس سے دیپک بدکی کے سنجیدہ مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔

''اس کہانی میں تواریخی طور پر افسانہ نگار سے سہو قلم ہو چکا ہے۔ بقول افسانہ نگار یسوعؑ کے تیرہ شاگرد تھے اور تیرہویں شاگرد نے تیس سونے کے سکوں کے عوض نمک حرامی کی۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یسوعؑ کے بارہ شاگرد تھے اور نمک حرامی کرنے والے شاگرد نے محض تیس چاندی (سونے کے نہیں) کے سکوں کے عوض یسوعؑ سے دغابازی کی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور سہو جو افسانہ نگار سے ہوا ہے وہ یہ ہے کہ 'دی لاسٹ سپر' (The Last Supper) پینٹنگ مائیکل اینجلو نے نہیں بلکہ لیونارڈو ڈاونچی (Leonardo Da Vinci) نے بنائی ہے۔اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان تواریخی غلطیوں کے ہوتے ہوئے بھی افسانے میں کہیں کوئی کمی نظر نہیں آتی اور اس کا افسانوی تاثر برقرار رہا ہے۔''

(گلزار کی افسانہ نگاری۔عصری تحریریں۔ص ۴۷-۴۶)

دیپک بدکی نے سلگتے ہوئے مسائل پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ ہندو مسلم موضوع بڑا حساس موضوع ہے۔ایک طرف یہ دونوں فرقے شیر وشکر ہیں تو دوسری طرف ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بھی ہیں۔۱۹۴۷ کے بعد اس حساس موضوع پر بہت سے افسانے لکھے گئے۔دھواں بھی ان میں سے ایک ہے۔گلزار کی افسانہ نگاری پر دیپک بدکی کی یہ عالمانہ رائے بہت اہم ہے۔ یہ ایک ناقد کی اختصار پسندی کا ثبوت ہے۔جیسے قطرے میں سمندر سمو دیا گیا ہو۔مثلاً

''چھوٹی چھوٹی سی وارداتیں جنہیں ہم اکثر نظر انداز کرتے ہیں گلزار کے افسانوں کا موضوع بن چکی ہیں۔ان کے موضوعات کی بوقلمونی اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا مشاہدہ وسیع ہے اور مطالعہ گہرا۔وہ اپنے اردگرد سے ہی اپنے کردار بھی چنتے ہیں اور حقیقت نگاری سے ان کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔'' (عصری تحریریں)

دیپک بدکی جس تخلیقی فنکار پر قلم اٹھاتے ہیں نہ اس کی شخصیت سے مرعوب ہوتے ہیں نہ اس کے افکار و خیال کو خود پر مسلط ہونے دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی رائے پیش کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتے۔

تنقید ذہنی بصیرت اور فکری جہتوں کے نقش و نگار کی وضاحت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن ناقد بھی ایک انسان ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے کبھی کبھی کسی فنکار کے ساتھ زیادتی بھی ہو جاتی ہے۔ تخلیق ہر حال میں پہلے نمبر پر ہے۔ تنقید کا نمبر دوسرا ہے۔ لیکن ایماندار ناقد اس دوسرے نمبر سے گزر کر بھی پہلا نمبر حاصل کر لیتا ہے۔ اپنی مختصر ناقدانہ تحریروں کے تناظر میں دیپک بدکی نے پہلا نمبر حاصل کیا ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے یہ چند جملے ملاحظہ کریں۔ جو دیپک بدکی کی تنقیدی پرتوں کو اُجاگر کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔

> ''دیپک بدکی کی تنقید محض دل کی ترنگ اور موج میلے سے بلند ہو کر فنی قیود کے سانچے میں ڈھل کر نہیں نکھری ہے بلکہ لکھنے والے کی دماغی ساخت۔ اس کی معلومات اور اس کی سلامت روی کو انہوں نے ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ اس لیے تخلیق کار یا فن پارے کی سمجھ بوجھ کی روشنی ان کی تنقید میں ہوتی ہے۔ (سہ ماہی اسباق- گوشہ دیپک بدکی)

دیپک بدکی کی تنقیدی بصارت اور فنکارانہ دبازت کی تفہیم و تشریح کے لیے چند صفحات کم پڑتے ہیں۔ اس موضوع پر مفصل لکھا جائے تو ایک کتاب بھی کم پڑے گی اردو دنیا کی ذمہ داری ہے کہ اس جی دار، طرح دار اور جیالے اور باوقار ناقد کی اہمیت کو سمجھے اور اس کی عصری تحریروں سے تازہ اذہان کو متعارف کرائے۔

میں 'عصری تحریریں' کے مطالعہ کے بعد دیپک بدکی کو ایک اختصار پسند ناقد سمجھتا ہوں۔ جنہوں نے اپنی مختصر تحریروں میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کسی موضوع کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ ہر ایک کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔

☆☆☆☆☆

☆مضمون نگار: نذیر فتح پوری، ایڈیٹر سہ ماہی اسباق، پونے؛ پوسٹ بکس ۱۳؛ یراوڈا، پونے ـ ۴۱۱۰۰۶؛ موبائیل: 9822516338 بحوالہ 'عصری تحریریں'، مصنف: دیپک بدکی، ناشر میزان پبلشرز، سرینگر، کشمیر، اشاعت ۲۰۰۶ء، ضخامت: ۲۷۸ صفحات؛ قیمت ۲۵۰ روپے

دیپک بدکی بحیثیت تبصرہ نگار

--ڈاکٹر شیخ صفیہ بانو

تخلیقی ادب کے اپنے مثبت و منفی مسائل و اثرات ہوتے ہیں۔ تخلیق کار اپنی تخلیقی صلاحیت سے مطالعے اور مشاہدے کا سہارا لے کر روزمرہ کے حالات، زندگی کی اٹل سچائیوں اور تصوراتی دنیا سے روشناس کراتا ہے۔ اپنے خیالات کی ترسیل میں کون کتنا کامیاب ہوتا ہے یہ اس کے اسلوب پر منحصر ہوتا ہے۔ تاہم ہر شاعر و نثر نگار فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ہر تخلیق کو اپنے مخصوص انداز میں لکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں ہمیشہ ترقی کی منزلیں طے کرنے کی کوششیں جاری و ساری رکھتا ہے تا کہ پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر اپنے تاثرات چھوڑ سکے۔ بقول غالبؔ:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اس شعر کے ذریعے غالبؔ نے اپنے انداز بیان کو ہم عصروں سے الگ اور منفرد بتایا ہے۔ وہ اسلئے کیوں کہ غالبؔ جس زمانے میں شاعری کر رہے تھے اس وقت ایک سے بڑھ کر ایک معیاری شاعری کرنے والے شاعر کارزارِ ادب میں موجود تھے مثلاً ذوقؔ، مومنؔ، سوداؔ، حالیؔ، وغیرہ۔ اسی طرح جیسے شاعر اپنی بات شعری پیرائے میں کہنے میں ماہر ہوتا ہے ویسے ہی نثر نگار بھی اپنی بات نثر میں کہنے کے لیے فکشن، مضامین، مکتوب نگاری اور تنقید وغیرہ کا سہارا لیتا ہے اور اسے بڑی خوبصورتی سے قاری کے سامنے رکھ لیتا ہے۔ مثال کے طور پر سرسید نے اپنی نگارشات سے ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں بھی ہر طرح کی اور ہر طرح سے بات کہی جا سکتی ہے۔ اس بات کی تصدیق عبداللطیف اعظمی نے اپنے مضمون میں سرسید کے حوالے سے اس طرح کی ہے:-

''جہاں تک ہم سے ہو سکا، ہم نے اردو زبان کی علم و ادب کی ترقی میں، اپنے ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی (ا) مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ

اختیار کیا (۲) رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور استعاراتِ خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا (۳) اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو (۴) جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔'' [۱]

سرسید جس زمانے میں لکھ رہے تھے اس وقت لوگوں میں نثری اصناف کی اتنی بیداری نہیں تھی۔ سرسید نے پڑھنے اور لکھنے کے آداب سکھائے اور یہی وجہ ہے کہ قوم میں علمی بیداری لانے والے سرسید جیسی شخصیت کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے حالانکہ سرسید کے زمانے میں نواب محسن الملک، نواب وقارالملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاءللہ، خواجہ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولانا نذیر احمد، اور مولوی زین العابدین جیسے ادیب موجود تھے۔

جس طرح شعر کہنا اور نثر میں اظہارِ خیال کرنا مشکل ہوتا ہے اسی طرح تخلیقات کو ادب کی کسوٹی پر پرکھ کر اس پر تنقید کرنا یا پرمغز تبصرہ کرنا بھی بہت مشکل اور محنت طلب کام ہے۔ اردو کے ابتدائی زمانے میں اس کا رواج عام نہیں تھا جس کے سبب بہت سی اہم کتابیں گمنامی کی بھول بھلیوں میں کھو گئیں۔ حالانکہ ابتدائی زمانے میں چند ادیبوں نے تذکرے رقم کر کے اردو پر بہت بڑا احسان کیا مگر حقیقی شروعات حالی کی تنقید نگاری سے ہوئی۔ حالی کے بعد تنقید نگاروں کا ایک کارواں سامنے آیا جس میں کچھ اہم نام یوں ہیں؛ کلیم الدین احمد، رشید احمد صدیقی، امداد امام اثر، مولوی عبدالحق، افسر میرٹھی، وزیر آغا اور شمس الرحمن فاروقی وغیرہ۔

دراصل تبصرہ ایسا فن ہے جس کے ذریعے مبصر تخلیق کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرتا ہے اور اس طرح قارئین کو کتاب پڑھنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ بعض لوگ تبصرہ کو تنقید کا ہی ایک جزو مانتے ہیں کیونکہ اس میں تبصرہ نگار کی علمیت اور تجزیاتی ذہن کارفرما ہوتے ہیں اور وہ تخلیق کو اپنے تنقیدی میزان کی کسوٹی پر پرکھ کر اس پر اپنی رائے ظاہر کرتا ہے۔ عبادت بریلوی تبصرہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:-

'' تبصرہ نگاری کو پوری طرح تنقید تو نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ اس کا مقصد تنقید سے

قدرے مختلف ہوتا ہے۔"[۲]

اسی بات کو کلیم الدین احمد نے بھی اپنے انداز میں لکھا ہے۔ وہ اپنے مضمون 'اردو میں تبصرہ نگاری' میں اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

"تبصرہ ایک فن ہے اور فن تنقید کی ایک شاخ۔ اردو میں فن تنقید، اس کے اصول اور اغراض و مقاصد سے صحیح واقفیت نہیں۔"[۳]

مذکورہ حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تبصرہ تنقید کے بہت نزدیک ہوتے ہوئے بھی الگ حیثیت رکھتا ہے۔ پس یہ ثابت ہوا کہ تبصرہ تنقیدی صنف کی ہی ایک شاخ ہے مگر اس میں وہ بال کی کھال اتارنے والا معاملہ نہیں رہتا ہے جو تنقیدی مضامین میں نظر آتا ہے۔ دراصل یہ پرنٹ میڈیا کی دین ہے۔ جب کتابیں بڑی تعداد میں چھپنے لگیں تو ایک طرف ان کی نکاسی کا مسئلہ سامنے آیا اور دوسری طرف تعلیم کے پھیلاؤ کے سبب بازار میں کتابوں کی طلب بہت زیادہ بڑھنے لگی۔ ان دونوں مسئلوں کا حل ڈھونڈنے کے لیے اخبار اور رسالے سامنے آئے تاکہ صحیح کتاب صحیح ہاتھ میں پہنچ سکے۔ اشتہاروں سے یہ کام ناممکن تھا کیونکہ اشتہاروں میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ کوئی تیسرا آدمی، جو نہ مصنف ہو اور نہ ہی قاری ہو، کتاب پڑھے اور اس پر اپنی بے لاگ رائے ظاہر کرے تاکہ انجان قاری یہ سمجھ سکے کہ کتاب کا موضوع کیا ہے اور کارآمد ہے کہ نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم عصر اور آنے والی نسلوں کی رہبری کے لیے نئی کتابوں پر تبصرے لکھے جانے لگے تاکہ لوگ کتاب کی غرض و غایت سے روشناس ہوں اور اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ تاہم مبصر پر یہ ذمہ داری عائد ہوگئی کہ وہ کتاب سے متعلق جو کچھ بھی تاثرات، تجربات و مشاہدات حاصل کرے، اس کو خوش اسلوبی سے اور صرف کام کی باتوں کو اہمیت دیتے ہوئے اس انداز سے تبصرے کے توسل سے قاری تک پہنچائے کہ دلچسپ کتابیں ڈھونڈنے اور پڑھنے والا اس قدر راغب ہو جائے کہ وہ نہ صرف خود اس کتاب کو پڑھے بلکہ دوسروں تک بھی اس کا پیغام پہنچا سکے۔ اس بات کو وقار عظیم مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

"بات کہنے والا بات کہے اور اس نیت اور مقصد سے کہے کہ سننے والا اسے توجہ سے سنے اور اس میں دلچسپی محسوس کرے تو اس کے دل میں یہ معلوم کرنے کی خواہش بھی

بیدار ہوتی ہے کہ سننے والے پراس کی بات کا کیا رد عمل ہوا اور یوں اظہار کی خواہش
اور اس اظہار کا رد عمل دیکھنے کی آرزو ایک ہی احساس کے دو لاینفک جز بن جاتے
ہیں۔اب اگر بات کہنے والا یہ اندازہ کرے کہ اس کی بات اس کے سامع یا مخاطب
کے دل میں اپنی جگہ بنا رہی ہے تو اس کا اثر اس کے اسلوب اظہار پر پڑتا ہے اور اس
کا یہ احساس مسرت کہ اس کی کہی ہوئی بات دوسروں کے لیے باعث کشش اور دل
نشینی ہے۔'' ؎

نقاد کی طرح ہی مبصر کا کام بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ایک طرف مصنف یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی صرف تعریف کرے کیونکہ اپنی تصنیف کو وہ اولاد کی طرح عزیز رکھتا ہے اور دوسری طرف قاری یہ توقع رکھتا ہے کہ مبصر دیانت داری اور کسی تعصب کے بغیر اپنا کام انجام دے اور کھوٹے کو کھرا نہ کہے۔ یہ تو تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہوتا ہے۔مبصر جتنی غیر جانبداری، اختصار اور خوش اسلوبی سے کسی بھی کتاب کے متعلق تبصرہ پیش کرتا ہیں اتنا ہی وہ مؤثر ہوتا ہے اور اسے اپنی پہچان بنانے اور پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لینے میں زیادہ وقت نہیں لگتا ہے۔انجام کار اس مختصر سی معلومات کے زیر اثر لوگ مذکورہ کتاب کو پڑھنے کے لیے راغب ہو جاتے ہیں۔ جدید اردو ادب میں ایسے بہت سے ادیب وصحافی ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے تخلیقی فن کے جوہر دکھائے ہیں بلکہ وہ ایک مبصر کی حیثیت سے بھی سامنے آئے ہیں۔ حال ہی میں یہ روش بھی عام ہو چکی ہے کہ تبصرے تو اخباروں اور رسائل میں چھپیں گے ہی مگر ان کو آنے والی نسل کے لیے محفوظ کرنے کے لیے کتابی صورت میں بھی پیش کیا جانے لگا ہے۔مگر اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ تبصرہ بہت عرق ریزی کے بعد لکھا گیا ہو، رقم کرنے سے پہلے ساری کتاب کا مطالعہ کیا گیا ہو، کتاب کے مثبت ومنفی پہلوؤں کو اختصار کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہو، تجزیے کے دوران اپنے نظریاتی تعصب کو دور رکھ گیا ہو اور تبصرے کو خوش اسلوبی کے ساتھ لکھا گیا ہو۔

ہم عصر افسانوی ادب کے ایک ایسے ہی قلم کار دیپک بدکی ہیں جنہوں نے سنجیدگی سے تبصرہ نگاری کی صنف کو اپنا لیا ہے۔ان کے افسانے ہندو پاک سے لے کر سمندر پار اردو کی نئی بستیوں تک مقبول ہو چکے ہیں۔انہوں نے اپنی زندگی کا بیش قیمت وقت یا تو افادۂ عام کے لیے سرکاری ملازمت یا پھر ادبی

خدمات میں صرف کیا ہے۔ چنانچہ ان کی تحریروں سے ان کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ زندگی کے سفر کے اس پڑاؤ پر بھی دن میں آٹھ دس گھنٹے کتب بینی میں صرف کرتے ہیں۔ ان کی ملازمت کی بات کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پانچ سال کشمیر ایمپوریم میں نوکری کر کے انڈین سِوِل سروس کا امتحان پاس کیا اور پھر بھارتیہ ڈاک محکمے میں تعینات ہوئے۔ اسی نوکری کے دوران وہ نو سال فوج میں ڈیپوٹیشن پر رہے اور لیفٹیننٹ کرنل کا عہدہ پا کر واپس اپنے محکمے میں چلے آئے۔ آخر میں وہ ۲۰۱۰ء میں ممبر (پلاننگ)، پوسٹل سروسز بورڈ کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ انہوں نے جہاں ایک جانب پچھتّر سے زائد خوبصورت افسانے لکھے ہیں وہیں عصری اردو ادب، ادیبوں اور ان کے کارناموں پر تنقیدی مضامین وتبصرے بھی رقم کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ایم مبین اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:-

> ''دیپک بدکی نے نہ صرف افسانہ نویسی کی ہے بلکہ عصری اردو ادب اور عالمی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ انہیں اس دوران جو بھی عصری اردو ادب کی کتابیں پڑھنے کو ملیں انہوں نے بڑے خلوص سے ان کتابوں پر اپنی بیباک رائے لکھی ہے۔'' ۵

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے دیپک بدکی کے تخلیقی سفر کی ابتداء یوں تو بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی سے ہوئی مگر موافق حالات نہ ہونے کے سبب انہوں نے سات آٹھ سال کے بعد لکھنا ترک کر دیا۔ لیکن دل کے کسی گوشے میں لکھنے کی خلش اور اظہار کی چبھن ابھی بھی باقی تھی اس لیے انھوں نے ۱۹۹۶ء سے دوبارہ لکھنا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے گزشتہ سولہ سال میں اردو ادب کو چار افسانوی مجموعے اور تین تنقیدی مضامین وتبصروں کے مجموعے دیے جن کے نام یہ ہیں:

افسانوی مجموعے: (۱) ادھورے چہرے (۲) چنار کے پنجے (۳) زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی
(۴) ریزہ ریزہ حیات

تنقیدی مضامین وتبصروں کے مجموعے: (۱) عصری تحریریں (۲) عصری شعور
(۳) عصری تقاضے

اول الذکر مجموعوں کے افسانے ہندستان، پاکستان اور یورپ کے کئی موٴقر اخباروں اور رسالوں میں چھپے ہیں اور اس کے بعد کتابی شکل میں منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اسی طرح ان کے تنقیدی

مضامین وتبصرے بھی مختلف اخباروں اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں اور ان کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ انٹرنیٹ پر بھی دیپک بدکی کے دو نجی بلاگ ہیں جن پر وہ اپنی تخلیقات کو انٹرنیٹ کی وساطت سے قارئین تک پہنچاتے ہیں۔

1)deepakbudki.com 2)budki.blogspot.in

بدکی نے جب باقاعدگی سے افسانے لکھنا شروع کیا تھا تب اس بات کا اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ وہ جتنے اچھے افسانے تحریر کرتے ہیں اتنے ہی اچھے تبصرے بھی تحریر کریں گے۔ اس بات کی توثیق عصری اردو ادب کی کتابوں پر کیے گئے ان کے تبصروں اور تنقیدی مضامین سے ہوتا ہے جو اب کتابی شکل میں 'عصری تحریریں'، 'عصری شعور' اور 'عصری تقاضے' کے نام سے ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ اس میدان میں قدم رکھنے کے بارے میں تبصرہ نگار خود ہی 'عصری تحریریں' کے 'حرف اول' میں فرماتے ہیں کہ:

> "یہ محض اتفاق تھا کہ میں نے تبصرہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ ہوا یوں کہ ماہنامہ انشاء کولکتہ کے مدیر ف س اعجاز نے اپنی تصنیف 'صاحب فن' میری رائے جاننے کے لیے بھیج دی۔ رائے قلم بند کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ میں کتاب پڑھوں، سمجھوں اور پھر اپنے تاثرات لکھ دوں۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر نہ جانے کہاں سے کتابوں کا ایک سیلاب سا آیا...... تاثرات لکھتے وقت میں نے کبھی بخیلی سے کام نہیں لیا البتہ جن کتابوں پر تبصرے لکھے، ان کو اول تا آخیر پڑھا، نوٹس بنائے، اور پھر اپنے تاثرات قلم بند کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تبصروں میں نہ تو عام تبصروں کی سطحیت اور اختصار ملے گا اور نہ ہی تنقیدی مضامین عمق اور طوالت۔ یہ تاثراتی تبصرے کسی مخصوص مکتب فکر کی دین نہیں ہیں" [6]

اپنی تبصرہ نگاری کے بارے میں دیپک بدکی 'عصری شعور' کے حرف آغاز میں مزید لکھتے ہیں:-

> "یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ میں نے روایتی تبصرے قلمبند کرنے سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ چنانچہ میں نہ تو کسی رسالے سے وابستہ ہوں اور نہ ہی کسی ایڈیٹر کے تقاضے کی امید کرتا ہوں۔ اس لیے میں زمانی و مکانی بندشوں اور حد بندیوں سے آزاد ہوں۔ عام طور پر رسالوں کے لیے عجلت میں بہت ہی مختصر تبصرے تحریر کیے جاتے ہیں جن

سے قاری کی تشنگی برقرار رہتی ہے۔ میں جب تک تصنیف کو اوّل سے آخر تک نہیں
پڑھتا، اس پر قلم نہیں اٹھاتا اور جب اس تصنیف کو پورا پڑھتا ہوں تو کم سے کم الفاظ
میں اس کا لب لباب پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ساتھ ہی اپنی بے لاگ رائے
بھی قلمبند کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ زیر نظر تصنیف سے چیدہ چیدہ اشعار یا اقتباسات
بھی ہائی لائٹ کرتا ہوں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی
جانب راغب ہو جائے اور تخلیق کار کو اپنی محنت کا پھل مل جائے۔'' ۷

دیپک بدکی کی تبصرہ نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رفیق شاہین تحریر کرتے ہیں
کہ:

''تبصروں اور تاثرات میں مباحث اور تماثیل کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ شعور
ادراک اور افہام تفہیم کو بروئے کار لا کر ہی اپنے Subject کا محاسبہ کرنا ضروری
خیال کرتے ہیں۔ وہ اپنی نپی تلی زبان کا استعمال کرتے ہیں اور کسی فنکار کے محاسن
بیان کرتے وقت نہ تو جذباتی ہوتے ہیں اور نہ جانب داری کے غار میں گرتے ہیں۔ ۸

اسی طرح ڈاکٹر انوار احمد انصاری دیپک بدکی کی تبصرہ نگاری پر یوں رقم طراز ہیں:

''تبصرے اور تنقیدی مضمون میں کافی فرق ہوتا ہے لیکن دیپک بدکی نے اپنی رائے
ظاہر کرنے کے لیے بیچ کا راستہ اپنایا ہے جسے تاثراتی تنقید کہا جا سکتا ہے۔ ایک طرح
سے انھوں نے ایک نئی صنف کی بنیاد ڈالی ہے۔'' ۹

اس طرح یہ واضح ہے کہ دیپک بدکی نے نہ صرف انتقادیات کو بلکہ تبصرہ نگاری کو بھی بڑی
سنجیدگی سے لیا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ وہ اس میدان میں بھی ادب کی نئی راہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

نمبر	مصنف	حوالہ (کتاب/رسالہ)	صفحہ
(۱)	عبدالطیف اعظمی	اردو نثر کی ترقی میں سرسید کا حصہ	

مضامین وتبصرے بھی مختلف اخباروں اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں اور ان کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ انٹرنیٹ پر بھی دیپک بدکی کے دو نجی بلاگ ہیں جن پر وہ اپنی تخلیقات کو انٹرنیٹ کی وساطت سے قارئین تک پہنچاتے ہیں۔

1)deepakbudki.com 2)budki.blogspot.in

بدکی نے جب باقاعدگی سے افسانے لکھنا شروع کیا تھا تب اس بات کا اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ وہ جتنے اچھے افسانے تحریر کرتے ہیں اتنے ہی اچھے تبصرے بھی تحریر کریں گے۔ اس بات کی توثیق عصری اردو ادب کی کتابوں پر کیے گئے ان کے تبصروں اور تنقیدی مضامین سے ہوتا ہے جو اب کتابی شکل میں 'عصری تحریریں'، 'عصری شعور' اور 'عصری تقاضے' کے نام سے ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ اس میدان میں قدم رکھنے کے بارے میں تبصرہ نگار خود ہی 'عصری تحریریں' کے 'حرف اول' میں فرماتے ہیں کہ:

> ''یہ محض اتفاق تھا کہ میں نے تبصرہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ ہوا یوں کہ ماہنامہ انشاء کولکتہ کے مدیر ف س اعجاز نے اپنی تصنیف 'صاحب فن' میری رائے جاننے کے لیے بھیج دی۔ رائے قلم بند کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ میں کتاب پڑھوں، سمجھوں اور پھر اپنے تاثرات لکھ دوں۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر نہ جانے کہاں سے کتابوں کا ایک سیلاب سا آیا......تاثرات لکھتے وقت میں نے کبھی بخیلی سے کام نہیں لیا البتہ جن کتابوں پر تبصرے لکھے، ان کو اول تا آخیر پڑھا، نوٹس بنائے، اور پھر اپنے تاثرات قلم بند کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تبصروں میں نہ تو عام تبصروں کی سطحیت اور اختصار ملے گا اور نہ ہی تنقیدی مضامین عمق اور طوالت۔ یہ تاثراتی تبصرے کسی مخصوص مکتب فکر کی دین نہیں ہیں'' ٦

اپنی تبصرہ نگاری کے بارے میں دیپک بدکی 'عصری شعور' کے حرف آغاز میں مزید لکھتے ہیں:-

> ''یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ میں نے روایتی تبصرے قلمبند کرنے سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ چنانچہ میں نہ تو کسی رسالے سے وابستہ ہوں اور نہ ہی کسی ایڈیٹر کے تقاضے کی امید کرتا ہوں۔ اس لیے میں زمانی ومکانی بندشوں اور حد بندیوں سے آزاد ہوں۔ عام طور پر رسالوں کے لیے عجلت میں بہت ہی مختصر تبصرے تحریر کیے جاتے ہیں جن

سے قاری کی تشنگی برقرار رہتی ہے۔ میں جب تک تصنیف کو اوّل سے آخر تک نہیں
پڑھتا، اس پر قلم نہیں اٹھاتا اور جب اس تصنیف کو پورا پڑھتا ہوں تو کم سے کم الفاظ
میں اس کا لب لباب پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ساتھ ہی اپنی بے لاگ رائے
بھی قلمبند کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ زیر نظر تصنیف سے چیدہ چیدہ اشعار یا اقتباسات
بھی ہائی لائٹ کرتا ہوں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی
جانب راغب ہو جائے اور تخلیق کار کو اپنی محنت کا پھل مل جائے۔'' ۷

دیپک بدکی کی تبصرہ نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رفیق شاہین تحریر کرتے ہیں
کہ:

''تبصروں اور تاثرات میں مباحث اور تماثیل کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ شعور
ادراک اور افہام تفہیم کو بروئے کار لا کر ہی اپنے Subject کا محاسبہ کرنا ضروری
خیال کرتے ہیں۔ وہ اپنی نپی تلی زبان کا استعمال کرتے ہیں اور کسی فنکار کے محاسن
بیان کرتے وقت نہ تو جذباتی ہوتے ہیں اور نہ جانب داری کے غار میں گرتے ہیں۔ ۸

اسی طرح ڈاکٹر انوار احمد انصاری دیپک بدکی کی تبصرہ نگاری پر یوں رقم طراز ہیں:

''تبصرے اور تنقیدی مضمون میں کافی فرق ہوتا ہے لیکن دیپک بدکی نے اپنی رائے
ظاہر کرنے کے لیے بیچ کا راستہ اپنایا ہے جسے تاثراتی تنقید کہا جاسکتا ہے۔ ایک طرح
سے انھوں نے ایک نئی صنف کی بنیاد ڈالی ہے۔'' ۹

اس طرح یہ واضح ہے کہ دیپک بدکی نے نہ صرف انتقادیات کو بلکہ تبصرہ نگاری کو بھی بڑی
سنجیدگی سے لیا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ وہ اس میدان میں بھی ادب کی نئی راہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

نمبر	مصنف	حوالہ (کتاب/رسالہ)	صفحہ
(۱)	عبدالطیف اعظمی	اردو نثر کی ترقی میں سرسید کا حصہ	

		(سہ ماہی ادیب خصوصی شمارہ جامعہ اردو علی گڈھ)	۱۷۳
(۲)	عبادت بریلوی	تبصرہ نگاری (اردو تنقید کا ارتقاء)	۴۵۸
(۳)	کلیم الدین احمد	اردو میں تبصرہ نگاری (اردو تنقید پر ایک نظر)	۳۲۷
(۴)	وقار عظیم	مضمون 'افسانہ نگار اور قاری' از فنِ افسانہ نگاری	۲۵۱_۱۵۲
(۵)	ایم مبین	مضمون 'عصری تحریریں۔ معاصر ادب کا آئینہ' (ورق ورق آئینہ..دیپک بدکی شخصیت اور فن)	۲۱۶
(۶)	دیپک بدکی	حرف اوّل، عصری تحریریں (تنقیدی مضامین وتبصرے)	۱
(۷)	دیپک بدکی	حرف آغاز، عصری شعور (تنقیدی مضامین وتبصرے)	۱
(۸)	رفیق شاہین	آسمان تنقید کا درخشاں ستارہ۔ دیپک بدکی (بحوالہ ورق ورق آئینہ، دیپک بدکی۔ شخصیت اور فن)	۲۰۶
(۹)	انوار احمد انصاری	عصری تحریریں (بحوالہ ورق ورق آئینہ، دیپک بدکی۔ شخصیت اور فن)	۲۵۵

☆☆☆☆☆

☆ مضمون نگار: ڈاکٹر شیخ صفیہ بانو اختر حسین، احمد آباد؛ ماخوذ مقالہ بعنوان 'دیپک بدکی کے تخلیقی افکار کا تنقیدی مطالعہ' برائے پی ایچ ڈی، ایم ایس یونیورسٹی آف بروڈہ، فروری ۲۰۱۴ء

==

Traffic Statistics of Blogs (Views)

Budki Ki Duniya		Budki's World	
کل ویوز	197944	کل ویو	41831
ڈاکٹر آنٹی	66696	ایک نہتے مکان کا ریپ	4906
میں ساری کی ساری تمھاری	21203	ٹھنڈی آگ	3075
ٹھنڈی آگ	19584	ڈاکٹر آنٹی	2184

دیپک بُدکی - ایک ہمہ جہت قلم کار

--توصیف مجید لون

ریاست جموں وکشمیر کے افسانوی افق پر دیپک بدکی ایک مشہور اور معتبر نام ہیں جو بیک وقت کرنل بھی رہے ہیں اور جرنل بھی، افسانہ نگار بھی اور تبصرہ نگار بھی، ناقد بھی اور صحافی بھی۔ادبی دنیا میں وہ بحیثیت افسانہ نگار شہرت کی بلندیوں سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ان کی کہانیاں مشہور و معروف ملکی اور غیر ملکی اخبارات اور رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔انھوں نے اردو اور انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے،اور عصری ادب پر ان کی خصوصی نظر ہے۔اگرچہ انھوں نے کافی تاخیر سے لکھنا شروع کیا لیکن اس دوران میں وہ مشاہدات و تجربات کی منزلوں سے گزرتے رہے۔عمیق مشاہدے، ذاتی تجربے اور وسیع مطالعے نے بہت جلد ان کی تحریروں کو وہ پختگی عطا کر دی جو دوسرے قلمکاروں کو ایک عمر کی ریاضت کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

دیپک کمار بدکی، جو ادبی دنیا میں دیپک بدکی کے قلمی نام سے مشہور ہیں،۱۵رفروری ۱۹۵۰ء کو سرینگر، کشمیر کے پائیں علاقے وازہ پورہ، کرالہ ٹینگ، مہاراج گنج میں پیدا ہوئے۔ وادیٔ کشمیر میں یونیورسٹی تک پڑھائی کر لی اور ایم ایس سی (بوٹنی) و بی ایڈ کی ڈگریاں حاصل کر لیں۔علاوہ ازیں جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب ماہر کی سند حاصل کر لی۔ملازمت کے سلسلے میں ملک کے مختلف علاقوں جیسے چنڈی گڑھ، دہلی، یوپی، گوہاٹی وڈبروگڑھ (آسام)،شیلانگ (میگھالیہ)، اگرتلا (تریپورا)، وڑودرا (گجرات) اور گوا وغیرہ میں کافی عرصے تک تعینات رہے جن کی پرچھائیاں ان کی تخلیقات پر صاف طور پر نظر آتی ہیں۔۱۹۷۵ء میں انھوں نے انڈین سول سروسز کا امتحان پاس کیا اور انڈین پوسٹل سروسز میں الاٹ ہوئے جہاں وہ سینئر سپرانٹینڈنٹ سے

لے کر چیف پوسٹ ماسٹر جنرل کی منزل طے کرتے ہوئے آخر کار ممبر پوسٹل سروسز بورڈ کے عہدے سے ۲۰۱۰ء میں سبکدوش ہوگئے۔ سبکدوشی کے بعد آج کل وہ بدستور ادب، خاص کر اردو افسانے، کی آبیاری جاری وساری رکھے ہوئے ہیں۔

جہاں تک دیپک بدکی کی ادبی زندگی کا تعلق ہے اس کا آغاز ۱۹۷۰ء میں افسانہ 'سلمیٰ' سے ہوا جو سرینگر کے روزنامہ 'ہمدرد' میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ مقامی اخباروں 'آفتاب'، 'نشیمن'، 'عقاب' اور پولیٹکل ٹائمز میں چھپتے رہے۔ ۱۹۷۴ء میں دیپک بدکی کا ایک افسانہ 'ریزے' دوردرشن سرینگر سے 'ایک کہانی' پروگرام کے تحت ٹیلی کاسٹ ہوا۔ انہی دنوں ان کی کہانیاں 'رفتار' جموں، 'تعمیر ہریانہ' چنڈی گڑھ، 'رگ سنگ' کانپور، گنگ وجمن' کانپور اور 'تعمیر' سرینگر میں بھی چھپ گئیں لیکن ۱۹۷۸ء سے لے کر ۱۹۹۵ء تک ان کے تخلیقی عمل پر جمود سا چھا گیا اور اس دورانیے میں انھوں نے لکھنا ترک کرلیا۔ اس کے بعد ۱۹۹۶ء سے آج تک اٹھارہ برسوں میں انھوں نے ایک سو (۱۰۰) سے زائد افسانے اور متعدد تنقیدی مضامین وتبصرے لکھے ہیں۔

بقول دیپک بدکی:

> ''یہ سب کارروائی اس جنون کی دین ہے، جس
> نے مجھے اردو زبان خاص کر اردو افسانے سے
> جوڑے رکھا۔''!

سرینگر، کشمیر میں دیپک بدکی چند ایک اخبارات جیسے 'جہان نو'، 'نوجیون، ہمارا کشمیر' اور 'عقاب' کے لیے مختصر مدت تک کارٹون بناتے رہے۔ ہفت روزہ 'عقاب' سرینگر کے ساتھ وہ بحیثیت جوائنٹ ایڈیٹر بھی تقریباً ایک سال منسلک رہے۔ اس کے علاوہ وہ ریڈیو کشمیر کی یووانی و جنرل سروسز اور دوردرشن سری نگر کے پروگراموں میں بھی شرکت کرتے رہے۔

اب تک دیپک بدکی کی جو تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں، ان کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

افسانوں کے مجموعے:

۱۔ادھورے چہرے (افسانوی مجموعہ) اردو- پہلا ایڈیشن، ۱۹۹۹ء، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۵ء،
تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء، ہندی- پہلا ایڈیشن، ۲۰۰۵ء،

۲۔چنار کے پنجے (افسانوی مجموعہ) اردو- پہلا ایڈیشن، ۲۰۰۵ء، دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء،
ہندی- پہلا ایڈیشن ۲۰۱۰ء

۳۔زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (افسانوی مجموعہ) اردو- پہلا ایڈیشن، ۲۰۰۸ء

۴۔ریزہ ریزہ حیات (افسانوی مجموعہ) اردو- پہلا ایڈیشن، ۲۰۱۱ء

تنقیدی مضامین وتبصروں کے مجموعے:

۵۔عصری تحریریں (تنقیدی مضامین وتبصرے) پہلا ایڈیشن، ۲۰۰۷ء

۶۔عصری شعور (تنقیدی مضامین وتبصرے) پہلا ایڈیشن، ۲۰۰۹ء

۷۔عصری تقاضے (تنقیدی مضامین وتبصرے) پہلا ایڈیشن ۲۰۱۳ء

مزید ان کی تین کتابیں 'روح کا کرب' (افسانوں کا مجموعہ)، 'مٹھی بھر ریت' (افسانچوں کا مجموعہ) اور 'عصری تناظر' (تنقیدی مضامین وتبصرے) زیر ترتیب ہیں۔

دیپک بدکی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کہانی پن کے قائل ہیں اور غیر ضروری علامتوں اور استعاروں سے پرہیز کرتے ہیں۔وہ اپنی کہانیوں کے موضوعات اپنے گردو پیش کی زندگی سے لیتے ہیں اور پھر ان موضوعات کو پوری جزئیات کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔

افسانہ نگار اپنے افسانوں میں ابتدا ہی سے ایسی فضا تیار کر لیتے ہیں کہ قاری جب پڑھنا شروع کرتا ہے تو اس کا تجسس اس کو آگے کھینچتا ہی چلا جاتا ہے اور وہ پوری کہانی ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔اس کی عمدہ مثالیں بدکی کے کئی افسانوں میں ملتی ہیں۔ان کی کہانی 'رشتوں کا درد' کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی ہے:

''اپنی بیوی کی ارتھی میں نے کئی بار
اٹھائی.........مجھے بخوبی یاد ہے کہ پہلی
بار میں نے شادی کے چوتھے دن ہی اس کی

ارتھی کو کاندھا دیا تھا۔ مرتے دم اس کی آنکھیں
ایسے لگ رہی تھیں جیسے کسی خواب پریشان
میں محو ہوں۔ میں نے بے نیازی سے ان
آنکھوں کے کواڑ بند کیے تھے۔'' ۲

دیپک بدکی کے افسانوں میں ایک طرف کشمیر کی مظلوم عوام پر ہونے والے ظلم وستم کا ذکر ملتا ہے تو دوسری طرف عراق میں ہونے والے خونیں حادثات کی تصویر کشی ملتی ہے۔ وہ ایک طرف سماجی وسیاسی کارستانیوں کی زد میں آئے نہتے لوگوں کی بات کرتے ہیں تو دوسری طرف ریاستی جبر وتشدد کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ جہاں وہ ایک طرف دہشت گردی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، وہیں دوسری طرف آمریت اور سامراجیت کے خلاف بھی سینہ سپر ہوتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال ان کے افسانے 'مخبر'، 'معصوم علی'، 'ریزہ ریزہ حیات' وغیرہ ہیں۔ افسانہ 'مخبر' میں دو ہتھیار بند نوجوان عمر رسیدہ، معذور اور بے قصور میاں بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں جبکہ دوسرے روز ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت اس خبر کو توڑ مروڑ کر مقامی اخباروں میں نمایاں طور پر یوں چھپوایا جاتا ہے:

''حبہ کدل میں مجاہدوں نے نیل کنٹھ اور ارن
دتی نامی دو مخبروں کو ہلاک کر دیا۔ ان پر شبہ
تھا کہ وہ فوج کے سراغ رساں ایجنسی کے لیے
سرگرم عمل تھے۔'' ۳

'معصوم علی' میں عراق کا ایک معصوم بچہ بمباری کی زد میں آکر اپنے دونوں بازو کھو دیتا ہے اور ہسپتال میں ہر کسی سے پوچھتا ہے کہ اس کا قصور کیا ہے۔ اسی طرح 'ریزہ ریزہ حیات' میں ایک تجارت پیشہ آدمی کے دو بچے دہشت کی نذر ہو جاتے ہیں اور وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر پرندوں میں اپنے بچے ڈھونڈتا رہتا ہے۔

جہاں تک افسانوں کے موضوعات کا تعلق ہے، کشمیر افسانہ نگار کا غالب موضوع رہا

ہے۔ 'اچانک' میں انھوں نے کشمیر کی مذہبی رواداری، 'ورثے میں ملی سوغات' میں ہسپتالوں کی خستہ حالی، ویوگ میں کشمیری رسم و رواج، 'آؤ کچھ اور لکھیں' میں ریڈیو کشمیر میں ٹیلنٹ کی ان دیکھی اور 'شیر اور بکرا' میں فرقہ وارانہ تشدد کو موضوع بنایا ہے۔ گذشتہ پچیس برسوں کے دوران کشمیر جس پر آشوب دور سے گزر رہا ہے اس کی المناک تصویریں ان کے اکثر افسانوں میں ملتی ہیں۔ 'گھونسلہ، ایک نہتے مکان کا زیپ، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، شیر اور بکرا، حرص گناہ'، 'سفید کراس'، چنار کے پنجے' اور 'مخبر' جیسے افسانوں میں کشمیر کے اس دور کی تصویر پورے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ 'گھونسلہ' افسانے میں ایک طرف پرندوں کے 'جنون تعمیر' کی کارفرمائی بڑی ہنر مندی کے ساتھ دکھائی گئی ہے تو دوسری طرف انسانی تخریب کی تباہ کاریوں پر بھرپور واویلا کیا گیا ہے۔ گھونسلہ دراصل اس درد و کرب کا علامتی و استعاراتی اظہار ہے، جو کشمیر کے ایک طبقے کو معاصر سیاست کی وجہ سے جھیلنا پڑا۔ البتہ یہ کہانی صرف اس خاص طبقے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی آفاقیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ یہ کہانی ان مہاجروں کی داستان بھی ہے جو سن ۴۷ء میں اپنے رشتے داروں کی لاشوں کے اوپر سے گزر کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے اور پھر سرحد پار کر کے اجنبی شہروں میں جا بسے، یہ ان لوگوں کی کہانی بھی ہے جو فلسطین، عراق اور کویت میں اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، یہ ان لوگوں کی کہانی بھی ہے جو مذہبی تشدد کی زد میں آکر ممبئی، گجرات اور اتر پردیش میں گھر سے بے گھر ہو گئے۔ گھر کے اجڑنے کا درد، ہجرت اور بے بسی کی داستاں کا نچوڑ افسانے کے آخری سطور میں نہایت ہی فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے:

> ''چڑے نے آخری بار مڑ کر اپنے لٹے ہوئے
> نشیمن پر نظر ڈالی، بڑی کوشش کے بعد پھر سے
> ہمت مجتمع کی، اپنے پر جھاڑے، اور پھر دور نیلے
> آسمان میں نہ جانے کہاں کھو گیا۔'' ۴

معاشرے کا ناکارہ نظام اور فرقہ پرستی بھی دیپک بدکی کے افسانوں کا اہم موضوع رہا ہے۔ جہاں 'دو گز زمین' میں بدکی نے میگھالیہ میں عیسائی فرقہ پرستی کو بے نقاب کیا ہے، وہیں 'شیر

اور بکرا' میں کشمیری مسلمانوں کی اندرونی فرقہ واریت پر وار کیا ہے۔ اسی طرح 'موت کے سوداگر' اور' گاڑی کا انتظار' جیسے افسانوں میں مصنف نے معاصر سماج کو آئینہ دکھایا ہے کہ نظام جب بکھرتا ہے تو ہر کل پُرزہ اپنی جگہ سے اکھڑ جاتا ہے اور استحصال کی کوئی حد نہیں رہتی۔ انسانی اعضا کی تجارت کی، جس کا ذکر 'موت کے سوداگر' میں کیا گیا ہے، اتنے برسوں بعد حال ہی میں نقاب کشائی ہوئی ہے اور ہمیں افسانہ نگار کی پیش گوئی کی داد دینے پر مجبور کرتی ہے۔ بہر حال دیپک بُدکی کے افسانوں میں رجائیت اور مقصدیت کا پہلو نمایاں رہتا ہے۔ ان کے یہاں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہوتا، بلکہ کرداروں کے ذریعے وہ اپنے مقصد کی ترسیل بڑی آسانی سے کرتے ہیں۔

انسانی نفسیات اور جنس بھی دیپک بدکی کے افسانوں کا ایک اور محبوب موضوع رہا ہے۔ یوں تو جنسی موضوعات پر منٹو اور عصمت چغتائی نے ایک سے بڑھ کر ایک کئی افسانے لکھے ہیں۔ ایسے میں کسی جدید افسانہ نگار کا جنس پر قلم اٹھانا بڑے ہی دل گردے کا کام ہے۔ بُدکی کے یہاں نہ تو پیشہ ور دلالوں کی کہانیاں ملتی ہیں اور نہ کوٹھے پر بیٹھی طوائفوں کی داستانیں۔ طوائف کے حوالے سے انھوں نے صرف ایک کہانی رقم کی ہے جس کا عنوان 'بیسوا' ہے اور جو بدنام زمانہ 'جی بی روڈ، دہلی' میں ان کے ذاتی تجربے پر مبنی ہے۔ طوائفوں اور دلالوں کے برعکس ان کے افسانوں میں ایک عام عورت مرکزی کردار نبھاتی ہے جو نفسیاتی اور جنسیاتی الجھنوں، کشمکشوں اور کجرویوں سے دوچار ہوتی ہے۔ مگر وہ ان افسانوں میں میلوڈراما بھرنے سے گریز کرتے ہیں۔ سو سے زائد افسانے لکھنے والے افسانہ نگار نے اکثر افسانوں میں عورتوں کے مسائل اور ان کے نفسیاتی انتشار پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے افسانوں میں جس عورت کا ذکر ہوتا ہے، وہ کئی صدیوں سے استحصال کا شکار ہو چکی ہے۔ یہ وہ عورت ہے جس کو دریودھن نے چیر ہرن (عریاں) کرنے کی کوشش کی، جس کو راجہ ہریش چندر کے ہاتھوں سرِ عام چوراہے پر نیلام ہونا پڑا۔ اسی عورت نے عیسیٰ کو جنم دے کر بدنامی مول لی۔ یہ وہ عورت ہے، جو ماں ہے، بہن ہے، بیوی ہے، بیٹی ہے۔ یہی عورت ان کے افسانوں کا ایک اہم کردار ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ بچے پیدا کرنے والی مشین ہے، اس لیے بھی نہیں کہ وہ جنسی بھوک مٹانے کا ذریعہ ہے بلکہ اس

لیے کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی خوبصورت ترین تخلیق ہے جس کو دیوی کا مرتبہ دیا جا چکا ہے مگر وہ ہر دور میں نرینہ جبریت سے جوجھتی رہی ہے۔ اکثر و بیشتر بدکی کی عورت باہمت اور باحوصلہ ہے۔ وہ پسپا ہو کر بھی ہار قبول نہیں کرتی اور مردانہ وار زندگی کے ساتھ روبرو ہو جاتی ہے۔ 'بکھرے ہوئے لمحوں کا سراب' میں ایک ٹھکرائی ہوئی عورت، جب ہوش میں آتی ہے تو اپنے ہوس پرست محبوب سے اس طرح مخاطب ہوتی ہے:

> ''میرے پاس اور چارہ بھی کیا تھا۔ تم تو
> چھوڑ کر چلے گئے تھے، تمہارے واپس آنے
> کا کوئی امکان نہ تھا۔ ویسے بھی تم مرد لوگ ایسے
> ہی ہو۔ بعد میں اس کو بے سہارا اور بے بس
> منجدھار میں چھوڑ دیتے ہو۔'' ۵

دیپک بدکی کے افسانوں میں نہ صرف عورتوں کے استحصال کی گھناونی مرقع کشی ملتی ہے بلکہ انھوں نے جنس کو انسان کی سرشت کے لازمی عنصر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ گھر کا بھیدی، چڑی کی بیگم، مغرور لڑکی، پہاڑوں کا رومانس اور آغوش ہوس وغیرہ جیسے افسانوں میں بدکی نے انسان کی جنسی جبلت کو اس کی فطری حالت میں پیش کیا ہے۔ 'آغوش ہوس' کی مایا دو ہزار روپے کے لیے اپنا جسم بیچنے آتی ہے، لیکن لورینا بن کر اپنی روح بیچ کر چلی جاتی ہے۔ اسی طرح 'گھر کا بھیدی' منٹو کے افسانے 'خورشٹ' کی یاد دلاتا ہے۔ جس میں ایک عورت اپنے شوہر کی جگری دوست سے تعلق پیدا کر کے دوستی اور اعتمادی کی دھجیاں ادھیڑ دیتی ہے۔

موضوع کے علاوہ کرداری نگاری افسانے کا اہم ستون ہوتا ہے۔ کردار نگاری ایک فن ہے، اور اس فن میں مہارت ہونا تخلیق کار کے لیے بہت ضروری ہے۔ کرداروں ہی سے کہانی آگے بڑھتی ہے اور کردار ہی تخلیق کار کی نفسیاتی کیفیات کو بروئے کار لانے میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ تخلیق کار کرداروں کو زبان دے کر اپنی بات قاری تک پہنچا دیتا ہے۔ دیپک بدکی کے افسانوں میں مرد، عورت، بوڑھے، بچے، جوان، چرند، پرند، ملازم، نوکر، تاجر، سیاستدان

وغیرہ بے شمار کردار ملتے ہیں۔ گو یہ کردار معاشرے کے ہر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں پھر بھی ان میں متوسط طبقے کا غلبہ نظر آتا ہے۔ ان کا افسانہ 'ادھورے چہرے' متوسط طبقے کی کردار نگاری کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"لڑکا گھر کا چراغ ہوتا ہے، نتاشا کا کیا بھروسہ، وہ تو آج یہاں ہے، کل کہیں اور ہوگی۔ پرایا دھن ہے چلی جائے گی۔ اس وقت پہاڑ جیسا بڑھاپا تمہارے سامنے ہوگا۔" [6]

دیپک بدکی کے اکثر افسانوں میں عورت کا کردار حاوی نظر آتا ہے۔ مثلاً رشتوں کا درد، بٹی ہوئی عورت، ریزے، خودکشی، کینچلی، ڈرفٹ وُڈ، اماں، دشتِ وحشت، مانگے کا اجالا، گھونسلا، گھر کا بھیدی، بکھرے ہوئے لمحوں کا سراب' اور اداس لمحوں کا کرب وغیرہ۔ ان افسانوں میں عورتوں کی نفسیات پر ارتکاز کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار عورت کو کسی خاص چوکھٹے میں بند کر کے قاری کے سامنے پیش نہیں کرتے بلکہ وہ اس کی مثبت اور منفی ہر دو خصوصیات کی تصویر کشی کسی لاگ لپیٹ کے بغیر کرتے ہیں۔

افسانہ نگار کا انداز تحریر بے حد دلچسپ ہے۔ ان کے افسانے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں۔ زبان پر انھیں قدرت حاصل ہے، اسلوب میں کوئی پیچ وخم نہیں۔ افسانہ دریا کی روانگی کی طرح اپنا سنگیت بکھیرتا آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ افسانے کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ قاری کو مجبور کر دیتی ہے کہ اسے اختتام تک پہنچنے سے پہلے نہ چھوڑے۔ ان کے افسانے قاری کے دل ودماغ پر گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی غمازی کرتے ہیں۔

تکنیک کی بات کریں تو دیپک بدکی نے اپنے اکثر افسانے براہ راست اسلوب میں لکھے ہیں، جن میں بیانیہ، مکالمے اور عمل کا امتزاج ہے۔ اگرچہ بعض افسانوں میں افسانہ نگار در پردہ ہی رہے ہیں، لیکن زیادہ تر افسانوں میں صیغۂ واحد متکلم استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ انداز بیان افسانے کو خودنوشت سے قریب کرتا ہے اور افسانے پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے اس لیے بعض

اوقات افسانہ نگاری کی کامیابی کا ضامن بن جاتا ہے۔افسانہ نگار اگرچہ بالواسطہ بیان میں اپنا موقف بھی سامنے رکھتے ہیں لیکن متکلم کے صیغے والے افسانوں میں معروضیت قائم رکھنا ایک فن ہے جسے افسانہ نگار بخوبی واقف ہیں حالانکہ وہ قاری کو اپنی موجودگی کا احساس بھی دلاتے رہتے ہیں۔'گھر کا بھیدی، حرص گناہ، چڑی کی بیگم' اور 'گھونسلا' اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں۔

افسانہ کسی بھی زبان میں لکھا جائے، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ افسانہ گار کو اس زبان پر قدرت حاصل ہو، زبان کے صرف ونحو، محاوروں اور استعارات سے واقف ہو۔ دیپک بدکی میں یہ اہلیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ان کے افسانوں کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے۔ ان میں سنجیدگی کے ساتھ پختگی بھی ہے اور پھر ان کا حسن بیان اسے اور بھی موٴثر بنا دیتا ہے۔ان کا اسلوب منفرد صورت اختیار کرتا ہے۔وہ عام فہم زبان سے اپنے فن کو جلا بخشتے ہیں اور اپنے خیالات کے ترنم اور جملوں کی طراوت سے قاری کے دل ودماغ میں تازگی، توانائی اور ایک قسم کی موسیقیت اجاگر کرتے ہیں۔دیپک بدکی کی کہانیوں میں قاری کا تجسس برقرار رہتا ہے، کہ جب تک ان کا افسانہ ختم نہیں ہوتا قاری اس وقت تک بے چین رہتا ہے۔دیپک بدکی نے افسانوں میں تشبیہات، تلمیحات اور ضرب المثال کا بڑی فنکاری کے ساتھ استعمال کیا ہے۔یہی نہیں اگر ان کی نادر ترکیبات پر نگاہ ڈالیں تو خود اندازہ ہو جائے گا کہ ان کو اردو زبان سے کس حد تک رغبت اور محبت ہے۔چند مثالیں ذیل میں درج ہیں:

☆ ''گھڑی کی ٹک ٹک ہی میرا واحد سہارا ہے
۔تم اسے مت چھین لو! یہ میری زندگی کا جامِ
ساعت نما ہے۔''[۷]

☆ ''تالا بذاتِ خود محافظ نہیں ہوتا۔محافظ ہوتے
ہیں آس پاس کے لوگ جو لاشعوری طور پر
پڑوسیوں کی جان ومال کی حفاظت کرنا اپنا اخلاقی
فرض سمجھتے ہیں۔''[۸]

☆ ''موت اتنی ڈراونی نہیں ہوتی جتنی کہ اس

کی آہٹ۔''۹

☆ ''راکیش اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم ایک فاتح کی

طرح گھر لوٹ آؤ گے تو پھر نہیں آنا۔ تم حقیقت

کا سامنا نہیں کر پاؤ گے۔ ہاں اگر تم صرف ایک

پتی کے روپ میں واپس آنا چاہو تو میں

تمھارے راستے میں آنکھیں بچھائے تمھارا

انتظار کروں گی۔''۱۰

☆ ''یہ معاملہ تو بہت پیچیدہ لگتا ہے، بھائی نہ نگلتے

بنتی ہے نہ اگلتے۔''۱۱

☆ ''طلاق ملتے ملتے سالوں بیت جاتے ہیں۔

تب تک سب کچھ لٹ چکا ہوتا ہے۔ اور پھر طلاق

کی شرائط بھی تو محدود ہیں، ذہنی اَن میل کے بنا پر

طلاق ملنے سے رہی۔ چاہے اونٹ کے گلے میں

بلی ہی کیوں نہ بندھی ہو۔''۱۲

مکالمے لکھنے میں افسانہ نگار نے کافی محنت سے کام لیا ہے۔ مکالمے چھوٹے چھوٹے اور کرداروں کے عین مطابق ہیں۔ ان کے کرداروں کی زبان سے ان کے سماجی، معاشی اور تعلیمی معیار کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اکثر مکالمے دل کو چھو لیتے ہیں۔ چند مثالیں:

☆ ''خودکشی انسان کا پیدائشی حق ہے۔''

☆ ''ہم اوروں کو اپنی ناتمام خواہشات کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔''

☆ ''ہر غم زدہ انسان میں شاعر بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔''

موصوف کی افسانوی تخلیقات کے متعلق مظہر امام اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

''آپ کو کہانی کا سلیقہ آتا ہے آپ کا بیانیہ
چست ہوتا ہے زبان و بیان پر آپ کی گرفت
ہے۔ مکالمے جاندار ہوتے
ہیں اور کرداروں کی تصویر کشی چابک دستانہ
ہے۔''[۱۳]

دیپک بدکی افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نقاد اور تبصرہ نگار کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ایک اچھا ادیب نہ صرف ادب کا قاری ہوتا ہے، بلکہ وہ ادب کا اچھا ناقد بھی ہوتا ہے، دیپک بدکی میں یہ سارے صفات موجود ہیں۔مضامین اور تبصروں پر مبنی اب تک ان کی تین کتابیں 'عصری تحریریں، عصری شعور' اور 'عصری تقاضے' شائع ہوچکی ہیں۔ان مضامین اور تبصروں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دیپک بدکی شعروادب کے تئیں کس قدر سنجیدہ ہیں۔ان کا مطالعہ کتنا وسیع ہے اور وہ ہم عصر ادب پر کس شدت کے ساتھ غوروخوض کرتے ہیں۔
اگر چہ دیپک بدکی بنیادی طور پر صنفِ افسانہ سے منسلک رہے ہیں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کی دلچسپی صرف افسانوی ادب تک محدود ہو اور وہ اسی پر اظہار خیال کرتے ہوں۔انھوں نے تین سو کے قریب شعری مجموعوں، افسانوں وافسانچوں کے مجموعوں، ناولوں، طنز ومزاح اور تنقید وتحقیق کی کتابوں پر بے لاگ تبصرے قلم بند کیے ہیں اور اردو ادب کے حوالے سے کئی سیر حاصل مضامین لکھ کر کثیر الجہات اور کثیر المطالعہ ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔

تنقیدی مضامین وتبصروں پر مبنی ان کی پہلی تصنیف 'عصری تحریریں' میں معروف افسانہ نگار مانک ٹالا پر چھ مضامین پر مشتمل مقالہ، گلزار، ویریندر پٹواری اور برج پریمی پر تنقیدی مضامین اور ۵۱ر کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔اس طرح یہ کتاب کافی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ یہ معاصر اردو ادب کی آئینہ بن چکی ہے۔مذکورہ کتاب کے مطالعے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ دہائی میں مختلف اصناف جیسے شاعری، افسانہ، ناول، تذکرہ، تنقید، تحقیق اور لطیفہ گوئی کے تحت ہمارے سامنے کیا کچھ آیا اور لکھنے والے کس حد تک کامیاب رہے ہیں۔یہ کتاب گذشتہ دہائی کے

اردو ادب کی ایک اہم دستاویز ہے جس میں تبصرہ نگار نے اس دہائی میں لکھے جانے والے ادب کا نہ صرف جائزہ لیا ہے بلکہ معاصر ادب کا ایک اجمالی تعارف اور خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ کتاب میں مانک ٹالا اور صلاح الدین پر دو گوشے بھی شامل ہیں۔ تنقید نگار نے گلزار کے ایک افسانے 'دھواں' کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ کچھ اس طرح تجزیہ لیا ہے:

> ''افسانہ 'دھواں' ہمارے معاشرے پر تیکھا طنز ہے جس میں مذہب کے نام پر مُردوں کی حرمت کا خیال رکھا جاتا ہے، جبکہ زندوں کو جلایا جاتا ہے۔ افسانے میں گاؤں کا چودھری جو انسان دوست اور سچا مسلمان ہوتا ہے یہ وصیت کرتا ہے کہ اس کی لاش کو جلا کر گاؤں کے کھیتوں پر بکھیر دی جانی چاہیے۔ اس کی وفا شعار بیوی اس کی وصیت کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی ہے، لیکن گاؤں کے مسلم مولوی اور ہندو پروہت دونوں اس کی مخالفت کرتے ہیں اور رات کے اندھیرے میں زبردستی اس کی لاش کو گاڑ دیتے ہیں۔ جبکہ اس کی مسلمان بیوی کو مکان سمیت زندہ جلاتے ہیں۔''[۱۴]

اسی نوع کے بے شمار تجزیے، تبصرے اور تنقیدی مضامین دیپک بدکی کے قلم سے نکلے ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری کتاب 'عصری شعور' ہے جس میں ۱۷ مضامین ایک تجزیہ اور ۳۹ تبصرے شامل ہیں۔ 'عصری شعور' میں جموں و کشمیر کے افسانے کے حوالے سے دو سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔ تیسری کتاب 'عصری تقاضے' میں ۹ مضامین اور ۶۰ تبصرے شامل ہیں۔ تبصرہ نگار نے جموں و کشمیر سے متعلق کئی ادیبوں کو اردو دنیا میں متعارف کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کیونکہ انھیں اس

بات کا احساس ہے کہ ریاست کے ادیبوں کو اردو حلقوں نے عام طور پر نظر انداز کیا ہے۔ 'عصری شعور' کے حرف آغاز میں موصوف فرماتے ہیں:

''میں پروفیشنل نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا نہ ہی مجھے انتقادیات سے بہت زیادہ تعلق ہے۔ البتہ میری ان کاوشوں کی غرض وغایت صرف اتنی ہے کہ ہم عصر ادیبوں کے لیے ممد ومعاون (Facilitator) کا رول ادا کرسکوں اور اس طرح تخلیق کاروں اور قارئین کے درمیان پُل باندھنے کا کام کرسکوں۔'' ۱۵

یہ تو دیپک بدکی کی انکساری ہے جو وہ اپنی انتقادی صلاحیت سے انکار کرتے ہیں ورنہ ان کے تبصرے تو بہت ہی وقیع اور عمیق ہوتے ہیں اور قاری ان کو پڑھ کر اوریجنل کتاب پڑھنے کے لیے قائل ہوجاتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ موصوف اردو ادب کا ایک چمکتا ستارہ ہیں۔

آخر میں دیپک بدکی کی افسانہ نگاری اور ان کی انداز تحریر کے بارے میں فرید پربتی کی اس رائے کو پیش کر کے اپنی بات کو ختم کرنا چاہوں گا:

''یہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایک تخلیقی ذہن رکھنے والا تخلیقی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اپنے تخلیقی عمل اور معاصر ادب پر بھی ضرورتاً اظہار خیال کرتا رہتا ہے۔ یہ روایت ہمارے یہاں ابتداء سے ہی پائی جاتی ہے۔ اصل میں ایک تخلیقی ذہن رکھنے والے کے وہ تاثرات کافی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جو اپنے بارے میں یا اپنے معاصر ادب کے بارے میں وقتاً فوقتاً تحریر میں لاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ بہت حد تک غیر مشروط ہوتے ہیں۔ دیپک بدکی بھی تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اچھا تنقیدی شعور

رکھتا ہے اور گاہے بگاہے اپنے تنقیدی شعور کا اظہار کبھی کسی کتاب پر

رائے دے کر، کبھی کسی کتاب پر تبصرہ لکھ کر اور کبھی ادبی شخصیت پر تنقیدی

مضمون لکھ کر کرتے رہتے ہیں۔[16]

☆☆☆☆☆

حواشی

۱۔ دیپک بدکی، چنار کے پنجے، ص ۷
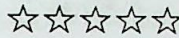
۲۔ دیپک بدکی، ادھورے چہرے، ص ۱۳

۳۔ دیپک بدکی، چنار کے پنجے، ص ۸۱

۴۔ دیپک بدکی، ادھورے چہرے، ص ۲۹

۵۔ دیپک بدکی، ادھورے چہرے، ص ۱۱۶

۶۔ دیپک بدکی، ادھورے چہرے، ص ۳۸

۷۔ دیپک بدکی، افسانہ ایک خط جو پوسٹ نہ ہو سکا، (چنار کے پنجے)، ص ۱۴۶

۸۔ دیپک بدکی، افسانہ ایک نہتے مکان کا ریپ، (چنار کے پنجے)، ص ۳۶

۹۔ دیپک بدکی، افسانہ مخبر، (چنار کے پنجے)، ص ۷۵

۱۰۔ دیپک بدکی، افسانہ ریزے، (ادھورے چہرے)، ص ۵۳

۱۱۔ دیپک بدکی، افسانہ بٹی ہوئی عورت، (ادھورے چہرے)، ص ۲۳

۱۲۔ دیپک بدکی، افسانہ بٹی ہوئی عورت، (ادھورے چہرے)، ص ۲۲

۱۳۔ مظہر امام، بحث مباحثہ (سہ ماہی)، جلد ۱، شمارہ ۴، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۸ء

۱۴۔ دیپک بدکی، عصری تحریریں، ص ۶۷

۱۵۔ دیپک بُدکی، عصری شعور، حرف آغاز، ص ۱

۱۶۔ ڈاکٹر فرید پربتی، ورق ورق آئینہ، ص ۲۱۸

☆☆☆☆☆

☆ مضمون نگار: توصیف مجید لون، ریسرچ اسکالر، دیوی اہلیہ وشودیالہ، اندور، ایم پی؛ مستقل پتہ: نائل، اننت ناگ، کشمیر؛ مطبوعہ سہ ماہی انتساب عالمی، سرونج؛ جلد ۳، شمارہ ۲، (پرانا نمبر شمار: ۹۸؛ ص ۱۲۸-۱۱۷

دیپک بُدکی کے افسانے فنی و تکنیکی رو سے

--ریاض احمد میر

جمّوں وکشمیر میں شاعری کے بعد جس صنفِ ادب کو فروغ ملا وہ افسانہ نگاری ہے۔ ریاست میں اردو افسانہ نگاری کا آغاز اگرچہ روایتی انداز میں ہوا لیکن رفتہ رفتہ افسانہ نگاروں کے سماجی وسیاسی شعور میں بیداری پیدا ہوئی اور فن افسانہ نگاری پر ان کی گرفت مضبوط تر ہوگئی۔ ان کی ادبی صلاحیتیں ابھرنے لگیں اور وہ اپنی کہانیوں میں زندگی اور اس سے جڑے لوازمات کی عکاسی کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں اقتصادی، معاشی، سیاسی اور نفسیاتی باریکیوں کی عکاسی کی اور ان میں مقامی رنگ بھر دیا۔

گزشتہ صدی میں برصغیر ہندو پاک میں جہاں اردو افسانہ ارتقا کی منزلیں طے کرتا رہا وہیں جمّوں وکشمیر کے افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات سے افسانوی ادب کو سجایا اور سنوارا۔ کشمیر کے پسِ منظر میں لکھی گئی ان کی کہانیاں یہاں کے حالات، کیفیات اور معاشی وسماجی صورتِ حال کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ آگے چل کر افسانہ نگاروں نے دبے الفاظ میں ہی سہی مگر دہشت گردی سے پیدا شدہ مسائل کو منعکس کیا اور دوسری جانب کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ چونکہ ان افسانہ نگاروں کی فہرست کافی طویل ہے اس لیے اس مختصر سے مضمون میں ان سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں۔ دورِ حاضر میں جب ہم افسانوی اُفق پر نظر ڈالتے ہیں تو خوشی محسوس ہوتی ہے کہ معاصر افسانوی منظر نامے میں کشمیر کے حوالے سے کئی ایسے نام موجود ہیں جو صحیح معنوں میں کہانی بننے کے فن میں یدطولیٰ رکھتے ہیں اور جن کے افسانے قومی اور بین الاقوامی سطح پر شائع ہو کر دادِ تحسین پاتے ہیں۔ افسانہ نگاروں کی اس فہرست میں دیپک بُدکی ایک معروف اور معتبر نام ہے جو بیک وقت ادیب بھی ہیں، صحافی بھی، ناقد بھی اور مبصر بھی اور جن کی ادبی کاوشیں افسانوی اُفق پر چھا چکی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دیپک بُدکی ہندستان کے مختلف علاقوں میں نوکری کرتے رہے ہیں اور نہ صرف سوِل بلکہ فوجی زندگی سے بھی وابستہ

رہے ہیں، اس لیے ان کے افسانوں کا کینواس بہت پھیلا ہوا ہے۔ان کی سانسوں میں جہاں کشمیر سمایا ہوا ہے وہیں انہوں نے دوسرے علاقوں کا بھی غور سے مشاہدہ کیا ہے۔

دیپک بُدکی نے ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۰ء میں افسانہ 'سلمیٰ' سے کیا جو روزنامہ 'ہمدرد' سرینگر میں شائع ہوا۔اس کے بعد وہ مقامی اخبارات خصوصاً روزنامہ 'آفتاب' سرینگر میں چند برسوں تک چھپتے رہے۔۱۹۷۴ء میں ان کا ایک افسانہ 'ریزے' دوردرشن سری نگر سے 'ایک کہانی' پروگرام کے تحت ٹیلی کاسٹ ہوا۔اس کے بعد تقریباً ۲۲ سال تک ان کے تخلیقی عمل پر کہرا سا چھایا رہا۔لیکن ۱۹۹۶ء کے بعد انیس برسوں میں انہوں نے تقریباً سو سے زیادہ افسانے اور متعدد تنقیدی مضامین و تبصرے لکھے ہیں۔

بقول دیپک بُدکی:-

''یہ سب کاروائی اس جنون کی دین ہے جس نے مجھے اردو زبان خاص کر اردو افسانے سے جوڑے رکھا۔'' (دیپک بُدکی ''چنار کے پنجے''،ص ۷)

اب تک دیپک بُدکی کی جو تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں ان میں چار افسانوی مجموعے 'ادھورے چہرے' [پہلا ایڈیشن ۱۹۹۹ء، دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۵ء، تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء]، 'چنار کے پنجے' [پہلا ایڈیشن ۲۰۰۵ء، دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء]، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'' [۲۰۰۸ء] اور 'ریزہ ریزہ حیات' [۲۰۱۱ء] شامل ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے تنقیدی مضامین و تبصروں پر مبنی تین کتابیں 'عصری تحریریں' [۲۰۰۶ء]، 'عصری شعور' [۲۰۰۹ء] اور 'عصری تقاضے' [۲۰۱۳ء] لکھ کر اپنی انتقادی بصیرت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ابتدائی دنوں میں بُدکی نے سری نگر، کشمیر میں چند ایک اخبارات مثلاً 'جہان نو'، 'نوجیون'، 'ہمارا کشمیر' اور 'عقاب' کے لیے مختصر مدت تک بحثیت کارٹونسٹ بھی کام کیا ہے۔وہ ہفتہ وار 'عقاب' سری نگر کے ساتھ بحثیت جوائنٹ ایڈیٹر تقریباً ایک سال منسلک رہے۔علاوہ ازیں دیپک بُدکی ریڈیو کشمیر کی یووانی سروس و جنرل سروس اور دوردرشن سری نگر کے پروگراموں میں بھی شرکت کرتے رہے۔کلانکیتن ڈراماٹک کلب، شوالہ، سرینگر سے بھی کچھ وقت تک وابستہ رہے جہاں انھوں نے کشمیری ڈرامہ 'تماہ' میں پولیس انسپکٹر کا رول نبھایا۔ڈرامہ کے شو گاندربل اور کنگن میں منعقد ہوئے تھے۔

فنی اور تکنیکی سطح پر دیپک بُدکی کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے افسانوں کی کئی جہتیں

سامنے آتی ہیں جن میں بیانیہ، تحریری، علامتی اور رومانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بُدکی کے افسانوں میں اکثر واحد متکلم صیغہ کا استعمال ہوتا ہے جس کی بنا پر ان کے افسانے منٹو کے افسانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ دراصل منٹو ان کے چہیتے افسانہ نگار ہیں۔ منٹو میں ان کی دلچسپی ڈاکٹر برج پریمی کے پی ایچ ڈی مقالے کی دین ہے جس کی کتابت اور تزئین بدکی نے کی تھی۔ اپنی کہانیوں میں دیپک بُدکی خود کردار بن کر دوسرے کرداروں کی زندگی کے تمام نشیب و فراز کو قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ اشاروں اشاروں میں سماجی، اقتصادی، معاشی اور سیاسی حالات کی مربوط تصویریں قاری کے ذہن میں اتارتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار معاصر زندگی کی نمائندگی کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور جدید ترین ماحول اور کروٹ بدلتے انسانی رشتوں کی اگوائی کرتے ہیں۔ بُدکی کے افسانوں کی تکنیک پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نذیر آزاد فرماتے ہیں:-

> ''دیپک بُدکی نے اکثر افسانے براہِ راست اسلوب میں لکھے ہیں جن میں بیانیہ، مکالمے اور عمل کا امتزاج ہے۔ اگرچہ بعض افسانوں میں مصنّف در پردہ ہی رہا ہے لیکن زیادہ تر افسانوں میں صیغۂ متکلم استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ اندازِ بیان افسانے کو خودنوشت سے قریب کرتا ہے اور افسانے پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے جو کہ افسانہ نگاری کی کامیابی ہے۔''
>
> (ڈاکٹر نذیر آزاد۔ ماہنامہ انشاء کولکتہ، مارچ ۲۰۰۹ء، جلد ۲۴، شمارہ ۲۴، ص ۴۰)

سیدہ نسرین نقاش اس ضمن میں رقم طراز ہیں :-

> ''دیپک بُدکی نے بیانیہ اور علامتی اسلوب کے درمیان دونوں کے معنیٰ خیز آمیزش سے وہ فضاء پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس میں واقعات کا بیان آفاقی سچائیوں اور کہیں کہیں مابعد الطبعیاتی مسائل کے حل کی تلاش بن جاتا ہے۔ انہوں نے علامتی اظہار سے معنیٰ آفرینی کا کام کیا ہے اسے کل ہی نہیں سمجھا۔''
>
> (سیدہ نسرین نقاش۔ ماہنامہ محفل صنم دہلی، مئی ۲۰۰۱ء، جلد ۳، شمارہ ۴، ص ۴۲)

دیپک بُدکی نے اپنے افسانوں میں مختلف موضوعات کو سمیٹا ہے۔ زندگی کی اتھل پتھل، ٹوٹ پھوٹ، بے جوڑ شادیاں، غیر ازدواجی جنسی تعلقات، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی ہوڑ، جھوٹ، مکرو

فریب اور ذاتی مفاد کے لیے ایک دوسرے کا استعمال، سماجی ناانصافی، عورتوں کا استحصال اور دہشت گردی وغیرہ آج کے سماج کی سچائیاں ہیں اور ان موضوعات کو دیپک بُدکی نے بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔انہوں نے آس پاس کے ماحول اور معاشرے سے اپنے موضوعات اخذ کیے ہیں جس کے توسط سے ان کے افسانوں میں عصری زندگی کی ناہمواریوں، بے ضابطگیوں اور بدعنوانیوں کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں ایک طرف کشمیر کے پُرانے رسم ورواج، کھان پان، تہذیب و تمدن اور شادی بیاہ کی قدیم روایتوں کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے تو دوسری جانب کشمیر کی خستہ حالی، رشوت خوری اور جہیز کے دردناک مسائل کو بھی پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ڈاکٹر خان حفیظ بُدکی کے افسانوں کے موضوعات کے بارے میں لکھتے ہیں :-

> ''دیپک بُدکی اپنے افسانوں میں جہاں سیاسی، سماجی برائیوں اور فرقہ وارانہ چپقلشوں کے خلاف واشگاف انداز میں احتجاج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں عورتوں کی نفسیات اور ان پر ہو رہے استحصالی حملوں کو باریک بینی سے غائر مطالعہ کرنے کے بعد قرطاسِ ابیض پر نہایت چابک دستی سے اتار دینے کے فن سے واقف ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ دیپک بُدکی ایک حساس افسانہ نویس ہیں۔''
>
> (ڈاکٹر خان حفیظ۔ورق ورق آئینہ،ص۔۹۲)

کردار نگاری ایک فن ہے اور اس فن میں مہارت ہونا تخلیق کار کے لیے بہت ضروری ہے۔کیونکہ کرداروں سے ہی کہانی آگے بڑھتی ہے اور کردار ہی تخلیق کار کی نفسیاتی کیفیات کو بروئے کار لانے میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔بُدکی کے افسانوں میں بے شمار کردار نظر آتے ہیں۔مثلاً مرد، عورت، بوڑھے، بچّے، عاشق، معشوق، چرند، پرند، ملازم، نوکر، تاجر، سیاست داں وغیرہ۔ان کی بیشتر کہانیوں کے کردار اس دنیا کے زندہ انسان ہیں جن کو افسانوی رنگ دے کر انہوں نے اپنی کہانیوں میں امر کر دیا ہے۔انہوں نے مزدور طبقہ سے لے کر اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کو اپنے افسانوں کی زینت بنانے کی کوشش کی ہے اور اس میں سرخرو ہو چکے ہیں۔

بُدکی کے اکثر افسانوں میں عورت بطور مرکزی کردار ابھر آتی ہے۔انہوں نے ایسے افسانوں

میں خواتین کے مسائل اور ان کی نفسیاتی الجھنوں پر روشنی ڈالی ہے۔ دیپک بُدکی کے افسانوں میں جس عورت کا ذکر ہے وہ سالہا سال سے نرینہ جبریت کا شکار ہو چکی ہے۔ اس کو دریودھن نے چیر ہرن کرنے کی کوشش کی، وہ سرے عام چوراہے پر راجہ ہریش چندر کے ہاتھوں نیلام ہوئی اور پھر اس نے عیسیٰ کو جنم دے کر بدنامی مول لی۔ یہ عورت کئی رشتوں سے مرد کے ساتھ بندھی ہوئی ہے جیسے ماں، بہن، بیوی، بیٹی وغیرہ۔ یہی عورت ان کے افسانوں کا ایک اہم کردار بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ بچّہ جننے والی مشین ہے یا جنسی بھوک مٹانے کا ذریعہ ہے بلکہ اس لیے کیونکہ وہ خدا کی بنائی ہوئی نازک و خوبصورت ترین مخلوق ہے جس کو 'دیوی' کا رتبہ دیا جا چکا ہے۔ بُدکی کے یہاں نسوانی کردار اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی متمنی ہیں، مردوں سے پنجہ لڑانے کی خواہاں ہیں اور برے حالات میں زندگی کا مقابلہ کرنے کی تمنائی ہیں۔ لیکن دیپک بُدکی یہیں پر نہیں رکتے، وہ عورت کے منفی کردار کو بھی اسی شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کیونکہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان متضاد اوصاف کا مرکب ہے جو ایک لمحے ایک رنگ دکھاتا ہے اور دوسرے لمحے دوسرا رنگ دکھاتا ہے۔ رئیس الدین رئیس دیپک بُدکی کی کردار نگاری کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

> ''ان کے کردار اچھے بھی ہیں اور برے بھی، ان میں رجعت پسندی بھی ہے اور رجائیت پسندی بھی، وہ بھی ہیں جو انسان دوستی اور انسانیت کا علم بلند رکھنے کے لیے تیار رہتے ہیں اور وہ خود غرض اور بے ضمیر بھی جو اپنی تجوریاں بھرنے کے لیے انسانیت کے قاتل بن جاتے ہیں''
>
> (رئیس الدین رئیسؔ، سہ ماہی، انتساب سرونج [گوشۂ دیپک بُدکی] جلد ۲۵، شمارہ ۶۳، ص ۳۲)

فکشن میں منظر نگاری کا بھی اہم رول ہوتا ہے کیونکہ اس سے نثر میں دل آویزی اور سحر کاری پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ ابتدا میں کہانی کی شروعات سننے سنانے سے ہوئی تھی، اس لیے بعد میں جب اسے لکھا جانے لگا تو اس کے تمام پہلوؤں اور پس منظر کو قاری کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی گئی تا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے سارا واقعہ ایسے گھوم جائے جیسے وہ اسی کے سامنے ہو رہا ہے۔ اس حوالے سے کہانی ڈرامہ کے بہت قریب رہی ہے۔ اس فضا کو ہو بہو منعکس کرنا اور پھر کرداروں کی زبان سے وہی گفتگو پیش

کرنا جو وہ عام طور پر روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرتے ہیں ایک اچھے اور باکمال افسانہ نگار کے اوصاف ہیں۔ جہاں تک دیپک بُدکی کا سوال ہے، انہوں نے اپنی کہانیوں میں مکالمہ نگاری، کردار نگاری اور منظر نگاری سے بھرپور انصاف کیا ہے۔ منظر نگاری میں دراصل فنکار کی فنکاری پنہاں ہوتی ہے۔ زبان و بیان پر قدرتِ کاملہ کا اظہار اسی کے ذریعے ہوتا ہے۔ چونکہ دیپک بُدکی اپنی نجی زندگی میں مصوری سے بھی وابستہ رہے ہیں اور فنِ دستکاری خصوصاً پیپر ماشی انھیں ورثے میں ملی ہے، لہٰذا ان کے افسانوں میں صبح کی بادِ نسیم، دوپہر کی تپتی ہوئی دھوپ اور شام کی دھندلی سیاہی کا بیان نہایت ہی دقیقہ شناسی سے ملتی ہے۔ دیپک بُدکی نے کشمیر کے برف پوش پہاڑوں، گھنے جنگلوں، سرسبز میدانوں اور آبِ حیات اگلتے چشموں کی بہترین الفاظ میں تصویر کشی کی ہے۔ افسانہ 'پہاڑوں کا رومانس' میں وہ کشمیر کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں:۔

> ''کشمیر کی وادی پہاڑوں کی شہزادی ہے۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے نیلے برفانی پہاڑ، چیڑ اور صنوبر سے ڈھکے ہوئے لامحدود جنگل، لہروں کے مضراب سے ساز بجاتی ہوئی ندیاں اور اِندر دھنش کے رنگوں سے سجے ہوئے پھولوں کے تختے عروسِ لالہ زار کے گہنے لگتے ہیں۔''

(دیپک بُدکی۔ 'پہاڑوں کا رومانس'۔ افسانوی مجموعہ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، ص ۲۳)

ریاست جموں و کشمیر میں شرپسند عناصر نے جو بارود بچھایا ہے اور جو لوگ اس آگ کی چپیٹ میں زخمی ہوئے ہیں ان کے درد سے بھی بُدکی بے خبر نہیں ہے۔ اس درد کو افسانہ نگار بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ 'حرصِ گناہ' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:۔

> ''چاروں جانب دہشت پھیلی ہوئی ہے، آدمی ہتھیلی پر جان لیے پھرتا ہے، سڑکوں پر موت کے سائے منڈلاتے ہیں، راہزنوں کے ہاتھ میں بھی بندوقیں ہیں اور راہبروں کے ہاتھوں میں بھی، دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو رہا ہے، دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہو چکی ہیں، خوش رنگ خوابوں کی جگہ ڈراونے خوابوں نے لے رکھی ہے۔''

(دیپک بُدکی۔ 'حرصِ گناہ'، افسانوی مجموعہ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، ص ۱۲۵)

دیپک بُدکی کا اندازِ تحریر بے حد دلچسپ ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان نہایت صاف اور شستہ

ہے اور انہیں زبان پر قدرت حاصل ہے۔ افسانوں میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ پختگی بھی ہے، رجائیت اور مقصدیت کا پہلو بھی نمایاں ہے اور پھر بُد کی کا حسنِ بیان اسے اور بھی مؤثر بنا دیتا ہے جس سے ان کا اسلوب منفرد صورت اختیار کرتا ہے۔ بُد کی عام فہم زبان سے اپنے فن کو جلا بخشتے ہیں اور اپنے خیالات کے ترنم اور جملوں کی طراوت سے ہمارے دل و دماغ میں تازگی، توانائی اور ایک قسم کی موسیقیت اُجاگر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر رینو بہل دیپک بُد کی کی زبان اور اسلوب کے بارے میں یوں قمطراز ہیں:-

''انہیں زبان پر قدرت حاصل ہے، اسلوب میں کوئی پیچ وخم نہیں۔ افسانہ دریا کی روانی کی طرح اپنا سنگیت بکھیرتا آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، افسانے کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ قاری کو مجبور کر دیتی ہے کہ اسے اختتام تک پہنچنے سے پہلے نہ چھوڑے، ان کے افسانے قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں اور انکی تخلیقی صلاحیتوں کی غمازی کرتے ہیں، اردو ادب کی دنیا میں وہ ایک چمکتا ستارہ ہے۔''

(ڈاکٹر رینو بہل، ورق ورق آئینہ۔ ص ۱۰۲)

سادہ اور سلیس زبان کے ساتھ ساتھ دیپک بُد کی نے اپنے افسانوں میں محاوروں اور ضرب المثل کا بھی ہنرمندی سے استعمال کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں، ان کی نادر ترکیبات پر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو اردو زبان سے کس حد تک رغبت اور محبت ہے۔ افسانوی مجموعہ 'ادھورے چہرے' سے چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:-

☆ ''آج کل تو بچّے ماں باپ کو گھاس بھی نہیں ڈالتے۔'' (ص ۳۶)

☆ ''کہتے ہیں مسکراتی ہوئی لڑکی اور کھیلتی ہوئی بھیڑ کو ہر کوئی ہنکا کر لے جاتا ہے۔'' (ص ۷۹)

☆ ''یہ معاملہ تو بہت پیچیدہ لگتا ہے بھائی، نہ نگلتے بنتی ہے اور نہ اگلتے۔''

☆ ''اس کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔'' (ص ۲۳)

☆ ''اور پھر طلاق کے شرائط بھی محدود ہیں۔ ذہنی ان میل کی بنا پر طلاق ملنے سے رہا۔ چاہے اونٹ کے گلے میں بلی ہی کیوں نہ بندھی ہو۔'' (ص ۷۹)

محاورات اور ضرب المثل کے علاوہ دیپک بُد کی نے مکالمے لکھنے میں بھی کافی محنت سے کام کیا ہے۔ ان کے مکالمے چھوٹے چھوٹے اور کرداروں کی نفسیات کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ اکثر مکالمے

دل کو چھو لیتے ہیں۔ مثلاً ''خودکشی ان کا پیدائشی حق ہے۔''، ''ہم اوروں کو اپنی ناتمام خواہشات کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔''، ''ہر غم زدہ انسان میں شاعر بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔''، ''زر، زمین وزن دنیا کی سبھی لڑائیوں کی جڑ ہیں۔''، ''جو چیز حاصل نہیں ہوتی اس کی خلش ہمیشہ کیوں رہتی ہے۔'' وغیرہ۔ اس کے علاوہ دیپک بُدکی نے انگریزی زبان کے ناگزیر الفاظ کا استعمال کر کے اپنے افسانوں کو اندازِ بیان کے معاملے میں مزید دلچسپ بنادیا ہے۔ چند ایک مثالیں توجہ طلب ہیں :-

☆ ''لیکن میں تو تم سے پیار کرتی ہوں راجیو! آئی لو یو فرام دی کور آف مائی ہارٹ''

(ریزہ ریزہ حیات۔ص۳۲)

☆ ''نائس ٹو میٹ یو۔ میں ہوں میجر کے۔ سی والیا فرام آرمی پوسٹل سروس''

(چنار کے پنجے۔ص۱۵۵)

☆ ''یہ ہیں تمہارے انکل 'روی جیکر' ہی از اے گریٹ آرٹسٹ''

(ادھورے چہرے۔ص۱۱۷)

مختصر یہ کہ دیپک بُدکی افسانوی ادب میں چمکتے ستارے کے مانند ہیں جو مستقبل میں بھی اپنی کہانیوں کی بدولت اردو ادب کی عمارت کو مستحکم کرنے میں ایک اہم رول ادا کریں گے۔ میں اپنے اس مختصر سے مضمون کا اختتام مظہر امام کی اس رائے سے کرتا ہوں :-

''آپ (دیپک بُدکی) کو کہانی کہنے کا سلیقہ آتا ہے، آپ کا بیان چست ہوتا ہے، زبان وبیان پر آپ کی گرفت ہے، مکالمے جاندار ہوتے ہیں، کرداروں کی تصویر کشی چابک دستانہ ہے۔'' (مظہر امام، 'ورق ورق آئینہ'۔ص۱۲۰)

☆☆☆☆☆

☆مضمون نگار: ریاض احمد میر، پی ایچ ڈی سکالر، دیوی اہلیہ یونیورسٹی، اندور، ایم پی؛ مصنف کا پتہ: ۵۱، پارن داس گارڈن، مانک باغ روڈ، اندور، مدھیہ پردیش۔۴۵۲۰۰۱؛ مطبوعہ: ماہنامہ بیباک، مالیگاؤں، مہاراشٹر؛ جولائی ۲۰۱۵، ص ۳۵-۳۲

دیپک بدکی کے افسانوں میں نسوانی کردار

--محمد امین نجار

دیپک بدکی نے ۱۹۹۶ء کے بعد تسلسل کے ساتھ افسانے تحریر کیے حالانکہ اس سے پہلے بھی ۱۹۷۰ء سے ان کے افسانے مقامی اخبارات اور غیر مقامی رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ افسوس کہ وہ سارا شائع شدہ و غیر شائع شدہ مواد جل کر راکھ ہو گیا۔ جیسا کہ خود افسانہ نگار کا بیان ہے انھوں نے وہ سارے افسانے (دو چار کو چھوڑ کر) از سر نو تحریر کیے اور دوبارہ رسالوں اور اخباروں میں شائع کروائے۔ ۱۹۹۹ء میں ان کا پہلا افسانوں کا مجموعہ 'ادھورے چہرے' منصۂ شہود پر نمودار ہوا جس میں تلف شدہ افسانے بھی شامل کیے گئے۔ اس کے بعد تین اور مجموعے 'چنار کے پنجے'، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' اور 'ریزہ ریزہ حیات' بالترتیب ۲۰۰۵ء، ۲۰۰۷ء اور ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئے۔

مندرجہ بالا افسانوی مجموعوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ 'عورت' دیپک بدکی کا مخصوص موضوع رہا ہے۔ حالانکہ وہ کسی مکتب فکر کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے تاہم ان کی نگارشات میں مقصدی پہلو صاف طور پر نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سرون سنگھ:-

> '' ساٹھ سے زائد افسانے لکھنے والے دیپک بدکی اکثر افسانوں میں عورتوں کے مسائل اور ان کی نفسیاتی الجھنوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ 'عورت' ان کے افسانوں کا کلیدی موضوع ہے اور وہ عورت کی مثبت اور منفی توانائی کو بڑی خوبصورتی سے منعکس کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جس عورت کا ذکر ہے ، وہ کئی یگوں سے استحصال کا شکار ہو چکی ہے، اس کو یدھشٹر نے بھری سبھا میں داؤ پر لگا دیا جبکہ دریودھن نے چیر ہرن کرنے کی کوشش کی ، وہ سرعام چورا ہے پر راجہ ہریش چندر کے ہاتھوں نیلام ہوئی، اس نے عیسیٰ کو جنم دے کر بدنامی مول لی اور پھر رام چندر کے سامنے اسے

اگنی پریکشا بھی دینی پڑی۔ یہ وہ عورت ہے جو ماں ہے، بہن ہے، بیوی ہے، بیٹی ہے،
وہی مظلوم عورت بدکی صاحب کے افسانوں کا محبوب ترین موضوع بن چکی ہے۔
اس لیے نہیں کہ وہ بچے پیدا کرنے والی مشین ہے، اس لیے بھی نہیں کہ وہ جنسی بھوک
مٹانے کا ذریعہ ہے بلکہ اس لیے کہ وہ ایشور کی خوبصورت ترین تخلیق ہے جس کو 'دیوی'
کا نام دیا جا چکا ہے۔ بدکی صاحب اسی استحصال زدہ عورت کی کھل کر وکالت کرتے ہیں
اور اسے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے میدان عمل میں اترنے کی ترغیب دیتے ہیں۔''
(ڈاکٹر سرون سنگھ، مضمون 'دیپک بدکی کے افسانوں میں عورت'، مطبوعہ ورق ورق آئینہ، ص ۹۳-۹۴)

چنانچہ افسانہ نگار نوکری کی وجہ سے ملک کے مختلف مقامات پر تعینات رہے اس لیے ان کے نسوانی کرداروں میں تہذیبی، ثقافتی اور شعوری گونا گونیت ملتی ہے۔ وہ خواتین کے کرداروں کو ان کے حقیقی روپ میں پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ایک حقیقت پسند آرٹسٹ کی طرح ان کا پس منظر بھی اپنے کینواس پر اتارتے ہیں۔ پڑھتے وقت قاری کو کہیں پر بھی یہ شبہ نہیں ہوتا کہ وہ زندگی کی سچی تصویر نہیں دیکھ رہے ہیں حالانکہ یہ قصے اور ان کے کردار بقول افسانہ نگار سب تخیلی ہیں۔ یہی دیپک بدکی کے افسانوں کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ قاری اپنے آپ کو یا پھر اپنے کسی جان پہچان والے کو افسانے کے کسی کردار سے موازنہ (Identify) کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ضمن میں دیپک بدکی 'چنار کے پنجے کے' حرف آغاز میں رقم طراز ہیں:

''سرچشمۂ حیات سے تحریک پا کر میں کہانی کے اتار چڑھاؤ اور اس کے انجام کے ممکنات پر غور وخوض کرتا ہوں۔ کئی امکانات سامنے آتے ہیں۔ ان امکانات سے ایک کو چن لیتا ہوں جو میری نظر میں اس کہانی کے لیے موزوں ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کہانیوں کے کردار بھی کسی نہ کسی موڑ پر مجھے مل چکے ہوتے ہیں مگر میں ان کی ہو بہو تصویر اتار کر چسپاں نہیں کرتا۔ پیش کیے گئے کردار گوشت پوست کے چلتے پھرتے کرداروں سے مختلف ہیں۔ وہ ان کے تخیلی اور تصوراتی روپ ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے افسانے جتنے حقیقت کے قریب دکھائی دیتے ہیں اتنے ہی اس سے دور بھی ہیں۔ ہاں میری یہ کوشش ضرور ہوتی ہے کہ پڑھتے وقت قاری کو سچائی کا

گماں ہو۔اسے یوں لگے کہ کہانی میں جو کچھ ہوا ہے یا ہو رہا ہے وہ ممکن ہے۔ایسا اس کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے، گھر میں ہوسکتا ہے، دفتر میں ہوسکتا ہے یا پھر سرِ بازار ہوسکتا ہے۔اگر میں اس مقصد میں کامیاب ہوا ہوں تو اسے اپنی سعادت مندی سمجھ لوں گا۔"

(دیپک بدکی،حرف آغاز،'چنار کے پنجے' پہلا ایڈیشن ۲۰۰۵ء ص ۱۱۔۱۲)

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے دیپک بدکی کے نسوانی کرداروں میں جغرافیائی اور ثقافتی لحاظ سے کافی رنگا رنگی ملتی ہے۔کہیں وہ روائتی معاشرے میں پل رہی طلاق شدہ حمیدہ کی بے بسی کی پُر درد تصویر کھینچتے ہیں (اداس لمحوں کا کرب) اور کہیں جنسی طور پر آزاد روکھا سی قبیلے کی لورین مرک کا ذکر کرتے ہیں (آغوش ہوس)۔کہیں وہ خواتین کی قربانی اور ایثار کو بیان کرتے ہیں (خودکشی) اور کہیں نسوانی بے راہ روی کی منظر نگاری کرتے ہیں (دشت وحشت)۔کہیں دم توڑتی ہوئی رجنی اپنے ڈاکٹر محبوب کو ڈاکٹری کے فرائض یاد دلاتی ہے (ایک ہی خط) اور کہیں ڈاکٹر کملا دیوی اپنے فرائض کو ترجیح دے کر مالی منفعت کو ہیچ کہتی ہے (ڈاکٹر آنٹی)۔غرض یہ کہ دیپک بدکی کے افسانے ایک کہکشاں کی مانند اپنے اندر بہت سارے نسوانی کردار سموئے ہوئے ہیں۔اس بارے میں ڈاکٹر سرون سنگھ فرماتے ہیں:۔

"دیپک بدکی کے نسائی کردار بعض اوقات بغاوت پر بھی اتر آتے ہیں۔یہ بغاوت کہیں علاقائی کلچر کی دین ہے اور کہیں عصری تقاضوں کی تابع۔چونکہ افسانہ نگار نے ہندوستان کا طول و عرض ناپ لیا ہے اس لیے ان کی کئی کہانیوں میں شمال مشرقی علاقے کے نسوانی کردار ملتے ہیں جن کی اخلاقی قدریں ملک کے باقی حصوں سے مختلف ہیں جیسے 'آغوش ہوس' اور 'دو گز زمین'۔افسانہ 'جاگو' بھی بغاوت پر آمادہ ایک مضبوط ارادے کی عورت کی کہانی ہے جو ساری کائنات کو مٹھی میں کر لینے کے خواب دیکھتی ہے........اور یہی دس مردوں کو پچھاڑنے والی عورت آج کی ناری ہے جو اپنی جنسی اور نفسیاتی ضرورتوں سے واقف ہے۔وہ سماجی اور سیاسی حقوق سے باخبر ہے۔اگر بدکی صاحب کی پیش گوئی پر یقین کیا جائے تو مستقبل میں ہمیں ایسی ہی عورت سے واسطہ پڑے گا۔اب پریم چند کے افسانہ 'نئی بیوی' کی آشا لالہ جی کے جانے کے بعد اپنے نوکر جگل کو اپنے شبستان میں نہیں بلائے گی بلکہ بہ بانگ دہل اپنے عاشق کے

ساتھ فرار ہو جائے گی۔ اب 'مانگے کا اجالا' کی مینا کشی آئینگرا اپنے عاشق سے تخم لے کر بچہ جنے گی یا پھر 'بکھرے ہوئے لمحوں کا سراب' کی شلپی اپنے فریادی عاشق کو دروازے سے ناکام لوٹا دے گی۔ اس صارفی دنیا میں اب باپ کے تخم (Sperms) بھی بکاؤ ہوں گے اور ماں کی کوکھ (Womb) بھی بکاؤ ہوگی۔

(ڈاکٹر سرون سنگھ، 'دیپک بدکی کے افسانوں میں عورت'، مطبوعہ ورق ورق آئینہ، ص ۹۶۔۹۷)

دیپک بدکی کے سبھی افسانوں میں خواتین کردار نہیں ملتے۔ کئی افسانوں میں تو صرف نرینہ کردار ہی ملتے ہیں۔ اسی طرح ان کے کچھ افسانے نسوانی کردار کے ارد گرد ہی بنے گئے ہیں اور ان میں خواتین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جبکہ کئی دوسرے افسانوں میں عورت کو ثانوی حیثیت حاصل ہے اور وہ اس افسانے کے نرینہ کردار کی تکمیل (Complement) کرتی ہے۔ چند اہم افسانوں کا تجزیہ ذیل میں درج ہے:

۱) **اماں:** افسانہ 'اماں' آزادی کے بعد کے معاشرے کا اصلی چہرہ ہمارے سامنے لاتا ہے جس میں ابھی بھی انگریزی مستعمرانہ طرز انصرام کو اپنایا جاتا ہے اور معاشرے کے کچھ طبقوں کو الگ تھلگ کر کے ان پر پیشہ ور نقب زنوں اور پیدائشی مجرموں کا لیبل لگایا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ایک گاؤں کے نام نہاد چور اور پیشہ ور مجرم طبقے کی المناک داستان درج کی گئی ہے۔ اس افسانے کے بارے میں رائے دیتے ہوئے مشہور و معروف تنقید نگار وارث علوی یوں رقمطراز ہیں:۔

> ''' اماں' کی تھیم بالکل نئی ہے۔ جرائم پیشہ قبیلوں پر افسانے لکھنے میں ایک خطرہ یہ ہے کہ افسانے بھی جرائم کی کہانیاں بن جاتے ہیں۔ اس کہانی میں آپ نے اضافی جہت پیدا کی ہے اور کمال کی بات یہ ہے کہ وہ بھی افسانہ کے آخری جملہ میں چونکانے والے انجام کے ساتھ ساتھ ماں کی نئی جھلک نے افسانہ کو نفسیاتی اور اخلاقی بصیرت سے مالا مال کر دیا ہے۔''
>
> (وارث علوی؛ مراسلہ بنام مصنف بتاریخ ۱۷ جون ۲۰۰۵ء؛ [بحوالہ ورق ورق آئینہ۔ دیپک بدکی، شخصیت اور فن]؛ ص ۲۶۷

اس افسانے کا مرکزی کردار ایک عمر رسیدہ بیوہ ہے جس کو سارا گاؤں 'اماں' کے نام سے جانتا ہے۔ جمہوری حکومت کے چنگیزی احکام، مسلسل پابندیوں اور حد بندیوں کے سبب وہ کوئی باعزت پیشہ اختیار نہیں کر پاتی۔ اس لیے گھر میں دیسی شراب بناتی ہے اور اس کو بچوں کے ذریعے گاؤں کے باہر بکری کے لیے بھیجتی ہے جس کارروائی میں اس کا اپنا بیٹا بھی ہلاک ہوتا ہے۔ اماں ہمارے ملک کی غریب درجہ فہرست قبیلے کی بے گناہ خواتین کا علامیہ ہے جو بدستور استعماریت، جبر اور افسر شاہی کے سائے میں ڈر اور خوف کے ساتھ جینے کے لیے مجبور ہے۔ یہ پُر اثر نسوانی کردار افسانے کی جان ہے۔

افسانہ خود مصنف بیان کرتا ہے جو کہانی کے ہر زیر و بم کا شاہد ہے۔ راوی اور اُس کے رفیق کار کشور شاہ کو اکادمی کی طرف سے گاؤں کے اعداد و شمار اکٹھا کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ وہاں اُن کی ملاقات ایک بوڑھی عورت سے ہوتی ہے جو گاؤں میں 'اماں' کے نام سے مشہور ہوتی ہے۔ جب دونوں اُس سے نام پوچھتے ہیں تو وہ کوئی جواب نہیں دیتی ہے بلکہ سہمی سہمی نظروں سے اُن کی طرف دیکھتی ہے۔ افسانے سے صاف ظاہر ہے کہ لوگوں کے دلوں پر ایمرجنسی کے زخم ابھی تک موجود ہیں کیوں کہ ٹارگیٹ پورا کرنے کے لیے ان دنوں جو کوئی سامنے پڑ جاتا تھا اس کو زبردستی پکڑ کر نس بندی کا آپریشن کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ پوری زندگی پولیس کی لاٹھی کے نیچے اپنی سانسیں لیتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اماں پوچھنے والوں کو حکومت کے کارندے سمجھ کر خاموشی اختیار کرتی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:-

> ''اب انہیں کون سمجھائے کہ ایمرجنسی تو کب کی ختم ہو چکی ہے۔ سر، دراصل
> یہ قبیلے ہمیشہ پولیس کی لاٹھی کے سائے میں اپنی سانسیں گنتے رہتے ہیں۔
> عتابِ حکومت تو انہوں نے ورثے میں پایا ہے۔''
>
> (دیپک بدکی؛ چنار کے پنجے، پہلا ایڈیشن ۲۰۰۵ء؛ ص ۱۸۔۱۷)

اعداد و شمار اکٹھا کرنے اور رت جگے کے بعد دوسرے دن کشور اور راوی دوبارہ گاؤں کے مکھیا کے کہنے پر بوڑھی اماں کے گھر دیسی شراب کی کشید دیکھنے کے لیے جاتے ہیں۔ وہ بھی ان کے انتظار میں ہوتی ہے۔ اس کا بیٹا کچھ عرصہ پہلے پولیس کی حراست میں مر چکا ہوتا ہے اور اس کی روزی کمانے کا کوئی ذریعہ دستیاب نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ دیسی شراب بیچ کر اپنا پیٹ پالتی ہے۔ ان شراب کی بوتلوں کو گاؤں سے شہر

تک لے جانے کے لئے معصوم بچوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔اقتباس:-

''دھیرے دھیرے بھاپ قطرہ قطرہ شراب بنتی رہی۔میں شراب کھینچنے کے اس طریقہ کار کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔جتنی دیر اماں یہ سب کارروائی کرتی رہی میں اس کے سراپا کا بغور جائزہ لیتا رہا۔گویا میرے سوال کا جواب اب مل چکا تھا مگر پھر بھی ایک بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اس شراب کو اماں باہر کیسے بھیجتی ہے۔

''ان شراب کی بوتلوں کو شہر تک لے جانے کے لیے گاؤں کے معصوم بچوں کا استعمال ہوتا ہے''۔کنہیالال جیسے میرے من کے اندر اٹھے سوال کو تاڑ گیا۔''

(دیپک بدکی؛ چنار کے پنجے، پہلا ایڈیشن ۲۰۰۵ء؛ص ۲۵)

'اماں' کے روپ میں دیپک بدکی نے اردو کو ایک حیرت انگیز اور دلچسپ عورت کا کردار دیا ہے۔ ایک ماں جو اپنا پیٹ پالنے کے لئے گھر میں دیسی دارو کشید کرتی ہے اور اپنے کمسن بیٹے کو گاؤں سے باہر شراب لے جانے کے لئے بطور کوریئر استعمال کرتی ہے مگر وہ لڑکا اس تسکری میں مارا جاتا ہے۔اماں کی اب یہ حالت ہے کہ اس کو ہر جوان لڑکے میں اپنا بیٹا نظر آتا ہے۔اس سین کی منظر کشی کرتا ہوا افسانے کا دلسوز اختتام پیش خدمت ہے:

''مظاہرہ ختم ہوتے ہی ہم نے اماں سے رخصت مانگی اور مکھیا کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ایک دو بار میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔اماں وہیں نیم وا دروازے پر کھڑی احساس گناہ میں جکڑی مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اس نے اپنا بیٹا آج ہی کھو دیا ہو۔''

(دیپک بدکی؛ چنار کے پنجے، پہلا ایڈیشن ۲۰۰۵ء؛ص ۲۵)

۲) رشتوں کا درد: 'رشتوں کا درد' کہانی ہے ایک بے میل جوڑے کی جن کی ازدواجی زندگی جہنم بن چکی ہے اور شوہر ہر دم یہ دعا کرتا ہے کہ کچھ ایسا کرشمہ ہو جائے اور اس کی بیوی اچانک مر جائے تا کہ اس کو تناؤ سے چھٹکارا مل سکے۔وجہ یہ ہے کہ اس افسانے کی ہیروئن بہت ہی اولوالعزم اور جاہ پرست عورت ہے اور دونوں میاں بیوی آپس میں نباہ نہیں کر سکتے ہیں۔اس افسانے کے بارے میں اردو کے مشہور و

معروف افسانہ نگار ہرچرن چاولہ اپنے تاثرات یوں رقم کرتے ہیں:-

"'رشتوں کا درد' زمانہ حال کی عورت کا دردانگیز روپ ہے اور اس کا عبرت ناک انجام۔ حرص و ہوس کی دوڑ میں تھکنے اور ٹوٹ کر گرنے کا ایسا ہی ہولناک نتیجہ نکلتا ہے ۔کسی کا قصور کس کے سر منڈھ دینے کا بے غیرت طریقہ۔ عورت جب گرتی ہے تو ذلالت کی انتہائی گہرائیوں تک چلی جاتی ہے۔ وہ جو اسے سماج نے ایک دیوی کا درجہ دے رکھا ہے وہ اس کے برعکس ایک ڈائن کا روپ بھر لیتی ہے۔ اور ایک ڈائن کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے یہ اس دردناک اور عبرت انگیز انجام کو عکس ریز کرتی ایک خوبصورت کہانی ہے۔(ہرچرن چاؤلہ، مراسلہ بنام دیپک بدکی مرقوم ۲۴ جون ۲۰۰۰ء)

خواتین کی جاہ طلبی کوئی گناہ نہیں۔ ایک مہذب معاشرے میں مرد و عورت کا شانہ بہ شانہ کام کرنا اور قدر و منزلت پانا معاشرے کی ترقی یافتہ ہونے کی دلیل ہے۔ مگر اس افسانہ میں جو سوال اٹھایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اپنا منصب پانے کے لیے کن ذرائع کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ انگریزی کا مقولہ ہے کہ نیک انجام نیک طریقوں سے ہی ممکن ہے (Good ends can be achieved through good means only)۔ مہاتما گاندھی بھی کمیونسٹوں سے اسی بات پر اختلاف کرتے تھے کیونکہ کمیونسٹ قتل و غارت اپنا کر معاشرے کو برسوں کے طبقاتی استحصال سے آزاد کرانا چاہتے تھے جو ان کے خیال میں غلط تھا۔ اس افسانے میں بھی ہیروئن اپنی مفلسی سے چھٹکارا پانے اور دولت حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"مفلسی کے بدبودار پیراہن کو اتار پھینکنے کے کوشاں تو ہم دونوں ہی تھے مگر اس نے بہت ہی عجلت سے کام لیا۔ وہ انسانیت کے سبھی تقاضوں کو بھول گئی۔ چوہوں کی اس دوڑ میں ہم ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں منہمک ہو گئے۔"

(دیپک بدکی، 'ادھورے چہرے' دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۵ء؛ افسانہ 'رشتوں کا درد' ص ۱۴)

ایک اور اقتباس پیش خدمت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی، جو غالباً کسی اونچے عہدے پر تعینات ہے اور اس افسانے کا راوی بھی ہے، پوزیشن کا فائدہ اٹھا کر گورنمنٹ سے دیے گئے ریلیف کو غلط طریقوں سے حاصل کرتی ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتی کہ اس بات کا پتہ چلنے پر کیا نتیجہ

نکل سکتا ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس:

''وہ جھوٹ، مکر و فریب اور جرائم کی بیساکھیوں کے سہارے ترقی کے زینے طے کرتی رہی۔ ریلیف دفاتر میں کئی بے نامی کھاتے کھول کر وہ دو دو ہاتھوں سے روپیہ بٹورنے لگی اور اسی سرمائے سے اس نے اپنے مستقبل کی مکان خرید لی۔ اس لوٹ میں میرے نام کو بھی گھسیٹا گیا۔ میرے اثر و رسوخ سے کھاتے کھلتے رہے اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ اب تک تو میرے نام کی دھجیاں بھی اڑ چکی ہوں گی۔''

راوی کی بیوی خود غرضی اور ابن الوقتی کا پیکر ہوتی ہے اور ہمیشہ اس کوشش میں لگی رہتی ہے کہ وہ اپنے پتی سے سبقت حاصل کر لے۔ ایسا کرنے میں چاہے اسے کوئی بھی حربہ استعمال کرنا پڑے۔ چنانچہ وہ ایک جرنلسٹ ہوتی ہے اس لیے اس کی بھینٹ فریڈم پارٹی کے ایک پُر اثر اور مقبول ترین نوجوان لیڈر ابھے سنگھ سے ایک انٹرویو کے دوران ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ابھے سنگھ اس کو محض ایک داشتہ بنا کر رکھنا چاہتا ہے جبکہ وہ ازدواجی بندھن میں بندھنے پر اصرار کرتی ہے تاکہ وہ باضابطہ منکوحہ عورت کی حیثیت سے سیاسی میدان میں اتر سکے اور اپنا کیریئر بنا سکے۔ اسی آپسی چپقلش میں ابھے سنگھ اس کو ایک ہوٹل کے تندور میں جلا کر راکھ کر دیتا ہے (بہت برس پہلے دہلی میں ایک ایسا ہی کانڈ سامنے آیا تھا) اور اپنے اثر و رسوخ سے صاف بچ نکلتا ہے جبکہ راوی کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے۔ بقول راوی اسے روز روز کی گھریلو چخ چخ اور تناؤ سے جیل کی وہ کوٹھری زیادہ آرام دہ لگتی ہے۔ غرض یہ کہ اس عورت کی بوالہوسی سے آخرکار نہ صرف وہ خود بلکہ اس کا شوہر بھی دردناک انجام سے ہمکنار ہوتا ہے۔

اس افسانے کے انجام پر ڈاکٹر انوار احمد انصاری اپنے تاثرات یوں قلم بند کرتے ہیں:

''دیپک بدکی کا اختتامیہ انتہائی چونکا دینے والا ہوتا ہے جس سے قاری کا ذہن ایک دم محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہی چیز افسانے کی جان ہوتی ہے۔ وہ پہلے سے ہی پلاٹ سازی کی فکر نہیں کرتے بلکہ ایک مبسوط افسانہ اپنے حیرت خیز اختتام سمیت ان کے ذہن میں اس طرح تشکیل پاتا ہے کہ بے اختیار کاغذ کے سینے پر پھسلتا جاتا ہے اور افسانہ تمام و کمال بس کلائمکس ہی کلائمکس نظر آتا ہے۔''

(ڈاکٹر انوار احمد انصاری، مضمون 'دل کو چھو لینے والا افسانہ نگار'

مطبوعہ پندرہ روزہ صدائے اردو بھوپال، ۱۵ جولائی ۲۰۰۵ء)

۳) چڑی کی بیگم :اس افسانے کا نسوانی کردار ایک نڈر، پُرخلوص اور جان نثار لڑکی ہے جس کا نام شیاملی ہے اور جو افسانے میں آخر تک چھائی رہتی ہے۔وہ نیلور آندھرا پردیش کی رہنے والی ہے جو اپنے ماں باپ کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے نوکری کی تلاش میں دِلّی آتی ہے۔یہاں اس بات کی جانب بھی اشارا ہے کہ وہ نہ صرف اس علاقے سے تعلق رکھتی ہے جو ساحلی ہے بلکہ جو دکن میں واقع ہے جہاں کالے رنگ کی فراوانی ہے۔اس کی پہلی ملاقات راوی سے ایس این داس گپتا کالج میں ہوتی ہے جہاں وہ دونوں آل انڈیا سول سروسز کے امتحان کی تیاری میں مشغول ہوتے ہیں۔شیاملی راوی کو پہلی ہی ملاقات میں پیار کا اظہار کرتی ہے جبکہ راوی اس کی شکل وصورت دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ سیاہی مائل سانولے رنگ کی ہوتی ہے۔راوی اسے چھٹکارا پانے کے لیے بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتا ہے اور بڑی بے دلی اور بے باکانہ لہجے میں مخاطب ہوتا ہے:-

پیار......!میں پیار ویار کا قائل نہیں۔عملی قسم کا آدمی ہوں۔یہ افلاطونی پیار کے قصے مجھے راس نہیں آتے۔آخر کار بات وہیں پہنچ جاتی ہے۔یعنی سیکس پر۔میرے پاس ان فالتو چیزوں کے لیے کوئی وقت نہیں۔ ہاں اگر سیکس چاہیے تو میں حاضر ہوں۔ ابھی اسی وقت۔''

(دیپک بدکی؛ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی پہلا ایڈیشن؛ص ۷۲)

کہانی کا ہیرو شیاملی کو یہ الفاظ اس لئے کہتا ہے کہ وہ اُسے بُرا بھلا کہہ کر اس کا پیچھا چھوڑ دے لیکن اس کا ردِ عمل کچھ اور ہی ہوتا ہے۔وہ بڑی ندامت کے ساتھ جواب دیتی ہے:-

''آپ بہت ہی سنگدل ہیں۔کٹھور اور بے مروت بھی!اگر آپ کو سیکس ہی چاہیے تھا کم سے کم میرا دل رکھنے کے لیے تھوڑا بہت پیار کا اظہار تو کیا ہوتا۔''

(دیپک بدکی؛ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی پہلا ایڈیشن؛ص ۷۳)

شیاملی دکھی ہو کر چلی جاتی ہے مگر کچھ سوچ بچار کرنے کے بعد پھر لوٹ آتی ہے۔اسے راوی کی

بے باکی اور شفافیت پسند آتی ہے اور اس کی شخصیت میں خلوص اور ایمانداری کا شائبہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اسی دیدہ دھوئی اور بے دریغی سے جواب دیتی ہے اور خود کو اس کے سپرد کرتی ہے۔ پھر راوی شیاملی کو اپنے دوست کے گھر لے جاتا ہے جہاں پر وہ سول سروسز کے امتحان کی تیاری کرنے کے لیے رہائش پذیر ہوتا ہے۔ دونوں اپنے جسموں کی آگ بجھاتے ہیں مگر ان کی دوستی بدستور جاری رہتی ہے۔ امتحان میں راوی کامیاب ہوتا ہے جبکہ شیاملی ناکام رہتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ راوی اس رشتے کو عارضی سمجھتا ہے اس لیے شیاملی کو بھول کر اپنی دنیا میں کھو جاتا ہے جبکہ شیاملی اس رشتے کے بارے میں مخلص ہوتی ہے اور اپنے محبوب کے بارے میں پتہ لگانے کے لیے اس کے دوست سے ملتی ہے ۔ چھ سال کی طویل مدت کے بعد راوی کی واپسی ہوتی ہے اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ شیاملی اس کے دوست جیون لال کی بیوی بن چکی ہے۔ وہ حیران ہو جاتا ہے اور دوست سے سوال کرتا ہے جس کا جواب اس کا دوست بخوبی دے دیتا ہے:۔

> ''مگر یار زندگی میں سیکس ہی سب کچھ نہیں ہے۔ بیوی کے اور بھی فرائض ہوتے ہیں۔''
>
> ''یہیں پر لوگ مات کھاتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی لڑکیاں جن کے بدن سے شرارے اٹھتے ہیں بیوی بننے کے قابل نہیں ہوتیں۔ غلط، بالکل غلط۔ میری ازدواجی زندگی اس کی سند ہے۔ ایسا کوئی وصف نہیں جو میری بیوی میں نہیں ہے۔''
>
> (دیپک بدکی؛ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی پہلا ایڈیشن؛ ص ۷۶)

بدکی صاحب نے اپنے افسانوں میں مردوں کی سوچ، ان کی نفسیات کو بہت ایمانداری سے پیش کیا ہے۔ مرد چاہے شادی شدہ ہو یا کسی بھی عمر سے تعلق رکھتا ہو۔ دوسری عورت اسے ہمیشہ پسند کرتی ہے۔ ان کے کردار آج کے دور کے کردار ہیں۔ اس افسانے پر رائے دیتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں۔

> '''چڑی کی بیگم' کا کردار قابلِ تعریف ہے اور تم نے ایسے کردار کو زبان دی اس کیلیے تم تعریف کے مستحق ہو۔ لیکن یہاں بھی افسانے کا انجام بنایا ہوا لگتا ہے۔ اس میں ناگزیریت نہیں ہے۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی؛ دیپک بدکی کے نام خط بتاریخ ۲۳/مارچ،۲۰۰۸؛

مطبوعہ ورق ورق آئینہ۔دیپک بدکی۔شخصیت اور فن؛ص ۲۷۱_۲۷۲)

افسانے پر ماہنامہ تخلیق لاہور میں تبصرہ کرتے وقت انور سدید اپنے تاثرات کو مندرجہ ذیل الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں:-

''میرے جیسے بوڑھے (عمر ۸۰ برس) قاری کو دو ہزار واٹ کا شاک لگتا ہے۔اس شاک میں اس وقت مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب شیا ملی پیاز کے چھلکوں کی طرح اپنے کپڑے اتار دیتی ہے اور اندر سے سانولے رنگ کا کسا ہوا چکنا اور متناسب جسم ابھرتا اور واحد متکلم کے وجود کو مہکا دیتا ہے اور پھر جسم بھول جاتے ہیں اور روحیں ہم کلام ہو جاتی ہیں۔افسانے کی تمام واردات ہیجان انگیز اور لذت خیز ہیں لیکن اختتام پر جب الٹے توے جیسی کالی اور کیل مہاسوں سے بھرے چہرے والی شیا ملی کو 'چڑی کی بیگم' کا خطاب دینے اور اس کی تمام جنسی وارداتوں سے باخبر........واحد متکلم کا دوست 'چڑی کی بیگم' سے شادی کر لیتا ہے تو افسانہ پھول کی طرح کھل اٹھتا ہے اور افسانے کی حقیقی اخلاقیات سامنے آجاتی ہیں۔''جوانی میں کس سے لغزش نہیں ہوتی۔جب تمھیں اور مجھے حق حاصل ہے تو عورتوں کو کیوں نہیں؟ یہ تو اتفاق سمجھو کہ مجھے اس کی بیتی ہوئی زندگی کا علم ہے ورنہ ارینجڈ (arranged) میرج ہوتی تو مجھے اس کے ماضی کے بارے میں کہاں جانکاری ہوتی؟''''

(انور سدید؛تبصرہ بعنوان' چند ہندوستانی کتابیں ایک پاکستانی کی نظر میں۔زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی؛مطبوعہ ماہنامہ تخلیق،لاہور پاکستان جلد ۳۹،شمارہ ۴،اپریل ۲۰۰۸،ص ۱۳۷_۱۳۹)

٤)اداس لمحوں کا کرب: افسانہ 'اداس لمحوں کا کرب' میں دو نسوانی کردار ہیں--ایک امیر خاندان سے تعلق رکھنے والی تعلیم یافتہ خاتون جو بلوریں محلوں میں رہنے کے سبب زمینی حقیقت سے ناآشنا ہے اور دوسری غریب ، مفلس اور ان پڑھ ہے جو اپنے خاوند کی طوطا چشمی کے سبب زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے ترستی ہے اور آخر کار کینسر میں مبتلا ہو کر بے یار و مددگار مر جاتی ہے--اس افسانے میں مسلم معاشرے میں طلاق کے عوض مہر مئوجل کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس افسانے پر رائے دیتے ہوئے

قمر رئیس رقمطراز ہیں۔

''اداس لمحوں کا کرب میں حمیدہ کا المیہ میرے نزدیک بنیاد پرستی اور دقیانوسیت کی اسیر ایک پوری قوم کا بلکہ پوری انسانیت کا المیہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ کسی عصبیت کے شائبہ کے بغیر آپ نے صرف انسانی دردمندی کے نشتر سے اس ناسور کو کریدنے کی جرأت کی۔''

(قمر رئیس؛ ورق ورق آئینہ [دیپک بدکی۔ شخصیت اور فن]؛ ص ۲۶۹)

افسانہ 'اداس لمحوں کا کرب' کے ابتدا میں ہم جس خاتون سے متعارف ہوتے ہیں وہ مسلم معاشرے کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ ذہین اور پڑھی لکھی ہے۔ وزٹینگ پروفیسر کے عہدے پر یونیورسٹی میں تعینات ہوتی ہے۔ اور اپنی بات سلیقہ سے پیش کرنے کے ہُنر سے واقف ہے۔ راوی کے سوالات کا دلائل کے ساتھ جواب دیتے ہوئے نادرہ بیگم کی روشن خیالی، خوش فکری، ذہنی آزادی اور ذہنی سرشاری کا پتہ چلتا ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ اونچے طبقے سے تعلق رکھنے کے سبب وہ پسماندہ طبقوں کی خواتین کے مسائل کا اندازہ نہیں لگا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طلاق جیسے مسئلے پر پریشان نظر نہیں آتی کیوں کہ وہ اس طبقہ سے تعلق رکھتی ہے جہاں طلاق کے عوض مہر مئوجل کے طور پر اسے ایک بہت بڑی رقم کے علاوہ موٹر کار اور بنگلے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ ذہنی طور پر خود کو مطمئن کرتی ہے کہ ان ساری آسائشوں کے ہوتے ہوئے اسے اور کیا چاہیے۔

''آپ کی انفارمیشن غلط ہے۔ یہ سب غلط فہمیاں چند مفاد پرست سیاسی رہنماؤں اور ذرائع ابلاغ کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ آپ میری ہی مثال لیجیے۔ جب میری شادی ہوئی تھی میرے ہونے والے پتی نے ایک بنگلہ اور ایک کار دینے کا وعدہ کیا۔ شادی ہوتے ہی انہوں نے میرے نام اپنا فارم ہاؤس لکھ دیا اور پھر ایک نئی کار خرید کر میرے حوالے کر دی۔ اب آپ ہی بتایئے اس کے علاوہ کیا دے سکتے تھے۔ خدانخواستہ اگر مجھے ضرورت پڑے گی تو کیا اتنی ساری رقم میرے لیے کافی نہیں۔''

(دیپک بدکی؛ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی پہلا ایڈیشن؛ ص ۸۵)

افسانے کا دوسرا اہم اور مرکزی کردار حمیدہ کا ہے۔ جو دراصل اس افسانے کا محرک بھی ہے۔ حمیدہ کی شادی خالہ زاد بھائی ایوب سے ہو جاتی ہے مگر پانچ برسوں میں ہی دو بیٹوں کو جنم دے کر اسے میکے واپس آنا پڑتا ہے کیوں کہ اس کا شوہر، جو کسی قالین تاجر کے ہاں کام کرتا ہے، کولکتہ میں کسی بنگالی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ وہ سال میں صرف ایک بار دس پندرہ روز کے لیے گھر آجاتا ہے اور ہر تین ماہ کے بعد اپنی بیوی کو پانچ سو کا منی آرڈر بھیجتا ہے۔ جس میں دو لڑکیوں کے سنگ گزر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ابتدا میں اس کا شوہر ایوب طلاق دینے سے گریز کرتا ہے کیوں کہ کولکتہ میں خدمت کرنے کے لیے نئی بیوی تھی اور کشمیر میں ذائقہ بدلنے کے لیے حمیدہ۔ بہر حال یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ نئی بیوی نے روپیہ بھیجنے پر روک لگا دی اور اسے طلاق دینا ہی پڑا:

> ''بے چاری تعلیم یافتہ تو نہیں تھی البتہ بچپن میں نمدہ سازی کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ وہ نمدوں پر خوبصورت کڑھائی کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتی تھی۔ بس اسی مزدوری سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے لگی۔''
>
> (دیپک بدکی؛ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی پہلا ایڈیشن ؛ص ۸۸)

حمیدہ محنتی، ایماندار، نیک اور حوصلہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ ہر حال میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ شومئی طالع یہ کہ وہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے اور ایڑیاں رگڑتے ہوئی رحمت حق ہو جاتی ہے۔ اس دوران وہ اپنے شوہر سے مہر میں ملے ہوئے ایک سو اکیاون روپے بے رحم زندگی کی امانت سمجھ کر اپنی رومال میں محفوظ کرتی ہے اور اپنی آنکھوں کے سامنے یوں لٹکاتی ہے کہ چوبیس گھنٹے ان پر نظر رہے۔ ایک سو اکیاون روپیوں کی قلیل رقم اس کی بے چارگی کا علاج تو نہیں ہو سکتی تھی۔ پہلے تو وہ خود بھی محنت مشقت کر کے کما لیتی مگر کینسر میں مبتلا ہو کر اب وہ یہ کام بھی نہیں کر پاتی تھی اور سامنے دو بیٹیاں تھیں جن کا پیٹ تو بہر حال پالنا ہی پڑتا تھا۔ اس کے برعکس اس کا خاوند اپنی نئی بیوی کے ساتھ کولکتہ میں عیش کرتا ہے۔ حمیدہ کے نالوں کی گونج شاید آسمان تک پہنچنے کے لیے کافی تھی۔ افسانے سے اقتباس:

> ''ارے خدا، میں نے تیرا کیا بگاڑا جو تم مجھ پر اتنے ستم ڈھا رہا ہے۔'' ''ارے مر گئی.. مجھے کوئی تو آکر بچا لو۔'' ''کیا اس دنیا میں کوئی نہیں جو مجھے بچا سکتا ہے۔............

ہائے خدایا، تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا۔'' ''اگر مرنا ہی قسمت میں لکھا ہے تو اٹھا تا کیوں

نہیں۔اتنی اذیتیں کیوں دے رہا ہے۔''

(دیپک بدکی؛ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی پہلا ایڈیشن؛ ص ۸۸)

☆☆☆☆☆

☆ مضمون نگار: محمد امین نجار؛ ماخوذ مقالہ بعنوان 'دیپک بدکی کے افسانوں میں نسوانی کردار' مقالہ برائے ایم فل؛ اسکول آف ہیومانٹیز، یونیورسٹی آف حیدر آباد؛ جون ۲۰۱۳

==

دیپک بُدکی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ

چنار کے پنجے

کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء میں منصۂ شہود پر رونما ہو چکا ہے۔

☆ آپ کہانی بغیر ادھر اُدھر بھٹکے، بغیر حشو وزائد برائے بیت کے، بڑی کفایت شعاری اور واقعات کی صحیح ترتیب کے ساتھ لکھتے ہیں۔زبان پر آپ کو غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔۔اماں تھیم بالکل نئی ہے...'ایک نہتے مکان کا ریپ' بے مثال افسانہ ہے:...یہ اردو میں اپنی نوعیت کا اچھوتا افسانہ ہے۔اس پر تمھیں جتنی مبارک باد دی جائے کم ہے۔

(وارث علوی ، احمد آباد؛ ۱۷ جون ۲۰۰۵ء)

☆ عنوان ہی گہری معنویت کا حامل ہے۔'حرف آغاز' میں آپ نے بڑی جرأت مندی سے کھری کھری باتیں کی ہیں...... آپ نے بعض ایسے مسائل کو چھوا ہے جنھیں عام افسانہ نگار قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ پہلا ہی افسانہ 'اماں' مسئلے کی ایک نئی جہت سے آشنا کراتا ہے۔''

(مظہر امام ، دھلی ؛ ۱۳ اپریل ۲۰۰۵ء)

☆ آپ کی کہانی (مانگے کا اجالا) دل کے نازک تاروں کو چھوتی ہے۔.... 'مخبر' مجھے بہت اچھی لگی...دنیا میں ظلم بہت بڑھ گیا ہے۔ناانصافیوں کا بھی شمار نہیں۔یہ کہانیاں ہمیں آئینہ دکھاتی ہیں اور ان آئینوں میں اگر ہم اپنا بھیانک چہرہ دیکھنے کی اخلاقی جرأت پیدا کرلیں تو شاید ہمارے اعمال درست ہو جائیں۔

(سلطانہ مہر ، وال نٹ، امریکا؛ ۱۶ مئی ۲۰۰۲ء)

☆ آپ کے افسانوں میں ایک عجیب قسم کی جذباتی اور زمینی کشمکش دکھائی دیتی ہے جو آپ کو ایک بالکل مختلف کہانی کار بنا دیتی ہے۔

(صالح الدین برویز، مدیر استعارہ، نئی دھلی مئی ۲۰۰۵ء)

ملنے کا پتہ :ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸، وکیل سٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-۶؛ قیمت ۲۰۰ روپے

دیپک بدکی کے افسانوں میں کشمیر کی عکاسی

--توصیف مجید لون

ضرور اس بستی میں مقتل رہے ہیں ہوا سے آرہی ہے بولہو کی اور

وادی کشمیر، جو دنیا بھر میں جنت ارضی کے نام سے موسوم ہے، کی ایک جھلک پانے کے لئے پوری دنیا کے لوگ بے قرار و بے تاب نظر آتے ہیں۔ قدرت نے جہاں ایک طرف اس سرزمیں کو قدرتی مناظر سے سنوارا ہے وہیں دوسری طرف یہاں کی ذرخیز مٹی کو یہ خصوصیت بخشی ہے کہ بے شمار عبقری ذہن پیدا ہوئے ہیں۔ اس زعفرانی مٹی نے کئی ایسے بلند پایہ اور خوش فکر ذہنوں کو جنم دیا ہے جنھوں نے اپنے رنگ اور خوشبو سے ریاست جموں و کشمیر کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی شہرت حاصل کی ہے۔ برج نرائن چکبست، علامہ اقبال، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، قدرت اللہ شہاب، اکبر حیدری وغیرہ جیسے عظیم قلمکاروں کا تعلق اسی سرزمیں سے رہا ہے اور وہ ہمیشہ کشمیری ہونے پہ فخر محسوس کرتے رہے۔ دیپک بُدکی بھی اسی شاداب سرزمین میں جنمے قلمکار ہیں جنھوں نے اپنی ذہنی قوتوں اور محسوساتی رنگارنگی سے وادی کشمیر کا نام بلند کیا ہے۔

دیپک کمار بدکی نے ۱۵ رفروری ۱۹۵۰ء کو کشمیر کے تاریخی شہر سرینگر میں محلہ کرالہ ٹینگ، وازہ پورہ، مہاراج گنج میں آنکھ کھولی۔ وازہ پورہ مسلم طباخوں کی بستی ہے جنھیں اس فن (وازہ وان) کے لیے عالمی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ موصوف نے اپنی تعلیم کا آغاز ایک جبری اسکول سے کیا جس کا سلسلہ بہت عرصہ پہلے مہاراجہ ہری سنگھ نے مقامی لوگوں میں تعلیم عام کرنے کی غرض سے شروع کیا تھا۔ ان اسکولوں میں بنا فیس لیے بچوں کو زبردستی لاکر تعلیم دی جاتی تھی۔ بُدکی نے وادی ہی میں یونیورسٹی تک پڑھائی کر لی اور پھر کشمیر یونیورسٹی سے ایم ایس سی، علم نباتات (Botany) اور بی۔ ایڈ کی ڈگریاں حاصل کر لیں۔ حالانکہ پرائمری اسکول میں تھوڑی بہت اردو سیکھی تھی مگر سائنس اسٹوڈنٹ ہونے کے سبب ہائی سکول میں

اردو سے ناتا ٹوٹ گیا اور انگریزی زبان ذریعہ تعلیم بن گئی۔ اردو زبان و ادب سے دیپک کمار بدکی کے رشتے کی تجدید پھر سے اس وقت ہوگئی جب ان کے ہم عمر پھپیرے بھائی کی ناگہانی موت واقع ہوگئی۔ انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے اور اپنے دل کا درد کاغذ پر انڈیلنے کے لئے اسی رات ایک ڈرامہ 'بندھن' اور کچھ اشعار لکھ ڈالے مگر وہ بعد میں تلف ہو گئے۔ انگریزی، ہندی یا اردو، کسی بھی زبان پر قدرت نہ ہونے کے سبب انہوں نے اردو سیکھنے کی ٹھان لی اور باضابطہ ایوننگ کلاسز جائن کر کے جامعہ اردو، علی گڑھ کے ادیب اور ادیب ماہر امتحانات ۱۹۶۹ اور ۱۹۷۰ء میں بالترتیب کامیاب کئے۔ اردو سیکھنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ ان کے پھوپھا پنڈت شام لال صراف، جو ریاستی کابینہ کے وزیر اور پھر لوک سبھا کے ممبر تھے، انھیں زندگی کے راز و رموز سمجھانے کے لئے اقبالؔ اور سوامی رام تیرتھ کے اشعار گاہے بہ گاہے سناتے تھے جن سے ان کے دل میں اس زبان کے لیے عجیب سا تجسس پیدا ہو گیا۔ اس طرح صراف صاحب کی سرپرستی نے ان کی زندگی کا نقشہ بدل ڈالا۔ اسی دوران ان کی افسانہ نگاری کا سلسلہ بھی چل نکلا اور دیپک کمار بُدکی سے ان کی تقلیب بطور دیپک بُدکی ہوئی۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ 'سلمیٰ' سے کیا جو سرینگر کے روزنامہ 'ہمدرد' میں دو قسطوں میں شائع ہوا اور جس کی انھیں انتہائی خوشی محسوس ہوئی۔ اپنی ابتدائی کاوشوں پر بات چیت کرتے ہوئے بدکی یوں لکھتے ہیں:-

> "۱۹۷۰ میں جب گاندھی کالج، سری نگر میں بی ایڈ کورس کر رہا تھا، کالج میں گورونانک کی تعلیمات پر ایک ڈبیٹ منعقد ہوا جس میں میں نے شرکت کی۔ حالانکہ سب سے زیادہ واہ واہ میں نے ہی بٹورلی اور ہال تالیوں کی گونج سے گونجتا رہا پھر بھی انعام کسی اور کو دیا گیا۔ اس واقعے کے زیر اثر میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر پہلا افسانہ تحریر کیا۔ بے صبری اتنی تھی کہ افسانے کو عنوان دئے بغیر ہی دوڑتا ہوا اخبار میں چھپوانے کے لئے نکل پڑا۔ اخبار کے گیٹ تک پہنچ کر بھی کوئی عنوان نہیں سوجھا اس لئے افسانے کی ہیروئن 'سلمیٰ' کا نام لکھ ڈالا۔"

(سہ ماہی 'انتساب' سرونج، گوشۂ دیپک بُدکی؛ جلد ۲۵، شمارہ ۶۳، جولائی۔ستمبر؛ ص۔۱۱۹)

اس کے بعد وہ مقامی اخباروں آفتاب، نشیمن، عقاب وغیرہ میں چھپتے رہے۔ ۱۹۷۴ء میں

دیپک بدکی کا ایک افسانہ 'ریزے' دوردرشن سرینگر سے ایک کہانی پروگرام کے تحت ٹیلی کاسٹ ہوا۔ پھر ان کی کہانیاں رفتار جموں، رگ سنگ کانپور، گنگ وجمن کانپور، تعمیر ہریانہ چنڈی گڑھ اور تعمیر سرینگر میں شائع ہوئیں۔ علاوہ ازیں مقامی اخباروں میں صحافت اور کارٹوننگ کے ساتھ بھی جڑ گئے۔ اس دوران انھوں نے کئی فرضی نام اختیار کیے جیسے ہجوؔد کاشمیری، ڈی کے سنتوش، موہن نرمل وغیرہ مگر کوئی بھی نام دل کو نہ بھایا اور آخر کار دیپک بُدکی کے قلمی نام پر ہی اکتفا کیا۔ ۱۹۷۸ء کے بعد ان کے تخلیقی عمل پر جمود سا چھا گیا اور انہوں نے لکھنا ترک کر لیا کیونکہ بقول دیپک بُدکی ''میں جو کچھ بھی لکھتا تھا اس میں موجودہ نظام کے خلاف احتجاج اور بغاوت کی بو آتی تھی۔ (سہ ماہی 'انتساب'، سرونج، گوشۂ دیپک بُدکی، جولائی۔ستمبر؛ ص۔۱۱۹)۔ شاید ان کی انڈین پوسٹل سروس کی نوکری بھی مانع رہی ہوگی۔ البتہ یہ خاموشی ۱۹۹۶ء میں ٹوٹ گئی اور ان کا قلم پھر سے چل پڑا۔

بہر حال اس دوران دیپک بُدکی نے اردو اور انگریزی ادب کا مطالعہ جاری رکھا اور نامور فکشن نگاروں جیسے موپاساں، سعادت حسن منٹو، برٹرینڈ رسل، آئین رینڈ، اِرونگ سٹون، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی وغیرہ کی کتابیں پڑھ لیں۔ انجام کار ان کے نظریات میں تبدیلی اور پختگی آتی گئی۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور تسلسل کے ساتھ افسانہ نگاری کے کینواس پر رنگ بھرتے رہے۔ دراصل ۱۹۹۶ء میں نجی حالات نے ایسی کروٹ بدل لی کہ دیپک بدکی دوبارہ ہاتھ میں قلم اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ تب سے آج تک وہ مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ان انیس برسوں میں انہوں نے دس کتابیں اردو ادب کی تجوری میں ڈال دیں جن میں سے چھ افسانوی مجموعے ہیں۔ نام یوں ہیں؛ (۱) ادھورے چہرے، ۱۹۹۹ء؛ (۲) چنار کے پنجے، ۲۰۰۵ء؛ (۳) زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ۲۰۰۷ء؛ (۴) ریزہ ریزہ حیات، ۲۰۱۰؛ (۵) روح کا کرب، ۲۰۱۵؛ (۶) مٹھی بھر ریت [افسانچے]، ۲۰۱۵۔ ان کے افسانے اور افسانچے ہندوستان، پاکستان اور اردو کی نئی بستیوں کے اکثر معیاری رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور علمی وادبی دنیا سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ کئی یونیورسٹیوں مثلاً جموں، حیدر آباد اور بڑودہ میں بدکی کی ادبی تخلیقات کو سراہتے ہوئے بیشتر اسکالروں نے ان کی تخلیقات پر تحقیق کا کام انجام دیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب کے نمائندہ فنکاروں اور ادیبوں نے ان کے تخلیقات پر اپنے قلم سے جواہر ریزے

بکھیر دئے ہیں۔

دیپک بدکی کے مجموعوں میں شامل کہانیاں دراصل کشمیر کی کہانیاں ہیں کیونکہ ان کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کا بیشتر حصہ اسی وادی میں گزرا ہے۔اس لئے اس علاقے کی ملی جلی تہذیب، اس کے رنگا رنگ قدرتی مناظر، شعروادب کی اعلیٰ روایات اور پرسکوں ماحول سے ان کا جذباتی رشتہ ہمیشہ قائم رہا۔ بدقسمتی سے زمانے کی آزمائشوں اور موسم کی سازشوں نے اس جنت ارضی کو جہنم کدہ بنا دیا۔حال آں کہ یہ وہی کشمیر ہے جو کبھی امن وسکون، سکھ چین اور بھائی چارے میں اپنی مثال آپ تھا۔یہاں کے لوگ اتنے رحم دل تھے کہ اپنے سامنے مرغے کو ذبح ہوتے دیکھنا برداشت نہیں کرپاتے تھے۔کشمیری لوگوں کی رحم دلی پر مشہور افسانہ نگار وریندر پٹواری یوں رقم طراز ہیں:

> ''کشمیری عوام عام طور کسی کو بھی جان سے نہیں مار سکتے، اس لئے سوچ سمجھ وعمل پر صوفی سنتوں کا اثر ہے۔اس لئے عام طور پر چوہے کو پھندے سے آزاد کر کے دریا میں ڈالا جاتا ہے۔چوہا کبھی ادھر کبھی ادھر تیرتا رہتا ہے''
>
> (دیپک بدکی، 'عصری شعور'؛ میزان پبلشرز، بٹہ مالو، سرینگر؛ ص۔۲۰)

البتہ آج معاملہ بالکل برعکس ہے۔کل تک جس جنت کی فضائیں روحانی مہک سے معطر تھیں، دیکھتے ہی دیکھتے اس جنت میں گولیوں اور دھماکوں کی گن گرج سنائی دینے لگی۔ ہر طرف چیخ وپکار، افراتفری، تباہی، بربادی کا سلسلہ پھیلتا گیا۔انسانی خون پانی کی طرح بہنے لگا۔پوری وادی عملی طور پر میدان جنگ میں یکلخت تبدیل ہوگئی۔ چھاپے، گرفتاریاں، کریک ڈاون، کرفیو، کراس فائیرنگ، گرنیڈ حملے، اور بم دھماکے کشمیر کا مقدر بن گئے۔دیپک بدکی اپنی بیشتر کہانیوں اور دوسری تحریروں میں دیار کشمیر کی گود میں گزارے ہوئے لمحوں کو عقیدت سے یاد کرتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ ان کے تخیل اور تخلیقی شعور کی تعمیر میں کشمیر کے اس خطے کا خاصہ عمل دخل رہا ہے۔ان کی کہانیوں میں وہ کشمیر بھی نظر آتا ہے جو تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ بھائی چارے، امن وسکون اور سکھ چین کے لیے دنیا بھر میں مشہور تھا۔وہاں کے لوگوں میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی، پیار ومحبت، اور میل ملاپ ہوا کرتا تھا۔بڑوں کا ادب واحترام کرنا، چھوٹوں پر شفقت کا ہاتھ رکھنا اور خواتین کی عزت کرنا فرض سمجھا جاتا تھا۔مذہب کے نام پر ایک دوسرے

کے ساتھ کسی قسم کا بھید بھاؤ نہیں ہوتا تھا۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ لوگ اپنا دکھ درد ایک دوسرے کے ساتھ بانٹتے تھے اور شرم وحیا کی بندشوں میں بندھے رہتے تھے۔۔ ہر کسی میں اپنے پن کی مٹھاس کوٹ کوٹ کر بھری رہتی تھی۔ مختلف فرقوں اور مسلکوں سے تعلق رکھنے والے ایک ہی کنبے کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ دوسری طرف دیپک بُدکی کے افسانوں میں وہ کشمیر بھی نظر آتا ہے جس کی مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو کی بجائے بارود کی بو آتی ہے۔ بدکی نے جس جرأت مندی اور سچائی سے ان چیزوں کو محسوس کر کے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے وہ قابل داد ہے۔ وہ اس لئے کہ کشمیر بذات خود ایک ایسا موضوع ہے جس کو تحریر کرنا تو در کنار، سوچنے سے پہلے انسان کے دل پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ بقول پردیسی: ''کشمیر کا ہر بدنصیب باشندہ بذات خود ایک افسانہ ہے جس کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہیں دی۔'' (دیپک بدکی، 'عصری شعور'، میزان پبلشرز، بٹہ مالو، سرینگر؛ ص۔۱۴)

دیپک بدکی نے بڑی صدق دلی اور جرأت مندی سے کشمیر کے دونوں رخ پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے کیونکہ وہ ان حالات کے چشم دید گواہ رہے ہیں۔ انہوں نے معصوم اور بے قصور انسانوں کو موت کی بھینٹ چڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور جگہ جگہ آتشزدگیوں اور لوٹ کھسوٹ کے واقعات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ وہ ان حالات سے خود گزر چکے ہیں۔ اس لئے انہوں نے کشمیر کا ایک صحیح اور سچا رخ پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہی ایک مخلص اور حقیقی تخلیق کار کی پہچان ہوتی ہے۔

افسانوں کے مجموعے 'ادھورے چہرے' کے بیشتر افسانے کشمیر کی خوبصورتی اور وہاں کے پرانے حالات کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمانے کے حالات اور وقت کی تبدیلی سے کوئی انسان بچ نہیں سکتا۔ وہ چاہے کسب معاش ہو، سیاسی و سماجی مجبوریاں ہوں یا پھر بچوں کے ساتھ رہنے کی للک۔ یہی وجہ ہے کہ دیپک بدکی دہلی کے نزدیک غازی آباد (یوپی) کے علاقے میں سکونت پذیر ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی پوری ذہنی قوت کے ساتھ کشمیر کی حسین یادوں کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے ہوئے مصروف عمل ہیں اور بچپن و جوانی کے یادگار لمحوں کو ذہن میں سجاتے ہوئے جنبش قلم سے ان حسین یادوں کو محفوظ کرنے میں مشغول ہیں۔ بُدکی نے اپنی کہانیوں میں ان حالات و واقعات کی بھرپور عکاسی بڑی ہنروری سے کی ہے جن سے وہ دوچار ہوئے تھے۔

'اچانک' دیپک بدکی کا ایک سبق آموز افسانہ ہے جس میں انہوں نے انسان دوستی کا درس دیا ہے۔ ایک طرف اس افسانے میں انہوں نے کشمیر کی مذہبی رواداری اور آپسی بھائی چارے کو منعکس کیا ہے اور دوسری طرف کشمیر کے قدرتی مناظر جیسے جہلم دریا، ہمالہ پربت، اہرہ بل آبشار اور وہاں کے رسم ورواج کی مؤثر انداز سے عکاسی کی ہے۔ اور ہاں، کیوں نہ کرتے! کشمیر کے قدرتی مناظر ہی کچھ ایسے ہیں کہ مغل بادشاہ جہانگیر اور شہزادہ داراشکوہ اور شعرا و ادبا ان کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کشمیر کے حسن سے متعلق ہی شاعر فردوسی بے ساختہ بول پڑے:

اگر فردوس بر روئے زمیں است   ہمیں است وہمیں است وہمیں است

افسانہ 'اچانک' رضوان، نسیم اور سومناتھ کے گرد گھومتا ہے۔ دیپک بدکی ان کرداروں کے ذریعے کشمیر کی اس ملواں تہذیب وتمدن اور بھائی چارے کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرتے ہیں جس میں سبھی مذاہب کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ یہاں مساجد بھی ہیں اور منادر بھی، گورودوارے بھی ہیں اور گرجے بھی۔ عید ہو یا دیوالی، تمام لوگ مشترکہ طور سے ان تیوہاروں کو یوں مناتے ہیں کہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ کس فرقہ کا تہوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ہندو بھائی چارے اور اتحاد میں یہ سرزمیں ہمیشہ سرفہرست رہی ہے۔ افسانہ نگار نے جہاں ایک طرف وادی کشمیر کے حسین، خوبصورت اور ہوشربا علاقوں، جن میں پانپور اور اہرہ بل قابل ذکر ہیں، کی عکاسی کی ہے، وہیں دوسری طرف اہرہ بل میں پیش آئے سانحے سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیا میں انسانیت کا مذہب عظیم ہے جس کا واضع ثبوت سومناتھ ہے جو اس وقت ایک ڈوبتی ہوئی بے یار و مددگار لڑکی نسیم کو بچانے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے جب غروبِ سورج کے وقت "بچاو.... بچاو" کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکراتی ہیں۔ نسیم کو پانی کے ریلے کے ساتھ بہتے ہوئے دیکھ کر ڈرپوک سومناتھ جبلی طور پر ایسا کام کر بیٹھتا ہے جس کی کسی کو امید نہیں ہوتی حالانکہ جائے واردات پر صحت مند ہم مذہب تیراک طالب علم بھی کھڑے ہوتے ہیں۔ خبر ہے کہ گذشتہ صدی کے ساتویں دہے میں کشمیر یونیورسٹی میں ایسا واقعہ حقیقت میں گزرا تھا اور آج بھی یونیورسٹی کے احاطے میں دونوں کی یادگار موجود ہے۔ کشمیریوں کی انسان دوستی اور بھائی چارے سے وابستہ یہ واقعہ ایک عمدہ افسانہ ہے اور ایک انسان مذہب کے جکڑ بندیوں سے بالاتر ہو کر اپنی جان کی پرواہ

کئے بغیر مذہب پر انسانیت کے رشتے کو فوقیت دیتا ہے۔

افسانہ 'ویوگ' میں افسانہ نگار نے کشمیری تہذیب و کلچر کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے خصوصاً کشمیری پنڈتوں کے رسم و رواج کا حسین پیرائے میں اظہار کیا ہے۔ یہ ایک رومانی کہانی ہے جس میں ڈرپوک محبوب اپنی معشوقہ سے پیار کا اظہار نہیں کر پاتا ہے جب تک کہ اس کی شادی ہو جاتی ہے اور پھر اپنی اس کم ظرفی پر پچھتاتا رہتا ہے۔ پرانے زمانے میں کشمیری پنڈتوں میں شادیوں پر کس طریقے سے انتظام کیا جاتا تھا اس افسانے میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب نہ میرج ہال تھے، نہ کیٹرریس تھے اور نہ ہی ڈیکوریٹرس۔ سب انتظام لڑکی والوں کو خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ ملاحظہ کیجیے ایک اقتباس:

> ''یوں تو شادی کی تیاریاں مہندی رات سے ہی شروع ہوتی ہیں۔ اس روز گھر کے صدر دروازے پر مختلف رنگوں سے گل بوٹے بنائے جاتے ہیں جس کو مقامی زبان میں 'کریول' کہتے ہیں۔''

(دیپک بُدکی، افسانہ 'ویوگ'، مجموعہ 'چنار کے پنجے'، دوسرا ایڈیشن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۴ء)

افسانہ 'گھونسلہ' پرندوں کے نشیمن بنانے اور انسان کے ہاتھوں تباہ ہونے کی دلسوز کہانی ہے۔ کہانی علامتی بھی ہے اور استعاراتی بھی۔ یہ افسانہ بھی وادیِ کشمیر سے ہجرت کرنے سے بالواسطہ تعلق رکھتا ہے۔ دراصل یہ افسانہ اس درد و کرب کا علامتی اظہار ہے جو کشمیر کے لوگوں کو غیر ذمہ دار سیاست دانوں کی وجہ سے جھیلنا پڑا ہے۔ یہ کہانی کسی خاص طبقے، جگہ یا وقت تک محدود نہیں بلکہ اس کی آفاقیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اس کہانی کا اطلاق اس ہجرت پر بھی ہوتا ہے جس میں لاکھوں بے گناہ لوگ تقسیم ملک کے سبب اپنے رشتہ داروں کی لاشوں کے اوپر سے گزر کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوئے اور پھر سرحد پار کر کے اجنبی شہروں میں جا بسے۔ دراصل کشمیر اسی سانحے کا ایک زخم ہے جو اب تک بھر نہیں پایا۔ یہ کہانی ان لوگوں کی بھی ہے جو ویت نام، فلسطین، تبت، عراق، کویت اور افغانستان میں گھربار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ ان لوگوں کی بھی کہانی ہے جو گجرات کے فسادات میں پس گئے اور ہجرت کر کے گھر سے بے گھر ہوئے۔ گھر کے اجڑنے کا درد اور بے بسی کی داستان کا نچوڑ افسانے کے آخر میں نہایت ہی فنکاری سے پیش کیا گیا ہے۔

''چڑے نے آخری بار مڑ کر لٹتے ہوئے نشیمن پر نظر ڈالی۔ بڑی کوشش کے بعد پھر سے

ہمت مجتمع کی، اپنے پر جھاڑے اور پھر دور نیلے آسمان میں نہ جانے کہاں کھو گیا۔''

(دیپک بدکی؛ افسانہ 'گھونسلا'، ؛ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، میزان پبلشرز، سرینگر)

'ایک نہتے مکان کا ریپ' بدکی کا ایک اہم اور عمدہ افسانہ ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ریاست میں رونما ہوئے نامساعد حالات و واقعات کی وجہ سے ہجرت کرنے والے لوگوں کی داستان رقم کر لی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۹۸۹ء میں سوچی سمجھی سازش کے تحت یہ افواہ پھیلائی گئی کہ کشمیری پنڈت ریاست چھوڑ کے جانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں اور اسی گرم افواہ کی بنا پر نامعلوم بندوق برداروں نے ۱۴ر ستمبر ۱۹۸۹ میں بی جے پی کے ایک اہم اور فعال رکن ٹکہ لال ٹپلو کو حبہ کدل میں گولی مار کے ابدی نیند سلا دیا۔ ٹکہ لال ٹپلو پہلا کشمیری پنڈت ہے جو اس سوچی سمجھی سازش اور گرم افواہ کی زد میں آ گیا۔ اس دلدوز اور انسانیت سوز حادثہ سے ریاست کے پنڈتوں کو عدم تحفظ کا احساس ہوا اور انہوں نے وادی سے ہجرت کرنے کو ترجیح دی اور ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں پناہ لے کر اپنی میراث کشمیر ہی میں چھوڑ دی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ساتھ ان کا جذباتی لگاو ہے اور دوسری یہ کہ ریاست میں آئے دن رونما ہونے والے واقعات سے عدم تحفظ، افراتفری اور بے چینی کا عالم بپا ہو گیا تھا۔ 'ایک نہتے مکان کا ریپ' میں کشمیری مہاجروں کی کرب ریزی اور ہجرت کے بعد انکی میراث کا حشر، جو چند ایک لالچی اور بدنیت مقامی باشندوں کے ہتھے چڑھ گیا، افسانہ نگار نے علامتی انداز میں منعکس کیا۔ دیپک بُدکی نے ایک بے جان مکان، خاص کر تالے، کے توسط سے انسانی لالچ اور بہیمیت کو بے نقاب کیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں مکان کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر مالکن کانپتے ہاتھوں سے دروازے پر قفل چڑھا کر اسے دو تین بار جھنکتی ہے تاکہ اسے یقین ہو کہ تالا بند ہو چکا ہے اور مکان محفوظ ہے۔ مکان کے پاس سے گزرنے والے ہر آدمی کی رال ٹپکتی ہے کہ نہ معلوم مکان میں کتنی دولت چھپی ہوگی۔ اچانک پولیس کے ڈر سے بھاگتا ہوا ایک نامعلوم بندوق بردار تالا توڑ کر خالی مکان میں پناہ لیتا ہے۔ اس کے بعد سبھی حریص لوگوں کے لیے مکان میں داخل ہونے کے لئے راستے کھل جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے نظریں بچا کر مکان کی ہر چیز لوٹتے ہیں یہاں تک کہ جلے ہوئے مکان کا کوئلہ بھی نہیں چھوڑتے۔ یہاں انسانی فطرت کا

چربہ کھینچا گیا ہے کہ حریص آدمی کو آخرت کی فکر کیے بنا ہر برُا کام جائز لگتا ہے جب کہ اکثر نیک اور پارسا لوگ خوف خدا کی وجہ سے ایسے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں۔ حیرانی تو اس بات کی ہے کہ چھوٹے بچے جو دین و دنیا اور آخرت سے بے خبر ہوتے ہیں، وہ بھی دو تین روپے کی لالچ میں زمین میں دبے ہوئے تالے کو بازار میں بیچتے ہیں۔ غرض یہ کہ پیسہ انسان کو اندھا بنا دیتا ہے اور وہ بھلے برُے کی تمیز نہیں کر پاتا۔ اس افسانے کو پڑھ کر یہ عیاں ہے کہ دیپک بدکی کا شعور پختہ اور مشاہدہ گہرا ہے۔ وہ اپنی تخلیقی توانائی کے ساتھ اپنے افسانوں کو حقیقت کا لباس پہنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ 'ایک نہتے مکان کا ریپ' پر نامور نقاد وارث علوی کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

> ''ایک نہتے مکان کا ریپ بے مثال افسانہ ہے.... یہ اردو میں اپنی نوعیت کا اچھوتا افسانہ ہے۔'' (وارث علوی، سہ ماہی 'انتساب'، گوشۂ دیپک بدکی، جولائی ستمبر؛ ص۔ ۱۲۵)

'چنار کے پنجے' دیپک بدکی کا ایک اور قابل مطالعہ افسانہ ہے۔ یہ کشمیر کے حالات کو بڑے مؤثر طریقے سے اجاگر کرتا ہے۔ اس افسانے میں بدکی نے انوکھے انداز میں ان پرآشوب حالات کا بڑی بے باکی سے ذکر کیا ہے جو صدیوں سے یہاں کے لوگوں کو درپیش آتے رہے ہیں۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے پتھر دل انسان بھی موم کی طرح پگل کر آنسو بہائے بنا نہیں رہ سکتا۔ افسانہ نگار نے افسانے میں 'چنار' کو علامت کے انداز میں پیش کیا ہے۔ یوں تو کشمیر میں پیڑ پودوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین پودے اُگتے ہیں لیکن جو عظمت اور وحدت چنار کو قدرت کے مہربان ہاتھوں نے عطا کی ہے وہ دوسرے کسی پیڑ میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ چنار کشمیر کا استعارہ بن کر رہ گیا ہے۔ کشمیری ہمیشہ اس قدرت کے حسین تحفے سے جذباتی طور پر وابستہ رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی چنار کے سائے میں ایک گھنٹہ آرام کرے تو رگوں میں صاف خون دوڑنے لگتا ہے۔ اس لئے اس درخت کو شاہی درخت (Royal Tree) کہا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چنار کشمیر کی شناخت ہے اور تقریباً ہر شاعر اور ادیب کے دل و دماغ پر اس قدر چھایا ہوا ہے کہ اس کے ہر فن پارے میں خود بخود اس کا ذکر آ جاتا ہے۔ چونکہ دیپک بدکی کا تعلق بھی اسی سرزمیں سے رہا ہے، گو آجکل وہ اپنے وطن سے بہت دور سکونت پذیر ہیں، اس لیے فطری ہے کہ ان کے دل و دماغ میں اسی چنار کے سائے رچ بس گئے ہیں، یہاں کی سوندھی سوندھی

خوشبوان کے سانسوں کو معطر کرتی ہے اور انہیں اس چمن کے لٹ جانے کا شدید غم ہے۔ اسے ناسٹلجیا کہیں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ تمام تر افسانہ راوی اور چنار کے درمیان ایک مکالمے کی صورت میں تجریدی طرز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

افسانہ 'مخبر' بھی ایک حقیقت آمیز کہانی ہے۔ یہ وادیِ کشمیر میں رونما ہوئے خون ریز واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔ بدکی نے اس افسانے کے کرداروں کے ذریعے کشمیر کی دہشت گردانہ سرگرمیوں کا ایک دردناک پہلو سامنے لایا ہے۔ افسانہ 'مخبر' کا مرکزی کردار نیل کنٹھ ہے جس کا مکان جہلم دریا کے کنارے واقع ہے اور روز بہ روز بگڑ رہے حالات کے سبب اس کی پریشانی اور بے چینی بڑھتی جارہی ہے جس کا مظاہرہ وہ دیر رات تک کھڑکیوں اور دروازوں کا معائنہ کر کے کرتا ہے۔ دوسری طرف وہ اور اس کی بیوی بڑھاپے کی تنہائی جھیل رہے ہیں کیونکہ موجودہ دور میں بچے پنکھ پاتے ہی پرندوں کی طرح دور آسمانوں میں پرواز کرتے ہیں اور لوٹنے کا نام نہیں لیتے۔ اسی تنہائی سے جوجھتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کی زندگی میں خالی جگہوں کو پُر کرتے ہیں۔ ان کی اس تنہائی کو غیر یقینی ماحول اور بھی خوفزدہ بنا دیتا ہے۔ گو ان کے بچے انھیں اپنے پاس بلاتے رہتے ہیں مگر وہ اس ڈھلتی عمر میں اپنی دھرتی چھوڑ کر اجنبی ملک میں جانے سے کتراتے ہے۔ عمر رسیدہ لوگوں کی یہ دبدھا بڑی ہی ہنرمندی سے پیش کی گئی ہے۔ آخر کار دونوں بستر میں گھستے ہیں کہ اتنے میں دو نقاب پوش بندوق بردار دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو جاتے ہیں اور اندھا دھند فائرنگ کر کے دونوں میاں بیوی کو ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سلا دیتے ہیں۔ دہشت گردی کے پس منظر میں یہ افسانہ اس انسانیت سوز واقعے کو بیان کر کے امن و آشتی کا جنازہ اٹھا لیتا ہے۔ ایک عمر رسیدہ انسان کو مخبر کا لیبل چسپاں کر کے موت کے گھاٹ اتار دینا کسی مذہب میں نہیں لکھا ہے۔ اس افسانے میں انسانی بہیمیت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ سلطانہ مہر اس افسانے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتی ہیں:

> ''مخبر مجھے بہت اچھی لگی...... یہ کہانیاں ہمیں آئینہ دکھاتی ہیں اور ان آئینوں میں اگر ہم اپنا بھیانک چہرہ دیکھنے کی اخلاقی جرأت پیدا کریں تو شاید ہمارے اعمال درست ہو جائیں گے۔

(سلطانہ مہر؛ سہ ماہی 'انتساب'، سرونج؛ جلد ۲۵، شمارہ ۶۳؛ جولائی، ستمبر؛ ص ۱۲۵)

'کتا' ایک طنزیہ افسانہ ہے جس میں کتے کی وفاداری کو انسانی وفاداری پر ترجیح دی گئی ہے کیونکہ انسان نامساعد حالات میں اپنی خودغرضی کے لیے اپنے رشتوں، دوستوں اور جانوروں کو بھول جاتا ہے جن کے ساتھ اس نے ساری زندگی بتائی ہوتی ہے مگر کتا کبھی طوطا چشم نہیں بن سکتا۔ ایسے ہی ایک کتے کی وفاداری کرشن چندر نے بھی اپنے ناول 'غدار' میں پیش کی ہے۔ نویں دہائی میں جب کشمیر میں حالات خراب ہو گئے تو دوسرے لوگوں کی طرح سپرو بھی اپنا گھر بار چھوڑ دیتا ہے اور پورے خاندان کو لے کر اپنی سرزمین کو خیرآباد کہہ دیتا ہے۔ اس وقت حالات ایسے تھے کہ کشمیر سے لاکھوں لوگوں نے وادی کی حسین یادوں کو دل میں بسائے راتوں رات ملک کے مختلف حصوں میں ہجرت کی۔ جائیداد تو خیر بے جان اور غیر منقولہ تھی اس لیے اپنے ساتھ لے جانا ممکن نہ تھا۔ لیکن وہ اپنے پالتو کتے 'راکی' کو بھی بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے کیونکہ اسے اپنے مستقبل کی ضمانت نہیں ہوتی۔ تاہم جس طرح وہ اپنے بال بچوں کو لے جاتا ہے شاید وہ کتے کو بھی لے جا سکتا تھا مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ اس افسانے میں کئی کردار جنم لیتے ہیں لیکن سپرو، محمد شفیع، اور راکی کے گرد کہانی گھومتی ہوئی اپنے انجام کو پہنچتی ہے یہ ایسے کردار ہیں جو آج کے دور کے انسان کی خودغرضی اور لاچاری کے پیکر بنے ہوئے ہیں۔

جہاں تک دیپک بدکی کے افسانوں کے موضوعات کا تعلق ہے ان میں کافی بوقلمونی ملتی ہے۔ بہر حال کشمیر ان کا کلیدی اور غالب موضوع رہا ہے کیونکہ یہ ان کا ذاتی تجربہ بھی ہے اور زندگی کی روداد بھی۔ اچانک، ویوگ، شیر اور بکرا، گھونسلہ، ایک نہتے مکان کا ریپ، چنار کے پنجے، وغیرہ جیسے افسانوں میں کشمیر کی المناک تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے افسانے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہیں۔ دیپک بدکی کے افسانوں کا اسلوب دلنشین ہے۔ وہ جو بھی کہنا چاہتے ہیں اس پر نہایت سنجیدگی سے سوچتے ہیں اور پھر گلابی الفاظ میں بیاں کرتے ہیں۔ زبان پر انہیں قدرت حاصل ہیں۔ اسلوب میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ کہانیاں دریا کے بہاؤ کی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں اور ان میں کہیں کوئی جھول یا بکھراو نظر نہیں آتا۔ یہ افسانے ابتداء سے اختتام تک مضبوطی سے قاری کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں۔ دیپک بدکی کے افسانے قاری کے ظاہر و باطن کو جھنجھوڑ دیتے ہیں جو ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی غمازی کرتے ہیں۔ مظہر

امام دیپک بدکی کے افسانوی تخلیقات پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

''آپ کو کہانی کا سلیقہ آتا ہے۔آپ کا بیانیہ چست ہوتا ہے۔زبان و بیان پر آپ کی گرفت ہے، مکالمے جاندار ہوتے ہیں اور کرداروں کی تصویر کشی چابکدستانہ ہے۔''

(مظہر امام۔مکتوب بنام دیپک بُدکی؛ بحوالہ سہ ماہی 'بحث مباحث'؛ اکتوبر ۲۰۰۸)

☆☆☆☆☆

☆ مضمون نگار: توصیف مجید لون، ریسرچ اسکالر؛ مطبوعہ: ماہنامہ سب رس، حیدرآباد؛ مارچ ۲۰۱۶ء، ص ۳۱۔۲۵

==

دیپک بُدکی کا تیسرا افسانوں کا مجموعہ

زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی

☆ آپ نہایت عقلی ذہن اور روشن سوچ رکھتے ہیں جو لگ بھگ آپ کی ہر کہانی سے مترشح ہوتی ہے اس لیے جس مجلّہ میں کہیں آپ کی کہانی نظر آتی ہے کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح اسے پڑھ کر لطف اٹھاؤں...آپ کے تخلیقی ذہن کی انفرادیت، دکھوں اور محرومیوں سے نڈھال انسانی روح کی تلاش میں ہی ملتی ہے۔راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ کسی دوسرے کہانی کار کے یہاں ایسا رچا ہوا compassionate رویہ اور pathos کم از کم مجھے نظر نہیں آیا۔

(قمر رئیس ، نئی دھلی؛ 'زیبرز کراسنگ پر کھڑا آدمی پر تاثرات)

☆ 'زیبرز کراسنگ پر کھڑا آدمی' کے کئی افسانے میں بیٹھے بیٹھے پڑھ ڈالے۔'گھونسلا' بہت عمدہ افسانہ ہے ہر چند کہ تم نے چڑے چڑیے کو ایک حد تک انسانی جذبات سے متصف ظاہر کیا ہے...'چڑی کی بیگم کا کردار قابل تعریف ہے اور تم نے ایسے کردار کو زبان دی اس کے لیے تم تعریف کے مستحق ہو...میرا خیال ہے 'ادھوری کہانی اس مجموعے کا سب سے اچھا افسانہ ہے اور اسے تمھارے بہترین افسانوں میں شمار کرنا چاہیے۔ **(شمس الرحمن فاروقی ؛ ۲۳ مارچ ۰۸ء)**

☆ آپ کا انداز تحریر نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز اور معنی خیز بھی ہے۔کہانی قاری کو پکڑ لیتی ہے۔ اور یہ انجذاب کی کیفیت آخر تک قائم رہتی ہے...(مانگے کا اجالا) اردو کہانی کو آپ نے ایک تازہ کار انحرافی کردار سے متعارف کرایا ہے...'ایک نہتے مکان کا ریپ' پڑھ کر انسانی زوال کی تماشہ گری مغموم کر جاتی ہے۔دہشت پسندی پر لکھی گئی آپ کی یہ کہانی وحشی انسان کی جبلت کا زندہ استعارہ بن گئی ہے۔ **(فیاض رفعت؛ لکھنؤ ، ۱۷ جون ۰۵ء)**

ملنے کا پتہ: میزان پبلشرز، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر؛ سن اشاعت: ۲۰۰۷ء؛ ضخامت: ۱۶۳ صفحات؛ قیمت: ۲۵۰/روپے

دیپک بدکی کے دو افسانوں کے مجموعے:

ادھورے چہرے اور چنار کے پنجے

-- احمد سہیل

دیپک بُدکی کے دو افسانوں کے مجموعے 'ادھورے چہرے' اور چنار کے پنجے کی قرأت کے بعد جدید تر افسانے کی وسعت کا احساس ہوا۔ اس میں بیشتر افسانے میں فیس بک پر پڑھ چکا تھا۔ مگر کتاب پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

ان افسانوں کو پڑھ کر دیپک بدکی، ان کی افسانوی مہارت اور ان کا اصل افسانوی منطق ذہن میں تشکیل پاتا ہے۔ مزید ان کی افسانوی فِطانت اور درک کی تفہیم ہوتی ہے جس میں نئی جہات اور سمتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد میں پروان چڑھنے والے حساس اور بشری ناسٹلجیائی صورت حال کا منفرد اظہار ان افسانوں کے بطن میں موجود ہے۔ ان افسانوں میں انسانی لاچارگی ، انسان کا انسان کے ہاتھوں استحصال ، فرد کی مغایرت اور ان کا وجودی بحران ایک سیاسی مکالمہ بن جاتا ہے جہاں فرد فنا کا متمنی ہے۔ اس میں قاری یقیناً اپنے منتشر وجود کو شناخت کر پاتا ہے۔ یہی ان کے افسانوں کی شناخت ہے۔ اور خلیقہ ہے۔ فرد کی ذات کے سانحات کا بھی عندیہ ملتا ہے۔ یہ تمام تجربے، محرومیاں، اضطراب ، معاشرتی تناؤ میں کشمیر کے پس منظر میں جو کہانیاں لکھی گئی ہیں اس میں ماحولیاتی (Ecological) پس کربیہ (ناسٹلجیا) اپنی جگہ موجود ہے۔ 'وادی گلپوش' کے پھولوں کی خوشبوؤں میں مخصوص جمالیاتی خوشبو موجود ہے جس میں بارود کی خوشبو کی آمیزش ہے جو جمالیاتی اذیت کا تخلیقی عمل بن جاتا ہے۔

یہ تمام افسانے کسی مخصوص گروہ کی چھتری یا خیمے کے سائے میں بیٹھ کر نہیں لکھے گئے ہیں۔ افسانہ نگار کے سر پر صرف نیلا آسمان ہے۔ یہی ان کی چھت ہے جس کے نیچے بیٹھ کر یہ افسانے خلق کیے

گئے ہیں۔انھوں نے اپنی ایک کہانی 'آ ؤ کچھ اور لکھیں' میں اردو تنقید پر اردو افسانوں کی صورت حال اور اس سے بیزاری کا بھی اظہار کیا ہے۔جس سے اردو افسانہ لہولہان ہوا اور علامتی افسانے کی چیستانی مزاج پر بھی طنز کیا ہے۔ان کے اس سوال کہ" جدیدیت ،ساختیات اور پس ساختیات کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ ان تحریکوں نے ہمارے اردو افسانے پر کیا اثرات چھوڑے ہیں؟"میں بھی یہی طنز پوشیدہ ہے۔ان دونوں مجموعوں میں اردو اور ہندی لفظیات کا خوبصورت متنی مخاطبہ ابھرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

☆تبصرہ نگار:احمد سہیل ،امریکہ؛ بحوالہ 'ادھورے چہرے' (تیسرا ایڈیشن)اور چنار کے پنجے'(دوسرا ایڈیشن) ؛ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸،وکیل اسٹریٹ،کوچہ پنڈت،لال کنواں، دہلی۔٦؛مطبوعہ روزنامہ چٹان، سرینگر، کشمیر

==

دیپک بُدکی کا چوتھا افسانوں کا مجموعہ

ریزہ ریزہ حیات

☆انسان کی کمزوریوں اور خودنمائی کے جذبات کے علاوہ موجودہ معاشرے کے ہر کمزور پہلو پر دیپک بدکی کی نظر ہے۔ان کے افسانے موجودہ رویوں اور معاشرے کی برہنہ سچائیوں کا احاطہ کرنے میں نڈر اور بے باک حقیقت کا مظہر ہیں۔دیپک بُدکی کے افسانوں کی یہی نو بہ نو سچائی ہر ملک کے اہل نظر کو متوجہ کرتی ہے۔ **(ڈاکٹر ذکی طارق، تبصرہ 'ریزہ ریزہ حیات)**

☆دیپک بُدکی کی کہانیاں عصری مسائل کو اپنی گرفت میں لیتی ہیں۔وہ اندھ وشواس، ضعیف الاعتقادی اور دیگر عصری مسائل پر برملا اظہار کرتے ہیں۔ان کی بعض کہانیاں نفسیاتی نکات کو بھی ابھارتی ہیں۔'ریزہ ریزہ حیات' میں زندگی کی حقیقتوں اور زندگی سے جڑے چھوٹے بڑے مسائل کو دلچسپ اور مؤثر انداز میں اس طرح اجاگر کیا گیا ہے کہ قاری ان میں کھو سا جاتا ہے اور پڑھنے کے بعد داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(زنفر کھوکھر، راجوری، ۲ دسمبر ۲۰۱۲ء)

ملنے کا پتہ: میزان پبلشرز، بٹہ مالو سرینگر کشمیر؛ اشاعت:۲۰۱۱ء؛ضخامت:۱۲۸صفحات قیمت ۲۰۰/روپے

ادھورے چہرے-ایک جائزہ

--ڈاکٹر اشوک پٹواری

دیپک بُدکی ایک مشہور و معروف افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں۔ پچھلے چالیس برس میں انھوں نے ۹۰ سے زیادہ افسانے لکھے ہیں جو ہند و پاک اور دوسرے ممالک میں کئی سارے رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ موجودہ دور میں جہاں موڈرن ٹیکنالوجی (Modern Technology) کی بدولت لوگوں کو ادبی علوم کا مطالعہ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی اور خاص طور پر اردو افسانہ پڑھنے والوں کی گنتی کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے، وہیں دیپک بُدکی جوش وخروش کے ساتھ مسلسل لکھتے جارہے ہیں۔ 'ادھورے چہرے' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا تھا۔ سال ۲۰۱۴ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن منظر عام پر آنا اس حقیقت کی سند ہے کہ اردو زبان کئی دشواریوں کا سامنا کرتے ہوئے بھی اپنا وقار برقرار رکھے ہوئے ہے اور ملٹی میڈیا (Multimedia) کی مخمور کن چمک دمک کے باوجود قارئین دیپک بُدکی کی کہانیاں پڑھتے ہیں۔

سولہ کہانیوں پر مشتمل زیر تبصرہ افسانوی مجموعہ 'ادھورے چہرے' پڑھ کر دو باتیں صاف نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ دیپک بُدکی ایک عمدہ قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین نابض بھی ہیں۔ اپنے گردو پیش کے ماحول کو ایک حساس انسان کی طرح باریکیوں سے دیکھنا، لاکھوں کروڑوں لوگوں کے درمیان اپنے افسانوں کے کردار ڈھونڈنا اور پہچاننا، انھیں سمجھنا، محسوس کرنا، اور ان کے حالات سے ایمپاتھائز (Empathise) کر کے انھیں اپنے قلم سے کاغذ پر اتارنا- افسانہ نگاری کی ان تمام لوازمات کو دیپک بُدکی مکمل طور پر پورا کرتے ہیں اور نہایت خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ قلم بند کرتے ہیں۔ ان کے افسانے کسی مخصوص مقام، دور، پیشے یا مذہب سے جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کے کردار صاف اور سپاٹ ہیں جن کے بارے میں سوچ کر قارئین کو اپنے دوست یا پڑوسی کی شکل نظر آتی ہے یا پھر اپنی ہی ذاتی زندگی

گئے ہیں۔انھوں نے اپنی ایک کہانی 'آؤ کچھ اور لکھیں' میں اردو تنقید پر اردو افسانوں کی صورت حال اور اس سے بیزاری کا بھی اظہار کیا ہے۔جس سے اردو افسانہ لہولہان ہوا اور علامتی افسانے کی چیستانی مزاج پر بھی طنز کیا ہے۔ان کے اس سوال کہ " جدیدیت ،ساختیات اور پس ساختیات کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ ان تحریکوں نے ہمارے اردو افسانے پر کیا اثرات چھوڑے ہیں؟" میں بھی یہی طنز پوشیدہ ہے۔ان دونوں مجموعوں میں اردو اور ہندی لفظیات کا خوبصورت متنی مخاطبہ ابھرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

☆ تبصرہ نگار: احمد سہیل ،امریکہ ؛ بحوالہ 'ادھورے چہرے' (تیسرا ایڈیشن) اور چنار کے پنجے' (دوسرا ایڈیشن) ؛ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸، وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۶؛ مطبوعہ روزنامہ چٹان، سرینگر، کشمیر

==

دیپک بُدکی کا چوتھا افسانوں کا مجموعہ

ریزہ ریزہ حیات

☆ انسان کی کمزوریوں اور خودنمائی کے جذبات کے علاوہ موجودہ معاشرے کے ہر کمزور پہلو پر دیپک بدکی کی نظر ہے۔ان کے افسانے موجودہ رویوں اور معاشرے کی برہنہ سچائیوں کا احاطہ کرنے میں نڈر اور بے باک حقیقت کا مظہر ہیں۔دیپک بُدکی کے افسانوں کی یہی نو بہ نو سچائی ہر ملک کے اہل نظر کو متوجہ کرتی ہے۔ **(ڈاکٹر ذکی طارق، تبصرہ 'ریزہ ریزہ حیات)**

☆ دیپک بُدکی کی کہانیاں عصری مسائل کو اپنی گرفت میں لیتی ہیں۔وہ اندھ وشواس، ضعیف الاعتقادی اور دیگر عصری مسائل پر برملا اظہار کرتے ہیں۔ان کی بعض کہانیاں نفسیاتی نکات کو بھی ابھارتی ہیں۔'ریزہ ریزہ حیات' میں زندگی کی حقیقتوں اور زندگی سے جڑے چھوٹے بڑے مسائل کو دلچسپ اور موثر انداز میں اس طرح اجاگر کیا گیا ہے کہ قاری ان میں کھو سا جاتا ہے اور پڑھنے کے بعد داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(زنفر کھوکھر ، راجوری ، ۲ دسمبر ۲۰۱۲ء)

ملنے کا پتہ: میزان پبلشرز، بٹہ مالو سرینگر کشمیر؛ اشاعت: ۲۰۱۱ء؛ ضخامت: ۱۲۸ صفحات قیمت ۲۰۰/روپے

ادھورے چہرے-ایک جائزہ

--ڈاکٹر اشوک پٹواری

دیپک بُدکی ایک مشہور و معروف افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں۔پچھلے چالیس برس میں انھوں نے ۹۰ سے زیادہ افسانے لکھے ہیں جو ہندو پاک اور دوسرے ممالک میں کئی سارے رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔موجودہ دور میں جہاں موڈرن ٹیکنالوجی (Modern Technology) کی بدولت لوگوں کو ادبی علوم کا مطالعہ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی اور خاص طور پر اردو افسانہ پڑھنے والوں کی گنتی کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے، وہیں دیپک بُدکی جوش وخروش کے ساتھ مسلسل لکھتے جارہے ہیں۔'ادھورے چہرے' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا تھا۔سال ۲۰۱۴ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن منظر عام پر آنا اس حقیقت کی سند ہے کہ اردو زبان کئی دشواریوں کا سامنا کرتے ہوئے بھی اپنا وقار برقرار رکھے ہوئے ہے اور ملٹی میڈیا (Multimedia) کی مخمور کن چمک دمک کے باوجود قارئین دیپک بُدکی کی کہانیاں پڑھتے ہیں۔

سولہ کہانیوں پر مشتمل زیر تبصرہ افسانوی مجموعہ 'ادھورے چہرے' پڑھ کر دو باتیں صاف نظر آتی ہیں۔ایک یہ کہ دیپک بُدکی ایک عمدہ قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین نابض بھی ہیں۔اپنے گرد و پیش کے ماحول کو ایک حساس انسان کی طرح باریکیوں سے دیکھنا، لاکھوں کروڑوں لوگوں کے درمیان اپنے افسانوں کے کردار ڈھونڈنا اور پہچاننا، انھیں سمجھنا، محسوس کرنا، اور ان کے حالات سے ایمپا تھائز (Empathise) کر کے انھیں اپنے قلم سے کاغذ پر اتارنا-افسانہ نگاری کی ان تمام لوازمات کو دیپک بُدکی مکمل طور پر پورا کرتے ہیں اور نہایت خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ قلم بند کرتے ہیں۔ان کے افسانے کسی مخصوص مقام، دور، پیشے یا مذہب سے جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ان کے کردار صاف اور سپاٹ ہیں جن کے بارے میں سوچ کر قارئین کو اپنے دوست یا پڑوسی کی شکل نظر آتی ہے یا پھر اپنی ہی ذاتی زندگی

کا عکس...! دیپک کی دوسری صفت یہ ہے کہ بحیثیت ایک افسانہ نگار وہ جو کچھ بھی سوچتے ہیں، سمجھتے ہیں یا یقین کرتے ہیں اسے بے باکانہ انداز میں بے خوف ہو کر نہایت خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں۔ کہانی 'ڈرفٹ وُڈ' میں تزویج محرمات (Incest) کے سنجیدہ موضوع کو جس طرح انھوں نے بیان کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

دیپک بُدکی نے 'ادھورے چہرے' میں شامل بیشتر کہانیوں میں 'رئیلزم' (Realism) تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ سچویشن اور کردار بنا کسی بناوٹ کے حقیقت کے قریب نظر آتے ہیں۔ انیسویں صدی میں اینٹون چیکوف (Anton Chekov) اس تکنیک کو اپنی مخصوص چھاپ بنا کر افسانہ نگاری میں اپنے لیے ایک منفرد جگہ بنا چکے ہیں۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ دیپک اپنے افسانوں میں اس طرز بیان کا بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ کچھ کہانیوں میں افسانہ نگاری کے کئی اور تکنیک استعمال کیے گئے ہیں خاص طور پر 'ریزے' کے کلائمکس پر ریکھا کے کردار میں اپی فینی (Epiphany) کو بہت ہی عمدہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

عورت کے کردار کو قلم کاروں نے اکثر اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ عام طور پر مشرقی پاکیزگی اور روایت پسندی کو ہی ہندوستانی عورت کی عظمت اور وجود بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ کئی قلم کاروں نے نسوانیت، جنسی رویے، بے وفائی، یا فریب کو عورت کی پہچان بنانے کی کوشش کی ہے۔ آنجہانی شرت چندر چٹرجی نے اپنی بیشتر کہانیوں میں ہندوستانی عورت کا وہ پہلو اجاگر کیا ہے جس سے قارئین کے سامنے ایک بے زباں، حالات سے مجبور، ہمیشہ اور ہر موقعے پر قربانی دینے والی ایک مظلوم عورت کا نقشہ کھنچ جاتا ہے کہ جس کے تئیں صرف افسوس اور ہمدردی کا ہی جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مرحوم منشی پریم چند کی کہانی 'غبن' میں ایک سادہ لوح گرہستی عورت کے زیورات کے تئیں کمزوری کو مرکزی خیال بنا کر ایک یادگار کہانی لکھی گئی ہے۔ 'ادھورے چہرے' میں دیپک بُدکی نے عورت کے کئی چہروں کو منعکس کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کہانی 'رشتوں کا درد' میں ایک نہایت ہی اولوالعزم (Ambitious) فطرت کی عورت کی پرواز اور انجام کا ذکر ہے۔ 'کینچلی' میں بیگانگی، محرومیت اور لاتعلقی کا احساس اس طرح نجمہ کی شخصیت پر حاوی ہو جاتا ہے کہ وہ ایک آرام طلب اور بناوٹی زندگی کو اپنا لیتی ہے۔ 'بٹی ہوئی عورت' آرام و

آسائش اور نفسیاتی ضرورتوں کے درمیاں ایک ایسے سمجھوتے کی کہانی ہے جسے سماج شاید حقارت سے دیکھے مگر لاجونتی کے لیے ایک ضرورت ہے۔ 'بکھرے ہوئے لمحوں کا سراب' اور 'ریزے' میں دیپک نے عورت کی انا اور سیلف ریسپیکٹ (Self respect)، خود اعتمادی اور وقار کو بلندی تک پہنچایا ہے۔ مجموعے کی آخری کہانی 'راکھ کا ڈھیر' عورت کے ایک ایسے چہرے سے متعارف کراتی ہے جو پاک ہے، شفقت اور بے لوث محبت سے سرشار ہے۔ ایک ایسا چہرہ جو نہ تو ماں کا ہے اور نہ ہی محبوبہ کا - ایک بے نام رشتہ - ایک مقدس جذبہ جو انسانی رشتوں کی گہرائی کو اجاگر کرتا ہے۔ اس کہانی میں شبنم کا کردار اتنا قد آور ہے کہ نرینہ عصبیت (Male chauvinism) میں یقین رکھنے والے عناصر بونے نظر آنے لگتے ہیں۔

زیر نظر مجموعے میں کچھ ایسے بھی کردار شامل ہیں جن کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں دی گئی ہے مگر قارئین کے ذہن پر ایک گہرا اثر چھوڑ دیتے ہیں۔ افسانہ 'ادھورے چہرے' میں مسز اشوک پٹیل، 'خودکشی' میں سلمان رشید، اور 'ادھ کھلی' میں جُلکا کا خاوند ایسے کردار ہیں جو کہانی کے بنیادی کردار سے بھی زیادہ مضبوط ہیں اور قارئین کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

'ادھورے چہرے' ایک ایسا مجموعہ ہے جس کی ساری کہانیاں حقیقی زندگی سے جڑی ہوئی ہیں۔ ہر کردار جانا پہچانا لگتا ہے اور ہر سچویشن میں کوئی اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ دیپک بُدکی نے اس مجموعے کو انسانی فطرت، احساسات اور جذبات کا ترجمان بنا کر اپنے فن کارانہ انداز سے زندگی کے حقائق اور اس کی اصلیت کی بخوبی عکاسی کی ہے۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ!

☆☆☆☆☆
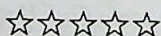
☆ تبصرہ نگار: اشوک پٹواری؛ کتاب: 'ادھورے چہرے'، مصنف دیپک بدکی، تیسرا ایڈیشن؛ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸، وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۱۱۰۰۰۶؛ مطبوعہ روزنامہ پرتاپ نئی دہلی، اور روزنامہ چٹان، سرینگر کشمیر

دیپک بُدکی: ادھورے چہرے کے آئینے میں

--امیر حمزہ

دیپک بدکی اردو افسانوی دنیا میں منفرد شناخت کے حامل شخصیت ہیں ۱۹۶۰ء کے بعد جب افسانہ کو افسانہ نگار ایک نئی جہت عطا کرنے میں لگے ہوئے تھے اسی وقت دیپک بدکی افسانوی دنیا میں اپنا قدم رکھ رہے تھے۔اس دور کی ادبی تحریکیں اور رجحانات جو ہر ایک افسانہ نگار کو اپنے دامن میں سمیٹ رہے تھے وہیں دیپک بدکی خود کو ان رجحانات سے دور رکھتے ہوئے اپنا راستہ خود منتخب کر رہے تھے۔جہاں انہوں نے افسانوں سے علامت ابہام اور تجریدیت کے زور کو کم کر کے اس میں کہانی پن پیدا کیا اور اس کو قاری سے قریب کیا۔جس سے ان کے افسانوں کا انداز نگارش بہت ہی سادہ، آسان، سہل اور زود فہم ہوا ۔جس کی وجہ سے اردو کا ایک عام قاری بھی ان کے افسانوں سے وہ لطف اٹھاتا ہے جو ایک خاص قاری کے حصہ میں آتا ہے۔اس طریقے سے دیپک بدکی فوری طور پر اس کو اپنے خیالات واحساسات کا ہم شریک بنالیتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب مصنف کے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۹ء تک کے درمیان لکھے گئے ۱۶ر افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ان افسانوں کو جمع کرنے سے پہلے یہ تمام افسانے ملک وبیرون ملک کے اہم رسالوں میں شائع ہو چکے تھے۔جس سے وہ افسانوی دنیا میں اس مجموعہ کے آنے سے پہلے ہی مقبول ومشہور ہو چکے تھے۔اس کے بعد ان کے دو اور افسانوی مجموعے 'زیبرا کرسنگ پر کھڑا آدمی' اور 'چنار کے پنجے' منظر عام پر آکر قارئین وناقدین کے یہاں اپنی ایک الگ شناخت قائم کر چکے ہیں۔مصنف کا تعلق صرف افسانوی دنیا ہی سے نہیں بلکہ ان کے تنقیدی مضامین ملک وبیرون ملک کے رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں جس کی بدولت تنقیدی مضامین پر مشتمل تین کتابیں 'عصری تحریریں'، عصری شعور' اور 'عصری تقاضے' بھی شائع ہو کر شرف قبولیت سے سرفراز ہو چکے ہیں۔تاہم ان کی شناخت ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے مسلم ہے۔

زیر تبصرہ کتاب اور دیگر افسانوں میں مصنف ان موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جو حقیقی زندگی میں وقوع پذیر ہونے کے بعد انسانی زندگی کو اہم درس دے جاتے ہیں۔ اور کچھ مسائل ایسے ہیں جس میں اکثر لکھنے اور بولنے والے خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن مصنف وہاں ایک فن کار کی حیثیت سے ان مسائل کی باریکیوں کو بہت ہی چابکدستی سے پیش کرتے ہیں۔

اس مجموعے میں تقریباً سارے افسانے اپنے موضوع کے اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ 'جاگو' اور 'ادھورے چہرے' یہ دونوں افسانے ایمرجنسی کے درمیان لکھے گئے ہیں جن میں اس دور کے کرب اور حالات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ''ادھورے چہرے'' میں اس معاشرہ کی عکاسی کی گئی ہے جہاں رشتے ناطے عارضی اور ہنگامی بن کر رہ گئے ہیں۔ جہاں اجنبی لوگ دیکھتے ہی دیکھتے ایک دوسرے کے رشتہ دار بن جاتے ہیں اور اصل رشتوں کا خون حالات بدلتے ہی سفید ہو جاتا ہے، انجام کار انسان اس بھری دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے۔ افسانہ 'ڈرفٹ وُڈ' ایک معصوم لڑکی کی امنگوں اور مسکراہٹوں کا مدفن ہے۔ اس کہانی میں وہ لڑکی گھریلو جنسی زیادتی کا شکار ہوتی ہے۔ ایسے واقعات عموماً ۹۵ فیصد پوشیدہ رکھے جاتے ہیں۔ جہاں وہ ذہنی مرض میں مبتلا ہو کر خودکشی کی مرتکب ہو جاتی ہیں۔ جب کہ اس کہانی میں سُمن خود کو ڈرفٹ وُڈ کی مانند دریا کے موجوں کے حوالے کر دیتی ہے اور مردوں کو آلۂ کار بنا کر زندگی ہموار کرتی رہتی ہے۔ اس افسانہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو ''ایسی صورت حال میں لڑکیاں اپنے آپ سے حقارت کرتی ہیں اور پستی کی گہرائیوں میں گر جاتی ہیں مگر وہ اپنے مغموم دل کو قہقہوں کے پھاہے لگاتی رہی، جسمانی قربتوں سے اپنے مضروب روح کو جھوٹی تسلیاں دیتی رہی اور مردوں کو آلۂ کار بنا کر اپنی زندگی کی راہیں ہموار کرتی چلی گئی''۔ 'رشتوں کا درد' آج کے کرم خوردہ سماج کی تصویر ہے جہاں جھوٹ، مکر و فریب اور جرائم کا بول بالا ہے۔ اس کہانی میں ایک ایسا سماج ہے جہاں مجرم بری ہوتا ہے اور معصوم تختۂ دار پر لٹکایا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اس مجموعہ کی دیگر کہانیاں اپنے اندر ایک اہم موضوع اور فکر لیے ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ مصنف کی کہانیاں موضوعاتی سطح پر اردو کی افسانوی تاریخ میں اپنا اہم مقام حاصل کریں۔ ☆☆☆

☆ مبصر: امیر حمزہ؛ کتاب 'ادھورے چہرے'، مصنف دیپک بدکی؛ اشاعت ۲۰۱۴ (تیسرا ایڈیشن)؛ ضخامت ۱۵۲؛ قیمت ۱۷۵ روپے؛ ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ مطبوعہ 'ہماری زبان'، دہلی

افسانوی مجموعہ ُادھورے چہرے‘-تبصرہ

--ڈاکٹر انواراحمد انصاری

دیپک بُدکی اردو افسانے کے لیے نیا نام نہیں ہیں۔ان کے افسانے ہندو پاک کے معیاری ادبی رسائل کی زینت بن چکے ہیں اور تا حال یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔کچھ عرصہ قبل ماہنامہ ُشاعر‘ نے ان پر ایک گوشہ بھی شائع کیا تھا۔اس لحاظ سے وہ بین الاقوامی شخصیت کے مالک ہیں۔ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ ُچنار کے پنجے‘ بھی منظر عام پر آچکا ہے نیز وہ ایک تبصرہ نگار کی حیثیت سے بھی نام کما چکے ہیں۔

ُادھورے چہرے‘ دیپک بدکی کے افسانوی مجموعے کا دوسرا ایڈیشن ہے۔یہ بھی اس بات کا ضامن ہے کہ پہلے ایڈیشن کی مانگ اور مقبولیت اس قدر تھی کہ دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔یہ بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوتا ہے۔اس لیے بُدکی صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔سولہ افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ واقعی قابل مطالعہ ہے۔مصنف کی ایک خاص پہچان یہ ہے کہ وہ نئے نئے موضوعات کو چھوتے ہیں جسے پڑھ کر قاری حیران ہوجاتا ہے۔مصنف کی باریک بینی، گہرے مشاہدے اور رفعت خیال کی داد دیے بنا نہیں بنتی۔مثال کے طور پر ُڈرفٹ وُڈ‘ افسانہ میں ایک لڑکی اپنے باپ کے استحصال کا شکار بنتی ہے جو ہمارے سماج کی نئی بیماری تزویج محرمات کی نشاندہی کرتی ہے۔اسی طرح مخلصی موت پر مبنی ایک افسانہ ُخود کشی‘ بھی رونگٹے کھڑے کردیتا ہے۔ ُکینچلی‘، ُرشتوں کا درد‘ اور ُادھورے چہرے‘ بھی خاصے کی چیزیں ہیں جن کے مطالعہ سے قاری کے دل ودماغ پر ایک دیرپا تاثر قائم رہتا ہے جو کہ افسانہ نگار کی کامیابی کا ضامن ہے۔

دیپک بُدکی کا اسلوب نگارش نہایت دل پذیر ہے۔وہ انگریزی ادب سے بہت زیادہ متاثر ہیں نیز جدید تہذیب کے مسائل کی پیش کش ان کے نظام فن میں بدرجہ اتم موجود ہے۔حرف اوّل میں

محترم انیس رفیع (ریٹائرڈ ڈائریکٹر دوردوشن ڈبروگڑھ، آسام) نے لکھا ہے۔ ''بُد کی اپنی طرح کے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو افسانوں میں نفسیاتی گرہوں اور غیر ضروری تہ داری کے قائل نہیں۔ افسانہ بیان کرتے وقت انھیں ہر لحظہ یہ خیال ہے کہ افسانے میں موجود Message ماند نہ پڑے اور پڑھنے والے کے دل ودماغ تک بے لاگ پہنچے۔'' بے شک ان کے افسانے اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔

امید ہے بُد کی صاحب آئندہ بھی ہمیں نئے نئے موضوعات سے آشنا کرواکر اردو افسانے کے دامن کو وسیع تر کریں گے۔ پہلے ایڈیشن کے برعکس یہ ایڈیشن پیپر بیک کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ آخر میں مشاہیر کی آراء کتاب کی وقعت میں اضافہ کا باعث بنی ہیں۔ کمپوزنگ میں کوئی غلطی نظر نہیں آئی۔ امید ہے یہ کتاب اردو دوستوں کے حلقہ میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

☆☆☆☆☆
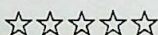
☆ مبصر: انوار احمد انصاری؛ کتاب: 'ادھورے چہرے [دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۵ء]؛ صفحات ۱۴۳، قیمت: ۱۰۰/روپے، ناشر: چنار پبلی کیشنز، تالاب تلو، جموں توی ۱۸۰۰۰۲؛ مطبوعہ پرواز ادب، پٹیالہ پنجاب، مئی- جون ۲۰۰۷ء؛ ص ۸۵

==

افسانہ 'ادھورے چہرے' - ایک تجزیہ

--محمد متین ندوی

افسانہ کی تاریخ، اس کی ابتدا، سنہری دور اور جدیدیت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور برابر لکھا بھی جارہا ہے، اس لئے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں لکھنا۔ بیسویں صدی، آج کل، شاعر، شب خون، مباحثہ، خاتون مشرق، ذہن جدید اور انتساب وغیرہ کے بھی افسانے پڑھتا رہا ہوں ۔میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اچھا افسانہ تو اچھا ہی ہوتا ہے چاہے وہ کہیں بھی چھپ جائے۔ کسی بھی اچھے افسانے پر ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی چھاپ نہیں لگائی جاسکتی۔ایک اچھے افسانہ نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی تحریک کے پیچھے نہیں بھاگتا بلکہ تحریکیں اس کی محتاج ہوتی ہیں۔آج بھی بہت سے اچھے افسانہ نگار موجود ہیں جو افسانہ کو نہ صرف زندہ رکھے ہوئے ہیں بلکہ اس کے حسن و جمال میں برابر اضافہ کررہے ہیں جیسے کہ دیپک بدکی، نعیم کوثر، دیپک کنول، قمر جمالی، انجم عثمانی، نور شاہ، وحشی سعید وغیرہ ،اچھے افسانہ نگاروں کی فہرست کافی طویل ہے لیکن اس وقت میرا مقصد نہ تو افسانہ نگاروں کی فہرست تیار کرنا ہے اور نہ ہی ان کا تذکرہ لکھنا، اس وقت مشہور افسانہ نگار دیپک بدکی صاحب کے تعلق سے مختصراً عرض کرنا ہے۔

دیپک بدکی صاحب ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو نقاد سے زیادہ اپنے افسانوں پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ نقاد کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے ہنر سے واقف نہیں، ہاں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ انھیں اتنی فرصت نہیں کہ وہ اچھے افسانے بھی لکھیں اور نقاد کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور اپنے اوپر لکھانے کے لئے اس کے دروازے پر دستک دیتے رہیں اور اس کی خوشامد کرتے پھریں۔غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں پر کم لکھا گیا ہے جب کہ ان سے کم تر درجے کے کئی افسانہ نگاروں پر ان کے مقابلہ میں زیادہ لکھا گیا ہے۔یہاں پر یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ نقاد کو اپنی طرف متوجہ کرکے اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ مضامین لکھا کر چند روز کے لئے تو ادبی دنیا میں شہرت حاصل کی جاسکتی ہے، لیکن اگر افسانوں میں جان نہیں ہے تو آج نہیں تو کل گمنامی ہی نصیب ہوگی کیونکہ وقت سب سے بڑا نقاد

ہوتا ہے۔

دنیا کے حالات برابر تغیر پذیر ہیں، معاشرتی، ذہنی، تہذیبی، فکری اور ادبی ہر لحاظ سے انسانوں میں تبدیلی کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ سو سال اور پچاس سال پہلے کے حالات کچھ اور تھے، آج کچھ اور ہیں ایسے ہی کل کے حالات کچھ اور ہوں گے۔ ایک زمانہ تھا کہ مشرقی تہذیب وثقافت ہی معیار ہوا کرتی تھی، اس کو لوگ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، مشرقی علوم وفنون کا دنیا میں ڈنکا بجتا تھا لیکن آج حالات اس کے برعکس ہیں، آج مغربی تہذیب اور مغربی علوم وفنون کا بول بالا ہے۔ مغربی تہذیب نے ہماری مشرقی تہذیب وثقافت کا جنازہ نکال دیا، کبھی ہندوستان اپنی تہذیب وثقافت اور علوم وفنون پر فخر کرتا تھا، آج مغرب کی ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے اور اپنی تہذیب وثقافت منوں مٹی کے نیچے دفن کر کے مغرب کے رنگ میں پورے طور پر رنگ جانا چاہتا ہے، جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ قبل اس کے کہ میں اپنی بات آگے بڑھاؤں ماہنامہ ''آج کل'' نئی دہلی (افسانہ نمبر) کے اداریئے سے چند لائنیں پیش کرنا چاہتا ہوں، خورشید اکرم صاحب افسانہ کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''افسانے کے فکری رجحانات یقیناً خارجی حالات طے کرتے ہیں، اجتماعی بھی اور انفرادی بھی، عصریت صرف ان حقائق کو معرض تحریر میں لانے کا نام نہیں ہے، جو ہنگامی اور تیز گام تبدیلیوں کے زیر اثر سامنے آتے ہیں، بلکہ وہ حقائق بھی ہیں، جو فکر وشعور کی نئی جہتیں کھلنے کے بعد ہماری نگاہ میں آتے ہیں۔''

خورشید اکرم کی رائے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ادب کا طالب علم بھی یہ دیکھ سکے کہ دیپک بدکی صاحب کے افسانوں میں عصریت کا کس قدر عنصر موجود ہے کیونکہ دیپک صاحب صرف ہنگامی ہی نہیں بلکہ ایسی تبدیلیوں کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں، جن تک عام طور پر دوسروں کی رسائی نہیں یا وہ انھیں محسوس نہیں کرتے۔

دیپک بدکی صاحب کے افسانوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں ایک جہاں آباد ہے، بالکل ایسے ہی جیسے کہ ہم اس عالم آب وگل میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ دیپک صاحب کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے ہمیں بالکل اجنبیت نہیں محسوس ہوتی۔ ہاں! ذہن کو حاضر ضرور رکھنا پڑتا ہے۔ ان کے افسانوں کے تمام کردار ہماری اسی دنیا سے ماخوذ ہیں جس سے ہمارا دن رات کا واسطہ ہے۔ ان کے افسانوں میں بدلتے ہوئے حالات کو دیکھا جاسکتا ہے، چاہے وہ بدلتے ہوئے حالات

تہذیب وثقافت اور ذہنی وفکری تبدیلیوں کے لحاظ سے ہوں یا افسانوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے ۔دیپک صاحب کے افسانوں کو پڑھنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے افسانے سرسری نہیں بلکہ بنظر غائر قرأت کا تقاضا کرتے ہیں، اخباروں کی خبروں کی طرح طائرانہ نظر ڈالنے سے ان کا حسن گرفت میں نہیں آتا۔جب میں نے اس سلسلہ میں سنجیدگی سے غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ بہت زیادہ علم کے حامل افسانہ نگاروں کے یہاں عام طور پر کچھ ایسی ہی کیفیت نظر آتی ہے جیسی کہ دیپک بدکی صاحب کے افسانوں میں موجود ہے، اب اس کیفیت کو کوئی خوبی سے تعبیر کرے یا خامی سے لیکن بہرحال یہ بات تو طے ہے کہ یہ تبحر علمی کا نتیجہ ہے۔

دیپک صاحب کے کئی افسانوی مجموعہ زیور طبع سے آراستہ ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں، لیکن اس وقت میرے سامنے 'ادھورے چہرے' ہی ہے۔افسانے پڑھنے کے بعد میں یہ سوچنے لگا کہ کس افسانہ پر گفتگو کروں۔آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ 'ادھورے چہرے' پر ہی گفتگو کرنی چاہئے کیونکہ اسی افسانہ کے عنوان پر کتاب کا نام بھی رکھا گیا ہے، ضرور اس میں کوئی بات ہے جو دیگر افسانوں کے مقابلہ میں اسے امتیازی حیثیت عطا کرتی ہے کیونکہ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر افسانہ نگار اچھے سے اچھے افسانہ کو افسانوی مجموعہ کے نام کے لئے منتخب کرتا ہے۔یہی سوچ کر دوبارہ سہ بارہ اس افسانہ کو پڑھا۔افسانہ کو پڑھ کر جس نتیجہ پر پہنچا وہ یہ ہے کہ انھوں نے اس میں (Throw away Culture) 'اتار پھینک کلچر' اور اس کے نتائج کو بیان کیا ہے۔یہ دور Use and throw کا ہے اسے استعمال کرو اور پھینکو یا کام نکالو اور آگے بڑھو بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اس دور میں ہر چیز استعمال کرو اور اور پھینکو والی ہی پسند کی جارہی ہے چاہے وہ کھانے پینے کے برتن ہوں، لکھنے کے قلم یا دیگر اشیاء۔حد تو یہ ہے کہ آج رشتے ناتے بھی یوز اینڈ تھرو کی وبا سے محفوظ نہیں ہیں۔اس افسانہ میں بالخصوص مشرقی ومغربی تہذیب اور ان کے اثرات ونتائج پر بڑی خوبصورتی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔نتاشا ایک لڑکی ہے، جو بچپن میں تو مشرقی انداز فکر کی حامل تھی لیکن جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی ہے اور تعلیمی لحاظ سے آگے بڑھتی ہے مغرب کی طرف مائل ہوجاتی ہے، نتاشا کے پاپا یوز اینڈ تھرو کے فلسفہ پر عامل ہیں، اس کی والدہ اور نانی مشرقی تہذیب کی پاسدار ہیں، نتاشا کی ممی اور پاپا میں کسی بات پر تلخ بحث ہوجاتی ہے، تو اس کے پاپا اس کی ممی سے کس انداز سے مخاطب ہوتے ہیں اس کو کتنے اچھے انداز میں دیپک صاحب نے بیان کیا ہے، بالکل وہی الفاظ اور وہی انداز گفتگو ہے، جو ایسے موقع پر اختیار کیا جاتا ہے:

''گنواروں میں پلی ہو، گنوار ہی رہوگی، وہاں میکے میں تھا ہی کون، جو تمہیں اٹھنے بیٹھنے
کی تمیز سکھاتا، ان کلچرڈ لیڈی!'' انھیں دنوں نتاشا کی نانی اس کے یہاں آجاتی ہیں،
تو اس کی امی ساری کہانی سنا دیتی ہیں، پوری کہانی سن کر وہ اپنی لڑکی کو سمجھاتے
ہوئے مشرقی انداز میں کہتی ہیں: ''پتی پرمیشور ہوتا ہے بیٹی! اس کی باتوں کا ملال کیسا،
ویسے بھی مرد لوگ ایسی باتیں کہتے ہی رہتے ہیں، سن کر بات ٹال دیا کرو۔''

آخر نتاشا کی زندگی میں ایک دن وہ بھی آتا ہے، جب اس کا باپ اسے اور اس کی ماں کو بھی چھوڑ کر ڈپوٹیشن پر طنزانیہ چلا جاتا ہے، جاتے وقت کہتا ہے بیٹی فکر مت کرو، بس دو سال کی ہی تو بات ہے، یہ گیا وہ آیا، ماں کا خیال رکھنا، شروع میں ہفتہ میں دو خط آئے، اس کے بعد مہینہ میں ایک، پھر خطوں کا سلسلہ ہی بند ہو گیا، مالی پریشانیوں سے مجبور ہو کر اس کی ماں نے ایک شخص کے شوروم میں سیلز وومن کا کام سنبھال لیا اور اسے اسکول کے ہاسٹل میں داخل کر دیا، وہ چھٹیوں میں اپنی ماں کے پاس آیا کرتی تھی، ایک بار وہ چھٹیوں میں ماں کے پاس آئی ہوئی تھی، اسی زمانہ میں شوروم کے مالک کے لڑکے کا جنم دن منایا جا رہا تھا، یہ دونوں بھی اس میں مدعو تھے، وہاں پر جو کچھ پیش آیا وہ (Throw away Culture) کی انتہا ہے:

''زندگی سے اکتائی ہوئی دور وحیں اتنی ساری بھیڑ میں وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے
ایک کونے میں سمٹ کر اپنا وجود کھو بیٹھی تھیں، دریں اثنا سامنے دروازے سے ایک جانا
پہچانا آدمی کسی تیس پینتیس سالہ عورت کی کمر میں اپنے بازو حمائل کئے ہوئے چلا آیا،
اور پھر بھیڑ میں گم ہو گیا، نتاشا اس کو دیکھتے ہی تلملا اٹھی، وہ بہت دیر تک جل بن مچھلی
کی طرح صوفے پر تڑپتی رہی، آخر اس سے رہا نہ گیا، ہمت بٹور کر وہ کھڑی ہوئی اور
بھیڑ کو چیرتی ہوئی دبے قدموں سے اس آدمی کا پیچھا کرنے لگی، اس آدمی کا دھیان
اپنی طرف مبذول کرنے کی خاطر نتاشا نے پیچھے سے اس کے کوٹ کے دامن کو کھینچ
لیا اور ساتھ ہی رندھی ہوئی آواز میں چلائی۔ پا..... پا۔
وہ آدمی مڑا مگر ضبط کر کے خاموشی سے اس نے نتاشا کو پہچاننے سے انکار کیا۔ دیکھتا
رہا۔''

دیپک بدکی صاحب کے افسانوں میں سب سے اہم چیز موضوعات کا تنوع اور کہانی لکھنے کا

انداز ہے، ان کی علمیت، اسفار، اور تجربات ومشاہدات نے ان کے افسانوں کو دیگر افسانوں کی بھیڑ میں گم ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے، دو تہذیبوں کے ٹکراؤ اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو افسانہ نگار نے کتنے اچھے انداز میں بیان کیا ہے، اس افسانے کا اختتام دل دہلا دینے والے انداز میں ہوا ہے، وہ لڑکی جو اپنے باپ سے بے انتہا محبت کرتی تھی، اس سے ملاقات کا سپنا دل میں سجائے زندگی سے جوجھ رہی تھی، اس کا باپ اسے ملتا بھی ہے، تو کس حالت میں کہ اپنے لخت جگر کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔ الفاظ اور جملوں کے برمحل اور برجستہ استعمال نے اس افسانے کو بلندی عطا کی ہے۔

ممبر پلاننگ پوسٹل سروسز بورڈ جیسے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتے اور اپنے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دیتے ہوئے کہانیوں کے لئے وقت نکال لینا ہی بہت بڑی بات ہے، جب کہ دیپک بدکی صاحب صرف کہانیاں لکھتے ہی نہیں بلکہ ہند و بیرون ہند کے معیاری رسائل میں اہتمام کے ساتھ چھپتے بھی ہیں۔ شاعر، انتساب اور اسباق جیسے انٹرنیشنل ادبی رسائل نے ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر ان پر گوشے بھی شائع کیے ہیں۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ بہت اچھے مضامین اور تبصرے بھی لکھتے ہیں۔ تین تنقیدی کتابیں 'عصری تحریریں' اور 'عصری شعور' اور 'عصری تقاضے' منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں ان کی تنقیدی بصیرت اور انداز تحریر کی عمدگی کو دیکھا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

☆ محمد متین ندوی، مدرسہ ریاض المدارس، سرونج، ۴۶۴۲۲۸ (ایم پی)

تبصرہ

دیپک بُدکی کے ادبی سفر کا ایک اہم سنگ میل

-چنار کے پنجے-

--ڈاکٹر اشوک پٹواری

اردو زبان کی رومانیت، پرکشش لہجہ اور مٹھاس کے بارے میں کچھ بھی لکھنا ایک ٹھوس حقیقت کو دوہرانے کے سوائے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ یہ کہنا شاید ضروری ہے کہ جہاں ہندی ٹی وی سیریلوں اور فلموں میں بولے جانے والے مکالمے اور گانے اردو زبان کی شیرینی اور ولولہ انگیز الفاظ کے محتاج ہیں وہیں اردو رسم الخط میں لکھنے پڑھنے والے کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں۔ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اردو زبان میں لکھی ہوئی کتابیں آج کل دیوناگری رسم الخط میں شائع ہورہی ہیں اور بے حد مقبول ہورہی ہیں۔ ایسی صورت حال میں دیپک بدکی کا 'چنار کے پنجے' کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آنا اردو زبان کے چاہنے والوں کے لیے باعث فخر ہے۔

یوں تو ایک تخلیق کار کے حساس ذہن کو جھنجھوڑنے کے لیے کسی متاثر کن منظر کی بس ایک جھلک اور اس کے قلم میں توانائی لانے کے لیے فقط ایک لمحہ ہی کافی ہے۔ ایسے میں اگر ایک باشعور اور نابض قلم کار کو مختلف مقامات کو قریب سے دیکھنے کے مواقع فراہم ہوں اور افسانوی کرداروں کو لاکھوں کی بھیڑ میں سے کھوج کر نکالنے کی صلاحیت ہو تو اس کے قلم کی روشنائی کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ دیپک بُدکی اس معاملے میں کافی حد تک خوش قسمت ثابت ہوئے ہیں۔ روزگار کی مصروفیت جہاں ان کی تخلیقی صلاحیت کو پیش کرنے میں شاید استحکام کا باعث بنی ہے، وہیں اپنے پیشے سے وابستہ لوازمات پورے کرتے ہوئے وادی کشمیر کے باسی دیپک بُدکی کو اُتر پردیش کے دوردراز دیہات میں 'اماں' اور گجرات کے قبائلی علاقے میں موچی پپلا کا 'کلو' ڈھونڈ نکالنے میں بھی مدد کی ہے۔

'چنار کے پنجے' اُنیس خوبصورت کہانیوں پر مشتمل ایک ایسا افسانوی مجموعہ ہے جسے پڑھتے

ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ آپ کہانی پڑھ رہے ہیں یا منظر دیکھ رہے ہیں۔سادگی میں لپٹے ہوئے معنی خیز الفاظ آنکھوں سے ہوتے ہوئے دل میں اُتر کر ذہن میں ایک تصویر کھینچ دیتے ہیں۔افسانہ نگاری کے اس دلکش ہنر کی عکاسی اس مجموعے کی کئی کہانیوں میں نظر آتی ہے۔

عورت کے ماں بننے کی صلاحیت کو انسانی ارتقاء کا ایک عظیم تحفہ مانا جاتا ہے۔شاید اسی لیے عورت کو مرد سے کہیں زیادہ برتر نوع کہا جاتا ہے۔نو مہینے کے حمل اور زچگی کے شدید درد سے گزر کر جب ایک ماں اپنے بچے کو شفقت کے ساتھ اپنے سینے سے لگا کر اپنی چھاتی کا دودھ پلاتے ہوئے مسکراتی ہے تو جہاں کا خالق بھی اپنی بنائی ہوئی اس عظیم تخلیق کے سامنے سرخم کر دیتا ہے۔مگر ایک افسانہ نگار کے خیالات کی پرواز ہوا کی سمت کی محتاج نہیں ہے اور نہ ہی اسے معاشرے کی تنگ دیواروں میں قید کیا جاسکتا ہے۔ 'مانگے کا اجالا' میں ایک حساس مرد کے جذبات کو ایک نئے طریقے سے پیش کیا گیا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور غیر متوقع بھی۔

۱۹۹۰ء سے کشمیر کے بدلتے ہوئے اور افسوس ناک حالات نہ صرف کشمیر کے لیے بلکہ کشمیریت کے لیے بھی ایک بدنما داغ ہے۔جو لوگ خوف اور تشویش کے زیر اثر اپنے ہنستے کھیلتے گھروں سے نکل کو بے گھر ہو گئے اور جو لوگ اپنے گھروندوں کے اندر رہ کر بھی خوفزدہ ہیں، دونوں تکلیف میں ہیں۔بُدکی صاحب شاید ذاتی طور پر اس بحران سے نہیں گزرے مگر بقول غالبؔ دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں۔اور یہی درد 'ایک نہتے مکان کا ریپ'، 'چنار کے پنجے'، 'وفادار کتا'، 'سفید کراس' وغیرہ میں چھلک چھلک کر نظر آرہا ہے۔

'چنار کے پنجے' میں گھر چھوڑ کر جانے والے کشمیریوں کی مشابہت خزاں کے زرد پتوں سے کر کے دیپک نے ایک سیاسی مسئلے کو نہایت ہی غیر جانبدارانہ انداز میں اور انسانی درد کو ایک حساس تخلیق کار کی نظر سے لاجواب طرز بیان کے ساتھ پیش کیا ہے۔خاص طور پر جب وہ لکھتے ہیں۔''یرقان زدہ پیلے پنجے جن پر ٹیڑھی میڑھی انگلیاں اُگ آئی ہیں، انگلیوں کی رگیں بھی صاف دکھائی دے رہی ہیں، نیچے میرے قدموں تلے چرمرا رہے ہیں، سسک رہے ہیں، کراہ رہے ہیں۔اس چرمراہٹ سے میں بچپن میں بہت مسرور ہوتا تھا مگر اب اس آہ و بکا سے کوفت ہوتی ہے۔''

'مخبر' ایک المناک حقیقت ہے جس کے بارے میں سوچ کر جھرجھری سی آتی ہے۔شاید اس خیال سے کہ نیل کنٹھ اوزارن دتی کی جگہ میں بھی ہوسکتا تھا یا میرے بوڑھے لاچار والدین بھی .....! 'وفادار کتا' میں راکی کے کردار کی مشابہت کشمیریت کے اس جذبے سے کی جاسکتی ہے جو آج بھی آنکھیں کھولے اس شئے کی واپسی کی امید میں آخری سانسیں گن رہا ہے جس کا وجود ہی شاید ختم ہو چکا ہے۔ 'سفید کراس' ایک ان دیکھے خدشے کی عکاسی ہے جو وہم بن کر ذہن کو لہولہان کر دیتا ہے اور انسان موت سے پہلے ہی فوت ہو جاتا ہے۔اس احساس کو بیشتر کشمیریوں نے محسوس کیا ہے اور دیپک نے اس حقیقت کی ترجمانی دِل کو چھونے والے انداز سے کی ہے۔

دیپک بُدکی کے افسانوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ کہانی کے آغاز میں آپ اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں کہ کہانی کس سمت میں جانے والی ہے اور کردار آگے چل کر کیا کرنے والے ہیں۔ 'کہانی ورثے میں ملی سوغات' میں گیان چند اپنے دوست کو دغابازی کے لیے اسے گالی نہیں دیتا بلکہ ایک پیار بھرا خط لکھ کر زبردست طمانچہ مارتا ہے۔ 'ویوگ' ایک معصوم سی لوسٹوری love story ہے جس کے کردار آکاش میں نہ تو مجنون کا پاگل پن ہے، نہ فرہاد کی شدت، نہ مہیوال جیسا عزم اور نہ ہی مرزا جیسی ہمت۔بس ایک جذبہ ہے- ایک حسیں سا بے لوث جذبہ-لڑکپن میں پھوٹنے والے اس نمود کی طرح جو اکثر پودے نہیں بن پاتے۔صرف ایک میٹھی یاد بن کر رہ جاتے ہیں۔ 'فریب گفتار'، 'آؤ کچھ اور لکھیں'، 'پارٹی'، 'احتجاج'، 'سپنوں کا شہر' اور دیگر کہانیاں موجودہ حالات، معاشرے، میڈیا، انسانی قدروں اور انسانی مصروفیاتِ زندگی کا آئینہ ہیں جس میں ہم ہر روز اپنی شکل دیکھتے ہیں مگر اس بھرم میں اپنے ذہن سے جھٹک دیتے ہیں کہ یہ میری نہیں کسی اور کی تصویر ہے۔

'چنار کے پنجے' دیپک بُدکی کی ادبی صلاحیت کے ایک اور خوبصورت پہلو کو منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوا ہے۔جس میں بہار کی آمد آمد کا پیغام بھی ہے اور خزاں کے زرد پتوں کی اُداسی بھی۔یہ مجموعہ ان کے ادبی سفر کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ان کے قلم کی روانی اور تخلیقی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے یہ بات یقیناً کہی جاسکتی ہے کہ دیپک بُدکی کا قلم اردو افسانے کو کافی دور تک لے جائے گا۔☆☆☆

☆ مبصر: ڈاکٹر اشوک پٹواری: 'چنار کے پنجے'، دوسرا ایڈیشن؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی؛ مطبوعہ روزنامہ چٹان سرینگر

'چنار کے پنجے'- بشری کرب کا آئینہ

--ڈاکٹر نشاں زیدی

'چنار کے پنجے' دیپک بُدکی کے ۱۹/افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کے تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آ کر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ دیپک بدکی کا نام افسانہ نگاری میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ میں نے اردو افسانہ نگاری اس لیے نہیں کہا کیونکہ وہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں یکساں حیثیت کے حامل ہیں۔ 'چنار کے پنجے' کے تمام افسانے کردار، پلاٹ اور کہانی کے اعتبار سے چست ہیں اور ہر افسانے میں انھوں نے کسی نہ کسی مسئلے کو ابھارا ہے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''چنار کے پنجے میں تمام افسانے ہم عصر حالات کا آئینہ ہیں۔ ان افسانوں میں ایک جانب آپ کو سماجی حقیقت نگاری ملے گی اور دوسری جانب نفسیاتی و جنسیاتی الجھنوں کی گرہیں کھولنے کی کوشش۔''

'چنار کے پنجے' کے تمام افسانے ایک خاص لب و لہجہ اور خاص طرز کے افسانے ہیں۔ انھوں نے کشمیر کی خوبصورت وادیوں سے روشناس کراتے ہوئے وہاں کے باشندوں پر ہونے والے ظلم و جبر کا بڑی چابک دستی سے احاطہ کیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں کشمیر کے لوگوں کے کرب کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ 'چنار کے پنجے'، 'مخبر' اور 'ایک نہتے مکان کا ریپ' کہانیوں میں مصنف نے کشمیر کے حالات کو بڑے سلیقہ سے بیان کیا ہے۔ ان کہانیوں میں شہر میں پھیلی ہوئی دہشت گردی کی وجہ سے شہر کو خیر باد کہنے والوں کا حال بھی ہے اور سارے ظلم و ستم سہتے ہوئے اپنے وطن اپنی مٹی کو سینے سے لگانے والوں کی روداد بھی ہے اور موجودہ دور کے خوف زدہ ماحول کو دیکھ کر پہلے کے پُر سکون ماحول کو یاد کرنے والوں کی آہیں بھی ہیں۔ کہانی 'ایک نہتے مکان کا ریپ' میں جہاں ایسے خاندان کو موضوع بنایا گیا ہے جو دہشت گردی کے خوف سے اپنا گھر، اپنا وطن اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر کہیں انجان جگہ جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مصنف

نے ان کی درد بھری کہانی کو بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے:

''ایک ٹرنک، ایک اٹیچی اور ایک بستر۔ بس یہی مال ومتاع سمیٹ کر وہ اندھیری رات میں گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ چھ روحیں.....! وہ، اس کی بیوی، دو کمسن اور دو ناتواں بوڑھے جن کا بوجھ اسے زندگی میں پہلی بار محسوس ہو رہا تھا۔''

اہل خانہ تالا ڈال کر چلے جاتے ہیں۔ کچھ دن تو تالا پڑا رہتا ہے لیکن ایک دن ایک نوجوان آ کر اس مکان کو لوٹ لیتا ہے اور پھر کئی بار اس مکان کو لوٹا جاتا ہے۔ جب مکان بالکل خالی ہو جاتا ہے تو لوگ مکان کی ساری کواڑ اور لکڑی لے جاتے ہیں۔ آخر کار مکان میں آگ لگا دی جاتی ہے اور اس کا ملبہ پڑوسی اپنے اپنے گھروں میں لے جاتے ہیں۔ اسی طرح کہانی 'مخبر' میں کشمیر میں پھیلی ہوئی دہشت گردی کو افسانوی قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ یہ کہانی ان بے گناہ معصوموں کی ہے جن پر مخبری کا الزام لگا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور پھر ان کا کسی سراغ رساں ایجنسی سے تعلق بتا دیا جاتا ہے۔ یہ کہانی بوڑھے نیل کنٹھ اور اس کی بیوی ارن دتی کے گرد گردش کرتی ہے۔ جن کے دونوں بچے باہر ہیں اور والدین کو بھی لے جانا چاہتے ہیں لیکن وہ اپنی مٹی کی محبت کی خاطر اپنے وطن عزیز کو نہیں چھوڑتے حالانکہ خوف ودہشت سے ان کا بُرا حال ہے۔ ایک دن ہتھیار بند نوجوان ان کے گھر میں گھس جاتے ہیں۔ نیل کنٹھ اور ارن دتی کی روحیں دہشت گردوں کے خوف سے پرواز کر جاتی ہیں لیکن وہ نوجوان ان لاشوں کو گولیوں سے لہولہان کر دیتے ہیں اور دوسرے دن اخبار میں خبر چھپتی ہے:

''حبہ کدل میں مجاہدوں نے نیل کنٹھ اور ارن دتی نامی دو مخبروں کو ہلاک کر دیا۔ ان پر شبہ تھا کہ وہ فوج کی سراغ رساں ایجنسی کے لیے سرگرم عمل تھے۔''

'چنار کے پنجے' کہانی میں مصنف نے بڑے مؤثر انداز میں اپنے تاثرات کو قلم بند کیا ہے۔ ایسا شہر جہاں پر پہلے شادابی تھی، جشن جیسا ماحول تھا، ہر طرف خوشحالی تھی، لیکن اب اس وادی میں صرف خوف زدہ چہرے، سسکتی آہیں، اکھڑی اکھڑی سانسیں ہیں۔ اس مجموعے کی خوبی یہ ہے کہ جہاں مصنف نے کشمیر کے خوف زدہ ماحول کا ذکر کیا ہے وہیں کشمیر کے رسم ورواج سے بھی واقف کرایا ہے۔ 'ویوگ' کہانی میں کشمیری پنڈتوں کے یہاں ہونے والی رسم ویوگ (رنگولی) سے بڑے خوبصورت انداز میں متعارف

کراتے ہوئے ایک نوجوان کی عشقیہ کہانی کو سمویا ہے۔نوجوان کو اپنے گھر کے سامنے رہنے والی دوشیزہ سے پیار ہو جاتا ہے۔یہ پیار صرف ایک طرفہ نہیں ہے بلکہ اس آگ سے لڑکی بھی بچی نہیں ہے، وہ بھی چپکے چپکے لڑکے کا دیدار کرتی ہے لیکن دونوں ہی اپنی محبت کا اظہار نہیں کر پاتے ہیں اور لڑکی کا رشتہ کہیں اور طے ہو جاتا ہے۔آخر کار شادی کا دن قریب آجاتا ہے نوجوان اپنے دل میں خیال کرتا ہے کہ وہ لڑکی کو ایسا تحفہ دے گا کہ وہ زندگی بھر اس کو یاد کرے۔یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور اس کی شادی میں ایک خوب صورت رنگولی بنانے کا پکا ارادہ کر لیتا ہے۔لیکن شادی سے ایک روز پہلے اسے دفتر کے کسی ضروری کام سے شہر سے باہر بھیج دیا جاتا ہے اور اسے مجبوراً جانا پڑتا ہے۔اس کی تمنا دل میں رہ جاتی ہے اوہ وہ خود کو سب سے بڑا بزدل قرار دیتا ہے۔کہانی یہاں پر ختم ہو جاتی ہے لیکن قاری کو تادیر سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

دیپک بدکی نے سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اور جنسیاتی گرہوں کو کھولنے کی بھی کوشش کی ہے۔کہانی 'مانگے کا اجالا' اور 'وہ الھڑ لڑکی' اسی نوعیت کی کہانی ہے۔کہانی 'مانگے کا اجالا' میں جہاں ایک نرس کی جسمانی خواہش کو کہانی کے پیرائے میں بیان کیا ہے وہیں 'وہ الھڑ لڑکی' میں دہلی کی بسوں کی بھیڑ کا نظارہ کراتے ہوئے ایک مرد کی جنسی خواہش کو بیان کیا ہے۔'ٹک شاپ' اور 'ورثے میں ملی سوغات' میں بدعنوانی کو موضوع بنایا ہے۔مصنف نے کشمیر کے علاوہ اپنی فوجی زندگی میں ہونے والے تلخ شیریں تجربات سے بھی قاری کو موثر انداز میں روشناس کرایا ہے۔انھوں نے کشمیر کے ساتھ دہلی اور چنڈی گڑھ کو بھی پس منظر کے طور پر پیش کیا ہے۔'اماں' کہانی میں مظفر نگر کے گاؤں کے حالات کو بیان کیا ہے۔دیپک بُدکی کے تمام افسانے جہاں موضوع کے اعتبار سے پُر تاثیر ہیں وہیں اس تاثیر میں اضافے کا سبب ان کا اسلوب ہے، جو قاری کے ذہن پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا ہے۔زبان و بیان سادہ ہے، اس کے باوجود ادب سے عاری نہیں۔مجموعی طور پر تمام افسانوں میں سماجی مسائل کی بڑے موثر انداز میں غمازی کی گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

☆ تبصرہ نگار: ڈاکٹر نشاں زیدی، کتاب: چنار کے پنجے، مصنف دیپک بدکی، تبصرہ نگار کا پتہ: بی-۶۳/ایس-۲، ڈی ایل ایف، بھوپارہ، صاحب آباد، غازی آباد، یوپی؛ مطبوعہ ایوان اردو، جلد نمبر ۲۸، شمارہ ۳، جولائی ۲۰۱۴ء

دیپک بُدکی: 'چنار کے پنجے' کے آئینے میں

--امیر حمزہ

دیپک بدکی اردو معاصر افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ سرزمین کشمیر سے تعلق رکھنے والے دیپک بدکی کا شمار کشمیر کے سرفہرست افسانہ نگار اور ملک کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

دیپک بُدکی کی افسانوی زندگی کا آغاز ۱۹۷۰ء سے ہوتا ہے جب ان کا پہلا افسانہ 'سلمٰی' ہمدرد سرینگر میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے افسانے مسلسل ملک اور بیرون ملک کے اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے تاہم ان کو ایک اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت بیسویں صدی کے اواخر میں حاصل ہوئی جب ان کا افسانوی مجموعہ 'ادھورے چہرے' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوکر افسانوی دنیا میں ایک مقام حاصل کیا۔ 'ادھورے چہرے' کے علاوہ ان کے دوسرے افسانوی مجموعے 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، 'ریزہ ریزہ حیات' اور ایک زیر تبصرہ مجموعہ 'چنار کے پنجے' بھی ہیں۔

دیپک بُدکی کا تعلق صرف افسانوی دنیا ہی سے نہیں رہا ہے بلکہ ان افسانوی مجموعوں کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین ملک کے مختلف رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور تین کتابیں تنقیدی مضامین اور تبصروں پر مشتمل 'عصری تحریریں'، 'عصری شعور' اور 'عصری تقاضے' بھی شائع ہوکر شرف قبولیت سے سرفراز ہو چکے ہیں۔

دیپک بدکی کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو افسانوں سے علامت، ابہام اور تجریدیت کے زور کو کم کر کے پھر سے اس میں کہانی پن پیدا کیا اور اسے قاری سے نزدیک کیا۔ دیپک بدکی کے افسانوں کا اندازِ نگارش بہت ہی سادہ، آسان، سہل اور زود فہم ہوتا ہے جس کی وجہ سے اردو کا ایک عام قاری بھی ان افسانوں سے وہ لطف اور حظ اٹھاتا ہے جو ایک خاص قاری حاصل کرتا ہے۔ اس سے وہ فوری طور پر قاری کے ذہن میں اتر کر اس کو اپنے خیالات واحساسات کا شریک بنا لیتے ہیں۔

دیپک بدکی کے افسانوں میں قلم نے ان کا ساتھ عصر حاضر کے تقریباً تمام مسائل پر دیا ہے اور انھوں نے ان تمام موضوعات کو افسانوی قالب میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے جو موجودہ معاشرے کا جزوِ لاینفک بن چکے ہیں کیوں کہ ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف ادب کی افادیت کے قائل ہیں، اس اعتبار سے ان کے افسانوں کو ایک ایسا آئینہ قرار دیا جاسکتا ہے جس میں مختلف زاویوں سے سماج کی تصویریں نظر آتی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'چنار کے پنجے' مصنف کے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں ۱۹ راہم افسانے شامل ہیں۔ ان کے کئی افسانے ہندی، انگریزی، کشمیری، مراٹھی، اور تیلگو میں ترجمہ ہو کر شائع بھی ہو چکے ہیں۔ مصنف نے جہاں اپنے افسانوں میں وقت کے اہم موضوعات کو جگہ دی ہے وہیں ان کے افسانوں کا ایک اہم موضوع کشمیر کے حالات اور کشمیر سے ہجرت کے مسائل ہیں۔ اگر چہ ہجرت کے تعلق سے بہت سے افسانے ہماری نظروں سے گزرے ہوں گے لیکن مصنف کی تحریروں میں کشمیری پنڈتوں کی ہجرت کا جو کرب نظر آتا ہے وہ ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ 'چنار کے پنجے' میں کئی ایسے افسانے ہیں جن میں اس موضوع کو پیش کیا گیا ہے اور کئی افسانوں میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں ایک افسانہ 'چنار کے پنجے' اسی عنوان سے کتاب کا نام بھی موسوم ہے، اس افسانے کے ایک اقتباس سے اس چیز کا بہ خوبی احساس کیا جاسکتا ہے:

> ''غربت میں اکثر وہ مرجھا جاتا ہے۔ نیست و نابود ہو جاتا ہے، ہمیشہ کے لیے۔ اور پھر رہ جاتی ہیں یادیں۔ ڈھیر ساری یادیں۔ تواریخ کی کتابوں میں مدفن یادیں۔ فرعونی تہذیب کی یادیں۔ یونانی تہذیب کی یادیں۔ یا پھر رہ جاتے ہیں فوسل اور آثار قدیمہ۔ ڈائنوسورس اور آرکیوپٹیرکس۔ اسٹون ہینج اور جنتر منتر یا پھر رہ جاتے ہیں لِونگ فوسل۔ گنگو بائلو با اور ہم لوگ جو زندہ لاشوں کی طرح اپنی نسل کو گھسیٹتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔''

اسی طرح کئی اور افسانے ہیں جن میں کلچر اور ہجرت کی کشمکش ایک ساتھ ملتی ہے جن میں سے 'ایک نہتے مکان کا ریپ' اور 'سفید کراس' وغیرہ ہیں۔

مصنف کے افسانوں کی زبان بالکل سادہ ہے کہیں کہیں مکالموں میں ہندی الفاظ کے امتزاج سے مکالمے پُر لطف اور معنی خیز ہو گئے ہیں۔ افسانوں میں کہانی کو بہت ہی خوبصورتی سے بُنا گیا ہے اور الفاظ کے انتخاب میں مصنف نے احتیاط سے کام لیا ہے۔

مصنف کے یہ سارے افسانے جو شامل مجموعہ ہیں، ملک اور بیرون ملک کے مشہور رسالوں جیسے کتاب نما دہلی، استعارہ دہلی، سب رس حیدر آباد، شاعر ممبئی، اور پرواز لندن وغیرہ میں شامل ہو چکے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ مصنف کے یہ افسانے عالمی پیمانے پر شرف قبولیت سے سرفراز ہوں گے اور یہ افسانوی مجموعہ ادبی دنیا میں اپنا ایک اہم مقام تعین کرے گا۔

☆☆☆☆☆☆

☆ مبصر: امیر حمزہ؛ 'چنار کے پنجے'، مصنف: دیپک بدکی؛ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔۶، ضخامت ۱۶۸ صفحات، قیمت ۲۰۰ روپے: مطبوعہ 'ہماری زبان'، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، جلد ۷۳، شمارہ ۲۸؛ ۲۲ تا ۲۸ جولائی ۲۰۱۴ء، ص ۶

===

☆ آپ کی کتاب 'عصری تحریریں' پوری پڑھ ڈالی... کتاب بہت پسند آئی... نظم افسانہ تنقید پر آپ کو دسترس حاصل ہے۔ آپ کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ مغربی ادب کا مطالعہ بھی کرتے رہتے ہیں۔

(وارث علوی ۵ فروری ۲۰۰۷ء)

☆ دیپک بُدکی تنقید نگار بھی ہیں۔ وہ جمالیاتی اور تاثراتی ناقد ہیں... دیپک بُدکی معروضی انداز سے تجزیہ کرتے ہیں اور مواد پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھتے ہیں... وہ حکیمانہ نظر اور آگہی بھی رکھتے ہیں۔

(مناظر عاشق ہرگانوی، سہ ماہی اسباق، ۲۰۰۷ء)

تنقیدی مضامین و تبصروں پر مبنی

۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی دیپک بُدکی کی اولین کتاب

عصری تحریریں

(مضامین: ۶؛ تبصرے: ۵۶؛ اشاعت: ۲۰۰۶ء؛ ضخامت: ۲۷۸ صفحات؛ قیمت: ۲۵۰ روپے)

پانچ سو کتابیں کھپ جانا صحرا میں ایک بوند کے جذب ہونے کے برابر ہے۔ مگر اکثر و بیشتر ایسا بھی نہیں ہوتا اور اس کی وجہ اردو قارئین کی بے رخی، اردو ادیبوں کی بے مائیگی، اور اردو ناشروں کی بے سروسامانی ہے۔ رہا سہا کام اردو کے خودساختہ محافظوں نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔'' آگے وہ رقم طراز ہیں۔ ''افسوس پانچ صدیوں کا گنگا جمنی ورثہ بوسیدہ لائبریریوں میں دھول کھاتا بے صدا ہو گیا۔''

'چنار کے پنجے' میں یوں تو سبھی کہانیاں قابل مطالعہ ہیں، لیکن بطور خاص چند کہانیوں کا ذکر کرنا ناگزیر ہوگا۔ جیسے 'اماں'، 'چنار کے پنجے'، 'ایک نہتے مکان کا ریپ'، 'وہ الھڑ لڑکی'، 'ایک خط جو پوسٹ نہ ہوسکا'، 'سپنوں کا شہر' اور 'پارٹی'۔ دیپک بُدکی اپنی ہر کہانی میں ایک کرافٹ بناتے ہیں اور اس کے تحت کرداروں کا انتخاب کر کے ان کو جگہ جگہ کہانی میں فِٹ کرتے چلے جاتے ہیں۔ مرکزی کردار کی بُنت مضبوط ہوتی ہے اور وہ اپنی جگہ بے حد توجہ طلب ہوتا ہے۔ 'احساس' وہ جذبہ ہے کہ جو انسانی رشتوں کی بنیاد کو مضبوط کرتا ہے اور یہی رشتے آگے چل کر روائتوں کی راہ ہموار کرتے ہیں اور انھیں ایک جہت عطا کرتے ہیں۔ جس طرح انسانی جسم میں 'دل' کی کارکردگی اہم ترین ہے، بالکل اسی طرح احساس انسانی جذبات کے لیے ایک لازمی جز ہے اور دیپک بُدکی کی کہانیوں میں ایسے احساس کا ذکر جگہ جگہ نظر آتا ہے جو جذبات کا سبزہ اگاتا ہے اور سوچ کی بارش سے وہ نم ہو کر بعد میں شبنم کی صورت تصور کے برگ پر خواب بن کر چمکنے لگتا ہے۔ بُدکی صاحب نے کئی جگہ زبان کو خوب برتا ہے۔ محاورے، استعارے اور تشبیہات کو بہتر انداز میں استعمال کیا ہے جن کی وجہ سے کہانیوں کا پیمانہ دلچسپ ہوتا چلا گیا ہے۔ کہانی میں بہرحال تجسس قائم رہتا ہے اور یہی تجسس قاری کو آخر تک بے چین رکھتا ہے۔ کہانیوں کی دنیا میں دیپک بدکی کا نام اب کافی جانا پہچانا ہے۔ بدکی صاحب کہانی کا عنوان رکھنے میں بھی دسترس رکھتے ہیں۔ تقریباً ہر کہانی کا عنوان کہانی کے متن سے میل کھاتا ہے اور پڑھنے والے کو اس کا مافی الضمیر سمجھا دیتا ہے۔

'چنار کے پنجے' میں شامل ہر کہانی ایک نیا اچھوتا خیال رکھتی ہے، مختصر پیرائے میں ساری کہانیوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے اسی لیے 'چنار کے پنجے' ایک مرتبہ پڑھ لینا ضروری ہے۔ قاری اس کتاب کو ایک ہی نشست میں پڑھ سکتا ہے۔

دعا یہی ہے کہ بدکی صاحب ادب کی اس جد و جہد میں دور تک جائیں، آگے تو وہ نکل ہی چکے

'چنار کے پنجے' پر ایک طائرانہ نظر

--سمیرا حیدر

دیپک بُدکی ایک معتبر افسانہ نویس ہیں۔ ۲۰۱۴ء میں ان کا افسانوی مجموعہ بہ عنوان 'چنار کے پنجے' منظر عام پر آیا ہے۔ جس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ دیپک بُدکی ۱۵؍ فروری ۱۹۵۰ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ایم ایس سی، بی ایڈ، ادیب ماہر اور بہت ساری ڈگریوں کے مالک ہیں۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اور پوسٹل سروسز بورڈ نئی دہلی کے ممبر رہ کر ریٹائر ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں پہلا افسانہ 'سلمیٰ' کے عنوان سے ایک روزنامہ جو سرینگر سے شائع ہوا کرتا تھا، میں شائع ہوا۔ اس کے بعد تو یہ ادبی آسمان پر چھائے چلے گئے۔ ہندستان، پاکستان اور دیگر مغربی ممالک کے ممتاز رسالوں میں شائع ہوتے رہے، کئی کتابوں پر تبصرے بھی قلم بند کیے۔ ان کے کئی افسانے ہندی، کشمیری، انگریزی، مراٹھی اور تیلگو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ دوردرشن میں بھی ٹیلی وائز ہو چکے ہیں۔ ان کی تصانیف میں افسانوی مجموعہ 'ادھورے چہرے' اردو میں تین مرتبہ اور ہندی میں ایک بار شائع ہو چکا ہے، 'چنار کے پنجے' اردو میں دو مرتبہ اور ہندی میں ایک بار، جب کہ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، 'ریزہ ریزہ حیات'، اور تنقیدی مضامین و تبصروں کے تین مجموعے بعنوان عصری تحریریں، عصری شعور اور عصری تقاضے پہلی بار منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انٹرنیشنل فرینڈ شپ سوسائٹی نے ۲۰۰۹ء میں راشٹریہ گورو سمان سے نوازا اور آندھرا پردیش اکادمی نے ۲۰۰۷ء میں اعزاز اور سد بھاونا منچ سرونج نے کالیداس سمان سے نوازا۔

زیر نظر مجموعہ 'چنار کے پنجے'، جس میں کل انیس (۱۹) افسانے ہیں، اپنے طرز کے انوکھے اور جدید پیرائے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ 'چنار کے پنجے' سے متعلق وارث علوی، قمر رئیس، سلطانہ مہر، دیپک کنول، رفیق شاہین، انور ظہیر انصاری، حسن ساہو، سیدہ نسرین نقاش اور سرون سنگھ نے ان کے افسانوی فن پر تبصرے لکھے اور انھیں سراہا۔ پیش لفظ میں بدکی صاحب لکھتے ہیں: ''پانچ کروڑ اردو خواندہ آبادی میں

ہیں اب اسی بھیڑ میں وہ منفرد دکھائی دیں۔ اتنی اچھی کہانیاں لکھنے پر انھیں مبارک باد پیش ہے۔ یہ کتاب 'چنار کے پنجے' مصنف کے پتے یا پھر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے دو سو ادا کرنے پر حاصل کی جاسکتی ہے۔

؎ کوئی بھی ہم سفر نہ تھا شریک منزل جنوں بہت ہوا تو رفتگاں کا دھیان آ کے رہ گیا (ناصر کاظمی)

☆☆☆☆☆

☆ مبصر: سمیرا حیدر، رائچور، کرناٹک؛ کتاب 'چنار کے پنجے'؛ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶، ضخامت ۱۶۸/ صفحات، قیمت ۲۰۰/روپے: مطبوعہ: روزنامہ اعتماد حیدرآباد (اوراق ادب)، بروز پیر، ۱۸/اگست ۲۰۱۴ء؛ ص ۸

==

☆ کتابوں پر تبصرے اور مضامین کے لیے انھوں نے اپنا وضع کردہ ایک پیمانہ متعین کیا ہے کہ وہ اپنے ہم عصر شعراء و ادباء کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں۔ تبصرے میں وہ کسی قدر حیات و سوانح پر بھی بحث کرتے ہیں۔ وہ روایتی انداز کے تبصروں سے بھی گریز کرتے ہیں۔

(محمد خالد عابدی، بھوپال؛ صدائے اردو، فروری- مارچ، ۲۰۱۰ء)

☆ 'عصری شعور' کے مطالعے کے دوران مجھے بار بار یہ احساس ہوتا رہا کہ آپ کی تحریر میں کسی قسم کی جھجھک نظر نہیں آتی جو خود اعتمادی کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس خوبی کی وجہ سے آپ کی نثر میں روانی اور برجستگی کی وہ موجیں رواں دواں ہیں جو قاری کو بھی اپنے ساتھ رواں دواں رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ آپ کے کئی مضامین تجزیے اور تبصروں میں تنقیدی بصیرت کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔

(عالم خورشید، پٹنہ بہار؛ ۲۱/ اگست ۲۰۰۹ء)

چنار کے پنجے - چند تاثرات

-- صاحبزادہ غلام رضا شاکر

ذکاء اللہ شیخ صاحب غیر محسوس انداز سے میری ٹیبل پر ایک پارسل رکھ کر چلے گئے۔ جب میں فارغ ہو کر اس پارسل کی طرف متوجہ ہوا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ مجھے جناب دیپک بدکی صاحب کی کتابوں کا شدت سے انتظار تھا۔ اور وہ اب میرے ہاتھوں میں تھیں۔ اس پارسل میں ایک 'ادھورے چہرے' اور دوسری 'چنار کے پنجے' کے نام سے کتابیں شامل تھیں۔ میں نے 'چنار کے پنجے' ہاتھ میں لی اور گھر کی طرف نکل آیا۔ جب میں نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو اس کے ۱۹ر افسانے پڑھ کر ہی دم لیا لیکن اس وقت نئی صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔

جناب دیپک بدکی کا شمار ہندوستان کے نمائندہ تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک منجھے ہوئے مصنف ہیں۔ ان کی تحریریں الفاظ کی صورت میں ایسی تصویریں ہیں جن سے چاہتے ہوئے بھی نظر نہیں اٹھائی جا سکتی۔ انداز بہت خوبصورت، کرداروں کا چناؤ انتہائی اچھا اور منظر نگاری اپنی مثال آپ ہے۔ اس کتاب میں شامل افسانے 'اماں' سے لے کر 'آخری سبق' تک ایک تواتر کے ساتھ موضوعات کی لائن لگی ہوئی ہے۔ ہندی معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے وہاں کے سارے تہذیبی وتمدنی رنگ اور ثقافتی پہلو نہایت خوب صورتی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ بدکی صاحب کی تحریریں فطرت شناسی کی غماز ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ بدکی صاحب کا تعلق کشمیر جنت نظیر کے خوبصورت شہر سری نگر سے ہے۔ یوں ان کا فطرتی ماحول سے ہم آہنگ ہونا ایک لازمی سی بات ہے۔ کچھ اس خطے کی زرخیزی اور کچھ ماحول کے گہرے مشاہدے نے ایک ایسا آہنگ بنا دیا ہے جو بدکی صاحب کے افسانوں کی شان بن چکا ہے۔

موضوعات کے انتخاب میں بھی بدکی صاحب کا انداز ذرا ہٹ کے ہے۔ 'ایک نہتے مکان کا ریپ' ایک ایسا افسانہ جوان کے فنکارانہ جوہر کا عکاس ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسی کتاب کے نام سے جو

منسوب ہوا' چنار کے پنجے'، اس میں بھی جس انداز سے موسمی اثرات کا ذکر کیا گیا ہے وہ خال خال ہی نظر آتا ہے۔ایک جگہ اسی افسانے میں ایک پتے کی روداد یوں لکھتے ہیں۔ ''کہیں دور سے کوئی کرخت آواز آئی۔شاید کسی بادل کی گرج تھی۔گھبراہٹ کے سبب میرے سارے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی۔چنار کے پتے کو اچانک زبان مل گئی۔ ''گھبراؤ مت دوست! میں ہر روز یہ گھن گھرج سنتا تھا۔جب گرزدوں پر کالے بادل منڈلاتے تھے۔جب آندھیاں خاک اڑاتی تھیں اور جب بجلیاں کڑکتی تھیں۔اس وقت میں اپنی شاخ سے لپٹا ان ناسازگار حالات کا مقابلہ کرتا تھا۔اور کبھی گھبراتا نہیں تھا۔کبھی آسماں سے مسلسل پانی کی چادریں برستی تھیں۔تب میں پریشاں نہیں ہوا۔بس سورج نکلنے کا انتظار کرتا۔وہ جلوہ افروز ہوتا تو میں اپنی لے میں آ کر پھر سے جھومنے لگتا۔میرے اندر کی ساری کلیں جاگ اٹھتیں۔''

اس تحریر میں جہاں کرب و مصائب کا بیان ہے وہاں ایک حوصلہ افزا صورت حال بھی سامنے آتی ہے۔اور انداز تحریر سادہ ہونے کی وجہ سے ایک ایک لفظ دل میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔کردار نگاری بے شک بہت اہمیت کی حامل ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جزئیات نگاری بھی اہم ترین عنصر ہے۔اور جزئیات کو براہ راست زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے جو کہ بدکی صاحب کو خوب حاصل ہے۔اس کے ساتھ ساتھ تشبیہ اور استعارہ ایک ایسی تکنیک ہے جو اسلوب میں خاص لطافت اور چاشنی پیدا کرتی ہے۔جو آپ اس مختصر سے اقتباس میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔اسی اقتباس میں ایک اور پہلو یعنی مکالمہ جس میں بالکل روزمرہ کی زبان کا انداز نمایاں لگتا ہے۔بدکی صاحب نے اسلوب کو بہت سے تکلفات سے بچا کر رکھا ہے۔اسی لیے عبارت کی دلکشی تشبیہات، استعارات اور مکالمے نے بدکی صاحب کے اسلوب کی لطافت کو دوچند کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

☆ تبصرہ نگار: صاحبزادہ غلام رضا شاکر، چیف ایگزیکٹو، ماہنامہ 'صبح بہاراں' پاکستان؛ کتاب 'چنار کے پنجے'، دوسرا ایڈیشن ،مصنف دیپک بدکی، مطبوعہ ماہنامہ صبح بہاراں، اسلام آباد، پاکستان

زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (مجموعۂ افسانہ)

--وہاب اشرفی

دیپک بدکی تقریباً چار دہائیوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے باوجود وہ افسانہ نگاری کو عبادت کا سا درجہ دیتے ہوئے ہمیشہ تخلیقی مرحلے سے گزرتے ہیں۔ موصوف کی مادری زبان کشمیری ہے لیکن ان کے اندر اردو اس طرح رچی بسی ہے کہ اردو کے علاوہ دوسری طرف تا نک جھانک کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دیپک بدکی کے یہاں تخلیق ایک اعلیٰ درجے کا کام ہے۔ دوسرے امور محض ضمنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے میں خاصا تنوع ملتا ہے۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں کے یہ افسانہ نگار اپنی آنکھیں ہمیشہ وار کھتے ہیں۔ آج کے حالات جیسے بھی رہے ہوں وہی ان کی تخلیقی جودت کا باعث ہیں۔ اس بیکراں دنیا میں بہت سے فلسفیانہ خیالات وافکار بکھرے پڑے ہیں لیکن دیپک بُدکی نہ تو فلسفی بننا چاہتے ہیں، نہ مثالی دانشور، وہ بنیادی طور پر زندگی اور اس کے مختلف تیور اور نہج کے طالب علم رہے ہیں اور اس مرحلے سے گزرتے ہوئے عرفان وآگہی کی منزل تک پہنچتے ہیں۔ زندگی کسی بھی فنکار کو چین سے ایک کروٹ بیٹھنے نہیں دیتی، لازماً اس کا احساس ہوتا ہے لیکن دیپک بدکی کی تخلیقی حسیت انھیں مسلسل مہمیز کرتی رہتی ہے۔ اس عمل میں وہ ایک اضطراب کی زندگی گزارتے ہیں۔ زندگی کے باب میں بہت سے سوالات انھیں گھیرے رہتے ہیں، کہیں سے کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملتا، تب وہ افسانے کی راہ سے کتھارسس سے گذرتے ہیں اور ہر افسانے کو ایک آئینہ کی جہت دے کر زندگی کی سوکھی پھیکی قدروں کو نشان زد کرتے ہیں۔ گویا ان کے سامنے یہ ہے کہ:

؎ در پسِ آئینہ طوطی صفتے داشتہ ایم　　اول چہ استادازل گفت ہمہ می گویم

گویا وہ اپنے آپ سے کچھ نہیں کہتے۔ استادازل انھیں زندگی کی ناشائستگی، ناہنجاری وغیرہ کو سامنے لاتی رہتی ہے اور وہ انھیں ایک زبان دے کر عوام وخواص کے لیے کہانی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔

ان کے اضطراب اور ہیجان میں وہ نئی اور پرانی کہانیاں ہیں جو زندگی کی تعبیریں پیش کرتی ہیں۔ چھوٹی بڑی باتوں کو فن کا جامہ کیسے پہنایا جاسکتا ہے وہ ان کے بہت سے افسانوں سے ظاہر ہے۔

اس وقت میرے پیش نظران کا تازہ ترین مجموعۂ افسانہ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' ہے۔ جس میں ۲۳ /افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانے ایک جیسے نہیں بلکہ زندگی کے تقریباً ۲۳ رخ سامنے آتے ہیں۔ بعض پیچیدہ، بعض کھلے ہوئے اور بعض ان دونوں کے درمیان۔ کہہ سکتے ہیں کہ دیپک بدکی کا ذہن بے حد سیال ہے اور اس سیال ذہن کو contain کرنے میں انھیں فنی ریاض سے گزرنا پڑتا ہے۔

دیپک بُدکی ہر قسم کے استحصال سے نبرد آزما معلوم ہوتے ہیں۔ وہ فلسفی تو نہیں لیکن غور وفکر کا انداز انھیں مفکر کی ذیل میں لے آتا ہے۔ دھیمی دھیمی آواز میں بڑی باتیں کہنا، اہم مسائل کو چھیڑنا، ان سے جوجھنا اور پھر ایک ڈسکورس قائم کرنا، ان کا فن رہا ہے۔ ان کے اکثر افسانوں میں ایک زیبرا کراسنگ ہے جہاں اشخاص کھڑے نظر آتے ہیں۔ نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن۔

دیپک بدکی جان بوجھ کر اپنے افسانوں کو بوجھل نہیں بناتے۔ ان کے یہاں ترسیل کا المیہ نہیں ہے، جو ہے صاف ستھرا ہے لیکن ہر جگہ ایک آئینہ ہے جو جس تس کا منہ تکا کرے ہے۔ چاہے اس عمل میں اسے کچھ حاصل نہ ہو سکے۔

'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' کا کوئی بھی افسانہ ان کے تحیر کا پتہ دیتا ہے مثلاً 'پہاڑوں کا رومانس'، 'معصوم علی'، 'کئی گاندھی اور...'، 'شیر اور بکرا'، 'اداس لمحوں کا کرب'، 'حرص گناہ'، 'موت کے سوداگر'، 'گاڑی کا انتظار'، 'قسمت کی پوٹلی'، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' وغیرہ۔ موصوف ساٹھ سے زیادہ افسانے لکھ چکے ہیں اور ہندوستان کے مؤقر رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے 'ادھورے چہرے' (۱۹۹۹ء) اور 'چنار کے پنجے' (۲۰۰۵ء) سے ہی ان پر نگاہ پڑنے لگی تھی۔ پھر ان کے تنقیدی مضامین اور تبصرے بھی سامنے آتے رہے۔ تنقیدی مضامین اور تبصروں پر مشتمل کتاب 'عصری تحریریں' ۲۰۰۶ء میں شائع ہو چکی ہے۔ ان سب سے ان کے ذہن کی بنت واضح ہوتی رہی۔ کہہ سکتے ہیں کہ دیپک بدکی اپنے طرز کے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو زندگی کی تب وتاب کو سمیٹتے رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان کی تلخیوں کو بھی۔ ان کا حساس ذہن انھیں بے حد مضطرب رکھتا ہے اور یہ اضطراب ہی کہانی کے

تار و پود بنتے ہیں۔

دیپک بُدکی کسی سے ناراض نہیں لیکن سب سے بیزار بھی ہیں۔ایسا شخص جو مسلسل اٹوٹ محبت کا مظاہرہ کرتا ہو، اس کے سامنے جب کریہہ مناظر آتے ہیں تو وہ بھی اپنی جگہ بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ سکون اور ہیجان کا افسانہ نگار دیپک بُدکی کی پہچان صرف ان کے افسانے سے ہوتی ہے۔مناصب کی بات کو فی الحال الگ کیجیے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ دیپک بدکی پر ایک تفصیلی مضمون شائع ہو اور اس میں ان کے ہر ایک افسانے کی تحلیل کی جائے۔

دیپک بدکی کے افسانے طویل نہیں ہوتے۔اختصار اور جامعیت ان کا فن ہے۔وہ پلاٹ کے کساؤ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔شاید یہ بات ان کے علم میں ہے کہ پتھر سے ایک چہرہ بنانے کے معنی یہ ہیں کہ سارے غیر ضروری پتھریلے اعضا کاٹ دیئے جائیں اور جو بچے وہ خالص چہرہ ہو۔دیپک بدکی ایک ایسے ہی فن کار ہیں۔سادہ اور رواں اسلوب میں ان کی تمام کہانیاں پڑھنے پر اکساتی ہیں، اس حد تک کہ جب تک وہ ختم نہ ہو جائیں، تسکین نہیں ہوتی۔

'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' ایک ایسا مجموعہ ہے جو ہر سطح کے ذہن و دماغ رکھنے والے افراد کے لیے ایک تحفہ ہے۔میں ایسے خوبصورت مجموعہ کے لیے دیپک بدکی کو مبارک باد دیتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

☆ تبصرہ نگار: وہاب اشرفی؛ کتاب: 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' (افسانوں کا مجموعہ)، مصنف دیپک بدکی؛ سن اشاعت: ۲۰۰۷ء، ضخامت: ۱۶۳ صفحات؛ قیمت: ۲۵۰ روپے؛ ناشر میزان پبلشرز، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر-۱۹۰۰۰۹؛ مطبوعہ 'مباحثہ' شمارہ ۳۱؛ جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء؛ ص ۲۰۴-۲۰۶

زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی-تبصرہ

--ڈاکٹر انوار احمد انصاری

جدید اردو افسانہ نگاری میں جو نمائندہ نام ابھر کر سامنے آرہے ہیں ان میں دیپک بُدکی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں جو بے تکان اور بے باکی سے قلم چلا رہے ہیں اور سماج کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ جاتے ہیں۔ بسیار نویسی کے باوجود ان کے معیار میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ ان کی شخصیت ایک سمندر کی حیثیت اختیار کر چکی ہے جو تنقید، تبصرے اور افسانوں کے تیز بہاؤ کے ساتھ نئے نئے راستے بنا کر اردو دنیا میں اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔

ان کا زیرِ نظر افسانوی مجموعہ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' اس کی زندہ مثال ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے اردو افسانے کو توانائی اور تابانی بخشنے کے لیے اپنے ذہن کا سونا لٹایا ہے اور اپنے وجود کی چاندی نچھاور کی ہے۔ ان کے یہ تمام تر افسانے مختلف ادبی رسائل میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ان کا افسانہ 'ادھوری کہانی' بے حد متاثر کن افسانہ ہے جو کہ انسانی زندگی کی حقیقت کا درس دیتا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی تین مراحل سے ہو کر گزرتی ہوئی ختم ہوتی ہے اور وہ مراحل ہیں، بلبل، گدھا اور کتا اور جس کردار کو بُدکی نے اس حقیقت کا پیرہن عطا کیا ہے وہ لاجواب ہے۔ 'کئی گاندھی اور' میں گاندھی کی تعلیمات پر عمل پیرا شخص کی ناقدری اور کسمپرسی بیان کی گئی ہے۔ اس کے ساتھی خود غرض بن کر ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور اس کے دو بیٹوں کی قربانیوں کا اسے کوئی صلہ نہیں ملتا اور وہ اکتا کر تیرتھ یاترا پر نکل جاتا ہے۔ 'گھر کا بھیدی' دیور اور بھابی کے ناجائز تعلقات کو منظرِ عام پر لاتا ہے جس کا انجام شوہر کا قتل ہے۔ ہندوستانی سماج میں ایسی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں۔ کثیر الخاوندی کا رواج بھی کئی پہاڑی قبیلوں میں ہے لیکن مہذب سماج اس کی اجازت نہیں دیتا۔ افسانے 'چڑی کی بیگم'، 'مغرور لڑکی'، 'دشت وحشت'، اور 'آغوشِ ہوس' دورِ جدید کی تعلیم یافتہ، ترقی پسند اور کام کاجی عورتوں کی جنسی

زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ جب کہ 'موت کے سوداگر' میں ان ڈاکٹروں کو موردِ طنز بنایا گیا ہے جو بھولے بھالے عوام کو ان کے روشن مستقبل کا لالچ دے کر ان کے گردے نکال لیتے ہیں۔ 'موت کے سوداگر' اور 'گاڑی کا انتظار' دونوں افسانے دو کرداروں کے مکالموں سے شروع ہوکر اسی طرح ختم ہوجاتے ہیں۔ ایسا لب ولہجہ بھی قاری کو متاثر کر جاتا ہے۔ 'تخلیق کا کرب' افسانہ نگار کا شاہکار افسانہ ہے۔ ادیب کو ایسے قاری کی تلاش ہے جو اس کی دردِ سے لبریز تصانیف کو پڑھ سکے۔ یہ اقتباس دیکھیے :

'' مجھے قاری کی تلاش ہے جو میری کہانی پڑھ لے، میرے دل کی گہرائیوں میں اُترے اور میرا اہم نوا بن جائے۔ مجھے دور، دور تک کہیں کوئی بھی شخص نظر نہیں آتا۔ سبھی لوگ اپنے اپنے دائروں میں مقید ہیں۔ آخر میرا قاری ہے کہاں؟ غربت وافلاس کی دھول چاٹتا ہوا کر گھوں پر اپنی جوانی لٹا رہا ہے۔ قالینوں کی راچھوں پر دھاگوں کے تار و پود پھیلا رہا ہے۔ کانسی کے برتن سانچوں میں ڈھال رہا ہے یا پھر دھونکنی کی تال پر گرم لوہے پر ہتھوڑے برسا رہا ہے۔ بس اس کو میری زبان سمجھ میں آرہی ہے مگر اس کے پاس فرصت ہے نہ چاہت۔ وہ عالم ہے نہ دانشور البتہ میری زبان سمجھ لیتا ہے۔ مجھے وی ایس نائپال، سلمان رشدی، وکرم سیٹھ اور ارن دھتی رائے پر رشک آرہا ہے کیونکہ ان کی زبان الگ ہے اور ان کے قارئین بھی الگ ہیں۔''

اس مجموعے میں شامل بقیہ افسانے بھی پُرقوت بیانیہ سے قاری کو باندھ کر رکھتے ہیں اور زبان کی ثروت مندی ان کے تخلیقی استعمال سے ظاہر ہوجاتی ہے۔ دیپک بُدکی اپنے کرداروں کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزار کر انھیں اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور پھر فکشن کی زبان عطا کر دیتے ہیں۔ یہی ہنر مندی ان کو جداگانہ منصب عطا کرتی ہے۔

پچھلے مجموعوں کی طرح یہ مجموعہ بھی مقبولیت کی سند رکھتا ہے۔ پیپر بیک کے ساتھ شائع اس کتاب کی کمپوزنگ اغلاط سے پاک ہے اور عمدہ کاغذ وطباعت اس کی وقعت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆
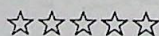
☆ مبصر: ڈاکٹر انوار احمد انصاری؛ کتاب 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، مصنف دیپک بُدکی، اشاعت ۲۰۰۷ء؛ قیمت ۲۵۰ر روپے؛ ناشر: میزان پبلشرز، سری نگر، کشمیر۔ مطبوعہ پرواز ادب، ستمبر-اکتوبر ۲۰۰۸ء؛ جلد نمبر ۲۹، شمارہ نمبر ۱۰-۹؛ ص ۸۴-۸۳

ریزہ ریزہ حیات - میری نظر میں

--زنفر کھوکھر

دیپک بُدکی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ اردو ادب کے ایک جانے پہچانے ادیب ہیں اور کئی شہرت یافتہ کتابوں کے مصنف بھی۔ ان کا تعلق سرزمین کشمیر سے ہے لیکن کچھ سال پہلے وادی کے پُر تشدد حالات نے انھیں ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ اب وہ وسندھرا، غازی آباد میں مقیم ہیں اور علم وادب سے اپنا رشتہ برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں شائع ہوئی ان کی کتاب 'ریزہ ریزہ حیات' میرے مطالعے میں ہے۔ ایک بڑے رائٹر کی کتاب پر کچھ لکھنا، تبصرہ یا تجزیہ کرنا میرے لیے چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے۔ لیکن ایک اچھی کتاب پڑھنا اور اس کے متعلق اظہار رائے نہ کرنا بھی زیادتی اور کتاب کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

'ریزہ ریزہ حیات' میں زندگی کی حقیقتوں اور زندگی سے جڑے چھوٹے بڑے مسائل کو دلچسپ اور مؤثر انداز میں اس طرح اجاگر کیا گیا ہے کہ قاری ان میں کھوسا جاتا ہے اور پڑھنے کے بعد داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت کل اٹھارہ کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں انسان کی ذات سے وابستہ ان گنت چھوٹی و بڑی ضرورتوں، مجبوریوں اور دیگر ان گنت مسائل کو فنکارانہ انداز میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ دیپک بدکی یوں ہی نہیں لکھتے ہیں۔ وہ اپنے سینے میں ایک حساس اور ہمدرد دل رکھتے ہیں۔ وہ دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی ہر کہانی اپنے اندر ایک خاص مقصد اور ایک خاص پیغام لیے ہوئے ہوتی ہے۔

دیپک بُدکی کی کہانیاں عصری مسائل کو اپنی گرفت میں لیتی ہیں۔ وہ اندھ وشواس، ضعیف الاعتقادی اور دیگر عصری مسائل پر برملا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی بعض کہانیاں نفسیاتی نکات کو بھی ابھارتی ہیں۔ مجموعے میں شامل 'بُدھ کی مسکراہٹ' تاریخی نوعیت کی ایک اہم کہانی ہے جو بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے

کی ترغیب دیتی ہے۔ یہ کہانی بیک وقت اپنے اندر سی سلگتے اور پھیلتے ہوئے مسائل کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ انسانیت دشمن عناصر جب تشدد پر آمادہ ہوتے ہیں تو وہ بے جان چیزوں کو بھی اپنا نشانہ بنانے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔ اس کہانی میں جہاں بین الاقوامی دہشت گردی کا ذکر ملتا ہے وہیں وادی کے پر تشدد حالات کے باوجود ہندو مسلم بھائی چارے کی ایک عمدہ مثال بھی ملتی ہے۔ 'ریزہ ریزہ حیات' بھی ملی ٹینسی سے جڑی ان ہزاروں لوگوں کی کہانی ہے جن کے ہنستے بستے گھر اور کاروبار ملی ٹینسی کی وارداتوں میں اجڑ چکے ہیں اور جن کی آنکھوں نے اپنے عزیزوں کی خون میں لت پت لاشیں دیکھی ہیں ۔اور اب نیم حواس باختہ زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

'دس انچ زمین' خود غرض اور لالچی انسانوں کی کہانی ہے جو اپنی لالچ، خود غرضی اور انا کی بدولت نہ صرف ایک دوسرے کے لیے آزار بن جاتے ہیں بلکہ اپنے بچوں کے درمیان بھی نفرت اور جھگڑے کی دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔ 'کبھی ہم سے سنا ہوتا' ایک سماجی کہانی ہے جس میں ایک شوہر اپنی بیوی اور سسرالی رشتے داروں کے ہاتھوں مصائب میں گھرا ہے لیکن اپنے ایک اچھے اور ہمدرد افسر کی بدولت وہ ہاری ہوئی بازی جیت جاتا ہے۔ 'درد کا جنگل' میں ان لوگوں کی بے بسی کو اجاگر کیا گیا ہے جو اپنا گھر آباد کرنے کے بجائے مجرد رہ کر دوسروں کے سہارے اپنی زندگی گزارتے ہیں اور آخر کار بے بس و بے سہارا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ 'ڈاکٹر آنٹی' ایک ایسی کہانی ہے جو انسان کی لاچاری، مجبوری اور بے بسی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خود غرضی کی جھلک دکھاتی ہے۔ 'سرابوں کا سفر' زمانے کی بدلتی قدروں اور سیاسی ہتھکنڈوں پر مبنی سنجیدہ الفاظ و سنجیدہ آواز میں پوشیدہ ایک طنزیہ کہانی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ جس کے لیے کوئی جگہ نہیں اس کے لیے سیاست کا میدان کھلا ہے۔

'یادوں کی مہک' ان خوشگوار یادوں اور خوشگوار لمحوں کی ایک جذباتی کہانی ہے جو اکثر سرمایۂ حیات بن کر رہ جاتی ہے۔ 'لمحوں نے خطا کی ہے' الگ الگ انٹرسٹ اور ٹیلنٹ کے حامل اس شادی شدہ جوڑے کی کہانی ہے جو ایک دوسرے کے انٹرسٹ اور ٹیلنٹ کی قدر نہیں کر پاتے ہیں اور بالآخر علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس مجموعے کی دیگر کہانیاں، لذت خلوت، ٹھنڈی آگ، اندھے خوابوں کا عذاب، پروٹوکول، افلاس کا کوڑھ، جزیرے پیار کے، کیبرے ڈانسر اور میں ساری کی ساری تمھاری

بھی انسانی زندگی سے وابستہ مسائل کی عکاسی کرتی ہیں۔

الغرض 'ریزہ ریزہ حیات' میں انسانی زندگی کے گونا گوں مسائل کو فنی محاسن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اغلاط سے پاک وصاف معیاری کاغذ اور خوبصورت گیٹ اَپ میں یہ کتاب میزان پبلشرز سرینگر نے شائع کی ہے۔

☆☆☆☆☆

☆ مبصر: زنفر کھوکھر، ساج، تھنہ منڈی، راجوری؛ کتاب 'ریزہ ریزہ حیات'، ؛ اشاعت: ۲۰۱۱ء؛ ضخامت: ۱۲۸ صفحات، قیمت: ۲۰۰ روپے؛ ناشر: میزان پبلشرز، سرینگر، کشمیر؛ مطبوعہ سہ ماہی اسباق پونے، اکتوبر-دسمبر ۲۰۱۳ء؛ ص ۵-۱۵۳

==

معاصر ادبی کاوشوں پر ایک اور تنقیدی دستاویز

عصری تقاضے

مصنف: دیپک بُدکی؛ سن اشاعت ۲۰۱۳ء؛ قیمت ۴۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: میزان پبلشرز، بالمقابل فائر سروسز ہیڈکوارٹرس، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر

☆ وہ (دیپک بُدکی) مجموعی تبصرہ نہیں کرتے بلکہ تفصیلی تبصرہ نگاری میں یقین رکھتے ہیں اور کتاب کا عرق نکال کر رکھ دیتے ہیں اور آخر میں اپنی رائے بھی دے جاتے ہیں اور کتاب کی وقعت اور اہمیت پر روشنی ڈال دیتے ہیں اور فن کار کی حوصلہ افزائی بھی کرنا نہیں بھولتے۔

(ڈاکٹر انوار احمد انصاری؛ پرواز ادب، جلد نمبر ۳۵، شمارہ ۱۰-۹)

☆ دیپک بُدکی کے یہ تبصرے اور مضامین پڑھ کر یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کے اندر ایک اچھا نقاد چھپا ہوا ہے۔ **(ڈاکٹر سیفی سرونجی، ایڈیٹر انتساب، سرونج)**

☆ اس کتاب میں شامل تبصروں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی رسمی اور سرسری نوعیت کے تبصرے نہیں ہیں بلکہ اکثر تبصرے ایسے ہیں کہ جس میں کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے تسلی بخش بحث کی گئی ہے۔ **(امیر حمزہ؛ ہفت روزہ 'ہماری زبان'، ۱۴-۸ مئی ۲۰۱۴ء)**

'ریزہ ریزہ حیات' - برہنہ سچائیوں کا درپن

--ڈاکٹر ذکی طارق

افسانوں کی دنیا میں چند لوگ ہی ایسے ہیں جن کے افسانوں پر وقت کی گرد اور زمانے کی تبدیلی اثر انداز نہیں ہوگی۔ ایسے افسانے اپنی تخلیق کے ایک صدی کے بعد بھی پڑھے جائیں گے تو تازہ دم محسوس ہوں گے بالکل غالبؔ کی غزلیات کی طرح جس پر وقت اور حالات کے بدلنے کے باوجود کوئی گرد نہیں جمی۔ ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب کوئی بات خیر و شر کے اس بنیادی مسئلے سے جڑی ہوتی ہے جو اس دنیا کی ابتداء سے آج تک بعینہٖ قائم ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دیپک بدکی کے افسانے صرف ہندوستان ہی میں نہیں، پاکستان میں بھی اسی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔

دیپک بدکی اگرچہ سرکاری ملازمت میں رہے لیکن ان کا قلم سرکاری گرفت سے ہمیشہ آزاد رہا۔ اس پر کسی مصلحت یا جبر کا تاثر قائم نہیں ہوا۔ 'ریزہ ریزہ حیات' دیپک بدکی کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں تقریباً اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ اس سے پیشتر 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' اردو زبان میں جبکہ 'ادھورے چہرے' اور 'چنار کے پنجے' اردو اور ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔

زیر نظر مجموعے میں شامل افسانوں کے عنوانات بذات خود قاری کی توجہ ملتفت کرنے کے لیے کافی ہیں جیسے 'ڈاکٹر آنٹی'، 'بدھ کی مسکراہٹ'، 'دس انچ زمین'، 'یادوں کی مہک'، 'سرابوں کا سفر'، 'کبھی ہم سے سنا ہوتا'، 'ریزہ ریزہ حیات'، 'درد کا جنگل'، 'وفا کی خوشبو'، 'لمحوں نے خطا کی ہے'، 'لذتِ خلوت'، 'ٹھنڈی آگ'، 'اندھے خوابوں کا عذاب'، 'پروٹوکول'، 'افلاس کا کوڑھ'، 'جزیرے پیار کے'، 'کیبرے ڈانسر' اور 'میں ساری کی ساری تمھاری'۔ یہ ایسے عنوانات ہیں جن میں قاری کے لیے تجسس موجود ہے۔ دیپک بدکی کے افسانے پہلے ہی ہندو پاک کے مقتدر ادبی جرائد میں شائع ہو کر اہل نظر کو متوجہ کر چکے ہیں۔ جن میں پاکستان کے اظہر جاوید، پروفیسر انور سدید، گلزار جاوید، سلطانہ مہر، صدیقہ بیگم، فرخ صابری، آغا گل، اور

طفیل اختر کے نام قابل ذکر ہیں۔ان لوگوں نے تحریری طور پر اپنی بے لاگ آراء سے سرفراز کیا ہے۔ ہندوستان کے اہل نظر حضرات میں وارث علوی، ہرچرن چاؤلہ،نورشاہ،شہاب عنایت ملک،فرید پربتی، انورظہیرانصاری، پریمی رومانی،،ظفراقبال ظفر،انیس رفیع،سیفی سرونجی،نذیرفتح پوری اورسیدہ نسرین نقاش کا نام خاص طور پرلیا جاسکتا ہے۔ان تمام اہل نظر قلم کاروں میں کچھ لوگ تو خود افسانہ نگار ہیں اور کچھ اہم تنقید نگار۔ان سب کی آراء 'ورق ورق آئینہ-دیپک بُدکی،شخصیت اورفن' میں کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔

انسان کی کمزوریوں اوراورخودنمائی کے جذبات کے علاوہ موجودہ معاشرے کے ہرکمزور پہلو پر دیپک بدکی کی نظر ہے۔'دس انچ زمین' دو پڑوسیوں کے مکانوں کے درمیان کا ٹکڑا ہے جس پر دونوں اپنے اپنے اڑیل رویوں کے سبب دشمن بن گئے۔اس افسانے کو تصور کا شاخسانہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ایسے تنازعے ہماری زندگی میں جگہ بہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس افسانے کی آخری سطر میں فاضل افسانہ نگار نے بھرپور چٹکی لی ہے۔

''دومکانوں کے درمیان دس انچ کی یہ گیپ آج تک اسی جگہ قائم ودائم ہے۔ایسا لگتا ہے کہ یہ شگاف دونوں پڑوسیوں پرخندہ زن ہے۔'' (ریزہ ریزہ حیات۔ص۲۹)

یہ دو جملے جہاں آج کے معاشرے پر لطیف طنز میں ڈوبے ہوئے ہیں وہیں نصیحت آموز بھی ہیں۔اہل نظر کے سامنے ہرمخاطب کی لفظیات سے اس کے مزاج اور علم کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔'ریزہ ریزہ حیات' میں حرف اوّل کے تحت جومختصر تعارف اپنے اوراپنے افسانوں کے بارے میں تحریر کیا ہے اس مختصر سے تعارف سے دیپک بدکی کی مثبت فکر کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

''سنا ہے انگریزوں نے چینیوں کوناکارہ محتاج بنانے کے لیے افیم کی عادت ڈال دی تھی۔آج افیم پلانے کی کئی اورصورتیں سامنے آئی ہیں۔کروڑوں غریب لوگ اپنے خون پسینے کی کمائی کرکٹ میچوں کی ٹکٹیں خریدنے یا پھرریئلیٹی شوز کوایس ایم ایس بھیجنے پرصرف کرتے ہیں۔ان کی جیبیں خالی ہوجاتی ہیں جب کہ کرکٹ کھلاڑیوں اورریئلیٹی شوز کے منتظمین کی تجوریاں کروڑوں روپے سے بھرجاتی ہیں۔غریب کسان بھوک

مری اور قرضے کی تاب نہ لاکر خودکشی پر مجبور ہو جاتے ہیں جب کہ سرمایہ داروں کے
لیے ہر سال بجٹ میں رعایتوں پر رعائتیں دی جاتی ہیں۔

(حرف اوّل۔ریزہ ریزہ حیات، دیپک بدکی)

اس مختصر سے اقتباس سے دیپک بدکی کے مزاج اور اندازِ فکر پر بھر پور روشنی پڑتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانے موجودہ رویوں اور معاشرے کی برہنہ سچائیوں کا احاطہ کرنے میں نڈر اور بے باک حقیقت کا مظہر ہیں۔ دیپک بُدکی کے افسانوں کی یہی نو بہ نو سچائی ہر ملک کے اہل نظر کو متوجہ کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

☆ مبصر: ڈاکٹر ذکی طارق، ۵۶۴، کیلا روڈ، گئوشالا پھاٹک، غازی آباد؛ کتاب 'ریزہ ریزہ حیات'؛ ضخامت: ۱۲۸ صفحات؛ قیمت: ۲۰۰ روپے، ناشر میزان پبلشرز، سرینگر، کشمیر؛ مطبوعہ ہفت روزہ ہماری زبان، نئی دہلی، ۲۱-۱۵ جولائی ۲۰۱۲ء؛ ص ۶

==

افسانوں کا مجموعہ 'ریزہ ریزہ حیات'۔تبصرہ

--رشید انجم

تین افسانوی مجموعوں 'ادھورے چہرے'، 'چنار کے پنجے'، اور 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، تین تنقیدی مضامین وتبصروں پر مبنی کتابوں 'عصری تحریریں'، عصری شعور' اور 'عصری تقاضے' کے علاوہ ہندی میں ترجمہ شدہ دو کہانی مجموعوں کے خالق دیپک بدکی صاحب کا تازہ اور چوتھا افسانوی مجموعہ 'ریزہ ریزہ حیات' میرے زیر مطالعہ ہے۔ اس مجموعے میں کل ۱۸/افسانے شامل ہیں۔ان افسانوں میں جو واقعات کردار نگاری کے توسط سے بیان ہوئے ہیں ان میں فاضل افسانہ نگار کبھی پس منظر اور کبھی پیش منظر سے جلوہ گر رہے ہیں اور یہی ان افسانوں کی خوبی ہے، حسن ہے اور سادگی سے معمور مگر توانا بیانیہ ہے جو افسانوں کو بغیر پیچیدہ بنائے لفظ لفظ قربتوں کا تخلیقی وصف دیتا ہے۔دیپک بدکی صاحب محض افسانہ نویس نہیں ہیں، اردو ادب کے مطالب ومفاہیم، کلاسیکی نظم وضبط اور اصناف کی سوغات کا ضابطۂ اخلاق ان کے وجود میں مبشرانہ شان سے پناہ گزیں رہا ہے۔افسانوں کے توسط سے دیپک بدکی صاحب بنی نوع انسان کے نظام حیات کے اس حسن کو بیان کرنے کے ہنر سے واقف ہیں کہ جیسے غالبؔ کے شعر کا صحیح اور دلآویز مفہوم استاد ذوق کی نگاہ نے بیان کیا تھا اور تاریخ ادب گواہ ہے کہ پریم چند کی حق پرست بیباکی کو محور بنا کر کرشن چندر، منٹو، بیدی اور دیگر افسانہ نویسوں نے بہت اعتدال مگر تخلیقی تزئین کے ساتھ کہانی کی ترسیل کی آسانیاں فراہم کیں۔موجودہ عہد میں کہانی نویسوں کا قافلہ حالات ومعاملات کے کوہ ودمن کے سلسلے کو سرفرازانہ تنظیم کے ساتھ عبور کر رہا ہے اور کہانی نویس اپنے فن کی شدت کو توصیفی معنی دینے کے ہنر میں مصروف ہیں۔ان میں ایک نام دیپک بُدکی کا بھی ہے۔مصور اور کہانی کار میں ایک بے حد مانوس سا رشتہ ہوتا ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ مصوری کے رنگ جب انگ انگ میں اتر کر نقوش کو احساس جمال دیتے ہیں تو کائنات صدا دے اٹھتی ہے۔اور حسن فطرت کی تقدیس، آرائش حیات کی گفتار بن جاتی ہے اور کاغذ کی

سفید جلد پر تخلیقی مناظر جسم وروح کی رفاقت سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ دیپک بدکی صاحب بھی ایسے ہی سرفرازِ فن مصور ہیں جو الفاظ کی بندشوں سے کسی کہانی کو زبان دیتے ہیں تو مونالیزا کی الوہی مسکراہٹ بھی چونک اٹھتی ہے۔

'ریزہ ریزہ حیات' کا عنوان تو ابہام کا مفہوم بیان کرتا ہے مگر اس میں شامل افسانے زندگی کا عکس ہیں۔ ان میں فضا کا شور نہیں ہے۔ انسان جذبات کی خود کلامی ہے اور معاشرتی مسائل کی بازگشت بھی۔ ان کی کہانیاں مبالغہ کا جب نقاب اُلٹتی ہیں تو انسانیت کے کھردرے نقوش واضح ہو جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ غم کا اظہار اور زخموں کی نمائش سے لطیف احساسات کی رفتار مدھم پڑ جاتی ہے۔ ان افسانوں میں وہ چاہے 'ڈاکٹر آنٹی' ہو یا 'بدھ کی مسکراہٹ' 'دس انچ زمین' ہو یا 'یادوں کی مہک'، 'سرابوں کا سفر'، 'کبھی ہم سے سنا ہوتا'، 'ریزہ ریزہ حیات'، 'درد کا جنگل' سے لے کر آخری افسانہ 'میں ساری کی ساری تمھاری' ہو، ہر کہانی میں ایک آرگنائزڈ فارم ہے جو روحانی ناداری کو پرفیکشن دے کر ذہن کی اساسی فکر کی نمائندگی کرتا ہے اور یہی پرفیکشن دیپک بدکی صاحب کو نہ صرف کامیاب افسانہ نگار بناتا ہے بلکہ وہ دیپک بدکی صاحب کے تخلیقی شعور و عمل کی بھی پیروی کرتا ہے۔ 'ریزہ ریزہ حیات' کے افسانے پڑھ کر قاری دیپک بدکی صاحب کے شخصی تناظر سے بھی متعارف ہوگا اور اس بات سے بھی کہ کہانی کو جس اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان افسانوں میں موجود ہے۔

☆☆☆☆☆

☆ تبصرہ نگار: رشید انجم، بھوپال؛ کتاب 'ریزہ ریزہ حیات' (افسانوں کا مجموعہ)، مصنف: دیپک بدکی؛ سن اشاعت جنوری ۲۰۱۱ء؛ قیمت ۲۰۰ روپے؛ ضخامت ۱۲۸ صفحات؛ ناشر: میزان پبلشرز، سری نگر، کشمیر، مطبوعہ: ماہنامہ صدائے اردو، بھوپال، اگست ۲۰۱۱ء ص ۱۵

ریزہ ریزہ حیات (افسانوں کا مجموعہ)۔تبصرہ

--ہفت روزہ سیرت، ممبئی

مشہور افسانہ نگار دیپک بُدکی کا افسانوی مجموعہ 'ریزہ ریزہ حیات' ڈاک سے موصول ہوا۔ موصوف نے 'حرف اوّل' کے تحت لکھا ہے 'کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں کہانیاں کیوں لکھتا ہوں، کیا فرق پڑتا ہے ان کہانیوں سے؟ پریم چند نے اپنی پوری زندگی سماج سدھار کے لیے وقف کی تھی، بال وواہ، بیواؤں کی از سرنو شادی، مہاجنی تہذیب، توہم پرستی، طبقاتی اونچ نیچ، اور مذہبی تعصب کے خلاف اس نے عمر بھر اپنا قلم اٹھایا مگر آج ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی ہمارے معاشرے میں یہ بدعتیں ترویج پا رہی ہیں اور ہمارے رہنما مصلحتاً ان کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ مذہبی کٹر پرستی تقلیب ماہیت کر کے دہشت گردی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ آدمی کو صبح گھر سے نکلتے وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ شام کو آئے گا بھی یا نہیں۔''

'ریزہ ریزہ حیات' میں شامل افسانوں کے ٹائٹل ہیں: ڈاکٹر آنٹی، بدھ کی مسکراہٹ، دس انچ زمین، یادوں کی مہک، سرابوں کا سفر، کبھی ہم سے سنا ہوتا، ریزہ ریزہ حیات، درد کا جنگل، وفا کی خوشبو، لمحوں نے خطا کی ہے، لذتِ خلوت، ٹھنڈی آگ، اندھے خوابوں کا عذاب، پروٹوکول، افلاس کا کوڑھ، جزیرے پیار کے، کیبرے ڈانسر، اور میں ساری کی ساری تمھاری۔

دیپک بُدکی کی دیگر تصانیف کے نام ہیں ادھورے چہرے (افسانوی مجموعہ)، چنار کے پنجے (افسانوی مجموعہ)، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (افسانوی مجموعہ)، عصری تحریریں (تنقیدی مضامین و تبصرے)، عصری شعور (تنقیدی مضامین وتبصرے) اور عصری تقاضے (تنقیدی مضامین وتبصرے)۔ ہندی میں ان کی دو کتابیں آچکی ہیں، ادھورے چہرے اور چنار کے پنجے اور یہ دونوں کہانیوں کے مجموعے ہیں۔

دیپک بُدکی پر پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی، اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے 'ورق ورق آئینہ- دیپک بدکی، شخصیت اور فن' نامی کتاب لکھی ہے۔

جاوید اقبال نے 'دیپک بدکی کی افسانہ نگاری' پر جموں یونیورسٹی سے ایم فل کیا ہے اور یہ مقالہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

'ریزہ ریزہ حیات' میزان پبلشرز (Meezan Publishers, Opp Fire & Emergency Services Hqrs, Batmaloo, Srinagar Kashmir-9) نے شائع کیا ہے اور اس کی قیمت دو سو روپے ہے۔

☆☆☆☆☆

☆ تبصرہ؛ ریزہ ریزہ حیات، مصنف دیپک بدکی؛ مطبوعہ: ہفت روزہ سیرت، ممبئی جمعرات؛ ۱۵ تا ۲۱ رنومبر ۲۰۱۲ء، ص ۶

==

افسانوں کا مجموعہ 'روح کا کرب' - تجزیاتی مطالعہ

--ڈاکٹر ذکی طارق

قصہ گوئی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ہی قصہ سے اس کی آشنائی ہونے لگتی ہے۔ جیسے جیسے وہ شعور کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے سماجی منظرنامے کو اس قصہ گوئی کے ذریعے ہی، جس کو وہ بچپن سے سنتا چلا آرہا ہے، سمجھنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ دھیرے دھیرے مکمل شعور حاصل ہوجانے پر اپنے ان طویل اور ارتقائی تجربات کو مزید جلاّ بخشتے ہوئے الفاظ کے ذریعے نئی توانائی اور حرارت عطا کرتا رہتا ہے۔

دیپک بُدکی اردو افسانے کا ایک معروف نام ہے جنھوں نے افسانے کی آبیاری میں اپنی عمر کا ایک طویل حصہ افسانے کے نصب العین کی نشان دہی کرنے میں گزارا ہے۔ اب تک ان کے پانچ افسانوں کے مجموعے منظرعام پر آکر اہلِ نظر ہی سے نہیں، افسانے کے سنجیدہ قارئین سے بھی مکالمہ کر چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے قاری کے دماغ میں سماج کے مثبت اور منفی پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور ان پہلوؤں پر جب قاری غور کرتا ہے تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں۔ اس کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ افسانے کا تانا بانا ہماری زندگی کے اردگرد سے ہی بنا گیا ہے اور افسانے میں شامل یہ تمام واقعات ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہی مصنف نے اکٹھا کر کے سماج کو آئینہ دکھانے کا کام کیا ہے۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے ان دردناک مناظر اور غمناک حالات و کیفیات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جو امیر اور غریب کے درمیان ایک خلیج پیدا کر رہی ہیں۔ انسان کا داخلی کرب بڑھتا جارہا ہے۔ خواہشیں، آرزوئیں اور تمنائیں گھنا رہی ہیں۔ ان سب کو دیکھ کر دیپک بُدکی کا قلم خون کے آنسو روتا ہے اور خود مصنف سماج کے ایک باوقار شخصیت ہونے کے ناتے نہ صرف ان کو محسوس کرتے ہیں بلکہ بڑی فن کاری اور چابک دستی سے افسانے کے خدوخال کو ابھارنے اور نکھارنے کا کام بھی

کرتے ہیں۔ خوبصورت اور لطیف طنزیہ جملے ان کے اسلوب کو مزید دلکش حسن لازوال عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔

'روح کا کرب' کا پہلا افسانہ 'ٹکڑوں میں بٹی زندگی میں' مصنف نے دنیا کی بوالعجبیوں اور نیرنگیوں کا مطالعہ بڑے معنی خیز اور اثر انگیز انداز میں کیا ہے۔ اس میں سماج کے نچلے اور پسماندہ طبقے کے استحصال کی حقیقت سامنے آئی ہے کہ آج بھی ترقی یافتہ سماج میں ذات برادری اور اونچ نیچ کا زہر ذہن میں کس طرح سرایت کر رہا ہے۔ 'کاگ پورنیما' ایک خوبصورت افسانہ ہے جس کے ذریعے نقل مکانی، ہجرت کا کرب اور جڑوں کی تلاش کے ساتھ ساتھ خوبصورت ماضی کی بازیافت کرنے کی ایک عمدہ کوشش ہے۔ 'جھوٹا سچ' میں بھی مصنف نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ سلیم احمد کے جھوٹ کو سچائی کا لبادہ پہناتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس موقعے پر راقم الحروف کو اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

جھوٹ اگر سچ کے ہی انداز میں بولا جائے
کوئی جھگڑا، کوئی جھنجھٹ نہیں ہونے دیتا

سلیم احمد پورے افسانے میں ایک اہم کردار ہے جو اپنی پوری زندگی میں اس اعتماد سے جھوٹ بولتا ہے کہ خود کو دھوکے میں ڈالے رکھتا ہے اور جس کے نتائج آخر میں اتنے خراب ہو جاتے ہیں کہ اس کو اپنے بچوں سے بھی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ افسانہ 'ترُ نذ' ایک طرف والدہ کی موت کے بعد والد کو جہاں تنہائی کا آسیب ڈس رہا ہے وہیں بچوں کا بے سروسامانی میں پرورش پانا گھر میں اچانک 'ترُ نذ' کا آ جانا فرضی آسیب کے تصور سے بچوں کا خوفزدہ ہو کر چیخنا پکارنا اور پڑوسیوں کے ذریعے ان کی مدد کرنا، جہاں پڑوسیوں کے حقوق پر روشنی ڈالتا ہے وہیں اختتامیہ کمزور ہے۔ والد کا گھر نہ آنا اور بچوں کا طویل انتظار کرتے ہوئے پڑوسیوں کے گھر میں سو جانا سمجھ سے بالاتر ہے جو قاری کے ذہن میں ایک تشنگی کا احساس جگاتا ہے۔

'ڈاگ ہاؤس' اس مجموعے کا دل دہلانے والے افسانہ ہے جو خود اپنی اولاد کے بدلتے رویوں اور سفید خون ہونے کے سبب بوڑھے شخص کی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ 'زندگی سوچ کر اداس ہو گیا میں' میں شکنتلا کو جہاں اولاد نہ ہونے کا غم کچوکے لگا رہا ہے وہیں رنجنا کا ایک سوتیلی ماں کی طرح برتاؤ کرنا سماج

کی حقیقت بیان کر رہا ہے۔ 'بے نسب ورثے کا وجود' جگولوز (Gigolos) کی ایسی کہانی ہے جس میں ممبئی کے شب و روز میں انسان کس طرح گمراہ ہوتا ہے اور خود ہی اپنی زندگی تباہ کرنے کے بعد اپنے وطن واپس لوٹ کر اور زندگی سے مایوس ہو کر موت کا طلبگار بن جاتا ہے۔ سیموئل اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ اسی طرح 'الم آشنا دل' میں خود غرضی کے سبب کس طرح ایک بھرے پُرے خاندان کا شیرازہ بکھرتا ہے اور سگے بھائیوں کے درمیان دیوار کھنچ جاتی ہے، بڑا دلدوز اظہار یہ ہے۔ لیکن اصغر کی انسان دوستی بھائیوں سے محبت اور خاندان کو ایک رکھنے کا جذبہ بڑے بھائی کی تیمارداری بھی کراتا ہے اور خاندان کو دوبارہ ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کرتا ہے جو حضرت یوسفؑ کی یاد دلاتا ہے۔ 'بستے کا بوجھ' ایک ایسی کہانی ہے جو معصوم بچوں کے کاندھوں کو ہی زخمی نہیں کرتا بلکہ ان کے ذہنوں کو بھی ماؤف کر ڈالتا ہے۔ کہانی میں مصنف نے بڑی سچائی سے کام لیتے ہوئے تعلیمی نظام کی حقیقتوں کو بیان کیا ہے۔ سچائی یہی ہے کہ آنے والے کل میں ان معصوموں کو کن چیزوں سے واسطہ پڑنا ہے، کن ممالک میں یہ جائیں گے اور وہاں جا کر انھیں کیا کرنا ہے، کس زبان کس معاشرے سے ان کا تعلق ہوگا، یہ بچہ تو جانتا ہی نہیں ہے۔ کس تعلیمی نظام کی ان معصوموں کو مستقبل میں ضرورت پڑے گی ان سب چیزوں پر نہ والدین سوچتے ہیں اور نہ ہی سرکار کے وہ نمائندے باوجودیکہ اس نظام تعلیم پر کروڑہا روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک میں تو خاص طور پر گزشتہ بیس برسوں کا لیکھا جوکھا سامنے رکھ کر پالیسیاں بنائی جاتی ہیں۔ جیسے حال ہی میں ہمارے تعلیمی نظام میں جرمن زبان کو غیر ملکی کہہ کر نصاب سے ہٹا دیا گیا اور اس کی جگہ مذہبی جنون کے تحت غیر مروج سنسکرت زبان نصاب میں شامل کر دی گئی۔ بُد کی صاحب نے نصاب کے اس موضوع پر اس افسانے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے شایستہ کے ذریعے اس درد کا اظہار کیا ہے کہ جرمنی پہنچنے کے بعد اس کو دوبارہ تعلیم حاصل کرنا پڑی اور وہاں گزر اوقات کے لیے شام کو ریستوران میں بیرے کا کام کرنا پڑا۔ کہانی میں شایستہ کی پاکستانی باشندے کاشف سے ملاقات ہونا اور پھر اس کے ہمراہ نکاح کر اپنا گھر بسا لینا جہاں ایک خوبصورت موڑ ہے وہیں شایستہ کی والدہ نائیلہ اور والد کا بڑھاپے میں تنہا رہ جانا اور ان کا خدا سے دعا کرنا کہ اگر ہم نے کوئی بھی کارِ ثواب کیا ہو تو اس کے صدقے میں دونوں کو ایک ساتھ بلا لینا، سماج کی ایک بہت سچی حقیقت کا غماز ہے۔

'حسرتوں کا مدفن' رجنی اور اس کے شوہر کی ایسی داستان ہے جس میں رجنی زیادہ آسائشوں کی تلاش میں اپنے شوہر کو وطن چھوڑ کر دیارِ غیر میں بسنے کے لیے مجبور کرتی ہے جہاں اس کا شوہر عیاشیوں کی حدود پار کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیتا ہے اور رجنی کو دنیا سے برسرِ پیکار رہنے کے لیے تنہا چھوڑ جاتا ہے۔ رجنی کا شوہر اپنی جائیداد اور اپنے اثاثے کو غربا کے لیے وقف کر کے ایک طرف جہاں رجنی کی خودغرضی کا انتقام لیتا ہے وہیں اس کی انسان دوستی اور سکول کے بچوں سے اس کی والہانہ محبت کا پتا چلتا ہے۔ افسانہ 'پراویڈنٹ فنڈ' کی وساطت سے مزدوروں کے مسائل حل کرانے کے نام پر یونین لیڈروں کا افسران پر دباؤ بنا کر جائز اور ناجائز کام کرانا اپنے ہی ساتھیوں سے رشوتیں لے کر ان کا استحصال کرنا ایسے کارنامے ہیں جن کو کسی بھی مہذب سماج میں شاید اچھا نہ کہا جاتا ہو۔ دیپک بُدکی نے اس افسانے میں اسی مہذب سماج کو آئینہ دکھایا ہے۔ 'یونین لیڈر' میں بھی کم و بیش اسی طرح کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ موتی لال کا کردار اس کے کام کرنے کا طریقۂ کار افسران سے اپنے ذاتی مفاد کے لیے سمجھوتا اور آخر میں گھر کی تنہائی موتی لال کے لیے سوہانِ روح ثابت ہوتی ہے، ایک ایسا بیانیہ ہے جو دفاتر کے ملازمین اور ان کی نمائندگی کرنے والے یونین لیڈروں کے منفی اثرات کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

ان افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیپک بُدکی صاحب نے اپنے وسیع تجربوں اور عمیق مشاہدوں کی روشنی میں سماجی صورتِ حال کا تجزیہ اس خوبصورتی اور فن کاری سے کیا ہے کہ موضوع کا اجلاپن کہیں بھی دھندلاہٹوں میں تبدیل نہیں ہو پاتا ہے اور ابتدا سے آخر تک قاری کی دلچسپی تجسس میں رہتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆
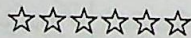
☆ تبصرہ نگار: ڈاکٹر ذکی طارق، ۵۶۴، کیلا روڈ، گؤشالہ پھاٹک، غازی آباد-۲۰۱۰۰۹؛ کتاب 'روح کا کرب' مصنف، دیپک بُدکی، سن اشاعت: ۲۰۱۵ء؛ قیمت: ۳۰۰/روپے؛ ناشر: میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، سرینگر، کشمیر-۱۹۰۰۰۹

عصری شعور (تنقیدی مضامین وتبصرے)

--محمد خالد عابدی

دیپک بُدکی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے مبصر بھی ہیں۔ دیپک بُدکی نے افسانے لکھتے لکھتے تبصرہ نگاری کیوں اختیار کی؟ جواب یہ ہے کہ وہ موصولہ کتابوں پر اظہار خیال ضروری سمجھتے ہیں اور اس شدید جذبے اور اظہار کے ابلاغ کے تقاضوں نے انھیں مبصر بنا دیا۔

دیپک بُدکی کی شخصیت میں ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ ایک دردمند دل رکھتے ہیں، دوسروں کے تئیں ہمدردی کا جذبہ ان کے مزاج کا لازمی عنصر معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے محسوس کیا کہ بعض مصنفین کو بڑے ناقد اور مبصر مل جاتے ہیں جو اثر ورسوخ کی بنا پر ان کی کتابوں پر اچھے تبصرے اور مضمون لکھتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے مصنفین بھی ہیں جو عرصے سے لکھ رہے ہیں لیکن نہ تو ان پر کچھ لکھا گیا اور نہ ان کی تصانیف پر اظہار خیال کیا گیا۔ چنانچہ دیپک بدکی نے کافی حد تک اس بے اعتنائی پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھیں اس توجہ پر خاص پذیرائی بھی حاصل ہو رہی ہے۔

دیپک بُدکی کو وقتاً فوقتاً جو کتب موصول ہوئی ہیں انھوں نے تمام موصولہ کتب پر تبصرہ اور مضمون لکھے ہیں۔ وہ یہ خدمات عرصے سے انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے متعدد کتب پر تبصرے اور مضامین رقم کیے ہیں۔ چنانچہ اس تعداد کا تقاضہ تھا کہ وہ کتابی صورت میں بھی منظر عام پر آئیں۔ ان کی تحریر کردہ تبصروں اور مضامین کا پہلا مجموعہ 'عصری تحریریں' ہے اور بعدہ 'عصری شعور' دوسرا مجموعہ آیا ہے جس میں بھی تبصرے اور مضامین شامل ہیں۔

دیپک بُدکی ہر اس کتاب اور مصنف کی قدر کرتے ہیں جس نے بڑے جتن سے کتاب شائع کی ہے نیز وہ کتاب اور مصنف کی جہد کو دیکھتے ہوئے تبصرہ مضمون لکھتے ہیں۔

'عصری شعور' آٹھ فصول اور ابواب میں منقسم ہے۔ فصل اول، مضامین کے لیے مختص ہے جس

میں سولہ تصانیف و تالیفات پر انھوں نے مضامین لکھے ہیں۔ فصل دوم 'جائزے'، فصل سوم 'تبصرے' کے لیے وقف ہے۔ شاعری، افسانہ، ناول، تنقید و تحقیق اور متفرقات نثر (ڈائری، سفرنامے، انٹرویو اور لطائف) کو انھوں نے اپنے اظہار خیال کے لیے بھی منتخب کیا ہے۔

کتابوں پر تبصرے اور مضامین کے لیے انھوں نے اپنا وضع کردہ ایک پیمانہ متعین کیا ہے کہ وہ اپنے ہم عصر شعراء و ادباء کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں۔ تبصرے میں وہ کسی قدر حیات و سوانح پر بھی بحث کرتے ہیں۔ وہ روایتی انداز کے تبصروں سے بھی گریز کرتے ہیں۔ نیز وہ کسی اثر یا دباؤ میں کتاب پر تبصرہ نہیں کرتے ہیں۔ وہ کسی اخبار یا رسالے کے پابند تبصرہ نگار نہیں ہیں کہ ایڈیٹر کی ہدایت کے مطابق تبصرہ ہو یا عجلت کے باعث رواروی میں مجوزہ کتاب پر تبصرہ کریں۔ انھوں نے تبصرہ نگاری اور مضامین نگاری میں یہ اجتہاد بھی پیدا کیا ہے کہ وہ جس کتاب کو تبصرے یا مضمون کی کسوٹی پر پرکھتے تو ضرورت پڑنے پر وہ کتاب کے مصنف و مؤلف سے مکالمہ یا انٹرویو کرتے ہیں۔ دیپک بُدکی کتاب پڑھ کر ہی تبصرہ کرتے ہیں جو تبصرہ نگاری کی روح ہے۔

'عصری شعور' میں تبصرے اور مضامین کی تعداد چھپن ہے۔ کتب کے موضوعات میں تنوع ہے۔ ہمہ قسم کے موضوعات پر انھوں نے اظہار خیال فرمایا ہے۔

دیپک بُدکی لائق ستائش ہیں کہ وہ اردو کے مصنفین و مؤلفین کی خواہشات کی قدر کرتے ہیں اور حتی الوسیع دستیاب کتاب پر پُر خلوص اظہار خیال فرماتے ہیں۔ وہ ان مصنفین کو ادب میں آئندہ بھی لکھتے رہنے کا شوق دلاتے ہیں کہ جو کتابیں تو شائع کر لیتے ہیں لیکن تبصرہ وغیرہ سے محروم رہتے ہیں۔ وہ ان مدیران کی طرح نہیں ہیں کہ برسوں کتابیں تبصرے کے انتظار میں پڑی رہیں اور کتابوں پر اٹی گردان کے وجود کو ختم کردے۔

دیپک بُدکی ہر اُس مصنف و مؤلف کے جذبے کی قدر کرتے ہیں کہ وہ کس تگ و دو میں کتاب شائع کر رہا ہے اور پھر تبصرے/مضمون کی خواہش سے ہم کنار ہوتا ہے لیکن اُسے بالعموم مایوسی ہوتی ہے۔ دیپک بُدکی اس ظلمت میں ایک کرن ہیں کہ وہ اپنی کتاب کی اشاعت اور اس پر کوئی تحریر دیکھ سکے۔

'عصری شعور' مجموعہ نہ صرف مطالعہ کی چیز ہے بلکہ یہ ان محققین و مورخین کے لیے بھی استفادہ

کی چیز ہے جو ببلیوگرافی اور اشاریہ سازی وغیرہ کی ضرورت بھی پوری کرتی ہے۔

'عصری شعور' کی قیمت تین سو روپئے (-/۳۰۰) ہے۔ کتاب ناشر میزان پبلشرز، بالمقابل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈکوارٹرس، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر ۱۹۰۰۰۹ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے مجموعی طور پر اس کتاب کی ایک جلد اس لائبریری میں ضروری ہے جہاں اردو سے محبت کرنے والے اور اردو زبان و ادب کے قاری ہیں نیز وہ لوگ جو نئی کتابوں کے اور نئے مصنفین سے باخبر ہونے کے شائق ہیں۔

☆☆☆☆☆
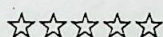
☆ مبصر: محمد خالد عابدی، بھوپال؛ کتاب: عصری شعور [تنقیدی مضامین و تبصرے]؛ مصنف دیپک بدکی؛ ضخامت: ۲۷۸ صفحات قیمت: ۳۰۰ روپے؛ ناشر: میزان پبلشرز، بالمقابل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈکوارٹرس، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر ۱۹۰۰۰۹؛ مطبوعہ: پندرہ روزہ صدائے اردو، بھوپال؛ جلد۹، شمارہ ۱۵-۱۴؛ ۱۵ فروری - ۱۵ مارچ ۲۰۱۰ء؛ ص ۱۵

==============================

عصری ادب کا آئینہ۔ 'عصری شعور'

۔۔ڈاکٹر انوار احمد انصاری

دیپک بُدکی جدید اردو افسانہ نگاری کے چوٹی کے فن کاروں میں شامل ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انتقادیات میں بھی کسی سے کم نہیں۔ ان کی تنقیدی نظر ہمیشہ نئے تخلیقی ادب پر رہتی ہے اور گمنام ادیبوں اور شاعروں کو متعارف کرا رہے ہیں۔ یہ ان کی بہت بڑی ادبی خدمت ہے۔ 'عصری شعور' سے قبل 'عصری تحریریں' بھی اسی قبیل کی ایک کتاب وہ تحریر کر چکے ہیں اور اسی سلسلے کی دوسری کڑی 'عصری شعور' کے عنوان سے یہ کتاب منظر عام پر آئی ہے جس میں ہم عصر فن کاروں پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ اس میں ۱۶ر مضامین شامل ہیں جن میں جموں و کشمیر میں اردو افسانہ، جموں و کشمیر کے افسانوی ادب میں قومی یکجہتی کے عناصر، شرون کمار ورما کی افسانہ نگاری، شبنم عشائی کی 'من بانی'، افسانہ نگار کیدار ناتھ شرما سے ایک مکالمہ، سماجی مسائل کا آئینہ دار بشیر مالیرکوٹلوی، ڈاکٹر انوار احمد کی مزاح نگاری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان مضامین کو موصوف نے اپنے خاص نقطۂ نظر سے ترازو میں تولنے کی سعی جمیلہ کی ہے۔

اس کتاب میں ۱۱ر افسانوی مجموعوں پر تبصرے شامل ہیں جن کے عنوان ہیں: چکر (جتیندر بلو)، اقرار نامہ (نعیم کوثر)، مٹی کے متوالے (گلزار جاوید)، ریزہ ریزہ دل (نذیر فتح پوری)، چھوٹی سے بات (صفیہ صدیقی)، اندھیرے کا کرب (مجیر احمد آزاد)، شہر تخیل (عرفانہ تزئین شبنم)، ضمیر اپنا اپنا (اندرا شبنم)، ہزاروں غم اور میٹھا زہر (ڈاکٹر مشتاق احمد وانی) اور لمحے (سالک جمیل براڑ)۔ اسی طرح ۶ر ناولوں پر تبصرے شامل ہیں۔ ناولوں کے نام ہیں انیسواں ادھیائے (نند کشور وکرم)، وشواس گھات (جتیندر بلو)، ایک ہزار دو راتیں (صلاح الدین پرویز)، آہنکار (نور الحسنین) ترشول (محمد ارمان حسین) اور مہربان جن (وکیل نجیب)۔ متفرقات [نثر] میں بند کمرے کی کھڑکی (نور شاہ)، آٹھ سفرنامے (قاضی مشتاق احمد)، براہ راست (گلزار جاوید) اور خوش کلامیاں قلم کاروں کی (کے ایک نارنگ ساقی)۔

شعری مجموعے اس طرح ہیں: بادباں سفیروں کے (رفیق شاہین)، سمندر سوچتا ہے (رئیس الدین رئیس)، شہر کی فصیلوں سے (نور منیری)، تیسرا دریا (رمیش تنہا)، روحیں چناب کی (سیدہ نسرین نقاش)، سوز دل (محمد خورشید اکرم سوز)، گلابوں کے چراغ (طہور منصوری نگاہ، مصباح (جمال اویسی)، سحر ہونے تک (سید احمد سحر شاہجہاں پوری) اور ماں (مناظر عاشق ہرگانوی/شاہد نعیم)۔ تنقیدی و تحقیقی کتب حسب ذیل ہیں: اردو ادب کے ہمہ جہت قلم کار (فراز حامدی)۔ ابراہیم اشک - نئے عہد کے گیت کار (ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)، سیفی سرونجی - شخصیت اور فن (محمد توفیق خاں)، نعتیہ شاعری میں ہیئتی تجربے (علیم صبا نویدی)، اردو دوہے، ایک تنقیدی جائزہ (ظہیر غازی پوری)، اردو ناول میں متوسط طبقہ کے مسائل (ڈاکٹر فرزانہ نسیم)، شعرائے پونہ - ایک تحقیق (نذیر فتح پوری) اور شمالی آرکاٹ میں اردو (ڈاکٹر جاویدہ حبیب)۔

دیپک بُدکی نے مندرجہ بالا کتب پر تبصرے ہی رقم نہیں کیے بلکہ فن کاروں کی شخصیتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس لیے ہم انھیں تذکروں میں بھی شامل کر سکتے ہیں۔ وہ حسبِ عادت بے لاگ مشورے بھی دیتے ہیں اور نکات اور معائب پیش کرتے ہیں اور ان کے تدارک کی سبیلیں بھی ساتھ ہی دیتے ہیں تاکہ مصنف کو نقاد سے کچھ پوچھنے کی گنجائش باقی نہ رہے اور وہ اپنی بھی اصلاح کر لے۔ اس لحاظ سے وہ کڑی اور تیکھی تنقید کے حامی ہیں اور بے جا تعریف کے بالکل خلاف۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا ان کے نظام فن کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ عصری ادب پر تحقیقی کام کرنے کے لیے ان کی یہ دو کتابیں بے حد معاون ثابت ہوں گی۔ اس طرح سے انھوں نے نئے تحقیق کاروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کا نیک کام کیا ہے اور اردو کے نمائندہ نقادوں کی فہرست میں بھی جگہ بنالی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اسی طرح بہتے ہوئے دریا کی مانند چلتے رہیں گے اور لوگ ان کی تحریروں سے فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ پیپر بیک کے ساتھ شائع ہوئی یہ کتاب عصری ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے بڑی ہی سودمند ہے۔ کمپوزنگ کی غلطیوں سے پاک یہ کتاب عمدہ کاغذ، طباعت اور ٹائٹل کے کھلے عام گواہی دے رہی ہے۔ یقیناً ادبی دنیا میں اس کتاب کی پذیرائی واستقبال کیا جائے گا۔ ☆☆☆

☆ ڈاکٹر انوار احمد انصاری؛ تبصرہ: عصری شعور؛ مطبوعہ: پرواز ادب، جلد ۳۱، شمارہ ۲-۱، جنوری - فروری ۲۰۱۰ء، ص ۸۷

تبصرہ

عصری تقاضے۔ چند تاثرات

--امین بنجارا

دیپک بدکی صاحب اردو دنیا کا ایک مقبول و معروف نام ہے اور اپنے افسانوی ادب کے طفیل انھوں نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ 'ادھورے چہرے'، 'چنار کے پنجے'، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' اور 'ریزہ ریزہ حیات' ان کے چار افسانوی مجموعے اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ 'ادھورے چہرے' اور 'چنار کے پنجے' دونوں مجموعے ہندی میں بھی چھپ چکے ہیں جن کی وجہ سے ان کے قارئین کا حلقہ کافی وسیع ہوا ہے۔ افسانہ نگار کے علاوہ ان کو محقق، ناقد اور مبصر کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ تنقیدی مضامین اور تبصروں پر مشتمل ان کی تین کتابیں 'عصری تحریریں'، عصری شعور' اور 'عصری تقاضے' منظر عام پر آ کر پذیرائی کا شرف حاصل کر چکی ہیں۔ یہاں ان کی آخر الذکر کتاب ہی میرے پیش نظر ہے لیکن اس کتاب کے حوالے سے چند جملے پیش کرنے سے قبل یہ بتانا لازم ہے کہ دیپک بُدکی کی شخصیت اور ان کے فن پر ایک کتاب بعنوان 'ورق ورق آئینہ' شائع ہو چکی ہے جسے میرے عزیز دوستوں شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی (مرحوم) اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے ترتیب دیا ہے۔ اس کے علاوہ جموں یونیورسٹی جاوید اقبال شاہ نامی ایک ریسرچ اسکالر کو 'دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری' پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے ایم فِل کی ڈگری تفویض کر چکی ہے۔

دیپک بُدکی کا تعلق ریاست جموں و کشمیر سے ہے لیکن ان دنوں وہ مستقل طور پر غازی آباد (یو پی) میں مقیم ہیں۔ گذشتہ ماہ وہ جموں تشریف لائے تو انھوں نے مجھے فون کر کے اپنی آمد کے بارے میں بتایا۔ میں ان کا دیدار کرنے کے لیے جب ان کی قیام گاہ پر پہنچا تو انھوں نے سب سے پہلے مجھے جن گراں مایہ تحائف سے نوازا وہ ان کی تین تصانیف لطیف تھیں جن میں ان کے دو افسانوں کے مجموعوں کے تازہ ایڈیشن تھے اور ایک تھی 'عصری تقاضے'، جس کا ذکر میں یہاں کر رہا ہوں۔ اس کتاب میں ان کے ستر

تفصیل سے نہ صرف گفتگو کی ہے بلکہ کتاب کی خوبی اور مصنف کے فن پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور فنی خوبیوں اور کمیوں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ دیپک بدکی نے دیباچے میں لکھا ہے۔

''تنقیدی مضامین وتبصروں پر مبنی ایک اور کتاب قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، اس سے پہلے دو ہزار چھ میں عصری تحریریں اور دو ہزار آٹھ میں عصری شعور منظر عام پر آئی تھیں، جن کی توقع سے کہیں زیادہ پذیرائی ہوئی، 'عصری تقاضے' بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ جیسا کہ عنوانات سے ظاہر ہے، ان تصانیف میں مصلحتاً دور حاضر کے قلم کاروں کی کاوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے تا کہ ان کے خیالات، محسوسات اور نظریات اردو کے قارئین تک پہنچ جائیں اور ان سے استفادہ کر پائیں۔''

۳۵۲ صفحات کی اس کتاب میں دیپک بدکی نے واقعی موجودہ دور کے تمام اہم قلم کاروں کی کتابوں کا تنقیدی جائزہ لے کر ایک بڑا کام کیا ہے اور ان سب مضامین وتبصروں کو کتابی شکل میں شائع کر کے ایک جگہ محفوظ کر دیا ہے تا کہ آئندہ کوئی بھی ریسرچ اسکالر کسی پر بھی کام کرے تو اسے آسانی سے ان کتابوں پر تبصرے یا مضامین مل سکیں، جن سے وہ استفادہ کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح دیپک بُدکی نے عصری تقاضے کو نہ صرف پورا کیا ہے بلکہ ایک بڑے غیر جانبدار نقاد ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے کہ بعض بڑے نقاد جن فنکاروں پر لکھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں، دیپک بدکی نے ان پر قلم اٹھا کر انھیں انصاف دلانے کی کوشش کی ہے اور وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ البتہ ان کی کتابوں پر لکھتے ہوئے وہ صحیح بات کہنے میں نہیں چوکے اور صاف طور پر ان کی کمیوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا اور کسی بھی شخصیت یا کتاب پر لکھتے ہوئے شخصیت پرستی یا تعریف وتوصیف کے پل نہیں باندھے بلکہ تخلیق کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا تجزیہ کیا۔

☆☆☆☆☆
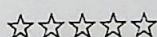
☆ مبصر: ڈاکٹر سیفی سرونجی، ایڈیٹر انتساب، سرونج؛ کتاب 'عصری تقاضے' (تنقیدی مضامین وتبصروں کا مجموعہ)، مصنف: دیپک بدکی؛ سن اشاعت ۲۰۱۳ء؛ ضخامت: ۳۵۲ صفحات، قیمت: ۴۵۰ روپے؛ ناشر: میزان پبلشرز، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر؛ مطبوعہ سہ ماہی انتساب عالمی سرونج، جلد ۲، شمارہ ۳، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء [پرانا نمبر شمار: ۳۳/۹۵]؛ ص ۲۳۳-۲۳۱

عصری تقاضے (تنقیدی مضامین و تبصرے)

--امیر حمزہ

دیپک بُدکی اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ان کے قلم نے صرف افسانہ نگاری ہی میں نہیں بلکہ تنقیدی میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں، وہ ایک اعلیٰ کتب شناس بھی ہیں۔ان کے تبصرے صرف ایک تبصرے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھے جاتے ہیں، 'عصری تقاضے انہی تبصروں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔

اردو میں تبصرہ نگاری کی کوئی مستحکم روایت نہیں ہے۔انگلیوں پر ان لوگوں کے نام گنے جاسکتے ہیں جنھوں نے شعوری طور پر تبصرہ نگاری کے فن کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔اس ضمن میں ظ۔انصاری کی 'کتاب شناسی'، کلام مہدی کی 'برملا'، شمس الرحمٰن فاروقی کی 'فاروقی کے تبصرے'، علیم صبا نویدی کی 'کتاب سے کتاب شناسی تک' کوثر مظہری کی 'بازدید اور تبصرے'، صفدر امام کی 'نئی پرانی کتابیں'، مظہر امام کی 'نگاہ طائرانہ' قابلِ ذکر ہیں۔اس ضمن میں دیپک بُدکی کی 'عصری تقاضے' ایک مضبوط کڑی ثابت ہوگی۔

'عصری تقاضے' کے شروع میں دس اہم تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں سے شروع کے دو مضامین میں اردو کے مسائل، حل اور مستقبل کے بارے میں بہت ہی تفصیل سے بحث کی گئی ہے، ہر جزوی مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور اس کا حل بھی پیش کیا گیا ہے اور اردو کی موجودہ صورت حال کے لیے ایک حد تک خود اردو داں طبقے کو ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔

دیپک بدکی کے مضامین میں تنقیدی نظر بہت اچھی پائی جاتی ہے۔ناول ہو یا افسانہ، شاعری ہو یا بچوں کا ادب سب میں ان کی نظر کی داد دینی پڑتی ہے۔ان کے مضامین میں موضوعاتی تنوع کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔انھوں نے ہر صنف کی کتابوں پر تبصرے لکھے ہیں۔تحقیق ہو یا

تنقید ہو یا شاعری، ناول وافسانہ ہو یا انشائیے، خاکے وڈرامے ہوں یا سوانح عمری، طنز ومزاح ہو یا شکار نامہ، ہر ایک پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس کتاب میں شامل تبصروں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی رسمی اور سرسری نوعیت کے تبصرے نہیں ہیں بلکہ اکثر تبصرے ایسے ہیں کہ جس میں کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے تسلی بخش بحث کی گئی ہے۔ کچھ تبصرے ایسے ہیں جو اپنی طوالت کی وجہ سے مضمون نظر آتے ہیں، جن میں 'فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا'، 'منٹو شناسی اور شکیل الرحمٰن'، 'نرم جھونکوں کی صدا'، 'خیال موسم'، 'لاوا' اور 'خونخوار تیندوے' وغیرہ ہیں۔ ان میں ایک تجزیاتی مضمون کا عکس بھی نظر آتا ہے۔

دیپک بدکی کی تبصرہ نگاری کا ایک مخصوص انداز ہے جس میں نہ ابہام ہے نہ اشکال البتہ کتاب کے حوالے سے وہ بے لاگ رائے کا اظہار کرتے ہیں اور نئے نئے گوشے بھی دریافت کرتے ہیں مثلاً محمد خالد عابدی کی کتاب 'ہماری فلمیں اور اردو' پر تبصرہ کرتے ہوئے دیپک بُدکی نے صاحب کتاب کے حوالے سے انکشاف کیا ہے کہ ''مولانا ابوالکلام آزاد نے نہ تو کسی فلم میں ہیرو کا رول ادا کیا ہے اور نہ انھوں نے کسی فلم کی ہدایت کاری کی اور نہ ہی وہ کبھی فلم ساز رہے۔''

'عصری تقاضے' کے حرف آغاز میں دیپک بدکی نے اگرچہ فن تبصرہ نگاری کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے لیکن انھوں نے اتنا ضرور لکھا ہے کہ ''اردو میں نہ تو شاعروں کی کمی ہے اور نہ ہی نثر نگاروں کی، نہ واعظوں کی کمی ہے اور نہ منافقوں کی، اگر کمی ہے تو سنجیدہ قارئین کی اور غیر جانبدار نقادوں کی جو تنقید کو محض روزی روٹی کا وسیلہ یا گروہی نظریات کا اشتہار نہ سمجھ کر ادب کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔'' اس وجہ سے انھوں نے اس فن کو بہت محتاط انداز میں برتا ہے اور فن تبصرہ نگاری میں اپنی ایک شناخت قائم کی ہے۔ ہر ایک تبصرے میں ان کا ایک اچھوتا انداز نظر آتا ہے۔ دیپک بُدکی زبان وبیان کے حرکات و سکنات سے بخوبی واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں زبان کا حسن بھی نظر آتا ہے اور بیان کی چاشنی بھی۔ دیپک بُدکی کی اس کتاب میں ساٹھ تبصرے ہیں امید ہے کہ یہ کتاب اچھی کتابوں کے متلاشی لوگوں کے لیے نشان راہ ثابت ہوگی اور علمی وادبی حلقوں میں شرف قبولیت سے سرفراز ہوگی۔ ☆☆☆

☆ مبصر: امیر حمزہ، ؛ 'عصری تقاضے [تنقیدی مضامین وتبصرے]' مصنف: دیپک بدکی ؛ اشاعت: ۲۰۱۳ء؛ ضخامت: ۳۵۲ صفحات؛ قیمت ۴۵۰/روپے، ناشر: میزان پبلشرز سرینگر؛ مطبوعہ: 'ہماری زبان' دہلی، جلد ۷۳، شمارہ ۱۸، ۱۴-۸ مئی ۱۴ء

عصری تقاضے (تنقیدی مضامین وتبصرے)

--ڈاکٹر انوار احمد انصاری

اردو ادب کے فروغ میں بلا امتیاز مذہب وملت سبھی فرقوں کے لوگوں نے حصہ ڈالا ہے۔ اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان کہنے والے بھاری غلطی کر رہے ہیں جب کہ اردو ادب میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں کا قابلِ قدر سرمایہ موجود ہے اور وہ اس زبان کی آبیاری کے لیے شب و روز مصروف ہیں۔ دیپک بُدکی ایک ایسی ہی شخصیت کا نام ہے جس نے اردو افسانہ میں قدم رکھا اور اس صنف کو عروج پر پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ان کے افسانے بین الاقوامی سطح پر پڑھے جاتے ہیں اور وہ خاطر خواہ داد وتحسین بھی پا رہے ہیں۔ جدید افسانہ ان کی پہچان ہے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے آ چکے ہیں (۱) ادھورے چہرے (۲) چنار کے پنجے (۳) زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (۴) ریزہ ریزہ حیات۔ ان کی افسانہ نگاری پر جموں یونیورسٹی، جموں وکشمیر نے ایم فل کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالہ بھی لکھوایا ہے۔ علاوہ ازیں کئی رسائل جیسے ماہنامہ 'شاعر' اور 'اسباق' نے ان پر گوشے اور خصوصی نمبر بھی شائع کیے ہیں۔

دیپک بُدکی نے اپنے آپ کو محض افسانہ تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ تنقید نگاری اور تبصرہ نگاری میں بھی انھوں نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ وہ بے شمار تنقیدی مضامین لکھ چکے ہیں اور سینکڑوں کتب پر تبصرے لکھ چکے ہیں جو مختلف النوع رسائل میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ تنقیدی مضامین اور تبصروں پر مبنی ان کی تین کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ (۱) عصری تحریریں، (۲) عصری شعور اور (۳) عصری تقاضے۔

زیر نظر کتاب 'عصری تقاضے' ان کی تازہ تصنیف ہے جس میں دس تنقیدی مضامین اور ساٹھ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ مضامین میں تین مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ موجودہ دور میں اردو کے مسائل اور ان کا حل، ریاست جموں وکشمیر میں اردو کا مستقبل اور اساطیر کی جمالیات اور شکیل الرحمٰن۔

'موجودہ دور میں اردو کے مسائل اور ان کا حل' دیپک بدکی کا لکھا ہوا بہت ہی اچھا مضمون ہے جس میں انھوں نے اردو زبان وادب کے آغاز وارتقاء کے ساتھ ساتھ تہذیبی رشتہ، رسم الخط اور اس کے مسائل کا گہرائی سے جائزہ لینے کے بعد چند نکات پیش کیے ہیں:

(۱) سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اردو کو ترقی پسند سوچ اور فکر ہمیشہ اپنانا چاہیے اور کسی تعصّباتی یا غیر فطری فکر و نظر سے گریز کرنا چاہیے۔

(۲) ہندستان اور پاکستان کے بیچ اردو کو قربانی کا بکرا بنانے کی بجائے باہمی اشتراک کی ضرورت ہے تا کہ ہندستان میں کاپی رائٹ شدہ کتابیں پاکستان میں اور پاکستان میں جملہ حقوق پائی کتابیں ہندستان میں جعلی طور پر نہ بیچی جاسکیں۔

(۳) اردو زبان وادب میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ دلوں کو جوڑ سکتی ہے اور پاکستان اور ہندستان کے درمیان پُل بنا سکتی ہے۔ برصغیر میں امن وآشتی لاسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مولوی عبدالحق اپنی جگہ صحیح ہوں، مگر میرا یہ ماننا ہے کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو دو ملکوں کو سیاسی طور پر نہ سہی مگر ثقافتی طور پر ایک بار پھر جوڑ سکتی ہے۔

اس طرح دیپک بدکی کی اردو کے ساتھ محبت اور ہمدردی ظاہر ہوتی ہے۔

دیپک بدکی نے مختلف اصناف سخن پر تبصرے رقم کیے ہیں جن میں مثنویات، شعری مجموعے، منی افسانے، ڈرامے، ناول، سوانح عمری، طنز ومزاح، انشائیے اور خاکے، شکارنامے، تنقید وتحقیق شامل ہیں۔ موصوف کی تمام اصناف پر گرفت ہے اور وہ بے لاگ اور بے لوث تبصرے لکھتے ہیں خواہ کسی ادیب وشاعر کو ناگوار بھی گزر جائے۔ وہ مجموعی تبصرہ نہیں کرتے بلکہ تفصیلی تبصرہ نگاری میں یقین رکھتے ہیں اور کتاب کا عرق نکال کر رکھ دیتے ہیں اور آخر میں اپنی رائے بھی دے جاتے ہیں اور کتاب کی وقعت اور اہمیت پر روشنی ڈال دیتے ہیں اور فن کار کی حوصلہ افزائی بھی کرنا نہیں بھولتے۔

ڈاکٹر انوار احمد انصاری کی تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب 'نظر وقدر' پر تبصرہ کرتے ہوئے دیپک بدکی اس طرح رقم طراز ہیں:

"زیر نظر کتاب سے ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ ان کی تحقیقی کتاب

کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی میں نے ان کی تنقیدی صلاحیت کی نشاندہی کی تھی جواب سچ بن کر ہمارے سامنے آئی ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد انصاری کی 'نظر و قدر' انتقادیات میں ایک گراں مایہ اضافہ ہے۔ ان کے یہاں معروضیت بھی ہے اور تجزیاتی فکر و عمل بھی۔ اس لیے تنقید کا میلان ان کی طبیعت سے فطری بات ہے۔ اگر وہ اس میدان پر مزید فوکس کر لیں اور انتقادیات کے جدید رجحانات کا گہرا مطالعہ کریں تو اردو ادب میں اپنی مہر ثبت کر سکتے ہیں۔''

دیپک بدکی نئے لکھنے والوں کے لیے مژدۂ جانفزہ کا کام کر رہے ہیں۔ ان کے لکھے ادب پر اپنے تاثرات رقم کر رہے ہیں، جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ آج وہ سینکڑوں قلم کاروں کے دل کی دھڑکن بن چکے ہیں ان کے افسانوں کے پرستار تو پہلے ہی ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کی وجہ سے ہی تین ادباء، پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انوار ظہیر انصاری، نے ان کے فن اور شخصیت پر ایک بے حد خوبصورت کتاب 'ورق ورق آئینہ' تصنیف کی ہے تا کہ بُدکی صاحب کی حیات اور خدمات کا مکمل احاطہ ہو سکے۔ لیکن وہ ابھی ایک تیز رو سمندر کی مانند آگے بڑھ رہے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے اور دیپک بُدکی اردو تنقید کے گلیاروں میں دیپک کی طرح جگمگاتے رہیں۔

خدا کرے کہ یہ مرحلۂ شوق نہ ہو طے۔

☆☆☆☆☆

☆ تبصرہ نگار: ڈاکٹر انوار احمد انصاری، مالیر کوٹلہ، پنجاب؛ کتاب: 'عصری تقاضے [تنقیدی مضامین و تبصرے]'، مصنف: دیپک بدکی؛ ضخامت ۳۵۲ صفحات، قیمت ۴۵۰/روپے، ناشر: میزان پبلشرز، بالمقابل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈ کوارٹرس، بٹہ مالو، سرینگر کشمیر-۱۹۰۰۰۹؛ مطبوعہ پرواز ادب پٹیالہ پنجاب، جلد نمبر ۳۵، شمارہ ۱۰-۹، ستمبر-اکتوبر ۲۰۱۴ء، ص ۸۵

ورق ورق آئینہ: دیپک بُدکی - شخصیت اور فن

- ایک جائزہ -

--محمد خالد عابدی

ادھر چند برسوں میں ایسی کئی کتب دیکھنے کا موقع ملا ہے جو کسی فن کار، شاعر و ادیب کی شخصیت اور فن پر محیط ہو کر شاعر و ادیب کا بھرپور تعارف اور اس کے سرمایۂ ادب کا جائزہ پیش کرتی ہیں۔ جس سے اس ادیب و شاعر پر نہ صرف یہ کہ ایک جگہ تمام تر مواد مل جاتا ہے بلکہ مختلف قلم کاروں، نقادوں اور مضامین نگاروں نے مل کر ادب میں اس کی کوئی حیثیت بھی متعین کی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی تناظر میں میرے پیش نظر 'ورق ورق آئینہ - دیپک بُدکی: شخصیت اور فن' کتاب ہے۔

دیپک بُدکی اردو ادب کے مقبول و معروف افسانہ نگار ہیں۔ ہند و پاک کے متعدد اخباروں و رسائل میں ان کے افسانے شائع ہوتے ہیں۔ دیپک بدکی کو پڑھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ ہے۔ ایسے جرائد جو کسی شاعر و ادیب کی مقبولیت کا فائدہ اس صورت میں اٹھانا چاہتے ہیں کہ وہ جریدہ اگر اس شخص پر اپنا سرمایہ خرچ کرے تو کیا وہ خرچ واپس مل سکتا ہے؟ تو ایسے شاعروں ادیبوں کے نام پر مختص رسائل، گوشے، نمبر اور ارمغان فائدے کا سودا ہوتے ہیں۔

دیپک بُدکی، اردو زبان و ادب کے ایسے فن کار ہیں کہ اگر کوئی رسالہ، یا کوئی ادارہ ان پر مرکوز کوئی اشاعت، منظر عام پر لاتا ہے تو اسے خسارہ نہیں اٹھانا پڑے گا۔ میں تو ذاتی طور پر اس امر کا بھی قائل ہوں کہ اگر فن کار متمول اور صاحب ثروت ہے تو وہ جرائد کی کفالت و معاونت بھی کر سکتا ہے۔

بہر حال 'ورق ورق آئینہ' مشہور افسانہ نگار اور ادیب دیپک بدکی پر وہ کائنات ہے جس میں ان کی حیات، شخصیت، ماحول، تعلیم، ملازمت، ازدواجی زندگی، زندگی کی جد و جہد، کشمکش اور ایک کامیاب اور نامور فن کار بننے تک وہ جن دشوار اور خوشگوار مراحل سے گزرے ہیں۔ کتاب میں جمع شدہ مضامین اس

کے غماز ہیں۔

'ورق ورق آئینہ' دیپک بُدکی کے واقف کاران کی مشترکہ کاوش ہے۔ یہ واقف کاران ہیں پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی، اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری۔ یہ مرتبین اردو ادب کی معروف شخصیات ہیں۔ اردو کے تقریباً سبھی جرائد میں ان کی گرانقدر نگارشات نظر سے گزرتی رہی ہیں۔ چنانچہ مذکورہ مرتبین کتاب کی ترتیب و تالیف میں برابر کے شریک کار ہیں۔ اعلیٰ اذہان کی کوشش سے دیپک بُدکی پر ایک اچھا ارمغان شائع ہوا ہے جو دیپک بُدکی صاحب کو ایک ہدیۂ تہنیت بھی ہے اور اس مقولے کو زبر دست جھٹکا ہے جو یہ کہتا ہے کہ "ہم مردہ پرست ہیں" بلکہ مرتبین نے فن کار کی زندگی میں اسے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اور اس کا اعادہ ہوتے رہنا چاہیے تا کہ مردہ پرستی کی روایت ختم ہو سکے۔

'ورق ورق آئینہ' دیپک بدکی کا وہ آئینہ ہے جو ۳۸۴ صفحات کا دستاویز ہے۔ کتاب میزان پرنٹرس سری نگر مطبع سے اپریل ۲۰۰۹ء میں پہلے ایڈیشن کی صورت میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس کے ناشر ہیں میزان پبلشرز بالمقابل فائر اینڈ ایمر جنسی ہیڈ کوارٹر، بٹہ مالو، سری نگر کشمیر۔ کتاب ۲ قسم میں اشاعت پذیر ہوئی ہے؛ لائبریری ایڈیشن اور پیپر بیک ایڈیشن۔ دونوں ایڈیشنوں کی قیمتوں میں قدرے تفاوت ہے۔

دیپک بدکی پر مرکوز کتاب 'ورق ورق آئینہ' میں پہلا باب دیپک بدکی ایک نظر میں ہے۔ اس باب کو افتخار امام صدیقی، دیپک بُدکی، سلطانہ مہر، نذیر فتح پوری، اور فیاض احمد وجیہ کی آٹھ تحریروں سے پُر کیا ہے۔ یہ تحریریں دیپک بُدکی کے تعارف، تخلیق عمل، ادبی ماحول، تخلیقی فکر اور ان کی زندگی کے دروں میں جھانکنے اور زندگی کی دبیز تہوں میں چھپے خزائن کی تلاش سے متعلق ہیں۔ ایک اور باب میں فکر جہات میں ایسے مضامین شامل ہیں جن میں دیپک بُدکی اور افسانہ نگاری اور ان کے افسانوں کا فنی جائزہ و تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

مذکورہ کتاب میں دیپک بُدکی کی سبھی مطبوعات 'ادھورے چہرے'، 'چنار کے پنجے'، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، 'عصری تحریریں' اور 'عصری شعور' پر متعدد مضامین، تبصرے اور تاثرات شائع ہوئے ہیں۔ ایک دو باب ردعمل کے عنوان سے ہیں ان میں مشاہیر اردو کے مکتوبات اور مراسلوں کی صورت میں

تاثرات ہیں۔ جن رسائل نے دیپک بدکی پر نمبر، گوشے اور خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کیا ہے ان کی تفصیل بھی ہے۔

کتاب میں سمندر کی گہرائی ہے کہ دیپک بُدکی کے ان قارئین کے جذبات کو بھی جگہ ملی ہے جنھوں نے ان کی صرف ایک کہانی یا افسانہ پڑھ کر بھی انھیں خط لکھا ہے۔ بعض قارئین ایسے بھی ہیں جنھوں نے ان کے فرداً فرداً بنام، بعنوان افسانوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ مرتبین نے سخت انتخاب کر کے قارئین و مراسلہ نگار کی محض ایک سطر، فقط ایک جملہ کو بھی اہتمام بخشا ہے۔ کتاب کی ترتیب حسن افزا ہے۔

'ورق ورق آئینہ' کتاب اس امر کی بھی متقاضی تھی کہ دیپک بدکی فائن آرٹ اور خطاطی سے بھی واقف ہیں۔ تو چنداں نمونہ جات ضرور شامل ہوتے۔ کتاب میں تصویروں کا فقدان ہے۔ بہر حال مجموعی طور پر 'ورق ورق آئینہ' دیپک بدکی پر ایک اچھی دستاویز ہے۔

☆☆☆☆☆
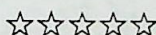
☆ تبصرہ نگار: محمد خالد عابدی؛ کتاب: 'ورق ورق آئینہ: دیپک بُدکی - شخصیت اور فن'؛ مرتبین: پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری؛ اشاعت: ۲۰۰۹ء؛ ضخامت ۳۸۴ رصفحات؛ قیمت: لائبریری ایڈیشن ۴۵۰ر روپے، پیپر بیک: ۳۰۰ر روپے، بیرونی ممالک: ۱۵ر امریکی ڈالر؛ ناشر میزان پبلشرز، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر-۱۹۰۰۰۹؛ مطبوعہ: پندرہ روزہ صدائے اردو، جلد ۹ شمارہ ۱۳-۱۲، ۱۵ جنوری-۱۵ فروری ۲۰۱۰

ورق ورق آئینہ: دیپک بدکی- شخصیت اور فن

--جمال رضوی

دیپک بدکی اردو کے معاصر افسانوی ادب کا معروف نام ہے۔صوفیوں، ولیوں اور رشی منیوں کی سرزمین کشمیر سے تعلق رکھنے والے دیپک بُدکی کا شمار اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے لیکن انھیں اردو کا سچا رفیق اور طالب علم کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔اردو سے ان کے انتہائی شغف کا ثبوت یہ ہے کہ روایتی تعلیم میں اسکولی سطح پر درجہ پانچ کے بعد اردو کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے طور پر اس زبان اور اس کے ادب سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔اس زبان سے مخلصانہ لگاؤ کی وجہ سے ہی دیپک بدکی نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود جامعہ علی گڑھ کے ادیب وادیب ماہر کے امتحانات پاس کیے۔۱۹۷۵ء میں دیپک بدکی نے انڈین سول سروسز میں کامیابی حاصل کی اور ترقی کرتے ہوئے چیف پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے تک پہنچے۔

دیپک بدکی کی پہلی کہانی 'سلمیٰ'، ۱۹۷۰ء میں روزنامہ 'ہمدرد' (کشمیر) میں شائع ہوئی تھی۔ بہ حیثیت افسانہ نگار دیپک بدکی کو اصل شہرت بیسویں صدی کی آخری دہائی میں حاصل ہوئی۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'ادھورے چہرے' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا تھا۔اس سے قبل ان کے افسانے ہندستان، پاکستان اور برطانیہ کے مؤقر رسائل و جرائد میں شائع ہو کر شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔'ادھورے چہرے'، کے علاوہ دیپک بدکی کے دیگر دو افسانوی مجموعے 'چنار کے پنجے' اور 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔مذکورہ تین افسانوی مجموعوں کے علاوہ تنقیدی مضامین اور تبصروں کے بھی دو مجموعے شائع ہو کر شرف قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔دیپک بُدکی کا یہ تخلیقی سرمایہ ان کی ادب شناسی اور وسیع مطالعے کا بین ثبوت ہے۔افسانوی ادب کے علاوہ شاعری اور تنقید پر بھی دیپک بدکی کی اچھی نظر ہے جس کا ثبوت ان کی کتاب 'عصری تحریریں' ہے۔

دیپک بدکی کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو افسانے سے علامت وابہام کے زور کو کم کر کے اس میں پھر سے 'کہانی پن' پیدا کیا اور اسے قاری سے نزدیک کیا۔ دیپک بدکی کے افسانوں کا نظام ترسیل بہت سادہ و واضح ہوتا ہے۔ وہ بہت سلیس زبان میں افسانے لکھتے ہیں جس کی وجہ سے اردو کا ایک عام قاری بھی ان کے افسانوں سے حظ اٹھاتا ہے۔ دیپک بدکی کے افسانے حقائق پر مبنی ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ فوری طور پر قاری کے ذہن و دل کو متاثر کرتے ہیں۔ انھوں نے عصر حاضر کے تقریباً تمام موضوعات کو افسانے کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے جو موجودہ انسانی معاشرہ کا لازمہ بن چکے ہیں۔ چونکہ دیپک بدکی ادب کی سماجی افادیت کے قائل ہیں اس لیے ان کے افسانوں کو ایسا آئینہ قرار دیا جاسکتا ہے جس میں مختلف زاویئے سے سماج کی تصویر نظر آتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'ورق ورق آئینہ' دیپک بدکی کی شخصیت اور فن پر دستاویز ہے۔ اس کتاب کی ترتیب وتالیف کی ذمہ داری پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے بہ حسن وخوبی انجام دی ہے۔ 'ورق ورق آئینہ' کو ۶ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں دیپک بدکی کی زندگی ،ان کے فن اور ان کی افسانہ وتنقید نگاری کے متعلق اردو کے معتبر ومعروف قلم کاروں واد باء کی آرا شامل کی گئی ہیں اس طرح اس کتاب کو اسم بامسمیٰ کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے کیوں کہ اس کا ہر صفحہ دیپک بدکی کی شخصیت وفن کے مختلف پہلوؤں سے متعارف کرواتا ہے۔

اس کتاب کے پہلے باب کو 'دیپک بدکی ایک نظر میں' کا عنوان دیا گیا ہے۔ صفحہ ۱۲ سے صفحہ ۴۸ پر مشتمل اس باب میں دیپک بدکی کی شخصیت اور ان کے فن پر بھرپور مواد پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں دیپک بدکی نے بھی 'ماہ وسال کے رنگ روپ' اور 'حیات کے اہم سنگ میل' کے تحت اپنی زندگی کے مختلف مراحل اور اپنی تخلیقی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ دیپک بدکی سے فیاض احمد وجیہ کا طویل انٹرویو اور افتخار امام صدیقی کی انٹرویو نما مختصر تحریر بھی اس سلسلے کی اہم تحریریں ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے باب 'فکری جہات-۱' میں دیپک بدکی کے تینوں افسانوی مجموعوں 'ادھورے چہرے'، 'چنار کے پنجے' اور 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' کے علاوہ ان کی تنقیدی کتاب 'عصری تحریریں' کے متعلق مضامین شامل

کیے گئے ہیں۔ان میں سے بیشتر مضامین وقتاً فوقتاً ہندو بیرون ہند کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔کتاب کے تیسرے باب 'فکری جہات-۲' میں ان مذکورہ کتابوں کے متعلق تبصروں کو جمع کیا گیا ہے۔ چوتھے اور پانچویں ابواب میں 'مکتوبات' اور 'تاثرات' کے تحت اردو کے مشاہیر ادباء و قلم کاروں کی دیپک بدکی کے فن کے متعلق آراء کو شامل کیا گیا ہے۔ان ابواب میں کالی داس گپتا رضا، مانک ٹالا، شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی، قمر رئیس، قتیل شفائی، شکیل الرحمٰن، نامی انصاری، مظہر امام، فیاض رفعت، قیصر تمکین، زبیر رضوی وغیرہم کے مکتوبات و تاثرات سے دیپک بدکی کے فن کے مختلف جہات پر روشنی پڑتی ہے۔اس کتاب کے آخری باب میں دیپک بدکی کی تصانیف کی اشاعتی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔

اس طرح 'ورق ورق آئینہ' ۳۸۴ رصفحات پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے جو دیپک بدکی کی شخصیت اور فن کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔اس سے قبل ماہنامہ شاعر (ممبئی)، سہ ماہی 'انتساب' (سرونج) اور 'اسباق' (پونے) نے بھی دیپک بدکی پر خصوصی گوشے شائع کیے تھے۔ان رسائل کے خصوصی گوشوں کے ذریعہ دیپک بدکی کی شخصیت اور فن پر اس طرح تفصیل اور جامع انداز میں روشنی ڈالی جاسکتی تھی جیسا کہ اس کتاب کے ذریعہ ممکن ہوسکا ہے۔اس کتاب کی طباعت اور سرورق دیدہ زیب ہے۔میزان پبلشرز سری نگر کشمیر اور پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری کی یہ کاوش لائق تحسین ہے کہ انھوں نے عصر حاضر کے ایک اہم افسانہ نگار پر دستاویزی نوعیت کی حامل اس کتاب کو شائع کرنے کا بہترین کام انجام دیا۔اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اپریل ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا ہے جس کی قیمت اندرون ملک ۴۵۰ روپئے اور بیرون ملک ۱۵ رامریکی ڈالر ہے۔اس کتاب کا پیپر بیک ایڈیشن ۳۰۰ر روپئے میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

☆ مبصر: جمال رضوی، کتاب: 'ورق ورق آئینہ'؛ مرتبین: پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری؛ ضخامت: ۳۸۴ صفحات؛ قیمت: ۴۵۰/۳۰۰ر روپئے؛ ناشر: میزان پبلشرز، سرینگر، کشمیر، [مبصر کا پتہ: ۲/۱۱۷، گجانند کالونی، شیواجی نگر، گوانڈی، ممبئی 400043] مطبوعہ: ایوان اردو دہلی، فروری ۲۰۱۲ء، ص ۵۵-۵۴

ورق ورق آئینہ: دیپک بُدکی- شخصیت اور فن

--سعید اختر اعظمی

''اردو کہانی آج ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں ایک جانب تیز رفتار مغربی فکر وعمل ہے تو دوسری جانب چیونٹی کی چال چلتا ہوا سست رفتار مشرقی معاشرہ۔ میں ادب میں تجربوں کے خلاف نہیں ہوں چاہے وہ فارم کے متعلق ہوں یا زمان ومکان کے متعلق مگر جس معاشرے کے لیے لکھا جا رہا ہے کیا ان تحریروں سے اس معاشرے کا بھلا ہو رہا ہے یہ دیکھنا ہمارے لیے ضروری ہے۔''

دیپک بُدکی کی یہ تشویش بجا سہی لیکن سوال یہ بھی ہے کہ مغربی افکار کی نقالی اور سماجی اقدار کی زبوں حالی پر کب تک ماتم کا یہ سلسلہ چلتا رہے گا؟ قلم کار سوسائٹی کو آئینہ ضرور دکھائے مگر اپنی تحریر میں اس کا سدِ باب بھی کرے۔ بدکی صاحب نے معاشرتی کجرویوں پر نشتر زنی ہی نہیں بلکہ سوالیہ نشان بھی لگایا ہے۔اب یہ ہماری فطرت پر منحصر ہے کہ اپنی روش بدلنے پر تیار ہیں یا نہیں؟

دیپک بُدکی میں 'بُد کی' کا لاحقہ کیوں کر در آیا اس حوالے سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ان کے گھر میں کسی شخص کو کھدائی کے وقت وہاں کے رائج الوقت سکّوں کا خزانہ مل گیا تھا جسے کشمیری زبان میں بُدکی کہتے تھے، اس لیے سب انھیں 'بُد کیوں والے' کہنے لگے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ صرف بُدکی رہ گیا۔ سری نگر کشمیر سے تعلق رکھنے والے بُدکی انڈین پوسٹل سروس میں سرکاری ملازم رہے ہیں۔ ملازمت میں بحالی سے قبل ہی انھوں نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کر دیا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں ان کا پہلا افسانہ 'سلمیٰ' شائع ہوا تھا۔ تقریباً نصف صدی کا سفر طے کرنے والا ان کا فسانہ طراز قلم اب بھی سرگرم ہے۔ مختلف رسائل وجرائد میں فکشن کے توسط سے اپنی منفرد پہچان بنانے والے بدکی پر ماہنامہ 'شاعر' ممبئی، 'اسباق' پونے اور 'انتساب' سرونج نے مبسوط گوشہ شائع کیا۔ ان کے تین افسانوی مجموعے 'ادھورے

چہرے'، 'چنار کے پنجے' اور 'زیبر کراسنگ پر کھڑا آدمی' قارئین کے روبرو ہو چکے ہیں۔ وہ 'عصری تحریریں' اور 'عصری شعور' کے عنوان سے غیر افسانوی رنگ (مضامین) بھی پیش کر چکے ہیں۔

'ورق ورق آئینہ؛ دیپک بدکی: شخصیت اور فن' کی ترتیب پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی مرحوم، اور ڈاکٹر ظہیر انصاری کی مرہون منت ہے۔ اس کے محتویات میں دیپک بدکی پر ایک نظر، فکری جہات (ادھورے چہرے، چنار کے پنجے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی اور عصری تحریریں پر مضامین و تبصرے)، ردِعمل، مکتوبات و تاثرات کی شمولیت ہے۔ ان پر خامہ فرسائی کرنے والوں میں افتخار امام صدیقی، سلطانہ مہر، نذیر فتح پوری، فیاض احمد وجیہ، ڈاکٹر انور ظہیر انصاری، سرون سنگھ، نور شاہ، قاضی مشتاق احمد، رفیق شاہین، فرخ صابری، ڈاکٹر خان حفیظ، آنجہانی مانک ٹالا، عرش صہبائی، ڈاکٹر حامد اشرف، رئیس الدین رئیس، ڈاکٹر پریمی رومانی، سیدہ نسرین نقاش، فیضان سعید، ڈاکٹر انوار احمد انصاری، طارق کابلی، اظہر نیر، دیپک کنول، حسن ساہو، ڈاکٹر نذیر آزاد، پرفیسر شہاب عنایت ملک، فرحت رضوی، ڈاکٹر رینو بہل، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، مختار شمیم، مناظر عاشق ہرگانوی، ویریندر پٹواری، ڈاکٹر سیفی سرونجی، عالم خورشید، ایم مبین، انور سدید، انیس رفیع، محمد ایوب واقف، بھگوان داس اعجاز، سید امتیاز الدین، قمر سنبھلی، رشید انجم، ابرار رحمانی، شفیق الرحمٰن، منصور خوشتر، اظہار احمد ندیم، عشاق کشتواڑی، شمع افروز زیدی، سید ظفر ہاشمی، عطیہ سکندر علی، احمد عثمانی، خان احمد فاروق اور شجاع الدین شاہد شامل ہیں۔ فکشن کو نئی جہت سے آشنا کرانے والے دیپک بدکی پر مرتب یہ کتاب شخصیات شناسی کے حوالوں میں نمایاں اضافہ ہے۔

☆☆☆☆☆

☆ مبصر: سعید اختر اعظمی؛ کتاب: ورق ورق آئینہ: دیپک بدکی۔شخصیت اور فن؛ مرتبین: پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری؛ اشاعت: ۲۰۰۹ء؛ ضخامت: ۳۸۴ صفحات؛ قیمت: لائبریری ایڈیشن ۴۵۰ روپے، پیپر بیک: ۳۰۰ روپے، بیرونی ممالک: ۱۵ امریکی ڈالر، ناشر: میزان پبلشرز، بالمقابل فائر اینڈ ایمر جنسی سروسز ہیڈ کوارٹرس، بٹہ مالو، سری نگر، کشمیر؛ مطبوعہ ہفت روزہ 'ہماری زبان' دہلی، جلد ۳۹، شمارہ ۳۱/۷۳: ۱۵ اکتوبر تا ۲۱ اکتوبر ۲۰۱۴ء؛ ص ۶

ورق ورق آئینہ: دیپک بُدکی۔ شخصیت اور فن

--احمد عثمانی

کوئی شک نہیں تھا کہ دیپک بُدکی اچھے افسانہ نگار ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری میں مزید نکھار پیدا ہورہا ہے۔ کشمیر کی خوبصورتی نا سہی آج کے زمانے کی بدصورتی کو وہ بڑی خوبصورتی سے اپنے افسانوں میں پروتے ہیں۔ اس کا اعتراف عصر حاضر کے معتبر نقادوں نے کیا ہے۔

'ورق ورق آئینہ' جوان کے فن اور شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ نا صرف ایک اچھے افسانہ نگار ہیں بلکہ ایک اچھے ملنسار انسان بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوپاک کے بڑے اور چھوٹے ناموں نے ان کی افسانہ نگاری پر اپنے خیالات کا بے لاگ اظہار کیا ہے۔ ان میں کئی نام ایسے ہیں جن کو زمانہ جانتا ہے اور کئی نام ایسے ہیں جن کو زمانہ جان گیا ہے۔ 'ورق ورق آئینہ' کے مرتبین بھی لائق ستائش ہیں کہ انھوں نے ہر چیز کو بڑے سلیقے سے سجایا ہے۔ ہمیں تو رشک دیپک بُدکی پر آتا ہے کہ انھوں نے ان کے بارے میں شائع شدہ اچھی اور بُری دونوں تحریروں کو سینت سینت کر رکھا اور عین ان کی افسانہ نگاری کے عالم جوانی میں اسے قارئین کے حوالے کر دیا یہ بھی ایک قابل تحسین عمل ہے۔ اگر کوئی صاحب صاحبِ علم ہیں یا کوئی اپنے آپ کو ادب کا طالب علم کہتا ہے تو ان کے بُک شیلف میں 'ورق ورق آئینہ' کا ہونا ناگزیر ہے کیوں کہ جب تک 'ورق ورق آئینہ' ان کے بُک شیلف میں نہیں ہوگا تو وہ بک شیلف ادھورا ہی رہ جائے گا۔ میں نے 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اب دیپک بُدکی ادب کی شاہراہ کے ایسے سنگ میل پر پہنچ گئے ہیں جہاں انھیں نا تو وارث علوی کے تعریفی الفاظ کی ضرورت ہے نا ہی ہرچرن چاولہ کے ہنکارے کی لیکن 'ورق ورق آئینہ' میں تو ہندوپاک کے معتبر اور قابل احترام شخصیات نے نا صرف ہنکارے بھرے بلکہ دیپک بدکی کی پوری پوری کہانی سنا دی۔ یہ دیپک بدکی کے لیے بھی اور تشنگانِ ادب کے لیے بھی بڑی بات ہے۔

۳۸۴ صفحات کی اس ضخیم کتاب کے مرتبین پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے ۴/ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب کو کڑی محنت سے مرتب کیا ہے یہ کتاب ادب خصوصاً افسانے اور تنقید پر تحقیق و تفتیش کرنے والوں کے لیے بے حد مفید سرمایہ ثابت ہو سکتی ہے۔

پہلے باب میں دیپک بدکی نے خود تین مضمون دیے ہیں جن سے ان کے تمام کوائف عیاں ہوتے ہیں۔ سلطانہ مہر، افتخار امام صدیقی، نذیر فتح پوری کے مضامین ہیں تو فیاض احمد وجیہ کا طویل انٹرویو ہے۔ باب دو میں فکری جہات (۱) میں دیپک بدکی کے فن پر مضامین ہیں تو فکری جہات (۲) میں تبصرے ہیں۔ ان کی تنقیدی کتاب 'عصری تحریریں' پر بھی تبصرے شامل ہیں۔ باب (۴) میں ردِ عمل کے عنوان سے مکتوبات کو یکجا کیا گیا ہے۔ ان خطوط میں مشاہیر کے خطوط پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاثرات کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہے۔ باب ٦ میں ان کی تخلیقات و تصانیف کی اشاعتی تفصیلات درج ہیں۔ اس کتاب کی قیمت لائبریری ایڈیشن چار سو پچاس اور پیپر بیک تین سو روپیہ ہے۔ کتاب کا کاغذ عمدہ ہے۔ چھپائی صاف ستھری ہے۔ مرتبین نے بڑی محنت کی ہے ساتھ ہی مسعود احمد کمپوزر نے بھی اچھی کمپوزنگ کی ہے۔ برج بہاری اور اعجاز حسین نے پڑھنے والوں پر کرم کیا کہ کمپوزنگ کی ایک بھی غلطی نظر نہیں آتی۔ اس پر ہمیں حیرت ہے۔ کہیں نہ کہیں دبی ضرور ہوگی۔ جلد دیپک بدکی کے ارادے کی طرح مضبوط ہے۔ سرنامہ بھی خوبصورت ہے اس میں دیپک بدکی آئینہ کی طرح چمک رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

☆ تبصرہ نگار: احمد عثمانی، مدیر بیباک، مالیگاؤں؛ کتاب 'ورق ورق آئینہ: دیپک بدکی- شخصیت اور فن'؛ مرتبین: پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری؛ ضخامت ۳۸۴ صفحات، قیمت: ۴۵۰/۳۰۰/روپے؛ غیر ممالک: ۱۵/امریکی ڈالر؛ ناشر: میزان پبلشرز، سرینگر، کشمیر ۱۹۰۰۹؛ مطبوعہ ماہنامہ بیباک مالیگاؤں، فروری ۲۰۱۰ء؛ ص ۴۱

چند اہم خطوط

گورچرن سنگھ

بی۔۱۶، درونا چاریہ اپارٹمنٹس،

میوروہار، فیز۔۱، ایکسٹینشن، دہلی۔۱۱۰۰۹۱

اکتوبر۲۰، ۲۰۱۰ء

محترم جناب دیپک بُدکی صاحب۔آداب

اکتوبر کے ایوان اردو کے شمارے میں آپ کی مختصر اور نہایت پُر اثر کہانی 'دس انچ زمین' کو تین بار پڑھا۔کہانی اور اس کا تھیم بہت اچھے لگے۔کل پونے دو صفحوں پر مشتمل کہانی نے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔آپ کی کہانی نے ایک بہت بڑے عصری المیے کو اُجاگر کیا ہے۔میری ایشور سے پرارتھنا ہے کہ وہ آپ کو اور ذہنی طاقت اور قابلیت دے تاکہ آپ اپنی رچناؤں سے اردو ادب کو اور بامقصد اور خوبصورت بناتے رہیں۔آپ کی کہانی کے سٹائیل کو دیکھ کر فرانسیسی رائٹر مپاساں یاد آئے۔ان کی دو کہانیاں میں نے طالب علمی کے زمانے میں پڑھی تھیں۔آپ کی طرح وہ بھی کوزے میں سمندر سمونے کی مہارت اور خداداد قابلیت رکھتے تھے۔

میں زندگی کی سڑک پر سات دہائیاں اور ۸ سال سے گامزن ہوں۔اردو طالب علمی کے ابتدائی ۸ سالوں میں پڑھی تھی۔اس زبان میں لکھے گئے لٹریچر کو پڑھا تو ہے مگر اردو لکھنے میں ہاتھ بہت تنگ ہے۔پہلے آپ کو انگریزی میں خط لکھنے کو سوچا مگر پھر اس خیال نے ایسا نہ کرنے پر مجبور کیا کہ میں اردو کے ایک مایہ ناز ادیب کو خط لکھ رہا ہوں۔چاہے ٹوٹی پھوٹی ہی سہی، اسی کی زبان میں لکھوں۔

کہتے ہیں حقائق کو خوبصورتی اور پُر اثر طریقے سے بیان کرنا ایک اچھی تخلیق کی علامت ہے۔'دس انچ زمین' میں یہ ساری خوبیاں ہیں۔آپ کی کہانی کے دو چچیرے بھائی گردھاری لال اور جواہر لال دراصل ہمارا ملک اور ہمارا پڑوسی ملک پاکستان ہیں۔ان دونوں کا پشتینی مکان بٹوارے سے پہلے کا

ہندوستان ہے۔اور متنازعہ'دس انچ زمین' کشمیر ہے۔آپ کی کہانی کے اختتام پر وہ دس انچ زمین کا گیپ اپنی جگہ قائم ہے اور کشمیر کا مسئلہ بھی اپنی جگہ۔کاش آپ کی کہانی مسئلے کے status quo پر نہیں، کسی طرح کی کامیڈی میں ختم ہوتی۔ ہماری نسل کو اس باہمی تنازعے کی وجہ سے بہت ذہنی اور جسمانی تکلیف پہنچی ہے۔ کیا ہم پڑوسی ملکوں کے درمیان دو انچ زمین کا فیصلہ ہو سکے گا؟؟ کاش ایسا ہو جائے اور پھر گردھاری لال اور جواہر لال اور ان کی اولادیں باہمی بھائی چارے اور پریم میں دو اچھے پڑوسیوں کی طرح رہ سکیں۔آمین۔

ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ　　　　آپ کا نیازمند

گورچرن سنگھ

پس نوشت: مجھے یاد آرہا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے میں نے ماہنامہ تخلیق جو لاہور پاکستان سے شائع ہوتا ہے، میں آپ کی شارٹ سٹوری 'وفا کی خوشبو' پڑھی تھی۔ جس کا رنگ ولہجہ بھی نہایت خوبصورت اور دل کو چھونے والا تھا۔

☆☆☆

(۲)

شکیل الرحمٰن

۲۸ جنوری ۲۰۰۸ء

بھائی نذیر فتح پوری صاحب! آداب!

اسباق کا خاص نمبر (جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء) موصول ہوا۔شکریہ۔

آپ نے بہت اچھا کیا جو اردو زبان و ادب سے محبت کرنے والوں کا ایک عمدہ ڈاکومنٹ ترتیب کر دیا۔ بہت پسند آیا۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔ یہ سب کہ جن کا ذکر شامل ہے اردو زبان سے بے پناہ محبت کرنے والے ہیں۔ان کی تحریریں قیمتی ہیں۔

دیپک بدکی بہت اچھے افسانہ نگار ہیں۔ان کا گوشہ نہت عمدہ ہے۔ان کا پہلا مجموعہ پڑھا تھا۔ مختلف رسالوں میں ان کی کہانیاں پڑھتا رہتا ہوں۔ اچھی تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کے

دوسرے افسانوی مجموعے نظر سے نہیں گزرے۔ جہاں بھی ان کا افسانہ نظر آجاتا ہے، پڑھتا ضرور ہوں۔

اندرا شبنم کا گوشہ بھی پسند آیا۔

بہت محنت کی ہے آپ نے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ یقین ہے ایسے اور بہت سے شمارے نکالو گے۔

نیاز مند

شکیل الرحمٰن

(یہ خط پروفیسر شکیل الرحمٰن (مرحوم) نے جناب نذیر فتح پوری ایڈیٹر اسباق پونے کے نام لکھا تھا جس میں دیپک بدکی پر گوشہ شائع ہوا تھا۔)

☆☆☆

(۳)

عبدالصمد

۱۲۱۲ اے، رجنی گندھا،

صداقت آشرم، پٹنہ، ۸۰۰۰۱۰

۲۰-۳-۱۴ء

برادرم دیپک بدکی صاحب۔ آداب!

امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔

آپ کی عنایت کردہ افسانوں کے دونوں مجموعے مجھے مل گئے تھے جب کہ آپ سے فون پر بات بھی ہوئی تھی۔ فوراً پڑھ نہیں سکا تھا جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مصروفیت کچھ ایسی ہی ہوئی تھی۔ اور رواروی میں پڑھنے کا میں قائل نہیں۔ ہولی کی چھٹیوں میں میں نے آپ کے سارے افسانے پڑھ ڈالے اور سچ پوچھیے تو مزا آ گیا۔ یوں تو میں آپ کو پڑھتا رہا ہوں۔ ان میں سے بھی بعض افسانے میرے پڑھے ہوئے تھے۔ ابھی جو پڑھا تو یاد بھی آ گئے۔ آپ کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے فن کے تئیں بے حد ایماندار ہیں بلکہ اسے عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ موضوعات کے انتخاب

میں آپ کا انداز خاصا جدا ہے۔ وہ موضوعات جو ہماری آپ کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں مگر ہوتے ہیں بالکل سامنے، انہیں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ایک فن کار کی نگاہیں ہونا چاہئیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ شیو کی تیسری آنکھ جو صرف ایک فن کار ہی کو ودیعت ہوتی ہے۔...آپ جیسے فن کار کو۔ کسی افسانے کو پڑھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ افسانہ پہلے بھی لکھا گیا ہے یا اس انداز میں برتا گیا ہے۔ ان افسانوں کے مطالعے سے تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ گفتگو کی جائے تو آپ کے سارے افسانوں پر علیٰحدہ علیٰحدہ باتیں کی جاسکتی ہیں جس کا یہاں موقع نہیں اور میں اس کا اہل نہیں۔ بس اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے قاری خود بھی ایک کردار بن جاتا ہے کیونکہ دوسرے کردار اس کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔۔ بلاشبہ آپ ایک مقبول افسانہ نگار ہیں۔ دل کی گہرائیوں سے میری مبارکباد قبول فرمائیں۔

خاکسار

عبدالصمد

☆☆☆

(۴)

عبدالاحد ساز

۱۴۹، یوسف مہر علی روڈ، زکریا مینور،
چوتھا منزل، ممبئی-۴۰۰۰۰۳
۲۲-۷-۱۱ء

برادرم دیپک بدکی صاحب

آداب!

آپ کے افسانوں کا مجموعہ 'ریزہ ریزہ حیات' موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے بہت ممنون ہوں۔ آپ کو رسائل میں پڑھا ہی ہے۔ ماہنامہ شاعر کا آپ پر گوشہ بھی غور سے پڑھا ہے۔ اب آپ کے یہ افسانے اطمینان اور انہماک سے پڑھوں گا۔

جہاں تک تبصرے کا تعلق ہے تو بھائی میں نے آج تک کسی افسانے کی کتاب یا نثری تصنیف کا تبصرہ کیا ہی نہیں ہے۔ شعری کتب پر تبصرے کیے ہیں اور مضامین بھی شاعری ہی سے متعلق لکھے ہیں۔

افسانوں کو ایک ادنیٰ قاری کے طور پر انجوائے ضرور کرتا ہوں مگر اس پر کوئی ناقدانہ و مبصرانہ نگاہ رکھنا اور ان کے تخلیقی محاسن پر گفتگو کرنا میرے دائرۂ استطاعت سے باہر ہے۔

آپ کا حرف اول ابھی پڑھا ہے۔ یہ بات مجھے بڑی بامعنی معلوم ہوئی کہ آپ نے موجودہ عہد میں ظلم، استحصال، طبقاتی کشمکش، مصلحت پسندی وغیرہ کی نئی اور متبادل صورت حال کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کے افسانے عصری سیاق و سباق میں ضرور up-date ہو گئے ہیں۔

یہ بھی بڑی قابل تحسین بات ہے کہ آپ نے اپنی کتاب کو ناقدین و مبصرین کی آرا، فلیپ یا مضامین کا ممنونِ احسان نہیں کیا ہے۔ آپ کا حرف اوّل بجائے خود بڑا ہی راست، مرتکز، متوازن اور احاطہ کن ہے جو آپ کی کہانیوں کو پڑھنے کا کلیدی ادّعا اس طرح پیدا کر دیتا ہے جو کسی نقاد یا دانشور کی تحریر نہ کر پاتی۔

اپنی تصنیف سے نوازنے کے لیے ایک بار پھر شکر گزار ہوں۔

مخلص

عبدالاحد ساز

☆☆☆

(۵)

۲۱/اگست ۲۰۰۹ء

برادر محترم۔ سلام و خلوص

آپ کا خوبصورت تحفہ 'عصری شعور' ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پڑھا۔ جی خوش ہوا کہ آپ ادب کے تمام اصناف سے محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے رموز و علائم، باریکیوں اور اجزائے ترکیبی سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ یہ خوبی بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

اس پر طرّہ یہ کہ آپ ان تمام اصناف پر بڑی آسانی سے مضمون، تجزیہ اور تبصرہ بھی نکتہ بینی کے ساتھ لکھ لیتے ہیں۔ یہ امر مجھے ہی کیا بہت لوگوں کو حیران کرتا ہوگا۔

'عصری شعور' کے مطالعے کے دوران مجھے بار بار یہ احساس ہوتا رہا کہ آپ کی تحریر میں کسی قسم کی جھجک نظر نہیں آتی جو خود اعتمادی کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس خوبی کی وجہ سے آپ کی نثر میں روانی اور برجستگی کی وہ موجیں رواں دواں ہیں جو قاری کو بھی اپنے ساتھ رواں دواں رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ آپ کے کئی مضامین تجزیے اور تبصروں میں تنقیدی بصیرت کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ سردست ان پر تفصیلی گفتگو کرنے کا موقع نہیں مگر ارادہ ہے کہ توفیق ہوئی تو باضابطہ لکھوں گا۔

اس وقت تو اس خوبصورت اور خوب سیرت اشاعت پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ آپ کے اس مجموعے کی بھی خوب خوب پذیرائی ہوگی۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

احقر

عالم خورشید

☆☆☆

دیپک بُدکی کی تحریروں پر اہم آن لائن

--تاثرات--

(Blogs: deepakbudki.com & budki.blogspot.in)

مجموعہ ادھورے چہرے:

جاگو:

ممتاز نازا: [۳ دسمبر ۲۰۱۱ء] بہت خوب، کیا کہنے کچھ لائنیں تو لاجواب ہیں۔ "یہ اندھیر نگری ہے، یہاں کا حاکم چوپٹ راجہ ہے۔" کیا کہنے!

اردو کاؤنسل: [۲۵ اکتوبر ۲۰۱۱ء] میں آپ کی کہانی 'جاگو' کی زبان کی تعریف کرسکتا ہوں۔ آپ کی کہانی کی بُنت کی تعریف کرسکتا ہوں، آپ کے سٹائل کی تعریف کرسکتا ہوں لیکن کہانی کے درمیان چند باتیں ایسی ہیں کہ میں ان کے تعلق سے کچھ نہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں۔ شکریہ!

اقبال حسن آزاد: [۲۵ اکتوبر ۲۰۱۱ء] بہت خوب، آپ نے ایک بہت بڑے موضوع کو لیا اور اس کے ساتھ انصاف کیا۔ یہ آپ کی بڑی کامیابی ہے۔ لیکن عنوان مجھے پسند نہیں آیا۔

قمر سبزواری: [۲۱ اکتوبر ۲۰۱۱ء] کمال کردیا آپ نے، اچھا لکھا، بہت عمدہ تخیّل کی پرواز اور حیرتوں کا تسلسل، مجھے آپ کی یہ تحریر آپ کے باقی فن پاروں سے بالکل ہٹ کر لگی۔

پرویز بلگرامی: [۲۱ اکتوبر ۲۰۱۱ء] جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ بہت ہی عمدہ تخلیق مگر کیا کروں کہ آگ کا دریا نہیں لکھا جاسکتا ورنہ پوری دنیا قرۃ العین کے پیچھے پڑ جائے گی اور اسے ایک ملک سے دوسرے ملک بھاگنا پڑے گا۔ ساحر لدھیانوی کی طرح منہ چھپا کر فرار ہونا پڑتا ہے۔ ایسی کہانی تخلیق کے بعد لوگ سوچ کے در کھولتے نہیں بند کردیتے ہیں جس کا دکھ ہر ذی شعور کو ہے مگر..........!

بیسوا:

طارق عزیز: [۳ دسمبر ۲۰۱۵ء] واہ بہت خوبصورت اور دلچسپ تحریر۔ گو کہ موضوع قدیم ہے پر

انداز نیا اپنایا ہے۔ بالکل ایسی ہی کہانی میرے لیٹرک نے ایک کلاس فیلو کی حقیقی کہانی ہے۔ یہی انجام کے ساتھ۔ بہت خوب!

مجموعہ چنار کے پنجے :

پیش لفظ:

وسیم احمد فدا: [۸ جون ۲۰۱۲ء] آپ کے مجموعے کے حرف آغاز کی ضمن میں آپ کے تاثرات پڑھے۔ ایک ایک سطر صداقت پر مبنی ہے۔ عصر حاضر میں اردو کی جو صورت حال آپ نے بیان کی ہے بے حد افسوس ناک ہے۔ لیکن کیا کیا جا سکتا ہے؟ یہ ایک تلخ حقیقت ہے! آپ کی کاوشیں لائق تحسین ہیں کہ آپ کے افسانے اردو ادب کے سرمائے میں قابل قدر اضافے کا باعث ہیں..... انڈیا میں اردو کی زبوں حالی کے تعلق سے آپ نے جو گفتگو کی ہے، اسے میں بھی اتفاق رکھتا ہوں۔ آپ نے ہندی کے پروفیسر کی ہندی سے لاپرواہی کا ذکر کیا ہے، اردو کے پروفیسرس کا بھی یہی حال ہے...!

اماں:

ارشد نیاز: [۲۲ فروری ۲۰۱۱ء] ایسی کہانی جو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایمرجنسی سے بوڑھیا کے گھر تک کا سفر اچھا لگا۔ یو پی اور وہاں کے جاگیردارانہ نظام کی گونج بھی اس میں سنائی دیتی ہے۔ بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کا حصہ بڑی آسانی سے ہضم کر جاتے ہیں۔ بے چاری بڑھیا کیا کرے۔ شراب نہ بنائے تو کیا بھوکے مرے۔ مگر یہ احساس جیسے اس نے ابھی ابھی اپنا لڑکا کھو دیا ہو کہانی پر آپ کی گرفت کا احساس دلا رہا ہے۔ اچھی کہانی۔ ویسے اپ عمدہ اور بہت ہی عمدہ لکھتے بھی ہیں۔

خورشید حیات: [۲۲ فروری ۲۰۱۱ء] 'اماں' نے شروع سے آخر تک باندھے رکھا، اور میں then and then کی کیفیت سے گزرتا رہا۔ شروع میں تو ایسا لگا کہ کہانی نس بندی اور پولیس کی لاٹھی کے سائے میں اپنی سانسیں گننے والوں کے ارد گرد گھومے گی مگر گاؤں کی کنڈی کو جب کوئی کھٹکھٹاتا ہے تو قطرہ قطرہ شراب کھینچنے کا طریقہ ایک سرور کی بجائے خمار میں مجھے مبتلا کر دیتا ہے۔ جس میں اماں کی جگہ ٹائر کی چپل پہنے ایک بڑھا دکھائی دیتا ہے جو بہت کچھ کہہ رہا ہوتا ہے۔ وہیں سے ایک نئی کہانی گاؤں کی زمین سے شروع ہوتی ہے..... کہانی کے اندر کہانی..... بہت عمدہ کہانی۔

صریر خالد: [۲۲ فروری ۲۰۱۱ء] پورا پڑھ لیا۔ ایسا لگا جیسے میں بھی کنہیا لال اور اس کے صاحب کے ساتھ مردم شماری کے لیے گیا ہوا تھا۔

ایم اے حق: [۲۲ فروری ۲۰۱۱ء] بہت ہی اچھی و جذباتی کہانی ہے۔ احساس ندامت کی بہت ہی پر اثر اور زندہ تصویر پیش کی ہے آپ نے لیکن میری ناقص رائے میں یہ کہانی کچھ مختصر کی جا سکتی ہے۔

زاہد مختار: [۲۲ فروری ۲۰۱۱ء] بیانیہ... پھیلاو... راوی کی تکرار... ایک ہی سڑک کے وہی یکساں موڑ... گاؤں کی زندگی سے نکل کر ایک کردار کی وہ بات جو مردم شناسی تک آ پہنچی ہے... مردنی سی چھائی ہے لذتِ مطالعہ میں۔ بس یہ کچھ بکھرے بکھرے سے احساس ہیں ردعمل کے طور پر۔

سلیم فاروقی: [۲۳ فروری ۲۰۱۱ء] اچھا افسانہ ہے، اختتام بھی چونکانے والا ہے۔ مجموعی تاثر اچھا ہے۔

ممتاز نازا: [۲۳ فروری ۲۰۱۱ء] واہ، بہت عمدہ... آخری جملہ تو کہانی کی جان ہے۔

ساجدہ عندلیب: [۲۳ فروری ۲۰۱۱ء] آپ کے افسانوں کی بات ہی الگ ہے۔ نئے نئے تھیم کو لے کر آپ کس انداز میں سماں باندھتے ہیں کہ بس پوچھیے نا۔ مبارکباد۔

مانگے کا اجالا:

انور جاوید ہاشمی: [۱۰ فروری ۲۰۱۱ء] سوچ بچار دیتی کہانی... آرزو پوری ہوئی، یہ جن کا بچہ ہے آ کر لے جائیں۔

رضیہ مشکور: [۱۰ فروری ۲۰۱۱ء] آپ کی کہانی 'مانگے کا اجالا' پڑھی۔ کہانی کی اٹھان جتنی اچھی تھی اختتام پر اتنی ہی کمزور ہوگئی۔ ایسا کیوں ہوا، کہہ نہیں سکتی۔ مگر شویتا کے بچے کی پیدائش پر اس کا شک کرنا اور اس کے شوہر کا اسپتال میں جانا اور نرس سے دوستی، پھر اس کی ایک غیر معمولی مانگ کا تعلق کم از کم میری سمجھ میں نہیں آیا؟ معذرت چاہتی ہوں۔ مگر افسانے کی بنیاد دو چیزوں پر ہوتی ہے۔ ایک پلاٹ پر اور دوسرے تھیم پر۔ مگر دونوں میں واقعات کا تسلسل اور ربط و آہنگ ہونا از بس ضرور ہوتا ہے۔ یہ میرا اپنا خیال ہے۔ ہو سکتا ہے غلط ہو۔ مگر کہانی کو ایسے مقام پر ضرور ختم ہونا چاہیے جو یا تو کوئی سبق دیتا ہو یا تحیر کا احساس۔ اس کہانی کا انجام آپ کی دیگر کہانیوں کے مقابلے کچھ گنجلک سا تھا، واضح نہیں ہوا۔ یا میری سمجھ کا پھیر

ہے۔

ایم اے حق: [۱۰ فروری ۲۰۱۱ء] بدکی جی کی کہانی نہایت سبق آموز ہے۔ لیکن ایک بات سمجھ میں بالکل نہیں آئی کہ اس کی بیوی شویتا کا اسپتال جانا، وہاں ایک لڑکے کو جنم دینا، بچہ بدلنے کے بارے میں تذکرہ کا ہونا، اس کی وجوہات پر روشنی ڈالنا... کے بعد والی کہانی جو کہانی کے ہیرو کے آپریشن سے شروع ہوتی ہے، کا کیا سمبندھ ہے؟ میرے خیال میں شویتا سے وابستہ ساری باتیں اس کہانی میں غیر ضروری لگتی ہیں یا ہوسکتا ہے میں ہی کہانی نہیں سمجھ سکا۔

شکیلہ رفیق: [۱۱ فروری ۲۰۱۱ء] آپ برا نہ مانیے گا یہ آپ کی کمزور کہانی ہے (منٹو بننے کی ارادی کوشش نہ کریں پلیز، اپنا انداز برقرار رکھیں)۔ یہ میری رائے ہے ضروری نہیں کہ آپ اور دیگر افراد بھی متفق ہوں۔..... [۱۱ فروری ۲۰۱۱ء] آپ حقیقی قلم کار ہیں جنھوں نے اس کھلے دل سے تنقید قبول کی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ورنہ آج کل تو یہ حال ہے کہ جمعہ جمعہ آٹھ دن کے لکھنے والے تنقید برداشت نہیں کر پاتے اور تنقید کرنے والے سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ تنقیدی شعور سے لاعلم ہیں۔

سلیم فاروقی: آپ کی کہانی پڑھی لیکن یہ آپ کی دوسری کہانیوں کے مقابلے میں ایک کمزور اور بے سروپا کہانی ہے (معذرت) بچے کی پیدائش، بچہ بدلنے کا خدشہ، نظر کا ٹیکہ سب بے معنی اور کہانی میں اضافی لگتا ہے۔ دوسری نرس سے افیئر بلکہ ہوس، نرس کا عاشق ہونا، بچے کی خواہش کرنا پھر اس سے لاتعلق ہو جانا، یہ سب مبہم ہے۔ آپ نے کوی کی مثال دی ہے لیکن یہ مثال بھی میناکشی پر صادق نہیں آتی۔ ہاں ایک چیز کہانی میں بھرپور ہے وہ ہے فحش نگاری۔ جناب عالی فحش نگاری بھی اسی وقت قابل قبول ہوتی جب بامقصد ہو۔

طارق احمد صدیقی: قباحت اس کہانی کے واقعات اور الفاظ کے انتخاب اور اسلوب میں نہیں ہے۔ کلیم الدین احمد کے بقول ''ادب میں عریانی کوئی نئی چیز نہیں اور بری چیز بھی نہیں۔'' ہمیں بہرحال فن کار کے مقصد کو دیکھنا ہے اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ فن کار نے کس طرح اپنے تخیل سے کام لے کر عریاں مضامین کو جنسی ہوس رانی وغیرہ کی آلائش سے پاک کیا ہے۔ اصل قباحت میجر اشوک کے رویے میں ہے

جو محبت کرنے والی اپنی بیوی کی محبت کو دھوکے تعبیر کرتا ہے اور ایک شادی شدہ نرس میناکشی کے ناجائز مطالبے پر اس کے رحم مادر میں ناجائز طور پر اپنا بیج بوتا ہے۔ اس کہانی میں ہم یا تو میناکشی کو کوئل کی طرح غیر انسانی حرکت کا مرتکب سمجھیں یا پھر میجر اشوک کو۔ میں سمجھتا ہوں کہ میناکشی اور میجر اشوک دونوں میں سے کسی پر کوئل جیسی غیر انسانی حرکت کی مثال صادق نہیں آتی بلکہ ان دونوں سے صرف زنائے خالص کا صدور ثابت ہوتا ہے۔ رہی بات اس دکھیاری عورت کی جو میجر اشوک کے نوزائیدہ بیٹے سے اپنی بیٹی بدلنا چاہتی تھی وہ قصوروار نہیں ہوسکتی۔ خوفزدہ عورت قصوروار نہیں ہوتی۔ اس لیے کوئل کی مثال اس پر بھی راست نہیں آتی۔......کوئل جیسی حرکت کوئی انسان کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوتاہی کر رہا ہے اور بچوں کو پالنے پوسنے کا جو کام فطرت نے اس کے سپرد کیا ہے اس کو اپنی کاہلی کے سبب انجام نہیں دے رہا ہے۔ کیا میناکشی جیسی پڑھی لکھی نرس سے ایسی حرکت ہوسکتی ہے؟ اسے تو یہ معلوم ہی تھا کہ وہ سیف پیریڈ میں ہے۔ پھر اس نے اپنے خاوند کو اس بارے میں کیوں نہ بتایا۔ میناکشی جیسی حساس عورت ماں بننے کے لیے اس قدر بے چین تھی اور یہ جانتی تھی کہ 'سیف پیریڈ' کیا ہوتا ہے تو اس کو اپنے بیوقوف شوہر کو کسی نہ کسی بہانے یہ بتانا چاہیے تھا کہ ''ہمارے ہنی مون کے دوران اس ہفتے حمل نہیں ٹھہر سکتا کیونکہ اس ہفتے سیف پیریڈ چل رہا ہے۔'' اس کے برعکس میناکشی ایک غیر آدمی کو اس کے بارے میں بتاتی ہے جس پر وہ روز اول سے فریفتہ ہے۔ پتا نہیں اسپتالوں میں مرد کے کمر سے نیچے کے آپریشنوں میں خواتین نرسوں کو کیوں لگایا جاسکتا ہے اور وہ بھی میناکشی جیسے کنواری نرس کو۔ جب میناکشی کی شادی ہوتی ہے اور اس کا شوہر احمق ثابت ہوتا ہے تب میناکشی لاشعوری طور پر میجر اشوک کے پاس ہی جاتی ہے۔ یہ تو خالص زنا کا کیس نظر آتا ہے جو کوئل جیسی حرکت کے مقابلے میں کم تر درجے کا فعل ہے۔ زنا تو محض لذت کوشی کا ایک فعل ہے اور نکاح کے دائرے سے باہر دخول کے ذریعے حمل ٹھہرا کر اولاد حاصل کرنے اور اس کو پال پوس کر بڑا کرنے کی خواہش جنسی لذت کوشی سے بڑا جرم ہے۔ میناکشی کو اگر اس فعل قبیح کا مجرم ٹھہرایا جائے تو پھر درج ذیل سوالات کھڑے ہوتے ہیں جن کا جواب اس کہانی سے نہیں مل سکتا:

ا) میناکشی نے اپنی شادی کسی ہوشمند مرد سے کیوں نہ کی جو سیف اوران سیف پیریڈ کا خیال رکھتا۔ اور باقاعدہ پلاننگ کے بعد گلف سے آتا۔ وہ تو ایک پڑھی لکھی بالغ نظر نرس تھی۔

۲) شادی کے بعد اس کے شوہر کو اگر سیف پیریڈ کا علم نہ تھا تو میناکشی کو اسے بتا دینا چاہیے کہ سیف پیریڈ کیا ہوتا ہے۔

۳) میناکشی کے لیے فرٹائیل پیریڈ میں گلف جا کر اپنے شوہر سے حاملہ ہونے کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا تھا۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر وہ چاہتی تو گلف جا سکتی تھی اور وہاں نرس کا جاب حاصل کر سکتی تھی۔ واضح رہے کہ کہانی میں اس کی باضابطہ صراحت ہے کہ اسے گلف میں نرس کی جاب بھی مل گئی۔ گلف جانے کا یہ کام تو وہ ناجائز حمل ٹھہرانے سے پہلے بھی کر سکتی تھی۔ اگر اسے گلف ہی جانا تھا تو وہ زنا سے پہلے گلف چلی جاتی۔ اس طرح اسے زنا کا موقع ہی نہ مل پاتا اور اسے جائز طور پر حمل ٹھہرتا۔ مگر چونکہ میناکشی کی نیت سرے سے یہ تھی ہی نہیں۔ یا تو وہ ایک وقتی جذبہ تھا جس میں وہ شیلانگ واپس آنے کے بعد مبتلا ہو گئی تھی۔ یعنی آپریشن ٹیبل پر پڑے ہوئے برہنہ میجر اشوک کی تصویر اس کے لاشعور میں موجود تھی جو رہ رہ کر اس کے ذہن میں در آتی تھی۔ یا پھر میناکشی چکھنے والوں اور چکھنے والیوں میں سے تھی۔ میں میناکشی کو چکھنے والی نہیں سمجھتا لیکن یہ مانے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ میناکشی کے ذہن میں ہسپتال والے دن کی یاد محفوظ تھی اور وہ وہی کر رہی تھی جو اس کا لاشعور انجانے میں اسے سرزد کرا رہا تھا۔ بہر حال معاملہ جو بھی ہو لیکن میناکشی دراصل ماں بننے کے لیے نہیں بلکہ لذت کوشی کے لیے ترس رہی تھی۔ ماں بننے کی بات تو جنسی لذت کے حصول کا محض ایک بہانہ تھا۔

۴) میناکشی کا میجر اشوک سے کہا گیا یہ قول کہ ''آگے کے پندرہ روز بڑے نازک ہیں اور میں یہ چانس مس نہیں کرنا چاہتی۔'' اگر سیاق و سباق کے ساتھ پڑھا جائے تو فاسد نظر آتا ہے۔ قول فاسد وہ ہے جو مبنی بر حقیقت نہ ہو۔ قائل کا منشا اگر فاسد ہو تو اس کا قول اس کے حق میں دلیل نہیں بن سکتا۔ ''میں یہ چانس مس نہیں کرنا چاہتی'' جیسی بات کہنے کے پس پردہ میناکشی کی اصل نیت کچھ اور تھی، مگر اس نے میجر اشوک کے سامنے کچھ اور پروجیکٹ کیا۔ شوہر کے گلف گئے ہفتہ دس دن بھی نہیں گزرے کہ اس پر جنسی لذت کوشی کا حملہ ہوا۔ میناکشی میجر اشوک کے سامنے اپنی اس بشری کمزوری کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی اس کمزوری پر پردہ ڈالا اور اس کو مادری لباس پہنا دیا۔ خود میجر اشوک خلوت میں میناکشی کو دیکھ کر اور اس کی باتوں کو سن کر اس کے کردار کا اندازہ درج ذیل الفاظ میں لگاتا ہے: ''میں نے سنا تھا کہ جنوبی ہند کی

دوشیزائیں بہت ہی شہوت پرست ہوتی ہیں۔ گوری چمڑی والوں پر مرمٹتی ہیں۔ مگراس کے ہیجان کا یہ حال ہوگا مجھے معلوم نہ تھا۔'' میجر کے الفاظ سے کہیں یہ پتا نہیں چل رہا کہ میناکشی تخم یا نطفہ کی ضرورت مند ہے۔ ضرورت مند عورتوں کے عادات واطوار کچھ اور ہوتے ہیں۔ اوران کا سیاق وسباق یعنی کانٹکسٹ بھی کچھ اور ہوتا ہے۔ یا تو ان کے مرد بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے فطری طور پر محروم ہوتے ہیں یا وہ عمر کے اس دور میں شادی کرتے ہیں جب ان کے نطفے کی فرٹیلٹی ختم ہوجاتی ہے یا پھران کے نطفے سے صرف بیٹیاں ہی پیدا ہوسکتی ہیں۔ اس مردوادی سماج میں تو مرد کی نااہلی کے لیے بھی عورت کو ہی موردِ الزام ٹھہرا کر ملامت کا شکار بنایا جاتا رہا ہے۔ میناکشی کا مرد بیوقوف ہوتو ہو مگر نامرد نہیں ہوسکتا ہے۔ پس میناکشی جیسے مضبوط کردار کے منہ سے نطفے اور تخم جیسے عاجزی کا مطالبہ مبنی برحقیقت نہیں معلوم ہوتا اور کہانی میں اس کے ایسے مطالبوں کی حیثیت حیلوں اور بہانوں کی ہے۔ اور تمام ایسے اقوال جو حیلوں اور بہانوں پر مبنی ہوں قول فاسد میں شمار ہوں گے۔ اور قول فاسد قائل کے حق میں دلیل نہیں بن سکتا۔ اس لیے میناکشی کا یہ کہنا کہ وہ ماں بننا چاہتی ہے غلط معلوم ہوتا ہے۔ میناکشی کے سلسلے میں خود میجر اشوک کے مذکورہ بالا تاثراتی الفاظ ہر لحاظ سے زیادہ قابل اعتبار نظر آتے ہیں۔ انھیں ایک بار پھر نقل کروں گا تا کہ بات واضح ہوجائے: ''میں نے سنا تھا کہ جنوبی ہند کی دوشیزائیں بہت ہی شہوت پرست ہوتی ہیں۔ گوری چمڑی والوں پر مرمٹتی ہیں۔ مگراس کے ہیجان کا یہ حال ہوگا مجھے معلوم نہ تھا۔''

۵) پس یہ ثابت ہوا کہ میناکشی سے دراصل کوئی جیسی حرکت صادر نہیں ہوئی بلکہ جب اس کی شادی کے صرف ایک ہفتے بعد اس کا خاوند گلف چلا گیا روزانہ کی اپنی جنسی طلب سے مجبور ہوکر میناکشی نے میجر اشوک سے ناجائز تعلق بنایا۔ اپنی شدید جنسی طلب کو جواز دینے کی خاطر اس نے میجر اشوک سے 'نشانی' مانگی تا کہ میجر اشوک یہ سمجھے کہ ''یہ عورت کچھ تو پارسا ہے کیونکہ یہ مجھ سے نطفہ کا مطالبہ اس لیے کررہی ہے کہ ماں بن سکے۔ حالانکہ یہ اس کا شہوانی حیلہ ہے۔ جس کو میجر کے الفاظ نے لاشعوری طور پر قبول کیا تھا۔ دیکھیں مذکورہ بالا اقتباس۔... 'سیف پیریڈ' میں حمل نہیں ٹھہرتا، یہ بھی ایک بڑی غلط فہمی ہے جو عام طور پر شادی شدہ جوڑوں کو ہوجاتی ہے۔ سیف پیریڈ میں ہی حمل ٹھہر جانے کے بعد انھیں معلوم ہوتا ہے کہ سیف پیریڈ اتنا سیف نہیں ہوتا۔ میناکشی اور اس کا شوہر گوپی ناتھ ہفتہ بھر ساتھ رہے، پھر گوپی ناتھ گلف چلا گیا

اور میناکشی بہت جلد (غالباً اگلے ہی دن، شتابی) شیلانگ پہنچ گئی۔اور پھر تقریباً ایک ماہ تک وہ میجر کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہی۔کل ملا کر میناکشی کے مردوں کے ساتھ اختلاط کے ایک ماہ اور دس دن ہوئے (تین دن شیلانگ آنے جانے کے حدف کرلیں) ایک ماہ اور دس دن میں میناکشی نے دو مردوں سے اختلاط کیا۔اب کس کے نطفے سے حمل ٹھہرا وہ تو ڈی این اے ٹیسٹ کے بعد ہی پتا چلے گا جو اس کہانی میں اب ناممکن ہے۔ظاہر ہے کہ میجر ایسے فوج کے آدمی کو عورتوں کے ایسے مخفی احوال سے اتنا سروکار نہ ہوگا۔ اس لیے یہی ممکن ہے کہ میناکشی نے میجر کو سیف پیریڈ کے نام سے چکر دینے کی کوشش کی۔

۶) میجر اشوک نے اپنا نطفہ میناکشی کو اپنی فیاض طبیعت سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ اپنی جنسی خواہش کے ہیجان سے مجبور ہو کر دیا تھا۔اس کے بھی کافی وشافی ثبوت کہانی میں پائے جاتے ہیں۔پس نہیں کہا جاسکتا کہ میجر اشوک سے کوئل جیسی کوئی حرکت صادر ہوئی (یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جس طرح کوئل اپنے انڈے دوسروں کے گھونسلے میں رکھتی ہے اسی طرح میجر اشوک نے اپنا نطفہ یا 'انڈا' میناکشی کے رحم مادر میں داخل کیا)۔

۷) میناکشی دراصل اپنی جنسی خواہش سے مجبور ہوگئی تھی اور اس کے لیے ایک اخلاقی بنیاد فراہم کرنا چاہتی تھی خواہ وہ ایک ناقص اخلاقی بنیاد ہی کیوں نہ ہو! اسی لیے اس نے میجر سے 'نشانی' کی مانگ کی تاکہ اپنی وقتی خواہش بھی پوری کرلے اور میجر اسے اس حد تک بے حیا نہ سمجھے کہ شوہر کے آنکھ سے اوجھل ہونے کے اگلے ہی دن وہ کسی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آ گری! واضح رہے کہ دو افراد جب ایک دوسرے کو کسی گناہ پر اکساتے ہیں تو دونوں کو یہ خوف بھی لاحق رہتا ہے کہ پتا نہیں کس وقت سامنے والے فرد کے اندر کا سماجی شعور بیدار ہوجائے۔یہی وجہ ہے کہ جب میناکش میجر سے اس کا 'تخم' مانگنے کے بہانے زنا کی کھلی دعوت دیتی ہے تو میجر احتیاطاً کہتا ہے: ''مجھے لگتا ہے تم باولی ہوگئی ہو۔'' پھر میناکشی کہتی ہے۔ ''نہیں سر! یہ میری آرزو ہے! میں عمر بھر آپ کی نشانی کو گلے لگانا چاہتی ہوں۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔'' میجر اشوک کے لاشعور سے قطع نظر اس نے شعوری طور پر وہی سمجھا جو میناکشی اس کو سمجھانا چاہتی تھی یعنی یہ کہ میناکشی کو صحیح معنوں میں تخم ہی کی ضرورت ہے اور جنسی لذت کوشی سے کوئی سروکار نہیں۔وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ اسپتال میں بھی اس نے جو کچھ دیکھا اس سے وہ متاثر نہیں ہوسکی۔کیونکہ یہ اس کا پیشہ ہے

وہ اپنے پیشے پر کوئی حرف آنے نہیں دینا چاہتی تھی کہانی کے آخر آخر تک میجر اشوک اپنی بصیرت کے زعم میں یہی سمجھتا ہے کہ "مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ میرے جسم کا کوئی حصہ ٹوٹ کر کہیں دور صحرا میں کراہ رہا ہو ۔میں اپنے بکھرے ہوئے وجود پر فکر مند تھا۔۔کہیں دور کوئی کوئل اپنی درد بھری آواز میں کوک رہی تھی۔کچھ دن پہلے اس نے اپنے انڈے کسی کوی کی تحویل میں رکھ چھوڑے تھے۔وہ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔الخ ۔"بہرحال کوئل اپنی فطرت سے مجبور ہوتی ہے اس لیے کوئل پر کچھ گناہ نہیں۔لیکن اس کہانی کا وہ موضوع نہیں معلوم ہوتا جس کے لیے دیپک بدکی صاحب نے قلم اٹھایا ہے۔جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ کہانی جنسی آوارگی اور اختلاط مردوزن کی بے لگام آزادی کی فحاشی کا پردہ فاش کرتی ہے۔ایسے اختلاط مردوزن سے اسپتال جیسی مقدس جگہیں بھی محفوظ نہیں ہیں جہاں میناکشی جیسی نرسیں دن رات بلا کسی مناسب جواز کے مردوں کے کمر سے نیچے کے اعضائے نہانی دیکھنے پر مجبور کی جاتی ہیں۔

یہ ایک قاری کا مدلل تاثر ہے۔براہ مہربانی بدکی صاحب اسے کسی اور بات سے معمول نہ کریں ۔بالفرض محال اگر اس کہانی میں کوئل ثابت ہوتا بھی ہے تو وہ میجر اشوک کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا کہ وہی میناکشی کے رحم مادر کو اپنے تخم کے لیے استعمال کررہا ہے۔اگر میجر اشوک کے تاثرات کو اس نقطۂ نظر کے ساتھ پڑھا جائے تو معاملہ سراسر پلٹ جاتا ہے۔گویا میجر اپنی غلطی تسلیم کررہا ہے کیونکہ کوئل والی حرکت اپنی مردانہ فطرت سے مجبور ہوکر خود اسی نے کی تھی۔"مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ میرے جسم کا کوئی حصہ ٹوٹ کر کہیں دور صحرا میں کراہ رہا ہو۔میں اپنے بکھرے ہوئے وجود پر فکر مند تھا۔....کہیں دور کوئی کوئل اپنی درد بھری آواز میں کوک رہی تھی۔کچھ دن پہلے اس نے اپنے انڈے کسی کوی کی تحویل میں رکھ چھوڑے تھے۔وہ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔الخ۔" کیا ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ میجر اشوک ہی کوئل کے روپ میں ہے اور اسے ایک کوئل کی حیثیت سے ایسا لگ رہا ہے کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ (نطفہ) ٹوٹ کر کہیں دور صحرا میں کراہ رہا ہو؟ جس طرح ایک کوئل کو اپنے بکھرے ہوئے وجود کا احساس ہوتا ہے اسی طرح میجر کو بھی اپنے بکھرے ہوئے وجود کا احساس ہے۔اور اسی نے اپنا تخم میناکشی کے رحم مادر میں رکھ دیا ہے؟ کیونکہ وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔رہی بات میناکشی کی تو وہ ابتدا ہی سے اپنے رحم مادر کے تعلق سے حساس نہیں تھی۔وہ اسپتال میں میجر کے ساتھ بیٹھ کر گپ لڑاتی تھی۔گویا ان نے اپنے رحم مادر کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیا

تا کہ کوئی بھی تنومند کسان اگر اس میں جو کچھ بونا چاہے، بودے، خواہ وہ نکاح کے دائرے میں ہو یا اس سے باہر۔ لیکن صحیح بات وہی ہے جو میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دونوں نے ہوس رانی میں مبتلا ہو کر منہ کالا کیا اور اس فعل قبیح کو ایک انسانی سا جامہ پہنانے کی کوشش کی اور اس طرح خدا یا سماج کی آنکھ میں دھول جھونکنے کی ناکام سی کوشش کی۔ یعنی پہلے میناکشی نے اپنی ہوس رانی کو مادرانہ لباس پہنایا اور اس کے بعد میجر بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ واقعی میناکشی تخم کی ضرورت مند تھی۔ اگر میناکشی کو واقعی تخم ہی کی ضرورت تھی تو ویسا ہی تخم تو اس کے خاوند کے پاس بھی تھا جو گلف چلا گیا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے گلف چلی جاتی اور فرٹائیل پیریڈ میں اپنے خاوند سے صحبت کرتی۔ پھر وہاں جاب کر لیتی، جب بچہ جننے کا وقت آتا تو واپس کیرل آکر ڈلیوری کراتی اور پھر واپس کام پر لوٹ جاتی۔ جب میناکشی ایسی ایڈوانس لڑکی اپنے شوہر سے سیف پیریڈ کے بارے میں بات نہیں کر سکتی تو اس کا مطلب تو یہی ہوگا کہ دنیائے افسانہ کی تمام کی تمام عورتیں اس قدر بزدل ہیں کہ شوہر کے سامنے زبان تک نہیں کھلتی۔

اس لیے اس کہانی کا موضوع وہ نہیں ہے جو اس کے خالق کا دعویٰ ہے بلکہ کہانی یہ بتا رہی ہے کہ اس سماج کے بعض ایڈوانس یا سطحی لوگ اس قدر بے حیا اور اوباش ہو چکے ہیں کہ محض لذت کوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ رہی بات یہ کہ وہ ایسے بے حیا کیوں ہو گئے ہیں تو اس موضوع پر بات ہو سکتی ہے ۔مگر فی الوقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہو سکتا۔

ایم اے حق: [۱۲ فروری ۲۰۱۱ء] میں جناب طارق احمد صدیقی کے خیال سے ۹۰ فیصدی متفق نہیں ہوں۔ دیپک بُدکی صاحب کی کہانیاں بہت غور سے پڑھنے کی چیز ہوتی ہیں، جس پر طارق صاحب نے شاید عمل نہیں کیا ہے۔ بدکی صاحب کے کرداروں کے ذریعے ادا کیے جانے والے ڈائیلاگ، سچویشن، اور کہانی کے واقعات کا اگر باریکی سے مطالعہ کیا جائے گا تو پتا چلے گا کہ میناکشی نے صرف جنسی بھوک مٹانے کے لیے میجر اشوک سے جسمانی تعلق حاصل نہیں کیا تھا بلکہ واقعی اس کو ایک خوبصورت اور صحت مند اولاد کی شدید خواہش تھی۔ میناکشی اگر جنسی بھوک مٹانے والی عورت ہوتی تو وہ میجر اشوک کی مخصوص عضو کی صفائی سے بھی لذت حاصل کرتی۔ لیکن میجر اشوک کے یاد دلانے پر بھی میناکشی نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ اسے کچھ ہوا تھا۔ طارق صاحب، آپ بدکی صاحب کے ان الفاظ کو دیکھیے ''اس نے طے شدہ پلان

کے مطابق ہم دونوں کی ملاقات کروائی۔ دیکھنے میں اوسط قد کا سیاہ فام متین لڑکا لگ رہا تھا۔" اوسط قد کا، سیاہ فام، اور متین لڑکے کی تینوں باتیں negative (منفی) ہیں۔ میناکشی کی دلی خواہش تھی کہ اس کا لڑکا tall, handsome and bold (لمبا، خوشنما اور نڈر) ہو۔ اور یہی ساری خوبیاں اشوک میں موجود تھیں۔ طارق صاحب آپ نے دیکھا کہ بدکی صاحب نے کس خوبصورت اور انوکھے انداز میں اشوک کا موازنہ میناکشی کے شوہر سے کیا ہے۔ میناکشی کو ڈر تھا کہ اگر وہ میجر سے جلد سے جلد 'ماں' نہیں بن جاتی ہے اور اس کے شوہر کا بچہ ٹھہر جاتا ہے تو پھر اسی طرح ناٹے قد کا سیاہ فام لڑکا پیدا ہو جائے گا۔ اور اسی وجہ سے وہ باؤلی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے وہ ایک جگہ کہتی ہے "میں یہ چانس مس نہیں کرنا چاہتی ہوں۔" طارق صاحب آپ کو لگتا ہوگا کہ بدکی صاحب نے اپنی کہانی میں فحاشی کا اظہار کیا ہے۔ معاف کیجیے گا ایسی بات نہیں ہے۔ میناکشی اپنی زبان سے میجر کے جسم کو اس لیے دیوانہ وار چاٹتی ہے کہ وہ اپنی ایکٹوہٹ (عمل) سے اسے پاگل بنا دینا چاہتی ہے تاکہ بیچ میں ہی اکتا کر میجر یہ کھیل کہیں ختم نہ کر دے اور اس کا خواب پورا نہ ہو۔ ایک بات اور مارک (نوٹ) کیجیے۔ طارق صاحب میناکشی کو اولاد کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو اسے اپنے شوہر سے بھی حاصل کر سکتی تھی۔ اسے تو ایک خوبصورت، دراز قد اور بولڈ لڑکا چاہیے۔ اسی لیے وہ کہتی ہے "مجھے آپ کی 'نشانی' چاہیے۔ طارق صاحب آپ نے دیپک بدکی صاحب کی کہانی سرسری طور پر پڑھنے کی غلطی کی ہے۔ بدکی صاحب کا کوئی بھی جملہ بلا مقصد نہیں لکھا گیا ہے۔ میناکشی خوبصورت ہے پھر اس کی شادی ایک پست قد اور سیاہ فام لڑکے سے کیوں کر دی جاتی ہے۔ بدکی صاحب نے صاف کر دیا ہے کہ لڑکا برہمن ہے اور غیر ممالک میں نوکری کرتا ہے۔ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ میناکشی کوئی اوباش عورت نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو اسے کس بات کا ڈر تھا۔ اس کا شوہر دوسرے دیش میں رہتا تھا۔ ماں باپ کیرل میں۔ وہ چاہتی تو اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لیے اشوک سے رشتے برقرار رکھ سکتی تھی۔ لیکن بدکی صاحب کا یہ جملہ دیکھیے "میناکشی کے ساتھ میرا رابطہ اسی دن ٹوٹ گیا جب اس نے شیلانگ کو خیر باد کہا۔" ہاں میں ۱۰ فیصدی طارق صاحب کی اس بات کی تائید کرتا ہوں کہ کہانی میں مادہ کوا اور کوئل کی مثال صحیح نہیں ہے۔

طارق احمد صدیقی: [۱۲ فروری ۲۰۱۱ء] میں نے کہیں پر یہ نہیں کہا ہے کہ دیپک بدکی صاحب

فحش نگار ہیں یا یہ کہانی فحش ہے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ یہ کہانی سماج میں موجود بعض افراد کی بے لگام آزادی کی فحاشی کا پردہ فاش کرتی ہے۔ فحاشی پر لکھی جانے والی ہر کہانی کا فحش ہونا ضروری نہیں۔ اس کہانی کا موضوع بہ دلیل فحاشی ہی معلوم ہوتا ہے اور اس کا وہ موضوع نہیں جو دیپک بدکی صاحب خود فرماتے ہیں۔ تخلیق کار کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر سے موضوع طے کرے اور فن پارہ کی تخلیق کردے۔ یہ قاری کا اپنا فہم ہے کہ وہ کس نقطۂ نظر سے کہانی کو پڑھتا ہے اور اس میں سے کیا برآمد کرتا ہے۔ چونکہ ادب کی تخلیق میں لاشعور کی بھی کارفرمائی رہتی ہے اور فن کار کا شعور بھی سرگرم عمل رہتا ہے۔ شعور اور لاشعور کی اس جدلیاتی کشمکش کی وجہ سے فن پارے کی ظاہری ساخت پر اثر پڑتا ہے اور بغور پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی فن پارہ کے مختلف حصوں میں وہ ہم آہنگی نہیں پائی جاتی جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے اپنی کسی کہانی یا افسانے کے متعلق ایک کہانی کار کا دعویٰ ایک قاری کے دعوے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ چھپی ہوئی کہانی کی مثال ایسی ہے جیسے کمان سے نکلا ہوا تیر۔ اب کمان چلانے والا اس تیر کو لوٹا نہیں سکتا۔ اب قاری ہی اس کے متعلق یہ فیصلہ کرے گا کہ تیر نے کتنا گہرا زخم پہنچایا ہے۔ جس طرح میں زیر نظر کہانی کا ایک عام قاری ہوں اس کہانی کا تخلیق کار بھی ایک عام قاری ہے۔ اور بہ حیثیت ایک عام قاری کے کسی کو کسی پر کوئی مخصوص اتھارٹی حاصل نہیں۔ میرے نزدیک تخلیق خود ہی یہ فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے کہ کون سی منظر کشی فحش کے دائرے میں آتی ہے اور کون سی نہیں۔

میں نے تو جو اپنے لیے سمجھا وہ لکھا ہے۔ اور بہ دلیل لکھا ہے۔ پہلے تو میں نے یہ ثابت کیا کہ بچہ بدلنے والی غریب عورت پر کوئل کی مثال راست نہیں آتی۔ کوئل کا معاملہ یہ ہے کہ وہ انڈے تو دیتی ہے مگر جس طرح دوسری چڑیاں اپنے انڈے سیتی ہیں اس طرح کوئل اپنے انڈے سینے کی دقت نہیں اٹھاتی۔ اس سے اس کی کاہلی اور سستی کہیں۔ اور یہی اس کی فطرت ہے۔ لیکن وہ چونکہ ایک ماں بھی ہے اس لیے اس کو اپنے بچوں کی فکر بھی ہوتی ہے اس لیے وہ درد بھری آواز میں کوکتی ہے۔ جو غریب عورت سسرال والوں کے ڈر سے میجر کے بیٹے سے اپنی بیٹی کو بدلنا چاہتی تھی اس سے کوئل جیسی حرکت کیسے صادر ہو سکتی ہے؟ بلاشبہ اگر وہ کامیاب ہو جاتی تو میجر کی بیوی شویتا اس کی بیٹی کو کچھ اس طرح پالتی جس طرح ایک کوّی کوئل کے بچوں کو انجانے میں پالتی رہتی ہے۔ میجر کی بیوی پر تو کوئل کی مثال راست آسکتی ہے لیکن اس دکھیاری عورت پر

کوتاہی اور کاہلی کا الزام کیسے آسکتا ہے۔ بالفرض اس پر کوئل کی مثال راست آتی ہے تو پھر وہ میجر کے بچے کو کیوں پالنا چاہتی ہے؟ کوئل تو خود اپنے بچے بھی پالنا نہیں چاہتی، کجا کہ وہ کوّے کے بچے پالے۔ دوسری بات ہی کہ وہ بے چاری عورت جو کچھ کر رہی ہے کسی فطری مجبوری کے تحت نہیں کر رہی ہے بلکہ وہ سسرال والوں کے ٹارچر کرنے کی وجہ سے ایسا کر رہی ہے۔ اس کی نیت زندگی کی صعوبتوں سے فرار کی نہیں ہے۔ تیسری بات یہ کہ ایک عورت کا دوسری عورت کے بچہ سے اپنا بچہ بدل لینا، کسی کوئل کے کسی کوّے کے گھونسلے میں انڈا رکھنے کے عمل سے قطعاً مشابہت نہیں رکھتا۔ کوئل اس لیے رکھتی ہے کہ بچہ نکل آئے، لیکن ایک غریب عورت اگر یہ جان لے اس کے پیٹ میں جو حمل ٹھہرا ہے وہ بیٹی ہے تو پھر وہ اس کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اگر اسے یہ معلوم ہو کہ وہ بیٹا ہے تو وہ شوق سے جنے گی اور خود پال پوس کر بڑا کرے گی۔ پس نیت کی سطح پر بھی غریب عورت اور کوئل میں کوئی مشابہت ثابت نہیں ہوتی۔ میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ کہانی کے اس پہلے حصے کا تعلق کہانی کے دوسرے حصے سے میل نہیں کھاتا۔

ایم اے حق: [۱۲ فروری ۲۰۱۱ء] طارق صاحب، میں نے بالکل وثوق کے ساتھ نہیں لکھا ہے کہ آپ نے بدکی صاحب پر فحاشی کا الزام لگایا ہے۔ ہاں مجھے آپ کی تحریروں سے ایسا شک ضرور ہوا تھا۔ اس لیے میں نے لکھا ہے "آپ کو لگتا ہوگا کہ کہ بدکی صاحب نے اپنی کہانی میں فحاشی کا اظہار کیا ہے۔" چلیے اب آپ نے جب خود ہی کہا ہے کہ یہ الزام آپ نہیں لگاتے ہیں تو پھر کوئی بات نہیں۔ کوئل اور کوّے کی مثال میرے خیال میں اس کہانی میں فٹ نہیں بیٹھتی ہے۔ اس بات کا اظہار میں نے آپ کے کمنٹ کے جواب میں کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی آپ لگاتار اس بات کو کافی تفصیل سے بیان کر رہے ہیں، یہ سمجھ میں نہیں آتی ہے کیوں؟

طارق احمد صدیقی: [۱۲ فروری ۲۰۱۱ء] ایک شخص اس لیے تو زنا کا مرتکب ہوتا ہے جب اس کو اپنے من پسند شخص سے نکاح کا موقع نہیں ملتا۔ میناکشی کو میجر اشوک جیسے مرد پسند تھے۔ اسی لیے تو وہ اسپتال میں میجر سے گھنٹوں گپ لڑاتی تھی۔ آپ نے میناکشی کے براہمن ذات کے پستہ قد شوہر کا حوالہ دیا ہے جو صحیح ہے مگر اس سے تو میرے ہی خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ اگر واقعی اس کہانی میں نکاح کے سلسلے میں کسی جاتی وادی جبر کا عنصر بھی شعوری یا غیر شعوری طور شامل کیا گیا ہے تو بجا طور یہ کہا جا سکتا ہے کہ

میناکشی کے روایتی براہمن خاندان کے افراد نے میناکشی کو مجبور کیا ہوگا کہ وہ براہمن سے ہی شادی کرے خواہ وہ بدصورت ہی کیوں نہ ہو۔ایک بدصورت شخص سے شادی کے بعد میناکشی کو وہ جنسی سکون اور طمانیت حاصل نہ ہوسکی ہوگی جو کسی شخص کو اپنے من پسند جنسی پارٹنر کے ساتھ صحبت کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ شادی کے بعد میناکشی آرگزم کی تلاش میں تھی جو اسے ایک پست قد برہمن سے حاصل نہ ہوسکتا تھا۔اس کے لیے تو میجر جیسا کوئی تنومند مرد درکار تھا۔جو میناکشی کے جوڑ کا ہے۔جب وہ گلف چلا گیا تب پیاسی میناکشی چاروناچار میجر کے پاس دوڑی چلی آئی۔اور وہ آنے کے لیے مجبور تھی۔اس طرح میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میناکشی سے کوئی جیسی قبیح ترین حرکت صادر نہیں ہوئی۔یعنی اسے ایکسٹرا میریٹل افیئر بنانے کا جرم تو ہوا مگر وہ صرف اس لیے ہوا کہ وہ ایک مکمل آرگزم تک پہنچنا چاہتی تھی۔یہ تو اس نے زمانے کے رواج کے لحاظ سے میجر سے کہہ دیا کہ اسے اس کے تخم کی ضرورت ہے ورنہ میناکشی کو تخم وخم کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کو بس ضرورت تھی ایک مکمل آرگزم کی جس سے اس کے گھر والوں نے محروم کردیا تھا ایک پستہ قد اور غیر جاذب نظر برہمن سے بیاہ کر! یہ تو سیدھا سادہ زنا کا معاملہ ہے جس میں میناکشی سماجی جکڑ بندیوں کی وجہ سے پڑی۔کسی حدتک دیپک بدکی صاحب نے بھی اس کا اقرار کیا ہے۔''میٹروپولیٹن شہروں میں اب یہ حقیقت ہے کہ اسپتالوں میں بچے بدلے جاتے ہیں اور کچھ عورتیں ایکسٹرا میریٹل ریلیشنز سے پیدا کیے بچے اپنے شوہروں پر لاد دیتی ہیں۔''

میناکشی کے میجر سے تخم کے مطالبے پر مبنی جس قدر باتیں ہیں وہ میناکشی کے دل کی گہرائیوں سے نہیں نکل رہی ہیں۔بلکہ وہ ان کے ذریعے اپنے جنسی ہیجان کی لیپاپوتی کر رہی ہے۔آپ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ میناکشی میجر اشوک پر فریفتہ تھی۔خود میجر رینا برہمن ہے۔برہمن خاندان کی میناکشی اگر چاہتی تو اس کو بہت سے ایسے برہمن لڑکے مل جاتے جو اس سے شادی کرنے کو تیار ہوتے۔آج کے زمانے میں ایک برسرروزگار خوبصورت لڑکی کالے کلوٹے، پستہ قد اور غیر جاذب نظر لڑکے سے شادی پر کیسے آمادہ ہو گئی؟ اگر وہ اتنی ہی فرینک اور الٹرا ماڈرن یا پوسٹ ماڈرن ہے کہ ایک غیر سے تخم مانگ سکتی ہے اور اپنے گھر والوں سے ذرا بھی احتجاج نہیں کرسکتی؟ حالانکہ ہندوستان اور پاکستان میں اجنبی قوم کے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے شادی کرلیتے ہیں اور مار دیے جاتے ہیں۔ہندوستان میں آنر کلنگ کا کیپٹل مانا

جاتا ہے ہریانہ۔ وہاں ہر قوم کے لڑکے لڑکیاں اپنی قوم کی مخالفت مول لے کر باہم شادی رچاتے ہیں۔
پھر میناکشی جیسی برسرروزگار جو نرسنگ کے پیشے کے سبب مرد کے ہر ہر عضو سے واقف ہے آخر احتجاج
کیوں نہیں کرتی؟ اس کا مطلب یہ ہے اسے اپنی ہی ذات کے غیر شخص کا تخم گوارا ہے لیکن وہ کسی کم تر ذات
کے تنومند خوبصورت مرد سے نکاح پسند نہیں کرسکتی۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کا اتنا
احترام کرتی ہے کہ ان کی بات کو ٹال نہیں سکتی۔ یا اگر اس میں طے شدہ نکاح ٹالنے تک کی جرأت نہیں تو
نطفہ مانگنے کی جرأت کیسے آ گئی؟ نطفہ تو الٹرا ماڈرن یا پوسٹ ماڈرن عورتیں مانگتی ہیں جنھیں اپنی روایتی
ذات برادری، حسب نسب، اور عزت آبرو کا کچھ خیال نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی ذات برادری اور عزت و آبرو
کے پیمانے کچھ دوسرے ہوتے ہیں۔ میناکشی کے وہ پیمانے نظر نہیں آتے نہ اس کا پس منظر ویسا ہے وہ تو
ایک دبی کچلی ہوئی مجبور بے بس لاچار عورت نظر آتی ہے جو نرس کا جاب مل جانے کے باوجود اپنے من پسند
مرد سے شادی نہیں کرسکتی۔ لیکن جو نکاح کے معاملے میں آزاد نہیں وہ زنا میں آزاد ہو جاتا ہے۔ اگر نکاح
کے سلسلے میں حدود و قیود ہم بڑھا دیں گے تو پھر فرد زنا کے ذریعے ان حدود و قیود کو توڑ ہی ڈالے گا۔ میناکشی
سے بھی یہی ہوا۔ اس کے ظاہری الفاظ پر نہ جائیں۔ انسان کرتا کچھ ہے اور بولتا کچھ ہے۔ میناکشی نے
جس وقت میجر اشوک کو اسپتال میں برہنہ دیکھا اور بقول مصنف میجر کے موئے زہار کو صاف کیا اس وقت
میجر کے الفاظ پر غور کیجیے۔ مصنف کا منشا صاف ظاہر ہو جائے گا۔ پھر جب میجر اشوک اسے پوچھتا ہے کہ تم
نے اسپتال میں میرے پیڑو کے بال صاف کیے تھے تو تم پر کیا گزری تھی؟ آپ اندازہ لگائے میناکشی کے
الفاظ کا کہ وہ کتنی صفائی سے مکر جاتی ہے کہ اس پر کچھ گزری بھی تھی۔ یہی تو وہ نکتہ ہے جس کے دم پر بڑے
وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ میناکشی صرف باتیں بنا رہی تھی اور تخم کے مطالبے کے پردے میں اس کی اصل
نیت میجر سے متلذذ ہونے کا تھا۔ ورنہ کیا عورت کو، خواہ وہ نرس ہی ہو، بھلا یہ یاد نہ رہے گا کہ اس نے اپنے
دوست کے موئے زہار صاف کیے تھے؟ میناکشی کی ایسی بہانے بازی کو کوئی معصوم اور سادہ لوح مرد ہی تسلیم
کرسکتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میجر اشوک ایک سادہ لوح مرد تھا اور میناکشی ایک بہانے باز عورت۔ جو
صرف اس وجہ سے بہانہ بنا رہی تھی کہ میجر اسے یہ نہ کہے کہ شوہر کے گئے چار دن بھی نہ ہوئے کہ یہ کھل کھیلی!
پس کہانی کا موضوع وہ نہیں معلوم ہوتا ہے جو ہم سب سمجھ رہے ہیں بلکہ کہانی کا اصل موضوع وہ ہے جس

کی طرف میں ایک قاری کی حیثیت سے اشارہ کر رہا ہوں۔

اس کے علاوہ بہت سے دلائل ہیں لیکن طوالت کے خوف سے انھیں درج نہیں کر رہا ہوں ۔آپ ایک بار میرے نقطۂ نظر سے سوچ کر دیکھیے ۔عین ممکن ہے کہ آپ بھی اس کے قائل ہو جائیں ۔ کہانی کے متعلق کہانی کار کی رائے ایک قاری کی رائے کی طرح ہوتی ہے جس کو بطور حجت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ میری رائے بھی حجت نہیں ۔مگر میں تو صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ جس طرح میں بحیثیت ایک قاری کے سوچ رہا ہوں اس طرح بھی سوچا جا سکتا ہے اور میں ایسا سوچنے کے حق میں دلائل بھی فراہم کر رہا ہوں، یہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں ۔ براہ مہربانی میری طرف سے کسی اور بات کو ذہن میں راہ نہ دیں۔

ملک زادہ جاوید: [۱۲فروری ۲۰۱۱ء] دیپک بُدکی کا شمار ہمارے ادب میں عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔ان کی قلم کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

سلیم فاروقی: [۱۲فروری ۲۰۱۱ء] اصل موضوع سے ہٹ کر کیا گفتگو شروع کر دی۔ پلیز یہ تنقید نہیں بلکہ کہانی اور اس کے کرداروں ، دونوں کا پوسٹ مارٹم ہے۔ طارق صاحب یہ تنقید تعمیری نہیں ہے۔ سوری!

اختر صاحب: [۱۰فروری ۲۰۱۱ء] بہت خوبصورت کہانی۔ پڑھنے والوں کے لیے سوغات۔ آپ جس چیز پر لکھتے ہیں وہ امر ہو جاتی ہے۔

پرویز بلگرامی (پاکستان): [۱۱فروری ۲۰۱۱ء] کہانی بہت اچھی ہے لیکن ہمارے نزدیک کچھ کراہیت آمیز ہے (پسند اپنی اپنی) دراصل میرے نزدیک سیکس کو محور بنانا کھلے الفاظ میں میں پسند نہیں کرتا.....بھلے ہی سیکس ہی مرکز کیوں نہ ہو مگر الفاظ کراہیت والے نہ ہوں۔

دیپک بدکی (جواب): [۱۲فروری ۲۰۱۱ء] پرویز صاحب ، میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مکالمہ جاری رکھا اور اپنے خیالات کی وضاحت کی ۔دراصل مغربی لٹریچر کی ترقی کو دیکھ کر میں نے عمداً اپنی لفظیات میں آزادی برتی ہے۔منٹو بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں لکھتے تھے،اب اکیسویں صدی ہے۔کہیں کسی ادیب کو یہ بیڑیاں توڑنی پڑیں گی۔ میں صرف پورنوگرافی کو ادب سے خارج سمجھتا ہوں، جنسی رویے (Sexual behavior) کو نہیں ۔ہاں شاید مجھے یا میرے جیسے ادیبوں کو سماج سے

resistence کا سامنا کرنا پڑے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ سماج کا کیا ہے، کچھ لوگ قدامت

پرست (Conservative) ہوتے ہیں اور کچھ ترقی پسند۔ آپ نے کبھی سوچا ہے عصمت کی لحاف اور منٹو کی کئی کہانیاں ممبئی میں لکھی گئیں مگران پر کورٹ کیس لاہور میں چلائے گئے۔ کیوں؟ وجہ صاف ہے۔ جہاں تک لکھنے کے وقت یا دور کا سوال ہے، یہ کہانی میں نے ۲۰۰۰ء میں لکھی تھی اور ایک اور کہانی جو سرد عورت پر لکھی تھی (ٹھنڈی آگ) وہ ۲۰۰۱ء میں لکھی تھی۔ مخلصی موت (Euthanasia or Mercy Killing) پر میں نے ایک کہانی ۱۹۷۸ء میں لکھی تھی (سلمیٰ/خودکشی) جو تلف ہونے کے سبب ۱۹۹۷ء میں دوبارہ لکھی گئی۔ ہنگامی کہانیاں (Topical Stories) لکھنے میں میں نے بہت کوشش کی ہے بشرطیکہ کیس سٹڈی ہو سکے۔ ایک اور کہانی 'ڈرفٹ وُڈ' ۱۹۹۶ء میں تذویج محرمات (Incest) پر لکھی تھی جو انشاء کولکتہ اور بادبان کراچی کے سالنامے میں چھپی تھی۔ اس پر بھی کافی resistence ملی تھی ایڈیٹر انشاء سے۔ اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ میری زیادہ تر کہانیاں کیس سٹڈیز پر مبنی ہوتی ہیں اور ان میں مصنوعی پن یا شہوت انگیزی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ خیر، آپ کے قیمتی کمنٹ کے لیے ممنون ہوں۔

ارشد نیاز: کیا کہانی ہے اتنی خوبصورت اور دلچسپ۔ آخری مرحلے میں میرے جسم میں سیمابی لہر دوڑ گئی۔ افسانہ طویل ضرور ہے مگر اپنی فطرت میں مختصر ہے۔ قاری پڑھتا ہی چلا جاتا ہے کہیں بھی رکنے کے لیے کوئی لفظ اسے اکساتے نہیں ہیں۔ بہت لطف ملا۔ کچھ دنوں قبل ایک ایسی ہی کہانی پڑھی تھی۔ کہانی کا عنوان یاد نہیں آرہا ہے۔ لیکن اس میں قیامت مسجد میں آجاتی ہے۔ اب تک کی یہ دو کہانیاں میری نظر میں عمدہ کہانیاں ہیں۔

خورشید حیات: [۱۳ فروری ۲۰۱۱ء] کہانی کے کردار آپ کی تخلیقی کائنات کا نیا اشاریہ پیش کر رہے ہیں۔ اور یہ جو مینا کشی ہے آج کی عورت کے وجود کا راس رنگ الاپتی دکھائی دے رہی ہے۔ لڑکا تو پیدا ہوا مگر اسے اپنی ماں کے پاس چھوڑ کر واپس پھر چمن حسن کی وسعت میں کھو جانا... کہانی میں آپ نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو آپ کہنا چاہتے ہیں پھر بھی کہانی ایک پل کے لیے بھی ننگی نہیں ہوئی، ختم ہوتے 'جذبات' کو جگا گئی یہ کہانی۔ کہانی stream line motion میں آگے بہت آگے کا سفر طے کرتی دکھائی دے رہی ہے۔

چنار کے پنجے :

ایم اے حق: [۵فروری ۲۰۱۱ء] پہلی بار میں نے ایسی فکرانگیز اور فطری کہانی پڑھی ہے جس میں ایک تصوراتی مکالمے کے ذریعے موجودہ ماحول میں ذہنی کرب کی عکاسی کی گئی ہے۔ مبارکباد (ترجمہ)

احمد سہیل: [۵فروری ۲۰۱۱ء] غضب کا افسانہ ہے۔ منظرنگاری غضب کی ہے۔

خورشید حیات: [۵فروری ۲۰۱۱ء] کشمیر کی مٹی کا درد...خوبصورت اظہار...لفظ لفظ میں پوشیدہ ایک داستاں... چنار سے روبرو ہوا تو آنسو آ گئے۔ ہر شجر سایہ دار، کیا ہو گیا؟؟ جوگی! خوشگوار موسم لوٹیں گے رات بدن جلنے کے بعد...دھند میں لپٹے ہوئے چہروں کو برف کی طرح پگھلتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں 'میں'۔ میں = ہم = ہم سب...ہم سب کدھر جا رہے ہیں۔ ہم آج کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئے ہیں اور آنے والے کل کی سوچ رہے ہیں۔ 'آج' آنکھیں ملا کر، ڈائیلاگ قائم کر رہی ہے آپ کی کہانی۔

سلیم فاروقی: [۱۴فروری ۲۰۱۱ء] آپ نے تو کمال کر دیا۔ بہت خوبصورت تحریر ہے۔ اندر کا موسم بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ خوش رہیے۔

ارشد نیاز: [۱۵فروری ۲۰۱۱ء] یہ شکایت کہ آپ کی کہانیوں میں کشمیر نہیں ہے، غلط ہے۔ کشمیر تو اپنے زخموں کے ساتھ اس کہانی میں موجود ہے۔ 'چنار' علامت ہے ان لوگوں کی جو اس بے موافق موسم میں بھی اپنی زمین سے جڑے ہوئے ہیں۔ واقعی 'دھرتی' کا پودا دھرتی پر ہی پنپتا ہے۔ یہ تو موسم ہے کہ چنار پر آفت آئی ہوئی ہے۔...اس چنار میں نئی نئی کونپلیں پھوٹیں گی۔ یہ پھر ہرا بھرا ہو جائے گا۔ ذرا موسم بدلے تو۔ بہت ہی اچھا لگا جب آپ نے کہا کہ...اس چرمراہٹ سے میں بچپن میں بہت مسرور ہوتا تھا۔ کیا تجربہ ہے۔ بچپن ابھی بھی آپ کی ذات میں زندہ ہے۔ اچھی کہانی، بہت ہی اچھی کہانی۔

ہری کشن رازداں: [۹فروری ۲۰۱۱ء] سچ ہے بدکی صاحب، امید زندگی کی افیم ہے۔ کیا اظہار خیال ہے اور پوری منظرنگاری میں روحانیت ہے۔...[۱۰فروری ۲۰۱۱ء] احساسات سانسوں کے برابر ہیں۔ احساس کا ختم ہونا سانس رکنے سے کم نہیں۔ (انگریزی سے ترجمہ)

ظہیر جاوید: [۹فروری ۲۰۱۱ء] لفظ...احساس کی تصویر بنتے ہیں۔ احساس مر جائے تو کچھ بھی نہیں رہتا، بدکی جی۔ خوش رہیے...ایک بندہ جب مرتا ہے تو اس کی ماں، اس کی بیوی، اس کے بچے،

اس کے بہن بھائی سب ایک ہی طرح دکھی ہوتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ کالا ہو یا گورا، ہندو ہو یا مسلم، درد کی آواز ایک جیسی ہوتی ہے۔ زمین، دولت، خواہشات نہیں، انسان اہم ہوتے ہیں۔ پرماتما کرے آپ اس احساس کے ساتھ لکھتے رہیں۔

اختر صاحب: [۵ فروری ۲۰۱۱ء] معمول کی طرح خوبصورت۔ کبھی کبھی آپ کی تحریر میں کرشن چندر کا رنگ جھلکتا ہے۔

ممتاز نازا: [۶ فروری ۲۰۱۱ء] کیا کہنے بہت اچھا افسانہ ہے، سارے استعارے، ساری تشبیہیں..... بس کمال ہی ہیں۔

ساجد حمید: بہت خوبصورت افسانہ ہے۔ احساس کی ڈوبتی ابھرتی لہروں سے مزین جس میں زندگی کا فلسفہ امید کی کرن کو فنکارانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

سید تحسین گیلانی: [۵ فروری ۲۰۱۱ء] آپ کا اسلوب اور انتخاب الفاظ یعنی Diction اور Style؛ استفہام، امر، نہیں، ندا، جار، عطف، اور افعال... کی عمدہ مثال ہے۔ آپ نے نیچر کو علامت بنا کر بہت بھاری بھاری باتیں کہہ دیں.... بہت اچھا ہے۔

سید پرویز احمد: [۵ فروری ۲۰۱۱ء] آپ کا انسانیت سے بھرپور رویہ مجھے بہت پسند ہے۔ بطور فن کار آپ نے ایک متوازن نظریہ سامنے رکھا ہے۔ آپ نے جس طرح مخصوص وادی کے بارے میں اپنے اندر کے جذبات کا اظہار کیا ہے، مجھے پسند آیا۔ (انگریزی سے ترجمہ)

ساجدہ عندلیب رحمان: [۷ فروری ۲۰۱۱ء] آپ کی کہانیوں پر کچھ کمنٹ دینا، آفتاب کو روشنی دکھانے کے مانند ہے۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں آپ کی کتنی بڑی پرستار ہوں۔ ہمیشہ کی طرح اس افسانے نے بھی دل و دماغ میں عجیب نقش چھوڑا ہے۔

طاہر الحسن ظہیر: [۱۹ اکتوبر ۲۰۱۱ء] امید فردا آنے والوں کے لیے ہوتی ہے، جانے والے کے لیے نہیں۔ اب جو وقت جا رہا ہے یا جو جا چکا ہے اس میں تین نسلیں تو امید فردا کی نذر ہو چکی اور بھی نہ جانے کتنی ہوں گی۔ بہر حال امید فردا ہی سب کو زندہ رکھے ہے۔ اچھی تحریر ہے۔ بہت خوب۔

موچی پپلا :

اسرار احمد رازی: [۱۲ مارچ ۲۰۱۲ء] یہ ایک بہترین اور جاندار کہانی ہے۔ آپ کی کہانیوں کا ہمارے موجودہ سماج سے سروکار ہی قاری کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔

احتجاج/پرتیواد (ہندی):

اسا نغنی مشتاق: [احتجاج، ۱۰ مارچ ۲۰۱۲ء] آج کل ہمارے ملک میں جس قسم کی سیاست چل رہی ہے اس پر اس سے بہتر تبصراتی کہانی شاید ہی لکھی گئی ہو۔ دیپک صاحب اپنی کہانیوں میں سماج کی چبھتی سچائیوں کو جس خوبصورتی سے اجالتے ہیں وہ اپنی جگہ منفرد ہیں۔

نادرا ہما احمر: [احتجاج، ۸ مارچ ۲۰۱۲ء] فکر انگیز، اگر سبھی لوگ نظام کا پرزہ بنیں گے تو کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ البتہ تبدیلی ہی ہماری کائنات میں پائندہ ہے، اس لیے ہم میں سے کچھ ایک آدمی پھر بھی اس تبدیلی کے متمنی رہتے ہیں۔ مجھے کہانی پسند آئی۔ (انگریزی سے ترجمہ)

راجیش کماری (ہندی رائٹر): کہانی دل کو چھونے مین کامیاب ہوئی۔ طنز کا انداز بھی صاف عیاں ہے۔ جانوروں میں بھی ہماری ہی طرح جذبات ہوتے ہیں، پھر وہ کتیا تو ایک ماں بھی تھی اس کی یہ کارروائی کرنا تو جائز تھا۔

ارشد نیاز: [احتجاج، ۷ مارچ ۲۰۱۲ء] واہ، بہت ہی پر اثر کہانی ہے۔ زندہ رہنا ہے تو درندوں کے گروہ میں شامل ہونا ناگزیر ہے ورنہ انجام بتانا نہیں ہے بلکہ سامنے نظر آرہا ہے۔ آپ کی کہانیاں اکثر سماج پر چوٹ بھی لگاتی ہیں اور کچھ سبق بھی دے جاتی ہیں۔

نعیم بیگ: [اردو افسانہ فورم ۲۶ نومبر ۲۰۱۵ء] آج کے پر احتجاج معاشرے کی کہانی، جہاں مصنف نے کمال ہنرمندی سے انسانی خون کی ارزانی کو سڑکوں پر بہتے خون کے استعارے سے موسوم کیا اور پھر تسلسل سے زرد صحافیانہ علامت کو بالآخر طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا۔ علامتی افسانوں میں استعارہ کا استعمال صرف ایک منجھا ہوا لکھاری ہی کر سکتا ہے۔ دیپک بدکی قابل ستائش ہیں کہ ان دونوں علامتوں کو ایک افسانے میں یکجا کیا ہے۔

فیضان احمد ملک: [اردو افسانہ فورم، ۲۵ نومبر ۲۰۱۵ء] جب کسی شخص کو اس بات کا مکمل احساس ہو جاتا ہے کہ اس کی سماج اور معاشرے کو راہ راست پر لانے کی ساری کوششیں کار فضول ثابت ہوئیں تو

پھر وہ بھی تھک ہار کے اسی ظلم کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ ایک بامعنی معنی خیز کہانی ہے۔ اس میں سماج کے خود غرض اور موقع پرست لوگوں کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ کتیا کا بھونکنا برحق تھا کیونکہ اس کا بچہ گاڑی کی زد میں آ کر مر گیا۔ اس کے جذبات اس کو بھونکنے پر مجبور کر رہے تھے۔ حالانکہ اس کا بھونکنا بالکل بے فائدہ تھا لیکن اس نے احتجاج کرتے کرتے اپنی جان دی جس طرح عام لوگ ظلم و جبر کے خلاف جان دیتے ہیں۔ صحافی کتیا کی طرح نہیں بھونک رہا تھا۔ اس کو اپنے سماج اور معاشرے کا کوئی درد نہیں تھا بلکہ اس کا پیشہ اس اسے حکومت کی غلط پالیسیوں کے خلاف بھونکنے پر مجبور کر رہا تھا۔ جب اس کو صحافت سے بھی زیادہ نفع بخش پیشہ مل جاتا ہے، وہ پیشہ جس کے خلاف وہ کل تک بھونکتا رہتا تھا کسی بات کی پرواہ کیے بغیر گلے سے لگا لیتا ہے۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی: [اردو افسانہ فورم، ۲۵ نومبر ۲۰۱۵ء] اچھا افسانہ ہے۔ سیاست، صحافت اور مظلومیت کی اچھی عکاسی۔

حسیب الرحمٰن ملک، لاہور: [اردو افسانہ فورم، ۲۵ نومبر ۲۰۱۵ء] بہت اچھا افسانہ۔ ایک بہت عمدہ تنقیدی پیرائے میں لکھا گیا۔ واقعی سسٹم میں جانے کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ نمک کی کان میں داخل ہونے والا خود نمک ہو جاتا ہے۔

کوثر بیگ: [اردو افسانہ فورم، ۲۵ نومبر ۲۰۱۵ء] افسانے میں دو احتجاجی ہیں، ایک کو فنا ملی جو آخری دم تک آواز اٹھاتے رہے اور ایک مخالفت کے باوجود ہاتھ ملا کر ساتھ کھڑے ہو گئے ہیں تو بقا پالی۔ زمانے کی روش کا خوب اظہار کیا ہے۔ اور بھی در پردہ باتوں کو اپنے الفاظ میں چھپا رکھا ہے یہ افسانہ جس کی وضاحت دوسرے دوست کر رہے ہیں۔ بہت عمدہ لکھا ہے افسانے کو۔

یاسمین الٰہی: [اردو افسانہ فورم، ۲۵ نومبر ۲۰۱۵ء] ظلم کو روکنے کے لیے آخری سانس تک جدو جہد کرنے کے بجائے بندہ اسی نظام کا حصہ بن جائے؟؟؟ اگر آواز نہیں اٹھا سکتا، تو خاموشی کو ہی اپنا شعار بنا لے۔

اقبال حسن آزاد: [اردو افسانہ فورم، ۲۵ نومبر ۲۰۱۵ء] اس افسانے میں بیک وقت دو کہانیاں چل رہی ہیں۔ ایک ایماندار صحافی کی جو بالآخر اسی سسٹم کا حصہ بن جاتا ہے جس کے خلاف وہ آواز اٹھاتا

رہا تھا اور دوسری اس کتیا کی جس کا بچہ افسر کی گاڑی کے نیچے آ کر مارا جاتا ہے اور احتجاج کرنے کی صورت میں کتیا بھی گاڑی کے نیچے آ کر اپنی جان گنوا بیٹھتی ہے۔ یہاں پر مجھے نریندر مودی کا وہ بیان یاد آ رہا ہے جب گجرات فسادات پر بولتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا کہ ''اگر کوئی کتے کا پلا آپ کی گاڑی کے نیچے آ جائے گا تو آپ کو افسوس تو ہوگا ہی۔'' یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ انھوں نے کتے کا پلا کسے کہا تھا۔

محمد ریاست (پاکستان): [اردو افسانہ فورم، ۲۵ نومبر ۲۰۱۵ء] بہت خوب جناب۔ بہت اچھا افسانہ ہے۔ میرے ملک میں ایسا ہو چکا ہے، میں ایک مشہور کالم نگار کو بہت شوق سے پڑھتا تھا، وہ آج کل نواز شریف کی کابینہ میں مشیر ہیں۔ آپ نے صحیح لکھا، کتا مرنے کا اتنا ہی افسوس ہوتا ہے جتنا ان صاحب کو ہوا، فرق تو ماں کو پڑا۔

مہر افروز: [اردو افسانہ فورم، ۲۵ نومبر ۲۰۱۵ء] زبردست۔ صحافت اور کتیا کا بھونکنا، دونوں کا موازنہ زبردست کیا ہے۔ صحافی دوغلہ انسان ہے جس نے اپنا قلم اور صحافت کو کرسی کے عوض بیچ دیا... جب کہ کتیا احتجاج کرتی ہوئی آہنی کار پر حملہ آور ہوئی اور اپنے احتجاج کے لیے جان دی۔... زبردست کہانی۔ ..زبردست احتجاج..... اقدار بہادری ایثار سچ کے لیے جان دینے کے اقدار جانوروں میں منتقل ہو گئے ہیں اور وہ ان اقدار کے علم بردار ہو کر جان دے دینے پر آمادہ ہیں۔... جب کہ انسان ہر احساس سے بیگانہ ہو کر حیوان بن گیا ہے... عمدہ فنی مہارتوں پر پورا اترتی لاجواب تحریر۔ اس احتجاج کے لیے نیک تمنائیں۔

ابرار احمد: [اردو افسانہ فورم، ۲۵ نومبر ۲۰۱۵ء] افسانہ اچھا ہے۔ ایک رائے، اور آپ کو اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ''اگر ایک پیراگراف جس میں کتیا بھونکتی ہوئی آتی اور کار والا اپنا ادھ کھایا برگر کتیا کے سامنے ڈال دیتا اور کتیا بھونکنا چھوڑ کر کھانے میں مشغول ہو جاتی اور ساتھ میں دم بھی ہلاتی اور پھر صاحب کار اس صحافی کا بطور وزیر حلف اٹھانے کی خبر پڑھتے۔ اس طرح موازنے میں چونکا دینے والا انداز بھی ہو جاتا۔ ایک خیال۔ افسانہ مکمل اپنی جگہ۔ بہترین۔

اختر منیر مروت: [اردو افسانہ فورم ۲۶ نومبر ۲۰۱۵ء] افسانہ بہت اچھا ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن میں ضرور کہنا چاہوں گا کہ انسان کو ہمت نہیں ہارنا چاہیے کسی بھی حالت میں... یہاں ایک صحافی تنگ آ کر اچھائی کو چھوڑ کر معاشرے کے باقی افراد کی طرح وہ بھی بن جاتا ہے حالانکہ وہ تو سمجھ دار انسان

ہے۔اس کوتو اپنے باضمیر انسان ہونے کا ثبوت دینا چاہیے تھا معاشرے کو۔ پر یہاں تو الٹ ہے۔

اسرار احمد لقوی: [اردو افسانہ فورم ۲۶ نومبر ۲۰۱۵ء] ایک مکمل کہانی......ایک تلخ حقیقت کی جانب اشارہ...صد حیف انسانیت ایک بار پھر ہار گئی...مفاد کی پہچان صفت انسانیت اور مفاد پرستی انسانیت کی تذلیل...اور وہ یوں کہ شاعر مشرق اقبالؒ فرماتے ہیں۔

؎ اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

عادل فراز: [اردو افسانہ فورم ۲۷ نومبر ۲۰۱۵ء] کہانی کا انجام جھنجھوڑ دینے والا ہے اور ہماری زرد صحافت کے رخ کو بھی واضح کرتا ہے۔ کتنی ماؤں کے شکم چاک کر کے بچے نکال لیے گئے مگر میڈیا خاموش تماشائی بنا رہا۔ آج وہی میڈیا چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ مسلمان دہشت گردی کے خلاف اپنا موقف واضح کریں جبکہ آج تک میڈیا کا موقف مشتبہ ہے۔

مجموعہ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی:

ادھوری کہانی:

اسرار احمد رازی: [۱۱ستمبر ۲۰۱۱ء] کیا خوب کہانی ہے جناب، اس پر آپ کا انداز بیان کیا کہنے۔ مزہ آ گیا۔...[۲۷ جنوری ۲۰۱۲ء] بہت ہی لاجواب اور عمدہ کہانی ہے۔ آپ کی کہانیاں ہماری آج کی زندگی کے مختلف حقیقی مناظر کو پیش کرتی ہیں۔

عالم خورشید: [۱۱ستمبر ۲۰۱۱ء] آپ اپنے افسانوں میں بہت سادگی سے اہم بات کہہ جاتے ہیں ۔جو بہت مشکل کام ہے۔ بہت ہی خوب۔

طاہر الحسن ظہیر: [۱۳ستمبر ۲۰۱۱ء] آپ نے عام آدمی کی زندگی کے تمام رنگ اس کہانی میں شامل کر دیے۔ بات چھوٹی سی ہے سوچیں تو بہت بڑی۔

عدیل ارشد خان: [۱۴ستمبر ۲۰۱۱ء] زندگی کی حقیقتوں کو جس طرح آپ نے لفظوں کا پیراہن عطا کیا، وہ واقعی قابل تعریف ہے۔

اقبال حسن آزاد: [۱۷ستمبر ۲۰۱۱ء] آج بھور بھئے آپ کی کہانی پڑھی۔ ابھی بالکل اندھیرا ہے، چہار جانب خاموشی کی چادر تنی ہے۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں۔ صرف میں ہوں اور آپ کی 'ادھوری کہانی'

جو ہر لحاظ سے پوری ہے۔ کہانی کی بنت میں جس ہنرمندی سے کام لیا گیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ ایک لووَر مڈل کلاس فیملی کی عمدہ تصویر کشی کی ہے آپ نے اور 'بلبل'، 'گدھے' اور 'کتے' کی علامت نے کہانی میں بڑی گہرائی اور گیرائی پیدا کردی جس سے کہانی تہہ دار ہوگئی ہے۔ زبان و بیان کی سادگی خوب ہے۔ کہانی میں کہیں پر کوئی جھول نہیں، غیر ضروری تفصیلات نہیں، پلاٹ گٹھا ہوا اور جاندار ہے۔ کردار بھی جانے پہچانے جیتے جاگتے ہیں۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کہانی معنوی اور فنی ہر دو اعتبار سے کامیاب ہے۔

بمل مصری: [۲۴ جنوری ۲۰۱۱ء] بہت اچھی، علامتی کہانی ہے جو ایک حقیقت ہے۔ ایک اچھی اور موزوں علامت کتنا کچھ کہہ جاتی ہے۔..... [۲۵ جنوری ۱۱ء] بھائی دیپک میرا اشارہ آپ کے گدھے اور کتے کی علامت کی طرف تھا۔ قریب ۲۵ سال پہلے میں نے اور میری شریک حیات نے ہند بک شاپ، ریذیڈنسی روڈ، سرینگر سے الیگزینڈر رسالزنٹسن کا ناول 'کینسر وارڈ' خریدا تھا۔ یہ علامت اسی ناول کی دین ہے۔ یہ پوری کہانی تقریباً ۲۵ سال کی عمر اور پھر گدھے، کتے اور ایک الو کی ایک انسان کی زندگی میں خیرات کے بارے میں ناول نگار نے بہت ہنرمندی سے درشایا ہے۔ لیکن آپ نے اسے ہمارے ماحول میں اتنی اچھی طرح استعمال کیا ہے کہ واہ!

دیپک بدکی: [جواب، ۲۶ جنوری ۱۱ء] میں نے سالزنٹسن کی کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے۔ اس لیے بتا نہیں سکتا کہ اس نے ان علامات کا کیسے استعمال کیا ہے۔ البتہ اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن دنوں میں دلی میں نوکری ڈھونڈ رہا تھا (۱۹۷۳ء) اور ایک دوست کے گھر میں رہ رہا تھا ان کے دادا جی مجھے اپنے پاس بلاتے اور بہت دیر تک باتیں کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے ہی کہا تھا کہ آدمی کی زندگی میں تین مرحلے ہوتے ہیں، پہلے وہ بلبل کی طرح ہوتا ہے اور کہیں بھی کسی بھی شاخ پر بیٹھ جاتا ہے، دوسرا جب وہ جوان ہوتا ہے اور گرہستی بن جاتا ہے، دن بھر گدھے کی طرح بوجھ اٹھاتا رہتا ہے مگر یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ کام کیوں کر رہا ہوں؛ پھر بڑھاپا آتا ہے اور وہ کتے کی طرح بھونکتا رہتا ہے مگر کوئی اس کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ مجھے دیکھو اب کوئی میرے کمرے میں نہیں آتا ہے۔ یہ کہانی تقریباً ۳۴-۳۳ سال میرے ذہن کے اندر کروٹیں بدلتی رہی اور تب جا کر کہانی کے روپ میں سامنے آئی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کا سٹارٹ (شروعات) ٹالسٹائے کے افسانے 'تین سوال' سے تحریک پا کر لکھا گیا ہے۔

پرویز بلگرامی: [۱۶ ستمبر ۲۰۱۱ء] آپ کا افسانہ 'ادھوری کہانی' پڑھ تو لیا تھا مگر غائب دماغی کی وجہ سے میں جواب نہ دے سکا۔.....آپ کی کہانی اپنے آپ میں ایک سمندر لیے ہے۔ ایسی کہانی کبھی کبھی ہی نوکِ قلم سے نکلتی ہے۔ مجھے بہت زیادہ پسند آئی تھی۔ ایسا لگا تھا کہ میری اپنی سرگذشت ہے۔ سوچا تھا کہ بعد میں تبصرہ کروں گا پر یاد نہ رہا۔

ظہیر جاوید (چراغ حسن): [۱۲ ستمبر ۲۰۱۱ء] واہ، واہ...جیون کے تین روپ.....واہ واہ...آپ نے اس مختصر کہانی میں سماج کے بہت سے رنگ بڑے خوبصورت انداز میں بیان کر دیے ہیں۔ کہیں جھول نہیں آیا۔ قاری کو آپ نے باندھ کے رکھا ہے۔ بہت خوب!

گھونسلا:

عالم خورشید: بہت اچھا افسانہ ہے۔ بہت پہلے پڑھا تھا مگر ذہن میں اب تک تازہ ہے۔ اشرف المخلوقات کے لیے خوبصورت انداز میں ایک سبق بھی ہے اور تازیانہ بھی۔ سطح پر براہ راست نظر نہیں آتا مگر زیریں لہروں میں شروع سے آخر تک اصل افسانہ مدھم رفتار سے بہتا رہتا ہے۔ میرے خیال میں یہی اچھے ادب کی ہنرمندی ہے۔

شمیم فاروقی: [۱۵ اکتوبر ۲۰۱۱ء] بہت خوبصورت علامتی افسانہ ہے۔

ارشد نیاز: [۱۵ اکتوبر ۲۰۱۱ء] کیا کہانی ہے۔ کتنی کامیاب کہانی ہے کہ اپنے قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ نشیمن کا اجڑنا، خود کو خودکشی پر آمادہ کر لینا، یہ کہیں علامت تو نہیں ہے ان کشمیریوں کی جو اپنی جان دیتے آرہے ہیں۔ گھونسلا واقعی انسان کا ایک خواب ہے جو اجڑتا ہے تو یہی ہوتا ہے۔ دیپک جی یہ کہانی میں نے دیر سے پڑھی، معذرت چاہتا ہوں کہ اتنی اچھی کہانی پڑھنے کے لیے میں جلد مائل کیوں نہ ہوا..... وادی کی بات ہوتے ہی کشمیری حالات اجاگر ہو جاتے ہیں۔ پہلے صفحے میں کوئی بات سامنے نہیں آرہی ہے مگر جیسے ہی آپ نے کہا کہ اوپر سے آرڈر آچکا تھا کہانی بولتی ہوئی لگنے لگی ہے۔ دیکھیں کہاں تک یہ سچ ہے ....دوسرے صفحے میں چڑیا کا آنا دل کو موہ لیتا ہے اور یہاں آپ کا انداز بھی خوب ہے۔...نہ صرف انسان بلکہ چرند و پرند بھی ایک خوبصورت آشیانے کے خواب بنتے ہیں، کیا بات ہے! آفس میں بیٹھ کر پرندوں کے اس فطری فعل پر سوچنا ایک عمدہ فن کار ہی کر سکتا ہے...واہ کیا بات ہے، پہرہ ہو تو چرند و پرند کی آزادی

بھی چھن جاتی ہے۔ ہر جاندار آزادی چاہتا ہے۔ اپنی مرضی سے جینا اور مرنا چاہتا ہے۔..... مالک اور غلام کا فرق واضح ہوا ہے۔ وہ پاپ کے ڈر سے گھونسلہ اجاڑ نہیں سکتا ہے اور مالک گھر کی صفائی کے لیے اسے رکھ نہیں سکتا ہے۔ دیکھا جائے آگے کس کی جیت ہوتی ہے۔.... دیپک جی بہت ہی جان لیوا صفحہ ہے، جسم میں سیمابی لہر دوڑ گئی۔

رضیہ مشکور: [۲۶ ستمبر ۲۰۱۱ء] ایک اور اچھی کہانی۔ افسانہ پوری طرح قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور یہی اچھے افسانے کی پہچان ہے۔ حالانکہ برہنہ حقیقت ہے۔

؎ آدمی ٹوٹ جاتا ہے ایک گھر بنانے میں　　　تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

ہر ذی نفس میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے یہ جذبہ رکھا ہے۔ اشرف المخلوقات کو یہ زعم ہے کہ وہی گھر کی تشکیل کرتا ہے جب کی گھر کی تشکیل تو چرند و پرند بھی کرتے ہیں اور اس کی آپ نے بھرپور عکاسی کی ہے۔ لفظ 'دہشت' بھی ایک کہانی سناتا ہے۔ جزاک اللہ!

خورشید حیات: [۲۶ ستمبر ۲۰۱۱ء] دیپک بدکی کی کہانی 'گھونسلہ سے جب میں روبرو ہوا تب ہوا یہ کہ گھونسلا کے الگ الگ تنکوں سے آنے والی چیخ، درد اور کراہیں ایک نئی صدا بن گئیں۔ کہانی کی زمین سے ابھرنے والی یہ صدا ہر عہد میں سنائی دیتی رہے گی۔ اور یہی اس کہانی کی کامیابی ہے۔ زندگی اور کائنات کی دھڑکنوں کو سننے کا ہنر ان کو خوب آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بظاہر چھوٹی چھوٹی سی دکھائی دینے والی گھٹنائیں ان کے بھاوک منوا کو بے چین کر جاتی ہیں۔ اور پھر لفظ بولنے لگتے ہیں... دیپک بُدکی کے یہاں فکر اور تخلیقی محرکات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہمیشہ یاد رہنے والی بہترین کہانی! اس کہانی کو لکھتے وقت دیپک جی کی کیا کیفیت رہی ہوگی اسے ہر وہ تخلیقی فنکار سمجھ سکتا ہے جو کہانی 'گھونسلا' کی 'پیڑا' سے گزرتا ہے۔ تنکا تنکا گھونسلا کا بننا اور پھر تنکوں کا بکھر جانا.... اُف!

ظہیر جاوید: [۲۳ ستمبر ۲۰۱۱ء] فطرت کی صحیح عکاسی... لفظوں کا خوبصورت چناو.... سحر بند انداز ...اور سبق آموز کہانی۔

محمد اعظم خان: [۳۰ ستمبر ۲۰۱۱ء] آپ نے یہ افسانہ اس قدر خوبصورتی سے لکھا ہے کہ اس میں سمجھنے کے لیے بھی بہت کچھ ہے، اور دوسروں کے لیے دل میں درد رکھنے والا انسان سوچ سکتا ہے کہ اگر اپنا

آشیانہ اجڑنے پر ایک چڑیا کی یہ کیفیت ہوگئی تھی تو جن انسانوں کے ہنستے بستے گھر اجڑ جاتے ہیں ان کی کیا حالت ہوگی۔

اشوک ایمہ: [۱۲ اکتوبر ۲۰۱۱ء] بہت اچھا نثر پارہ ہے۔ مجھے کچھ دیر کے لیے بہت دور لے گیا۔ آپ کو بیان کرنے کا بہت اچھا ہنر ہے۔ آپ مجھے تصورات کی دنیا میں لے گئے۔ جب میں نہرو کی نگارشات کالج میں پڑھا کرتا تھا، مجھے ان کی سیدھی سادی زبان اور پرکاری بہت پسند آتی تھی۔ مجھے وہ نظم لگتی تھی نثر نہیں۔ ان کے بعد آپ دوسرے شخص ہیں جنھوں نے مجھے اسی طرح متاثر کیا۔ اپنے جذبات پر مجھے قابو پانا مشکل ہو رہا ہے۔

محمد الیاس، نئی دہلی: [۱۸ جنوری ۲۰۱۲ء] کافی خوبصورت اور اثر انگیز کہانی ترتیب دی ہے آپ نے۔ اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ کہانی بے جا طوالت اور بے جا اختصار سے پاک ہے۔ عام فہم زبان ہے اور عام فہم کہانی۔ ایک بار پڑھ کر سمجھ میں آنے والی۔ کہانی میں تاثر اس بلا کا ہے کہ اس کو پڑھ کر کسی کا بھی پتھر دل پانی ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے بے شک آپ داد کے مستحق ہیں..... مگر میری ناقص فہم کے مطابق آپ سے ایک جگہ چوک ہوگئی ہے..... آپ نے لکھا ہے کہ چوکیدار نے کمرے کی صفائی سے اس لیے انکار کر دیا کہ چڑیا کے گھونسلے میں انڈے تھے۔ پھر.... آپ نے یعنی راوی نے گھونسلہ اٹھا کر پھینک دیا، اس میں موجود انڈے ٹوٹ گئے اور ان میں سے گاڑھا مادہ نکل کر زمین میں جذب ہوگیا..... پھر راوی لکھتا ہے کہ دس منٹ بعد چڑیا اپنی چونچ میں چوگا لیے ہوئے آئی۔........ اپنے گھونسلے کو تلاش کرتی رہی یہاں تک کہ بدحواسی کے عالم میں دانہ اس کی چونچ سے گر گیا۔ یہاں آپ سے یہ چوک ہوگئی کہ جب انڈوں سے بچے نکلے ہی نہیں تھے تو چڑیا کے دانہ لانے کا کیا تک بنتا ہے۔ یہ چوک اس کہانی میں داغ لگاتی ہے.... یا تو آپ کو پہلے ہی سے بچے دکھانے چاہیے تھے یا پھر دانہ لانے والی بات کہانی میں نہیں آنی چاہیے تھی۔ پتہ نہیں آپ میرے اس کمنٹ کو کس نظر سے دیکھیں گے... اور ہوسکتا ہے کہ آپ کے پاس اس کی کوئی جائز وجہ بھی ہو.... اگر ہے تو میں اس کو ضرور جاننا چاہوں گا۔

دیپک بدکی: [جواب، ۱۸ جنوری ۲۰۱۲ء] آپ نے میرے افسانے کو پسند فرمایا، اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے اپنے تاثرات بلاگ پر ہی دیے ہوتے تو زیادہ اچھا رہتا۔ کیونکہ وہ

مستقل رہتے ہیں اور وقت ضرورت کام آتے ہیں۔ جہاں تک چڑیا کے دانہ لانے کا سوال ہے۔ چڑا ہو یا چڑیا جب بھی گھونسلا بناتے ہیں وہ یا تو گھاس پھوس اکٹھا کرتے رہتے ہیں یا پھر اپنے لیے جہاں کہیں بھی چوگا مل جائے سمیٹ کر لاتے ہیں۔ یہ ان کی جبلی ضرورت اور کارروائی ہوتی ہے چاہے گھونسلے میں بچے ہوں یا نہ ہوں۔

جنید جاذب: [۱۸ جنوری ۲۰۱۲ء] میں لفظ 'سچ' کو 'فن' سے بدلنے کی حماقت کر رہا ہوں جس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں اور پھر یہ کہتا ہوں کہ 'فن خوبصورتی ہے اور خوبصورتی فن ہے'۔ جب کبھی کوئی فکر یا دلسوز مشاہدہ (جسے فن کار نے دیکھا، محسوس کیا اور ناپ لیا ہو) ایک تخلیقی عمل سے گزرتا ہے تو ایک شاہکار برآمد ہونے کے امکانات روشن ہو جاتے ہے۔..... گھونسلا!... مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں، ایک رنگارنگ تصویر کی مانند ہے، جو فکر انگیز بھی ہے اور فکر کو انگیز کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسے درپن کی طرح ہے جو ہمیں آئینہ دکھاتی ہے تاکہ ہم اپنے متعلق سوچ لیں۔ اس افسانے نے میرے اندر اور باہر ایک طوفان سا برپا کر دیا ہے جس کی لہریں تھمنے کا نام نہیں لیتیں۔ کہانی عمدہ طریقے سے رقم کی گئی ہے، پیشہ ورانہ انداز سے پیش کی گئی ہے اور لکھنے کا سبب بھی معقول ہے۔ ساتھ ہی زبان میٹھی اور فطری استعمال کی گئی ہے۔ مبارکباد۔ اور ہاں میرے لیے اس سے سبق لینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ آپ اپنے اسلوب اور اندازِ پیش کش سے لطف اٹھاتے رہیے کہ یہ آپ کا خاصا ہے۔ [انگریزی سے ترجمہ]

ایم اے حق: [۲۲ ستمبر ۲۰۱۱ء] ایک بہت ہی اچھی کہانی ہے۔ میرے خیال میں کہانی میں آخر میں لفظ 'دہشت' نے مزہ کرکرا کر دیا ہے۔ قاری کو کچھ تو سمجھنے دیجیے۔

یعقوب یاور: [۱۵ جنوری ۲۰۱۲ء] غضب کی قوتِ مشاہدہ ہے آپ کی۔ بڑی فنی چابک دستی سے آپ نے اس کہانی کو بُنا ہے۔ مبارکباد

خواجہ ظہور اقبال: [۲۴ ستمبر ۲۰۱۱ء] کیا خوبصورت تحریر ہے۔ کردار کی مناسبت سے ڈائیلاگ، الفاظ کا برمحل چناو، واقعیت کی جزیات پر گہری ہمدردانہ نظر، پرندوں کے احساسات کو سمجھنا اور انسانی جذبات سے تقابل کرنے کا اندازِ بیان، سب کچھ شاندار ہے۔ عرصہ کے بعد اچھی نثر پڑھنے کو ملی ہے۔ بہت اعلیٰ اردو تخلیق ہے۔

غلام عباس روحانی: [۲۴ ستمبر ۲۰۱۱ء] اختتام اچھا ہے، جو ہوتا ہے ایسا ہی ہوتا ہے اور اچھے کے لیے ہوتا ہے۔۔۔ کیا کہانی ہے! لیکن بڑا دردناک انجام ہے۔ بہت ہی افسوس ناک انجام۔ مجھ سے اور کوئی تبصرہ نہیں ہوگا۔

پہاڑوں کا رومانس:

قمر سبزواری: [۷ اکتوبر ۲۰۱۱] مجھے یہ افسانہ پڑھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے ابھی ابھی کشمیر سے ہو کر آیا ہوں۔ شکریہ بدکی صاحب۔ آپ کی منظر نگاری عمدہ ہے۔ لیکن عام افسانوں سے ہٹ کر اس افسانے نے جمالیاتی حظ سے زیادہ کشمیر والوں کے دکھ میں زیادہ مبتلا کر دیا۔ پتا نہیں کب آسمان والا ان معصوم لوگوں کے دکھ دور کرے گا۔

شمیم فاروقی: [۱۸ اکتوبر ۲۰۱۱ء] بہت ہی عمدہ ہے بھائی... عنوان دیکھتے ہی جی خوش ہو گیا۔ پھر نگاہیں تحریر کا احاطہ کرتی رہیں۔ واہ بہت خوب!

یحییٰ ابراہیم: [۱۵ اکتوبر ۲۰۱۱ء] تھوڑی تاخیر ہوئی کہانی پڑھنے میں۔ بہت عمدہ کہانی ہے.... تھیم اور ٹریٹ منٹ دونوں بہت اثر انگیز۔

مجموعہ ریزہ ریزہ حیات:

ڈاکٹر آنٹی:

وسیم احمد فدا: [۲ مارچ ۲۰۱۲ء] آپ کی کہانی 'ڈاکٹر آنٹی' نظر نواز ہوئی۔ بے حد پسند آئی۔ ایک طرف جہاں آپ نے مرکزی کردار ڈاکٹر کملا دیوی کو پوری طرح فوکس کیا ہے، وہیں دوسری جانب کہانی کے دیگر کرداروں کو بھی بخوبی متعارف کرایا ہے۔ موضوع، تکنیک، پلاٹ، کردار نگاری، مکالمات، غرض کہ ہر اعتبار سے یہ ایک شاہکار کہانی ہے۔

فاروق شہزاد: کہانی حقیقت میں بہت اچھی ہے مگر اس میں بحث و مباحث کا سلسلہ اچانک بدل جاتا ہے۔ میری تجویز ہے کہ آپ طوالت کی فکر نہ کر کے خموشی سے بحث و مباحث کو منطقی انجام تک لے جائیں۔ مجھے اس کا موضوع اور پیش کرنے کا انداز پسند آیا۔

بُدھ کی مسکراہٹ:

اسرار احمد رازی: [۲۷ فروری ۲۰۱۲ء] اتنی عمدہ فکر پر مبنی اس خوبصورت کہانی سے نوازنے کا بہت شکریہ! اس کہانی میں آپ کا انداز تحریر خصوصاً پسند آیا۔ آپ کے گہرے علم، فکر کی وسعت، اور زور قلم نے کہانی کو لازوال بنا دیا ہے۔

عالم خورشید: [۲۶ فروری ۲۰۱۲ء] بہت اچھی کہانی ہے بُد کی صاحب۔ آپ نے بہت عمدگی سے کہانی بُنی ہے اور اسے انجام تک پہنچایا ہے۔ کاش یہ بات سب کی سمجھ میں آجائے۔ پھر یہ دنیا کتنی خوبصورت ہو جاتی۔

وسیم احمد فدا: [۲ مارچ ۲۰۱۲ء] عمدہ پیرائے میں ایک بہترین کہانی تخلیق کی ہے آپ نے۔ آپ کی کہانیاں زندگی کی حقیقتوں کی سچی ترجمان ہیں۔

دس انچ زمین:

رونق جمال: [۳۱ جنوری ۲۰۱۱ء] لاجواب افسانہ ہے دس انچ زمین۔

انور جاوید ہاشمی: [۲۶ جنوری ۲۰۱۱ء] آپ کی ہر کہانی پہلی سے بڑھ کر اچھی لگنے لگی ہے۔

ظہیر جاوید: [۲۷ جنوری ۲۰۱۱ء] بہت اچھی کہانی۔ سادہ زبان میں زندگی کی ایک دکھتی تحریر۔

زورار شیروانی: [۲۷ جنوری ۱۱ء] بہت اچھی کہانی ہے، حرص و تمنا کے پجاریوں کے لیے ایک خوبصورت نصیحت۔ آپ نے سلیس و عام فہم و اختصار سے کہانی کو تحریر کیا گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا۔

ارشد نیاز: [۲۴ اکتوبر ۲۰۱۱ء] آپ نے پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ زر، زمین اور زن، سبھی لڑائیوں کی جڑ ہیں۔ دس انچ کے لیے جن کو بیٹی کہتے تھے انھی کو اپنے بستر پر لٹانے لگے۔ برسوں کی محبت برسوں کے لیے دشمنی میں بدل گئی۔ نہ جانے کتنے ایسے خاندان آج بھی ہیں جو ایک دوسرے کی میت میں بھی شامل ہونا گوارا نہیں کرتے ہیں۔ ایک سچی کہانی جو ہندوستان کے کسی شہر یا کسی نہ کسی گاؤں میں مل جائے گی۔

گردھاری لال دھر: [۱۲ جون ۲۰۱۳ء] یہ ایک ایسی کہانی ہے جو زندگی میں کئی بار دھرائی گئی ہے۔ بہت خوش اسلوبی سے تصویر کشی کی گئی ہے۔

صلاح الدین حیدر: [۲۶ جنوری ۲۰۱۱ء] دیپک جی، کاش آپ پاکستان میں ہوتے بلکہ کراچی میں تاکہ ہم آپ کی زبانی افسانے سنتے۔ بہر حال تحریر بہت پیاری ہے، ہماری دعا ہے کہ اس میں نکھار

آجائے۔

رضیہ مشکور: [۲۶ جنوری ۲۰۱۱ء] اچھا افسانہ ہے بدکی صاحب۔ مٹی کے رکھ رکھاو اور اس کے سکھ دکھ سب یکجا کر دیے ہیں آپ نے۔

خورشید حیات: [۲۷ جنوری ۲۰۱۱ء] دیپک بدکی جی کی 'دس انچ زمین' کا کینواس وسیع ہے۔ گردھاری لال کی زمین، اور دو مکان کے درمیان دس انچ کا گیپ، اپنی مٹی کا، انسانیت کا درد، اور بہت کچھ کہہ جاتے ہیں یہ لفظ۔۔ معنوی اعتبار سے کثیر الجہت، اسلوبیاتی اعتبار سے روشن کہ آپ دیپک جو ہیں ۔ میری رگوں میں دوڑتے، اچھلتے خون میں اتر گئی دس انچ زمین، انسانوں کو پال رہی زمین ایک مگر دیواریں ان گنت، ہم الگ الگ حصے کے وارث کیوں بننا چاہتے ہیں؟ کیوں نہ جنت کو دوزخ میں ملا دیں یارب، سیر کے لیے تھوڑی سی جگہ اور سہی۔۔۔۔ دیپک بھائی ہماری زندگی ریل کی پٹریوں جیسی ہے، مٹی سے جدا ہوئی یہ ریل کی پٹریاں، نئی اور پرانی تہذیبوں سے گزرتی، دوریاں مٹاتی، نیا اتہاس رچتی، نئے کیرتی مان کی عبارت لکھتی، یہ پٹریاں کتنی 'خاموش' رہتی ہیں۔ ٹائر کے چپل پہنے بوڑھے راموچاچا اور ریل کی پٹریوں میں کتنی سمانتا ہے۔۔۔۔ [۳ فروری ۲۰۱۱ء] یہ کہانی صرف دو پڑوسیوں ہی کی نہیں بلکہ دو پڑوسی ملکوں کی بھی ہے۔ ایک کامیاب کہانی اور صداقت سے بھرپور۔

ساجد حمید: [۲۶ جنوری ۲۰۱۱ء] اچھا افسانہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے دلوں میں درار کیسے پڑتی ہے اور یہ رشتوں کو کس طرح بدل دیتی ہے اسے آپ نے فنکارانہ چابکدستی سے بیان کیا ہے حالانکہ یہ بیانیہ افسانہ ہے لیکن اس میں بہت سی پرتیں ہیں۔ اگر عمارت کو استعارہ بنالیا جائے تو یہ افسانہ دور تک لے جاتا ہے۔

سلیم فاروقی: [۲۶ جنوری ۲۰۱۱ء] احساس کو جھنجھوڑنے والی تحریر ہے بدکی صاحب۔ آپ کی یہ 'دس انچ زمین' گویا استعارہ ہے۔ دنیا بھر میں یہی ہو رہا ہے۔ بہت ہی بہترین تحریر ہے، ماشااللہ۔

پرویز بلگرامی: بہت خوب۔ جہاں تک ذہن جائے گا مزہ دوبالا ہو جائے گا، بس پڑوسیوں میں سے ایک کا نام بدلنا پڑے گا۔ بہت مزہ آیا اس رخ پر سوچ کر۔

دیپک بدکی: [جواب: ۲۷ جنوری ۲۰۱۱ء] بھائی نام کیسے بدل دوں وہ تو ایک ہی ماں کے دو

بیٹے تھے۔ پھر ہم بھی تو ایک ہی کلچر کی اولاد ہیں! ہاں آپ جس کو جو نام دینا چاہیں، دے دیجیے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے، ''نام میں کیا رکھا ہے(What is in a name?)

سید تحسین گیلانی: [۲۷ جنوری ۲۰۱۱ء] اصل میں آپ نے پڑوسی کی علامت کا استعمال کر کے بہت اہم بات کی طرف توجہ مرکوز کروائی ہے۔ کہیں کہیں آپ نے واضح اشارے بھی دیے ہیں۔ مگر پڑوسی کی علامت پیٹرن اورینٹڈ(pattern oriented) ہے جو ایک مرکز کی داعی نہیں ...صرف پڑوسی کی علامت ہی کی ڈیپ سٹرکچرنگ(deep structuring) میں اترا جائے تو معنی کے نئے افق روشن ہوں گے۔ عمدہ فن پارہ ہے۔

غلام عباس روحانی: [۲۷ جنوری ۲۰۱۱ء] بہت ہی اعلیٰ تحریر دیپک صاحب۔ واقعی دس انچ کے چکّر میں سارا کام خراب ہو جاتا ہے اور ہم کسی بھی طرح رواداری سے کام لینے کے لیے تیار نہیں ہوتے... کاش ایسا نہ ہو۔ کاش!

صریر خالد: [۲۹ جنوری ۲۰۱۱ء] بہت خوب، قصہ ایسے انداز میں بیان ہوا ہے کہ پڑھنے والے کو یوں محسوس ہو کہ جیسے گردھاری اور جواہر کے بوسیدہ مکانوں کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ لالچ پے بھی چوٹ ہے اور ہمارے عدالتی نظام پے بھی۔ برادری بھول کر ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی چاہتوں کا رونا بھی۔ آپ کے لیے زورِ قلم کی دعا کرنا مناسب نہیں کہ یہ دعا طفلانِ مکتب کے لیے ہے جب کہ آپ ماشاءاللہ استادوں میں سے ہیں۔ میں چونکہ اردو کا طالب علم ہوں اس لیے اپنی دانست کے لیے جاننا چاہوں گا کہ کیا حسد مونث ہے جیسا کہ آپ نے اسے استعمال کیا ہے۔ آپ نے ناخوش گوار گالی کا لفظ استعمال کیا ہے جب کہ ہر طرح کی گالی ناخوشگوار ہوتی ہے، کیا یہ لفظ غیر ضروری نہیں ہے۔ امید ہے کہ آپ رہنمائی کریں گے۔

دیپک بدکی: [۲۹ جنوری ۲۰۱۱ء] شکریہ صریر بھائی۔ آپ نے کہانی اتنی دھیان سے پڑھی، میں آپ کا ممنون ہوں۔ حسد مذکر ہے، غلطی سے مونث استعمال ہوا ہے۔ جہاں تک ناخوشگوار کا تعلق ہے، کبھی کبھی رائٹر emphasis کے لیے ایسے adjectives استعمال کرتا ہے حالانکہ زائد ہے جیسے انگریزی میں very charming لکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر وسیم حیدر ہاشمی، بی ایچ یو، وارانسی [فروری ۲۰۱۱ء] میں نے آپ کے بہت سے افسانے پڑھے ہیں، مختلف رسائل اور جرائد میں۔ دو گز زمین کافی پہلے ہی پڑھ چکا ہوں۔ آج یہ مختصر افسانہ پڑھا تو دل سیر ہو گیا۔ جدیدیت کے بہت سے خواص، زبان، طرز تحریر اور برجستگی نے بہت متاثر کیا۔ ہندستان کے مختصر افسانہ نگاروں کے درمیان آپ کی جو انفرادیت ہے، وہ اس افسانے میں صاف نظر آتی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

شمیم فاروقی: [۱۲۴ اکتوبر ۲۰۱۱ء] ایسا لگتا ہے کہ مکان دونوں پڑوسیوں پر خندہ زن ہے......کیا خوبصورت علامتی افسانہ ہے بھائی۔ دلی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہوا، بہت خوب۔

اقبال حسن آزاد: [۱۲۴ اکتوبر ۲۰۱۱ء] یہ کہانی صرف دو گھروں کی نہیں بلکہ دو ملکوں کی لگتی ہے۔ سیدھے سادے انداز اور مختصر پیرائے میں اک عمدہ تحریر ہے۔

انور جاوید ہاشمی: [۱۳ جون ۲۰۱۳ء] دیپک بدکی نے یہ کہانی اگر دیوناگری میں لکھی ہے تو قابل معافی مگر 'نے کورٹ سے حکم التوا لایا، بیٹی کا ختنہ کروا دیا، راہ عدم اختیار کیا' جیسے الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہاں کے ہاں جذبات و خیالات کی شدت تو ہے روانی میں اردو زبان کے قوائد و عروض سے یہ صرف نظر کر جاتے ہیں۔ کہانی چوکس، بڑھیا اور مبنی بر حقیقت ہے۔ زر، زن، زمین، تینوں ہی فساد کی جڑ اس میں بین السطور موجود ہیں۔

یادوں کی مہک :

اوتار ہوگامی: [۲۷ مارچ ۲۰۱۲ء] یادوں کی مہک رومان پرور کہانی ہے۔ آج کل اکثر لوگ یادوں کی مہک اوڑھ کر زندہ ہیں۔

سرابوں کا سفر :

اسرار احمد رازی 'قاسمی': [۲۷ مارچ ۲۰۱۲ء] آپ نے اس کہانی میں موجودہ معاشرے کی بہترین عکاسی کی ہے۔ بڑا فن کار دراصل وہی ہوتا ہے جو سماج اور معاشرے کے ہر فرد سے اپنے سروکار کا اظہار کرتا ہے۔ اس کلیہ پر یہ کہانی مکمل طور پر اترتی ہے۔

ریزہ ریزہ حیات:

وسیم احمد فدا: [۲۱ اپریل ۲۰۱۲ء] آپ کی ایک اور بہترین کہانی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ کشمیر کے حالات کی بہترین عکاسی فرمائی ہے آپ نے اس کہانی کے ذریعے۔ یہ سچ بات ہے کہ مشاہدہ اور تجربہ کہانی کو حقیقی توانائی عطا کرتا ہے جو آپ کی کہانی کے منظرنامے میں پوری طرح محسوس ہوتا ہے۔..... [۲۳ اپریل ۲۰۱۲ء] کہانی نے بے حد متاثر کیا۔ لالہ کرم چند کے کردار کے توسط سے آپ نے وادی کے حالات کو بہت عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مشاہدہ اور تجربہ کہانی کو اس کی حقیقی فضا سے روشناس کراتا ہے جو کو آپ کی اس کہانی میں صاف طور سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اور میرے خیال میں یہی کامیاب فکشن کی ضمانت بھی ہے۔

قمر سبزواری: [۱۷ اپریل ۲۰۱۲ء] اچھی عکاسی کی ہے وادی کے کربناک و خونیں منظر کی۔ مجھے ایک شدید حسرت ہے کہ کبھی میں وادی کی دکھ بھری کہانی کا دوسرا رخ بھی کسی کی تحریر میں دیکھوں۔ کبھی کسی جبری بنائے گئے آتنک وادی کے نقاب کے پیچھے چھپے ہوئے آنسو بھی کوئی لکھے۔ کبھی کبھی کہیں یہ بھی پڑھنے کو مل جائے کہ کس طرح اپنے گھروں میں ہنستے کھیلتے لوگوں پر لاکھوں فوجی مسلط ہونے کے بعد زندگی اپنی طنزیہ ہنسی ہنستی ہے۔ اپنے ہی وطن میں بے وطن کردیے جانے والے لوگ کیا محسوس کرتے ہیں.

دیپک بدکی: (جواب/ ۱۸ اپریل ۲۰۱۲ء) میری ایک کہانی 'ایک نہتے مکان کا ریپ' شاعر ممبئی میں اس وقت چھپی تھی جب گجرات کی ہوا فرقہ وارانہ فسادات سے مکدّر ہو چکی تھی اور میں خود بروڈہ میں تعینات تھا۔ ایک قاری نے لکھا تھا کہ ''بدکی نے گجرات میں ہوئے مسلمانوں پر ظلم وستم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ افسانہ لکھا ہے۔'' شاعر میں میرا جواب کچھ یوں تھا۔ ''میرے افسانے میں جو باتیں کشمیر کے حوالے سے لکھی گئیں ہیں وہ مجھ پر یا میری برادری پر گزری ہیں اور میں نے بہ حیثیت مفعول کے ان کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ گجرات میں جو ہوا میرے گھر سے دو کلومیٹر کی دوری پر ہوا اور میں نہ ان میں شامل تھا جنھوں نے وہ غیر انسانی فعل کیا اور نہ ان میں شامل تھا جن پر وہ سب کچھ گزرا۔ اس لیے اس ماحول اور ان کرداروں کو پیش کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ ہاں آپ خود لکھیے اور ان پر خوب لکھیے۔ میں تب تعصب کا مرتکب ہوں گا جب میں آپ کے لکھے کو غلط کہوں یا اس کو خیالی قصہ کہانی کہوں۔ اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں کشمیر کا باشندہ ہوں اور ۱۹۹۰ء تک کشمیر میں پیار وخلوص سے رہ رہا تھا مگر غیر یقینی حالات کے سبب

میں ہی کیا سارے کشمیری پنڈت وہاں سے ہجرت کر گئے۔اس وقت تک کیا ہوا میں نے قلم بند کیا ہے، اس کے بعد کیا ہوا اس کا مجھے فرسٹ ہینڈ علم نہیں بلکہ صرف وہی خبریں ہیں جو ہندستانی اور پاکستانی میڈیا مجھ تک پہنچاتی ہیں اور دونوں میں قطبین کا فرق ہوتا ہے۔البتہ اگر آپ کشمیر کے معتبر قلم کاروں جیسے نور شاہ، عمر مجید (مرحوم) اور زنفر کھوکھر وغیرہ کا مطالعہ کریں گے تو شاید آپ کو تصویر کا دوسرا رخ بھی مل جائے گا۔میں نے تینوں کی کہانیوں پر تبصرے کیے ہیں۔اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کشمیر کرائسس کے اسباب کو پیش کرنا یا ان کا تجزیہ کرنا ایک افسانہ نگار کا کام نہیں ہے بلکہ سیاسی تجزیہ نگار کا کام ہے۔

درد کا جنگل :

وسیم احمد فدا: [یکم مئی ۲۰۱۲ء] 'درد کا جنگل' پڑھی۔کہانی نے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انسانی ذہن بے حسی کے کس سٹیج پر پہنچ کر سانس لے گا؟..آپ کی اس کہانی میں رشتوں کی شکست وریخت کا نوحہ بھی ہے اور تیزی سے ختم ہوتی جارہی اخلاقی قدروں کے لیے فکر مندی بھی۔اسی کہانی کے تناظر میں ناچیز کا ایک شعر ہے:

ؔمہر و اخلاص و وفا اور مروت گم ہے جب سے رشتوں کا سفر سود و زیاں تک پہنچا۔

بے حد عمدہ کہانی تحریر کی ہے آپ نے۔حالانکہ مجھے ایسا یاد آرہا ہے کہ اس کہانی کے کرداروں سے شاید کسی اور کہانی میں بھی مل چکا ہوں۔موضوع اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے ایک بہترین کہانی ہے۔

آغا بختیار علی، بلوچستان: [۱۱ مئی ۲۰۱۲ء] آج کے معاشرے کی اصل تصویر ہے۔

لذت خلوت:

وسیم احمد فدا: [۹ مئی ۲۰۱۲ء] کل ٹویٹر پر آپ کی اس کہانی کا لنک دیکھا تھا، لیکن کہانی پڑھ نہ سکا تھا اور بنا تخلیق پڑھے کمنٹ کرنے کو میں ادبی بددیانتی گردانتا ہوں۔آج جی میل اکاونٹ سے آپ کی یہ کہانی پڑھنے کا موقع ملا.....بہت عمدہ کہانی بُنی ہے آپ نے۔عورت کی نفسیات کے اس پہلو کو جان کر حیرانی ہوئی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ محبت کو دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کا ہر انسان کا الگ الگ نظریہ ہے۔

آپ کی کہانی پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات پر آپ کی عمیق نظر ہے۔

ٹھنڈی آگ:

وسیم فرحت کرنجوی، ایڈیٹر سہ ماہی اردو (اردو کوارٹرلی): [۱۶ مئی ۲۰۱۲ء] ٹھنڈی آگ پڑھی۔ بلاشبہ آپ کی کہانیوں میں زندگی بولتی محسوس ہوتی ہے۔ قاری نے کرداروں کے ساتھ ساتھ کہانی کار کو بھی خود میں ضم ہوتا محسوس کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک صرف ایسی ہی کہانیاں قابل اعتنا ٹھہرتی ہیں۔ اور باخدا آپ کی کہانیوں میں یہ عنصر بانفس نفیس موجود ہے۔ تیرے جنون کا خدا سلسلہ دراز کرے۔

وسیم احمد فدا: [۱۶ مئی ۲۰۱۲ء] ٹھنڈی آگ پڑھی، اچھی کہانی ہے۔ کہانی کو پڑھتے ہوئے کہیں کہیں ایسا لگا جیسے شایستہ فاخری کو پڑھ رہا ہوں۔ ان کے اکثر افسانوں میں جنسیات کی ہلکی ہلکی تپش ہوتی ہے۔ اس کہانی کے لیے آپ کو مبارکباد۔ [۱۸ مئی ۲۰۱۲ء] منٹو کے حوالے سے آپ نے جو گفتگو کی ہے اسے میں کلی طور پر متفق ہوں۔ آپ نے صحیح کہا ہے کہ ایسی کہانیوں کے لیے ہیومن بی ہیوئر (انسانی وتیرہ) جانچنا اور کردار سٹڈی کرنا ضروری ہے۔

افلاس کا کوڑھ:

وسیم فرحت کرنجوی: [یکم جون ۲۰۱۲ء] آپ انسانی جذبات کو خوب سمجھتے ہیں۔ اور میں اسے ایک اچھے افسانہ نگار کے لیے از حد ضروری متصور کرتا ہوں۔ لفظوں کے تانے بانے جذبات میں بن کر کہانی کار قاری کے ذہن سے ناتا جوڑ سکتا ہے۔ آپ اس مشکل مرحلے کو بھی نہایت چابک دستی سے طے کر لیتے ہیں۔

وسیم احمد فدا: [۸ جون ۲۰۱۲ء] کہانی پڑھی۔ انسانی نفسیات پر آپ کی عمیق نظر کے حوالے سے ایک بار پھر آپ کی تعریف کرنا چاہوں گا۔ قلبی مبارکباد۔

جزیرے پیار کے:

تصنیف حیدر: [۲۹ اگست ۲۰۱۰ء] افسانہ بہت اچھا ہے۔ خاص طور پر آخر کا جملہ "اور کبھی بھی نہ سوچا کہ غیر مذہبوں کے لیے یہ دعائیں قبول ہوں گی بھی یا نہیں۔" افسانے کا صحیح اور جامع اختتام ہے۔ آپ کے افسانے میں اپنی چھوٹی سی عمر سے پڑھتا آرہا ہوں۔ شاعر، ایوان اردو، اور نہ جانے کتنے رسالوں میں میں نے آپ کو پڑھا ہے۔ نور شاہ صاحب سے تو میری بڑی اچھی پہچان ہے مگر آج تک آپ سے بات کرنے کا موقع حاصل نہیں ہوا تھا۔ افسانے کا موضوع بڑا نازک ہے لیکن اسے آپ نے بخوبی

میں ہی کیا سارے کشمیری پنڈت وہاں سے ہجرت کر گئے۔ اس وقت تک کیا ہوا میں نے قلم بند کیا ہے، اس کے بعد کیا ہوا اس کا مجھے فرسٹ ہینڈ علم نہیں بلکہ صرف وہی خبریں ہیں جو ہندستانی اور پاکستانی میڈیا مجھ تک پہنچاتی ہیں اور دونوں میں قطبین کا فرق ہوتا ہے۔ البتہ اگر آپ کشمیر کے معتبر قلم کاروں جیسے نور شاہ، عمر مجید (مرحوم) اور زنفر کھوکھر وغیرہ کا مطالعہ کریں گے تو شاید آپ کو تصویر کا دوسرا رخ بھی مل جائے گا۔ میں نے تینوں کی کہانیوں پر تبصرے کیے ہیں۔ اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کشمیر کرائسس کے اسباب کو پیش کرنا یا ان کا تجزیہ کرنا ایک افسانہ نگار کا کام نہیں ہے بلکہ سیاسی تجزیہ نگار کا کام ہے۔

درد کا جنگل :

وسیم احمد فدا: [یکم مئی ۲۰۱۲ء] 'درد کا جنگل' پڑھی۔ کہانی نے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انسانی ذہن بے حسی کے کس سٹیج پر پہنچ کر سانس لے گا؟.. آپ کی اس کہانی میں رشتوں کی شکست و ریخت کا نوحہ بھی ہے اور تیزی سے ختم ہوتی جا رہی اخلاقی قدروں کے لیے فکر مندی بھی۔ اسی کہانی کے تناظر میں ناچیز کا ایک شعر ہے:

ے مہر و اخلاص و وفا اور مروت گم ہے — جب سے رشتوں کا سفر سود و زیاں تک پہنچا۔

بے حد عمدہ کہانی تحریر کی ہے آپ نے۔ حالانکہ مجھے ایسا یاد آ رہا ہے کہ اس کہانی کے کرداروں سے شاید کسی اور کہانی میں بھی مل چکا ہوں۔ موضوع اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے ایک بہترین کہانی ہے۔

آغا بختیار علی، بلوچستان: [۱۱ مئی ۲۰۱۲ء] آج کے معاشرے کی اصل تصویر ہے۔

لذت خلوت:

وسیم احمد فدا: [۹ مئی ۲۰۱۲ء] کل ٹویٹر پر آپ کی اس کہانی کا لنک دیکھا تھا، لیکن کہانی پڑھ نہ سکا تھا اور بنا تخلیق پڑھے کمنٹ کرنے کو میں ادبی بددیانتی گردانتا ہوں۔ آج جی میل اکاونٹ سے آپ کی یہ کہانی پڑھنے کا موقع ملا..... بہت عمدہ کہانی بُنی ہے آپ نے۔ عورت کی نفسیات کے اس پہلو کو جان کر حیرانی ہوئی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ محبت کو دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کا ہر انسان کا الگ الگ نظریہ ہے۔ آپ کی کہانی پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات پر آپ کی عمیق نظر ہے۔

ٹھنڈی آگ:

وسیم فرحت کرنجوی، ایڈیٹر سہ ماہی اردو (اردو کوارٹرلی): [۱۶ مئی ۲۰۱۲ء] ٹھنڈی آگ پڑھی۔ بلا شبہ آپ کی کہانیوں میں زندگی بولتی محسوس ہوتی ہے۔ قاری نے کرداروں کے ساتھ ساتھ کہانی کار کو بھی خود میں ضم ہوتا محسوس کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک صرف ایسی ہی کہانیاں قابل اعتنا ٹھہرتی ہیں۔ اور باخدا آپ کی کہانیوں میں یہ عنصر بانفس نفیس موجود ہے۔ تیرے جنون کا خدا سلسلہ دراز کرے۔

وسیم احمد فدا: [۱۶ مئی ۲۰۱۲ء] ٹھنڈی آگ پڑھی، اچھی کہانی ہے۔ کہانی کو پڑھتے ہوئے کہیں کہیں ایسا لگا جیسے شایستہ فاخری کو پڑھ رہا ہوں۔ ان کے اکثر افسانوں میں جنسیات کی ہلکی ہلکی تپش ہوتی ہے۔ اس کہانی کے لیے آپ کو مبارکباد۔ [۱۸ مئی ۲۰۱۲ء] منٹو کے حوالے سے آپ نے جو گفتگو کی ہے اسے میں کلی طور پر متفق ہوں۔ آپ نے صحیح کہا ہے کہ ایسی کہانیوں کے لیے ہیومن بی ہیوئر (انسانی وتیرہ) جانچنا اور کردار سٹڈی کرنا ضروری ہے۔

افلاس کا کوڑھ:

وسیم فرحت کرنجوی: [یکم جون ۲۰۱۲ء] آپ انسانی جذبات کو خوب سمجھتے ہیں۔ اور میں اسے ایک اچھے افسانہ نگار کے لیے از حد ضروری متصور کرتا ہوں۔ لفظوں کے تانے بانے جذبات میں بن کر کہانی کار قاری کے ذہن سے ناتا جوڑ سکتا ہے۔ آپ اس مشکل مرحلے کو بھی نہایت چابک دستی سے طے کر لیتے ہیں۔

وسیم احمد فدا: [۸ جون ۲۰۱۲ء] کہانی پڑھی۔ انسانی نفسیات پر آپ کی عمیق نظر کے حوالے سے ایک بار پھر آپ کی تعریف کرنا چاہوں گا۔ قلبی مبارکباد۔

جزیرے پیار کے:

تصنیف حیدر: [۲۹ اگست ۲۰۱۰ء] افسانہ بہت اچھا ہے۔ خاص طور پر آخر کا جملہ ''اور کبھی بھی نہ سوچا کہ غیر مذہبوں کے لیے یہ دعائیں قبول ہوں گی بھی یا نہیں۔'' افسانے کا صحیح اور جامع اختتام ہے۔ آپ کے افسانے میں اپنی چھوٹی سی عمر سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ شاعر، ایوان اردو، اور نہ جانے کتنے رسالوں میں میں نے آپ کو پڑھا ہے۔ نور شاہ صاحب سے تو میری بڑی اچھی پہچان ہے مگر آج تک آپ سے بات کرنے کا موقع حاصل نہیں ہوا تھا۔ افسانے کا موضوع بڑا نازک ہے لیکن اسے آپ نے بخوبی

نبھایا ہے۔ البتہ کچھ لوگوں کو 'مسجدوں' کے نام پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ عورتیں مسجدوں میں نہیں جاتیں ہیں مگر افسانے کی سطر سے یہ واضح نہیں ہے کہ افسانے کے کرداروں میں سے کون کہاں جاتا تھا اور پھر دونوں ہی کردار اتنے لبرل ہیں کہ امن مسجد میں جاسکتا ہے اور ثمینہ مندر میں۔ مجھے یہ کہانی کلیتاً پسند ہے۔

عذرا قیصر نقوی: [۲۰ ستمبر ۲۰۱۰ء] بہت اچھا افسانہ ہے۔ اسی طرح کی مثبت سوچ اور رویے کی اس عہد پر آشوب میں ضرورت ہے۔

مبصر لطیفی: جذبات کی بہت خوبصورت ترجمانی۔ ''خدا سے کیا شکوہ وہ تو مسلمان تھا، پر مصیبت میں پر ماتما نے بھی میری مدد نہیں کی''۔

فیروز اقبال: [۷ ادسمبر ۲۰۱۰ء] بہت خوب۔ آخری جملے میں بہت ہی معنی خیز اور دانش مندانہ بات کہی ہے آپ نے۔

روشن دھر: [۳ فروری ۲۰۱۱ء] آج آپ کا افسانہ 'جزیرے پیار کے' پڑھا۔ ایسا لگا جیسے ۳۵ سال پہلے سرینگر کے جی پی او/ ڈویژنل آفس میں بیٹھا تھا۔ آپ نے پرانی یادیں تازہ کردیں۔ شکریہ۔ آج آپ کا ڈرائیور راج احمد، مصری صاحب، سیرو صاحب، جو شاید اب اس دنیا میں نہیں ہیں، یاد آئے۔

کیبرے ڈانسر:

طارق احمد صدیقی: [۲۳ جون ۲۰۱۲ء] ابھی آپ کی یہ کہانی پڑھی۔ مرکزی خیال نیا تو نہیں البتہ متاثر کن ہے۔ پورا پڑھنے کے بعد اداسی کا تاثر قائم ہوتا ہے۔ کہانی کے ابتدائی حصے کے انداز بیان میں جوش وخروش پایا جاتا ہے جو درمیان سے بدلنا شروع ہوا ہے اور آخر میں اس میں اداسی پیدا ہوگئی ہے۔ مکالمے زیادہ ہیں۔ کم سے کم مکالموں کے ساتھ خارجی واقعات و مکالمات کے داخلی اثرات (جو راوی کے ذہن پر مرتب ہوئے) کو ادبی پیرائے میں بیان کرنا چاہیے تھا۔ راوی اور کیبرے ڈانسر کی کلب میں ملاقات کے درمیان کا مکالمہ فطری نہیں معلوم ہوتا۔ دوسری ملاقات میں ہی بوسوں تک نوبت پہنچ گئی۔ 'کتے کے بالوں میں ماضی ٹٹولنا' مجھے پتا نہیں کیوں بہت موزوں نہیں لگ رہا ہے۔ البتہ یہ کہانی کے مزاج سے ہم آہنگ ہے اور دلچسپ بھی۔ بھٹے کے مانند ماضی کا دانہ دانہ پھوٹنا اس کہانی کے ماحول میں فِٹ نہیں بیٹھ رہا ہے۔ البتہ یہ بھی دلچسپ ہے۔ ایسے تجربات جاری رکھیے۔ راوی اور کیبرے ڈانسر میں جدائی بھی اتنی

جلدی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ یہاں تک کہانی کا پہلا حصہ ہے۔ تبادلے کے بعد کا حصہ اتنا مختصر نہیں ہونا چاہیے تھا۔راوی کی کیبرے ڈانسر سے آخری ملاقات کی منظر کشی اور مکالمہ متاثر کن ہے۔ کہانی اخلاقی نوعیت کی ہے اور کچھ سبق آموزسی معلوم ہوتی ہے۔'مانگے کا اجالا' کا جو اسلوب ہے وہی اس کہانی کا بھی ہے۔اسلوب میں مزید ادبیت اور تجربہ لاتے رہیں۔آپ نے موپاساں، چیخوف، او ہنری وغیرہ کے افسانے ضرور پڑھے ہوں گے۔ان لوگوں کی کہانیاں دل پر اتنا اثر کیوں کرتی ہیں؟ آپ ان کی طرح لکھیں۔میں یہ نہیں کہتا لیکن قاری کے دل پر اثر کرنے اور دماغ کو چونکانے کی کوشش ضرور کریں۔

دیپک بدکی: (جواب): سب سے پہلے اتنا بتاتا چلوں کہ یہ کہانی ایک سچی کہانی ہے اور اس کے کردار اور مکالمات حقیقت سے بہت قریب ہیں۔رہا سوال وقت کا۔ بھائی پیار جتانے اور اس کو تکمیل تک پہنچانے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ہاں ہمارا مشرقی ذہن چونکہ کنڈیشنڈ ہو چکا ہے اس لیے میٹروپولیٹن شہروں کی تیز زندگی کے بارے میں سوچنے سے گھبراتا ہے۔کہانی کی روانی اس کی بنت پر منحصر ہوتی ہے۔ زندگی میں ملنے، پیار جتانے، پیار میں ڈوب جانے اور پھر جدا ہونے میں وقت کی پابندی نہیں ہوتی۔کبھی تو برسوں دو پریمی ایک دوسرے کو اپنے دل کی بات نہیں بتا پاتے اور کبھی یہی کام منٹوں میں ہو جاتا ہے۔ پھر بچھڑنے میں کیا ہے، باپ کی ٹرانسفر ہوگئی یا خود ٹرانسفر ہو گئے قصہ ختم۔ جہاں تک اسلوب کا سوال ہے میں نے موپاساں اور چیکوف دونوں کو پڑھا ہے۔دونوں کا اسلوب جدا ہے اور دونوں موضوع کو الگ الگ طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ہاں رہی بات چونکانے والی۔یہ طریقہ موپاساں اور منٹو نے خوب استعمال کیا ہے مگر اس کے بعد افسانہ نگاروں نے اس کو آہستہ آہستہ ترک کر دیا تاکہ افسانے سے میلو ڈرامائیت ختم ہو جائے۔آپ کے تاثرات پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔امید ہے کہ آئندہ بھی آپ اسی طرح اپنی رائے دیتے رہیں گے۔

مجموعہ روح کا کرب :

ٹکڑوں میں بٹی زندگی : (اردو افسانہ فورم/ دلت فکشن/ ۵/ اپریل ۲۰۱۶ء)

خورشید طلب:[اردو افسانہ فورم/ دلت فکشن/ ۵/ اپریل ۲۰۱۶ء] بہت اچھا افسانہ ہے۔عموماً افسانہ نگار ہمیں ہمارے مسئلوں سے روبرو کراتے ہیں اور بس۔مگر اس افسانے میں فاضل مصنف نے دو

قدم بڑھ کر ہمارے مسئلے کا حل بھی ہمیں بتایا ہے۔ متاثر کرنے کے پچھڑے طبقے میں اصل مسئلہ ہے تعلیمی فقدان...اور یہی کام میکھلا اس افسانہ میں کرتی ہے۔...اچھا اختتام۔ دیپک بُد کی ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ ان سے ایسے ہی افسانہ کی توقع تھی۔

ارشد اقبال [اردو افسانہ فورم/ دلت فکشن/ ۵/اپریل ۲۰۱۶ء]: دیپک بُد کی صاحب ایک منجھے ہوئے افسانہ طراز ہیں۔ زیر نظر افسانہ بھی ایک کامیاب تخلیق ہے۔ افسانہ مجھے ذاتی طور پر اس معنوں میں خاص معلوم ہوا کہ فاضل افسانہ نگار نے دلت طبقوں سے متعلق تعلیمی فقدان اور دیگر گوناگوں اہم مسائل کی جانب اشارے کیے ہیں۔ ساتھ ہی ان کے حل کی نشاندہی بھی کی ہے۔ یعنی مصنف مقصدیت کے قائل ہیں اور یہی خوبی افسانہ منفرد بناتی ہے۔

سلیم انصاری: [اردو افسانہ فورم/ دلت فکشن/ ۵/اپریل ۲۰۱۶ء] دیپک بُد کی کے اس افسانے کی شروعات اگرچہ بہت مؤثر ڈھنگ سے نہیں ہوئی اور افسانے کا عنوان بھی بہت زیادہ متاثر کرنے میں ناکام ٹھہرتا ہے مگر افسانہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے ایک بڑے کینواس پر پھیلتا جاتا ہے، اپنے خوبصورت بیانیہ کے سبب زندگی کے مختلف رنگوں کو عمدگی سے پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ خاص طور پر میکھلا کا کردار پورے افسانے کو پاورفُل بنا دیتا ہے۔ آخر میں میکھلا کا والینٹیر لی ریٹائرمنٹ لینا افسانے کو نئی بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔

عاکف محمود: [اردو افسانہ فورم/ دلت فکشن/ ۵/اپریل ۲۰۱۶ء] بہت اچھا بلکہ یہ کہنا چاہوں گا حیرت انگیز بیانیہ ہے۔ مصنف کی گرفت تکنیکیں بدلتے ہوئے بھی کہیں ڈھیلی نہیں ہوئی۔ کہانی نے اپنے آپ کو پڑھوایا۔ لیکن مصنف پر جبر کے سائے اس افسانے میں بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

مرکزی خیال سے گریز پائی اور قدرے دوری بنا کر لکھنے کی مجبوری سانجھی دکھائی دے رہی ہے جس سے حقیقت کے گھناونے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ دلتوں اور پچھڑے ہوئے لوگوں کے لیے لکھنے والوں کے لیے میرا اسلام۔ یہ تو ممکن ہے کہ 'ذلتوں کے مارے لوگ' جیسا کوئی شاہ کار جنم نہ لے لیکن اسی بنیاد پر شاندار عمارتیں بھی تعمیر ہوسکتی ہیں۔

امین بھیانی: [اردو افسانہ فورم/ دلت فکشن/ ۶/اپریل ۲۰۱۶ء] بے حد متاثر کن افسانہ اور بے

حدرواں بیانیے کے ساتھ بھرپوراوراہم ترین موضوع نے افسانے کو چار چاند لگادیے۔کرداروں کے پس منظر کے لحاظ سے مکالمے نہ صرف عمدہ ہیں اوران میں استعمال شدہ ہندی بھی سونے پر سہاگا ہے۔البتہ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ راوی کے بیان میں جا بجا ہندی لفظوں کا استعمال ایک اردو افسانے میں بلاوجہ اور قدرے ثقیل محسوس ہوتا ہے۔

سیّداعظم شاہ:[اردو افسانہ فورم/ دلت فکشن/ ۶/اپریل ۲۰۱۶ء] معاشرے کے دوطبقات کی کشمکش۔ جہاں اثر ورسوخ جیت جاتا ہے اور انسانیت کو جیتنا پڑتا ہے۔ایک بہت ہی سادہ بیانیہ جسے پنچ لائن ایک اچھا افسانہ بنا دیتی ہے۔وہی کارتک اگروال لوگوں کی بھیڑ میں میکھلا کا انتظار کرتا رہ گیا جو اس سے قبل اپنی اونچی ذات اور مرتبے کے بل بوتے پر اس سے جیت گیا تھا۔لیکن اس دفعہ فتح میکھلا کی نہیں انسانیت کی تھی۔ذات پات کے سارے بُت اس کے آگے باادب کھڑے تھے۔بلاشبہ یہ کارنامہ تعلیم نے سرانجام دیا۔دوزخی نظام کا خاتمہ صرف لیڈرشپ سے ہوتا ہے۔اور لیڈرشپ کے لیے رنگ، نسل، عہدہ، منصب اور سماج کی نام نہاد حدود وقیود سے بالاتر ہوکر آگاہی کی منزل کی طرف پیش رفت کرنا پڑتی ہے۔ قوم کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا پڑتا ہے۔

قاضی نیّرعلی خان:[اردو افسانہ فورم/ دلت فکشن/ ۶/اپریل ۲۰۱۶ء] میں مبارک باد دیتا ہوں بُد کی صاحب کو اس افسانے پر کہ انھوں نے بہت ہی سلجھے ہوئے انداز میں سماج کے اس طبقے کے ساتھ ہو رہے ستم کی طرف اشارہ کیا ہے۔میرا تعلق مہاراشٹر کے ناگپور شہر سے ہے۔وہی ناگپور...... جہاں پر ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر نے دلت سماج کو ہندو مذہب سے نکال کر آزادانہ بُدھ مذہب اختیار کر لینے کی ہدایت دی تھی۔ناگپور اور اس کے اطراف میں خصوصاً وِدربھ کے دیہی علاقوں میں دلت سماج کی اکثریت ہے۔آزادی کے ۶۷ سالوں کے بعد بھی یہ سماج اوران کے علاقے بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔میں نے محسوس کیا کہ ان کے وہ لیڈر جو حکومت سے قربت رکھتے ہیں، وہ بجائے ان سہولتوں کی مانگ کے، باباصاحب کے پُتلوں کی مانگ کرتے ہیں۔چنانچہ ان علاقوں میں ان پتلوں کی بہتات ہے جبکہ بنیادی سہولتیں آج بھی نہیں ہیں۔بچّے میلوں دور پیدل اسکول جاتے ہیں۔بجلی پانی نہیں۔ حکومت ان کی مانگ پر لاکھوں روپئے کے پُتلے تو کھڑے کردیتی ہے لیکن کوئی اور سہولت نہیں دیتی۔میں

نے میرے کئی دلت دوستوں کی توجہ اس طرف دلائی ہے کہ آپ پتلوں کی مانگ نہ کریں بلکہ حکومت سے سیدھے سہوتوں کی مانگ کریں۔

محمد احسان الاسلام: [اردو افسانہ فورم/ دلت فکشن/ ۶/اپریل ۲۰۱۶ء] یہ آپ نے کیا لکھ دیا؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ مسلمانوں کے سامنے کتنا سنگین مسئلہ درپیش ہے؟ چودہ سو سالوں میں ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ سلام بیٹھ کر پڑا جائے یا کھڑے ہو کر۔ یا کہ نبی کریمؐ بشر تھے یا نہیں؟ اور آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان آسام یا چھوٹا ناگپور کے گھنے جنگلات میں جا کر اسلامی مشنری (ادارے) چلائیں۔ مسلمان جہادی قوم ہے وہ خودکُش بمبار بن کر سیکڑوں جانیں لے سکتا ہے لیکن آپ اسے برسوں قبائیلوں کے درمیان رہ کر ملیریا یا جاپانی اینسیفلائٹس مچھروں کا شکار بنوا کر گمنامی کی موت مارنا چاہتے ہیں۔ ارے آپ کو تو یہ بھی پتہ نہیں کہ ہندو قوم کا ہیرو صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو کسی پادری کو اس کے اہل خاندان کے ساتھ زندہ جلا ڈالے یا وہ شخص جو دھرم کے نام پر اپنا پروڈکٹ بیچنے کی صلاحیت رکھتا ہو یا جو مسلمانوں کو اس دیش کا واحد دشمن ثابت کر ووٹ بٹور لے جائے۔ لگتا ہے آج کل آپ کچھ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہیں، بالکل میری طرح۔

انجم عثمان: [اردو افسانہ فورم/ دلت فکشن/ ۷/اپریل ۲۰۱۶ء] دیپک بُدکی صاحب طرز افسانہ نگار ہیں اور انھوں نے بڑی چابکدستی سے اپنے افسانے کے تانے بانے بُنے ہیں۔ ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ جہالت ہے۔ لیکن پھر معاشرے میں ایسے اولوالعزم لوگ بھی شامل ہیں جو اس برائی کے خلاف بھرپور جدوجہد کر رہے ہیں۔ افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے مسائل اور ان کا حل پیش کیا ہے۔

صدف اقبال: [اردو افسانہ فورم/ دلت فکشن/ ۸/اپریل ۲۰۱۶ء] دیپک بُدکی صاحب منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں اور ان سے مجھے اسی قسم کے بہترین افسانے کی توقع تھی۔ سماج کی برائیوں کے خلاف جنگ کرتا ہوا یہ افسانہ ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ سماج میں بہت سارے ایسے مسائل ہیں جن پر کم لکھا گیا ہے یا تخلیق کار ان موضوعات سے آنکھیں چراتے رہے ہیں۔ دیپک بُدکی نے ایک بہت بڑا سوال قارئین کے لیے چھوڑ دیا ہے جو دلوں کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے۔

علی نثار: [اردو افسانہ فورم/ دلت فکشن/ ۱۲/اپریل ۲۰۱۶ء] دیپک بُدکی کی اردو افسانہ نگاری کا

ایک بہت بڑا نام ہے۔ زیرِ نظر افسانہ اپنی تمام تر خوبیوں کی بدولت قاری کو متاثر کرتا ہے۔ میکھلا کا کردار ان ساری نچلی ذاتوں کی نمائندگی کرتا ہے جو دبے کچلے طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندو مائیتھولوجی اور تاریخ سے واقف کار ہیں۔ ''یہ بھید بھاؤ ہمارا ورثہ ہے۔ درونا چاریہ نے اکلویہ کا انگوٹھا اس لیے کٹوایا تھا تاکہ اس کے کھشتری شاگرد کو قبائل ذات سے منہ کی نہ کھانی پڑے۔ بھگوان رام نے شبری کے ہاتھ کے بیر تو کھالیے مگر اس کی اور اس جیسے لوگوں کی حالت سدھار نہیں پایا۔'' افسانہ ہر لحاظ سے عمدہ لکھا ہے۔

اقبال حسن آزاد: ایک عمدہ مقصدی افسانہ جس کی پلاٹ سازی بڑی محنت کے ساتھ کی گئی ہے

سید حسین تاج رضوی: میں نے اس افسانے میں افسانہ نگاروں کے لیے ایک پیغام بھی پایا۔ افسانہ صرف لفظی بازیگری یا مسائل کا طائرانہ جائزہ نہیں۔ کسی بھی کہانی کے شاہکار ہونے کے لیے کہانی کار کا موضوع کے اندر اترنا، کرداروں کی نفسیات کو اجاگر کرنا، اور کلائمکس پر مثبتیت کو موت سے بچالینا۔

طلسمی عینک:

خورشید حیات: [یکم ستمبر ۲۰۱۱ء] طلسمی عینک کے اندر جال سے ابھی نکلا ہوں۔ دیپک بدکی کی اصل زمین کہانی ہے، مگر کہانی کی زمین سے باہر نکل کر بھی انھوں نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ اس موضوع پر بھی کہانیاں لکھی ہیں جسے شجر ممنوع سمجھ کر تخلیقی فن کاروں نے نظر انداز کیا، بدن کی جمالیات کی بات خوب ہوئی مگر چنار کی نہیں، ابلتے میٹھے پانی کی نہیں ...یہ کہانی ابلتے ہوئے چشمے کی طرح اور بہتی ہوئی ہواؤں کی طرح میرے قریب پہنچ گئی، بہت قریب، کہانی جب خود سے قاری کے پاس پہنچ جائے، وہ کہانی کامیاب ہوتی ہے۔...کہانی کے کردار بدرالدین اور اس کی عینک کا ذکر ابھی باقی ہے۔...کہانی میرے پاس بیٹھی ہے، اور بدرالدین مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ کردار کو اک نئی آواز دیپک بدکی بڑی خاموشی سے عطا کر گئے ہیں۔ کہانی کا کردار آگے ہے اور کہانی کار پیچھے۔ کہانی کار اگر آگے چلتا تو کہانی پھسل جاتی... اور دلیپ کمار کی طرح بدرالدین چلاتا ہوا دکھائی دیتا....ارے کوئی ہے..ہے بھائی...!!! مگر ایسا اس کہانی میں کچھ نہیں ہوا...کہانی قاری کو ساتھ ساتھ لے کر چلتی رہی...اور میں then اور then کی کیفیت سے گزرتا رہا۔ چند بنیادی علامتوں/ استعاروں کے ہمراہ کہانی بیانیہ روانی کے ساتھ بہہ رہی تھی، رنگین چشمے سے جو منظر بڑا خوبصورت دکھائی دے رہا تھا اور..اور وہ جوبازی گر شراب اور شباب کی محفلوں میں شانتی کو

تلاش رہے ہیں...وہ شانتی ٹو اشانتی کے بحث میں براجمان تھے۔ازل سے یہی ہوتا آیا ہے، شانتی اشانتی کے بھیس میں سمانت ہوتی ہے اور طلسماتی عینک 'جہنم' کے منظر کو بھی جنت کی پوشاک پہنا دیتا ہے...مگر سچ تو سچ ہوتا ہے۔اب میں ایک بڑے شاعر کی طرح یہ کیسے کہوں، "کیوں نہ جنت کو دوزخ میں ملا دیں یارب، سیر کے لیے تھوڑی سی جگہ اور سہی"... جہنم میں آگ خود آدمی لے کر گیا...اور جنت بھی حسیں اپنے کرموں سے...اور یہ دنیا، یہ زمین، یہ نہر، یہ چشمے، یہ جھیلیں، حسیں کب دکھائی دیتے ہیں...؟......ابھی میں اتنا ہی لکھ پایا تھا کہ آواز آئی "دیکھو وہ جو بہار سے مولوی صاحب آئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو سکول بھیجنا ٹھیک نہیں"....کتنا سچا فن کار اور اس کا فن....یہ سچ ہے کہ بہار کے مولوی ہر جگہ...اب یہاں سے ایک اہم مسئلہ...مولوی/امام کسے بنانے کہاں گیا تھا۔کیا شریعت تھی...کہانی میں کئی شیڈس ہیں..اگر آپ مجھے بہکنے کی اجازت دیں تو تھوڑا سا میں لڑکھڑانا چاہوں گا۔علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے اور اس فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی آخرت میں جواب دہی کا باعث ہے...اس کہانی کا کہانی کارناستک ہے.... مگر لاشعوری طور پر، انڈر کرنٹ (زیریں لہر) انسانیت کی زمین سے جڑی کئی اہم باتیں سامنے آگئی ہیں.. ویسے..لا کے بعد ہی اِلا...اپنی بیوی سے الگ دور دراز علاقوں میں یہ جو مولوی صاحب امامت کر رہے ہیں کیا یہ جائز ہے؟اب آپ سب کہانی کو پھر سے پڑھیں...اُس مقام سے جہاں مولوی لڑکیوں کو تعلیم سے روکنا چاہتا ہے۔دیپک بدکی جی کی کہانی کا کینوس بہت وسیع ہے..اس لیے آپ سب سے گزارش ہے میری کہ ہر لفظ کا چہرہ قریب سے دیکھیں۔الگ الگ کردار کے ہر جملوں، مکالموں کے امتزاج سے، حالات اور ماحول کا ایک الگ چہرہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔نیچرلزم.....جو کچھ جیسا تھا، جیسا ہے اسے طلسماتی عینک نے دکھا دیا۔دانشمندانہ شعور کی objectivity (معروضیت) کو subjective (موضوعیت) انداز میں پیش کرنے کا ہنر دیپک بدکی جی کو خوب آتا ہے۔اردو کہانی کو نئی وسعتوں سے روشناس کرانے والے کہانی کار آپ سلامت رہیں کہ اردو میری جان تم دیپک کے آنگن میں محفوظ ہو۔

ابرار مجیب: [یکم ستمبر ۲۰۱۱ء؛ اردو افسانہ فورم پر تعارفی نوٹ] اردو افسانہ نگاروں کی نئی نسل کے درمیان دیپک بدکی کی اپنی مخصوص شناخت ہے۔بدکی نے جموں و کشمیر کے اس رخ کو بھی دکھانے کا فرض انجام دیا ہے جس سے اردو افسانہ کا دامن خالی نظر آتا ہے۔جموں و کشمیر کے براہمنوں کی مہاجرت اپنے

آپ میں تقسیم ہند کی ہجرت سے کچھ کم بڑا تاریخی جبر نہیں۔اس موضوع سے روگردانی کو تاریخ ایک ادبی بد دیانتی کے طور پر دیکھے گی۔دیپک بدکی نے کسی حد تک اس کمی کو پورا کیا ہے۔بدکی صاحب ایک ریٹائرڈ آئی پی ایس آفیسر ہیں اور بیک وقت ایک اچھے افسانہ نگار اور نقاد ہیں۔(افسانے پر تاثرات) طلسمی عینک اس حقیقت کا شاخسانہ ہے جہاں غربت انسانی سوچ کو پستی کی اس سطح پر لے آتی ہے کہ وہ مسلسل سنہرے خوابوں کی فنتسی میں خود کو بالآخر ایک دردناک عذاب میں گرفتار پاتا ہے۔طلسمی چشمہ سے نجات دراصل ان خوابوں سے نجات ہے جن کی کوئی تعبیر نہیں۔کہانی میں Marquez کی جادوئی حقیقت نگاری کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔گو کہ یہ افسانہ بنیادی طور پر حقیقت پسندی کی روایت سے وابستہ ہے۔

میں انّا ہوں :

عالم خورشید [۲۹ نومبر ۲۰۱۲ء] بہت نرمی اور سنجیدگی کے ساتھ کرپشن اور اس کی جڑوں پر وار کرتی ہوئی، خوبصورتی سے بُنی گئی کہانی۔

ترند :

ارشد نیاز: [۱۴ ستمبر ۲۰۱۲ء]: اچھی کہانی ہے۔باثر بھی۔

یونین لیڈر :

سہیل احمد صدیقی: [۱۷ اکتوبر ۲۰۱۲ء] بہت عمدہ اور مؤثر افسانہ تحریر کیا آپ نے۔مبارکباد۔

افسانے جو ابھی تک کتابی صورت میں پیش نہیں ہوئے :

اپنے اپنے زاویے : (مطبوعہ سہ ماہی تریاق ممبئی؛ فروری ۲۰۱۶ء)

عالم خورشید: [۲۸ فروری ۲۰۱۶ء] حالات کی اچھی اور سچی عکاسی! غور و فکر کے لیے آمادہ کرنے والی بہت اچھی کہانی!

سہیل احمد صدیقی: [۲۸ فروری ۲۰۱۶ء] برمحل ہے۔

اب میں وہاں نہیں رہتا : (مطبوعہ آجکل اردو؛ فروری ۲۰۱۶ء)

شمع افروز زیدی، ایڈیٹر ماہنامہ بیسویں صدی، نئی دہلی: [آجکل اردو، اپریل ۲۰۱۶ء] دیپک بُدکی صاحبِ طرز ادیب ہیں۔'اب میں وہاں نہیں رہتا' افسانے میں وہ بہت خوبصورت انداز میں قاری کو

یادوں کے جزیروں میں لے گئے ہیں۔ ساتھ ہی اس کہانی کے ذریعہ انھوں نے بعض بے حد اہم گوشوں کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ مثلاً ڈاکیہ اب ڈاک نہیں لاتا، لوگوں کے پاس خط لکھنے پڑھنے کی فرصت ہی نہیں، موبائیل پر دنیا بھر کی باتیں کر لیجیے۔ افسانے کی ایک ایک سطر قابل توجہ ہے۔ اس میں گھر سے دوری کا کرب ہی نہیں گزرے زمانے کا نوحہ بھی ہے۔ چار منزلہ لکھوری اینٹوں سے بنا گھر، درودیوار سے اٹھتی سوندھی سوندھی خوشبو، راشن لانا، گھاسلیٹ کی خاطر قطار سے کھڑا ہونا وغیرہ جب کہ موجودہ دور میں گھر بیٹھے ٹی وی میں دیکھ کر یا موبائیل کے ذریعے آرڈر کر دیجیے سب کچھ گھر بیٹھے حاصل، لیکن دلوں میں وہ چین، آرام اور سکون میسر نہیں۔ بظاہر مسکراتے چہرے اندر سے بے چین و بے قرار رہتے ہیں۔ اس کہانی میں دیپک بُدکی نے قدیم وجدید کا فرق بھی بے حد خوبصورت ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ ایک ایک سطر لائق توجہ ہے۔ اس شمارے کے تعلق سے بہت کچھ کہنے کو ہے لیکن طوالت کے خوف سے اپنی بات یہیں ختم کرتی ہوں۔

مشتاق جاوید، مٹیابرج، کولکاتہ: [آجکل اردو، اپریل ۲۰۱۶ء]؛ معروف افسانہ نگار انیس رفیع اور دیپک بُدکی کی کہانیاں عصری احساسات وجذبات کی ترجمان ہیں۔ ان کی کہانیوں میں آج کے انسان کا دل دھڑکتا ہے۔

ایم نصیر، مالیر کوٹلہ، پنجاب: [آجکل اردو، اپریل ۲۰۱۶ء]؛ افسانوں میں 'اب میں وہاں نہیں رہتا' ایک معاشرتی المیہ ہے جسے افسانہ نگار نے بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ بقول شاعر:

یہ تو ہونا ہی تھا بیٹوں میں بٹوارا کر کے
باپ زندہ ہے گھر میں ٹوٹی چھت کی طرح

کلدیپ جوشی، فرید آباد [آجکل اردو، مئی ۲۰۱۶ء]؛ دیپک بُدکی کی کہانی 'اب میں وہاں نہیں رہتا' نے کافی متاثر کیا۔ حالات سے مجبور ہو کر بار بار نقل مکانی کرنے والے لوگوں کی نفسیات کی خوب عکاسی کی ہے۔

پرویز مانوس بٹ: [فیس بک ۱۳ فروری ۱۶ء] دیپک بدکی صاحب آپ کا افسانہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا' آجکل میں پڑھا۔ ذہن ودل پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ آپ نے نہایت ہی عمدہ طریقے سے پوری قوم کے ماورا کرب کو بیان کر کے قوم کا حق ادا کیا ہے۔ جس کے لیے آپ مبارک باد

کے مستحق ہیں۔

مجیر احمد آزاد: (ایس ایم ایس) آپ کی کہانی 'اب میں وہاں نہیں رہتا' آجکل دہلی کے فروری شمارے میں پڑھی۔ پسند آئی۔ ایک درد کی لہر سی دوڑ گئی ذہن و دل میں۔ آپ نے حقیقت کو افسانے کا رنگ دیا ہے۔ یہ رنگ ذہن پر دیر تک چڑھا رہے گا۔ مبارک ہو۔ ایک عمدہ تخلیق۔

مجموعہ مٹھی بھر ریت (افسانچوں کا مجموعہ)

افسانچہ- مستقبل :

سہیل احمد صدیقی: [۱۲/اگست ۲۰۱۴ء]: آپ بجا کہتے ہیں۔ مغرب سے مستعار اس نثری صنف کے فروغ کے لیے کافی تکنیکی محنت درکار ہے۔

صباحت (پاک ۷۸۷ پاک): [۱۲ /اگست ۲۰۱۴ء] دیپک صاحب میں نہیں سمجھتا کہ پاکستان میں 'افسانچہ' کا مستقبل روشن ہے۔ قاری کی عدم دلچسپی یا پھر شاید رائٹر کی بے توجہی کی بدولت افسانچہ خود پر سے لطیفہ گوئی کی تہمت نہ اتار سکا۔ اور میرے خیال میں تو دیپک صاحب نثری نظم کا پاکستان میں ارتقا افسانچہ کی صنف کو لے ڈوبے گا۔

سچ کی تلاش :

اقبال حسن آزاد: [۱۸ اکتوبر ۲۰۱۱] آج میں نے آپ کی کئی منی کہانیاں پڑھیں، ہر کہانی کا الگ موضوع، ہر کہانی کا الگ لطف، واہ!

ظہیر جاوید: [۳۰ نومبر ۲۰۱۰] زندگی جھوٹ کا سمندر ہے... اس میں سچ تلاش کرنے والوں کے ہاتھ صرف تضاد ہی آسکتا ہے۔ سچ ابدیت اور عبودیت میں ملے گا.... پتہ نہیں آپ کے پاس کون سا صحیفہ ہے..... خوش رہیں۔

سبودھ لال: [۳۰ نومبر ۲۰۱۰] اپنا ایک پرانا شعر لکھ رہا ہوں:

جب سزا مجھ کو سنائی گئی سچائی کی　　　سننے والوں میں ماتم نہ اچنبھا دیکھا

پرویز بلگرامی: [۳۰ نومبر ۲۰۱۰] واہ جناب.... صحیفۂ زندگی کا ایسا آئینہ... چہرہ شناسی کا دعویٰ کرنے والے بھی کبھی کبھی دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

عزیز نبیل: [یکم دسمبر ۲۰۱۰] بہر حال آپ کی یہ تین سطریں.... بحث و مباحثہ کا طویل سلسلہ برپا کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ معمولی نہیں ہیں۔

فرحت پروین: [۲ دسمبر ۲۰۱۰] ہاں ایسا ہی ہے۔ میرا سچ آپ کے لیے جھوٹ اور آپ کا سچ میرے لیے۔ جب کہ دونوں کے سچ سچے ہیں۔ سچ وہی ہے جسے دل مانے، جو آپ کے اندر سے اٹھے۔ اپنے سچ کو مانو اور مست رہو، دوسروں کے سچ سے تقابل نہ کرو۔ ہے نا؟

ایم اے حق: [۳۱ دسمبر ۲۰۱۰] مختصر میں بہت بڑی بات، دل خوش ہو گیا۔

اختر صاحب: [۸ جنوری ۲۰۱۰] جناب، دونوں ایک ہی خدا کے لیے لڑ رہے ہیں حالانکہ دونوں بے خبر ہیں۔ یہ رویہ لوگوں کے ذہنوں میں بچپن سے ہی ڈالا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی کو سچائی کے بارے میں علم نہیں ہے اور کوئی منطق کو سننا ہی نہیں چاہتا ہے اور لطف تو اس بات کا ہے کہ کوئی صحیفہ میں لکھی گئی باتوں پر عمل نہیں کرتا۔.....سچائی کے بارے میں کسی کو علم نہیں ہے اور سچائی نہ کڑوی ہوتی ہے اور نہ میٹھی، بس سچائی ہوتی ہے اگر وہ ہو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے اگر ہو تو۔

نیکی :

عالم خورشید: [۱۸ جون ۲۰۱۳ء] بہت کم الفاظ میں آپ نے ایک بڑا منظر نامہ خوبصورتی سے سمیٹ لیا ہے جناب! بہت ہی خوب ہے!

ممنوع راستہ :

گرنام سنگھ شیر گل: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] بڑا ٹیڑھا سوال کر دیا آپ نے۔ میں ہوتا تو وہی کرتا جو آپ کر رہے ہیں۔ کوئی کام جو نیک نیتی سے کیا جاتا ہے وہ غلط نہیں ہوتا۔ آپ کا کام جائز ہے جب تک آپ کو انتظامیہ جسمانی طور پر روک نہ لے۔

مبصر لطیفی: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] یہ انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ جس کام سے اسے منع کیا جائے، وہ ضرور کرتا ہے۔ 'جرم آدم نے کیا اور سزا بیٹوں کو...!'

صلاح الدین حیدر: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] ہماری بے حسی کا یہ عالم ہمیشہ سے ہی رہا ہے۔ ہم بادشاہ لوگ ہیں، جو جی میں آئے کریں گے، کون پوچھتا ہے۔

رمیش مہتا: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] انسان آسان راستوں کا ہمیشہ سے عاشق رہا ہے حضور۔ تختی ہو یا نہ ہو!

نصیر احمد ناصر: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] شارٹ کٹس (چھوٹے راستوں) کی عادت اور ممنوعہ راستوں پر چلنے کی نفسیات اجتماعی ہے۔

مدیر، سہ ماہی عطا: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] لفظ 'شارع عام' کا ہمیشہ غلط مطلب نکالا جاتا ہے۔ اگر سڑک کا دوسرا سرا کھلا ہے، موقع مل جائے اور کوئی شناختی کارروائی نہ ہو، پھر یہ شارع خاص نہیں رہ جاتی ہے۔ یہ قانونی طور پر تب ممکن ہے جب دوسرا سرا بند ہو۔

عالم خورشید: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] آپ نے بے حد کم لفظوں میں حالات کی بہت سچی فوٹوگرافی فن کاری کے ساتھ پیش کی ہے۔ بہت خوب!

محمد صادق: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] افسانے کے کردار کی بے بسی اور فیکٹری والوں کی بے حسی۔ دونوں ہی نے قانونی کارروائی کیے جانے والے بورڈ کا نہیں بلکہ قانون کا لحاظ نہیں رکھا۔ اور قانون کی اہمیت اور اس کے احترام کو بالائے طاق رکھ کر اپنی تن آسانی کا ثبوت پیش کیا ہے اور اس طرح اخلاقی مجرمین کی صف میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ ملک میں رہنے والا ہر شخص اس طرح کے انداز اختیار کرتا رہے گا تو بہت جلد اس کا معاشرہ انتشار کا شکار ہو کر بدامنی اور لاقانونیت کا ہم مزاج ہو جائے گا۔ اور تہذیب و شائستگی کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ ہر وہ شخص جو قانون اور انصاف کا دامن چھوڑ دیتا ہے وہ سب سے بڑا ظالم ہوتا ہے جو نہ صرف غیر محسوس طریقے سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی چلاتا رہتا ہے بلکہ اوروں کی زندگیوں کو بھی تباہ و تاراج کر دیتا ہے۔ بہت ہی سادہ اور مختصر انداز میں لکھا گیا یہ افسانہ ایک تاریخی حقیقت کا انکشاف اور اکتشاف کرتا ہے۔

فرحت پروین: [۱۵ نومبر ۲۰۱۰ء] وہ نوٹس بورڈ آج تک وہیں لٹکا سوچ رہا ہے کہ 'خلاف ورزی کرنے والا قانون کو للکار رہا کہ دیکھو تم سچ مچ ہی اندھے ہو، مجھے روز گزرتا دیکھ کر کوئی کارروائی نہیں کرتے۔ اب کوئی خلاف ورزی کرنے والے سے پوچھے کہ اچھے شہری کے بھی کچھ فرائض ہوتے ہیں جو بغیر پکڑے دھکڑے جانے کے، دھمکی یا خوف کے از خود پورے کرنے چاہئیں۔ اسے کوئی احساس جرم

نہیں ہے۔شکایت ہے تو قانون سے جو نوٹس نہیں لیتا۔ میرے خیال میں تو دونوں اندھے ہیں۔ میرا ہونا نہ ہونا دونوں کے لیے ہی برابر ہے۔ ایک بات تو بتایئے، قصوروار کون ہے، قانونی کارروائی نہ کرنے والے یا خلاف ورزی کرنے والے؟......... نوٹس بورڈ اور انتظامیہ پر طنز تو ٹھیک ہے مگر شہری کو سِوک سینس (شہریت کا شعور) ہونی بھی تو ضروری ہے۔ کیا اس کا کوئی فرض نہیں۔ سوچیے !!

ایم اے حق: (۱۵ دسمبر ۲۰۱۰ء) نوٹس آج تک لٹک رہا ہے کا مطلب صاف ہے کہ نوٹس لٹکانے والے کو وِل پاور (قوت ارادی) کی کمی ہے کہ کوئی اس حکم کو نہیں توڑے۔ دیپک جی آپ نے یہاں موجودہ بھارت کی پوری تصویر ہی رکھ دی ہے۔

پھلا کلون :

احمد سہیل: [۲۵ دسمبر ۲۰۱۰ء] زبردست۔ چار لائنیں اور بہت بڑی اساطیری حقیقت۔ بدکی صاحب یہ بہت ہی غیر معمولی افسانچہ ہے۔

خورشید حیات: [۲۵ دسمبر ۲۰۱۰ء] لفظ دو مفہوم وسیع، تخلیقی فن کاری میں سمائے جائے ہے، انسانی وجود کا پورا نظام۔

ایم اے حق: [۳۱ دسمبر ۲۰۱۰ء] دیپک جی اس جانب تو ہمارا کبھی دھیان ہی نہیں گیا ہے۔ واقعی آپ کے جھٹکے سے تو میں ہل ہی گیا۔

سوال :

عالم خورشید: [۳۰ ستمبر ۲۰۱۰ء] کیا خوب چبھتا ہوا سوال ہے۔ بہت خوب جناب۔ آپ نے نثر میں شاعری کے اوصاف پیدا کر دیے ہیں۔ بہت خوب۔

وجے بدکی: [۳۰ ستمبر ۲۰۱۰ء]. اسی سوال کے جواب کا مجھے بیس سال بعد بھی انتظار ہے۔ اس مختصر کہانی میں آپ کی فنکارانہ جدت طرازی عیاں ہے۔

؎ پاگل ہوا نے اٹھا کے سمندر کی گود سے   صحرا کی گرم ریت میں دفنا دیا مجھے

زاہد مختار: [یکم اکتوبر ۲۰۱۰ء] کہانی میں یوں تو ایک ہی درد بھرا سوال ہے لیکن کوزے میں سمندر سمندر سوال ہیں۔ لمحوں کی خطا.... صدیوں کی سزا.... مختصر یہ کہانی خود بولتی ہے۔ اور ہم سکتے کے عالم میں۔

ایم ایل تاثیر بلوان: [۱۲ اکتوبر ۲۰۱۰ء] کبھی کبھی اور کہیں کہیں اقلیت میں ہونا ہی بذات خود ایک گناہ ہے۔

مبصر لطیفی: [سوال/۱۲ اکتوبر ۲۰۱۰ء] فرق بس اتنا کہ آدم خود سے نکلے مگر وہ جنت جنت ہی رہا لیکن ناتھ جی اوران کے اہل خانہ کے نکلنے کے بعد وہ جنت جہنم بن گئی۔

ایم اے حق: [سوال/ ۸ جنوری ۲۰۱۱ء] یہ کہانی اس بے انتہا درد کو منعکس کرتی ہے جو کشمیر کے مائیگرنٹس (مہاجروں) کو سہنا پڑ رہا ہے۔

اجے کمار: [یکم مئی ۲۰۱۱ء] سوال کا جواب شاید اس شعر میں مل جائے:-

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہر جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

مزدور رکشا:

مدیر، ویکلی احتساب: [۱۴ ستمبر ۲۰۱۰ء] یہی ہے جس کو poetic justice (شاعرانہ انصاف) کہتے ہیں۔ بے شک بہت ہی عمدہ ادب پارہ ہے، جناب! (انگریزی سے ترجمہ)

اندرا پونا والا (اندو شبنم): [۱۴ اکتوبر ۲۰۱۰ء] مزدور رکشا میں سوار ہونے سے پہلے زیادہ تر یہی کشمکش اٹھتی ہے۔ لیکن آپ نے اس کشمکش کو منی کہانی میں ڈھال کر کمال کر دیا۔ واہ تعریف کے قابل کہانی.

عالم خورشید: [۱۳ اکتوبر ۲۰۱۰ء] بہت خوب ہے۔ کیا بات ہے....واہ.....میرے اس خیال کو ان منی کہانیوں سے اور تقویت حاصل ہوئی کہ آپ اپنی نثر سے شاعری کا کام لے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

ایم اے حق: [۷ جنوری ۱۱ء] بہت ہی بہترین کہانی ہے۔ میرے خیال میں 'میں واپس....پھر رکشے پر بیٹھ گیا' بس کہانی یہیں پر ختم ہوتی ہے۔

خورشید حیات: [۷ جنوری ۱۱ء] 'مزدور رکشا' کہانی جہاں پر ختم ہوتی ہے، وہاں سے ایک نئی، کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی شروع ہو جاتی ہے....میرے دروں میں داخل ہو گیا کوئی۔

چمتکار:

پرویز بلگرامی: [۸ نومبر ۲۰۱۰ء] واہ مزہ دیر پا ہے۔ بہت لطف آیا۔ چار سطر میں اتنی عمدہ کہانی۔

واہ جناب...خدا آپ کی عمر دراز کرے اسی طرح خوب لکھتے رہئے اور اضافہ کرتے رہیے۔

پروین طاہر:[۱۸ انومبر ۲۰۱۰ء] یہ بھی بھگوان کی مایا ہے کہ دیپک اتنے مختصر الفاظ میں اپنی اور بھگوان کی بات بیان کر جاتا ہے۔

محمد حامد سراج:[۱۸ انومبر ۲۰۱۰ء] آپ افسانہ نگار ہونا، آپ کو بات کہنے کا فن آتا ہے خوب۔

مٹھی بھر ریت :

قمر سبزواری:[۶ دسمبر ۲۰۱۱ء] پہلے بھی نظر سے گزرے ہیں آپ کے یہ افسانچے (مٹھی بھر ریت، سوال)۔ پہلا افسانچہ تو بہت ہی عمدہ ہے۔ آپ کے انداز اور اسلوب کا نمائندہ ہے اور گہری چوٹ لگاتا ہے۔ دوسرے میں تھوڑی احتیاط پسندی لگی مجھے۔ مطلب تفہیم میں کچھ تشنگی سی چھوٹ گئی شاید، وادی کے حالات تو اس سے زیادہ کا تقاضا کرتی ہے چاہے پنڈتانی ہو یا مولویانی۔

اسرار احمد رازی:[۶ دسمبر ۲۰۱۱ء] دونوں ہی تخلیقات (مٹھی بھر ریت/ سوال) بہت ہی خوب صورت، سبق آموز اور گہرے تفکر و تدبر کی غماز ہیں۔ آپ نے نہایت مختصر الفاظ میں بہت مؤثر پیغامات دیے ہیں۔ آپ کے قلم کی روانی اور فکر کی پختگی آپ کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔

نادرا ہما احمر (قریشی):[۶ دسمبر ۲۰۱۱ء] آپ کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا بہت ہی مؤثر اور حیرت انگیز انداز ہے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

ہار جیت :

مبصر لطیفی: [۱۴ ستمبر ۱۰ء] قدرت کا انصاف۔........کھوکھلا پیار، خالی جذبات، لگتا ہے منٹو کے خالی بوتلیں اور خالی ڈبے محرک بنا ہے۔

مدیر، ویکل احتساب: [۱۴ ستمبر ۱۰ء] کون کہتا ہے منٹو مر گیا!

صادق کرمانی: [۱۵ ستمبر ۱۰ء] زندگی کے دو بھینکر روپ کو آپ نے کہانی میں سمویا ہے۔

عالم خورشید: [۱۵ ستمبر ۱۰ء] بہت خوب، واہ، واہ! بہت کم الفاظ میں آپ نے اپنی بات بڑے مؤثر انداز میں کہی ہے۔ اور آپ کے بیانیہ کے تیور چبھنے والے ہیں۔ خوشی ہوئی کہ آپ فعال ہوئے۔

اندرا پونا والا (اندو شبنم):[ہار جیت/۱۴ اکتوبر ۱۰ء] اس کہانی میں بہت کچھ کہہ گئے آپ۔ کون

ہارا کون جیتا، رئیلی ٹائٹل بہت ہی موزوں ہے۔سب اپنی اپنی جگہ ہار جیت میں شامل۔

عزیز نبیل: [۱۳۱ اکتوبر ۱۰ء] دیپک جی، کیا کہنے۔اتنے مختصر الفاظ میں ایسی بھرپور کہانی۔ افسانے کے سارے لوازمات اس مختصر سے افسانے میں موجود۔بہت خوب۔

اقبال نیازی: [۸نومبر ۱۰ء] دیپک صاحب، منی کہانی کے نام پر جولوگ لطیفے پروس دیتے ہیں ان کے لیے یہ کہانی سیکھنے لائق ہے۔یہ مکمل اور خوبصورت ہے۔...منٹو والی بات ویکلی احتساب سے میں متفق ہوں۔

رضیہ مشکور: [۱۴ نومبر ۱۰ء] مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں سِوک سینس Civic sense کی کمی شدت سے موجود ہے۔اگر ہم اس پر قابو پاسکیں تو یقین کریں میرے ملک ہندوستان سے بہتر کوئی ملک نہیں۔

ارشد نیاز: [۲۶ نومبر ۱۰ء] اپنی کسی ضرورت یا طلب کو وقت ضرورت پورا کرنا کوئی گناہ نہیں ہے البتہ اپنی خواہشات کو غیر قانونی طریقے سے پورا کرنا گناہ ہے۔فکشن میں اگر ہر کسی کو یوں لگے کہ وہ بھی اسی طرح گناہ گار ہے تو یہ قلم کار کی جبلت پر دال ہے کہ اس نے اس کو اپنے وجود کا حصہ بنایا۔یہ آپ کے تابندہ فکر کو بھی درشاتا ہے جو کسی وقت آپ کے ذہن میں جنم لیتا ہے۔(انگریزی سے ترجمہ)

پرویز بلگرامی: [۱۹دسمبر ۱۰ء] کتنی عمدہ تصویر معاشرہ دکھادی ہے بگڑتے معاشرے کو۔جو بیک وقت کئی وجہ سے بگڑ رہا ہے وہ تینوں رخ ایک کہانی میں سمیٹ دیے۔واہ جناب۔بہت اچھی کہانی ہے۔ شاہکار کہہ سکتے ہیں۔مزہ آ گیا۔

جاوید دانش: [۹ جنوری ۱۰ء] جگر بھائی دیپک۔آپ کا قلم سچا ہے....ایک ننگی حقیقت کو آپ نے پوری ایمانداری کے ساتھ گرفت میں لیا ہے۔

رفیق راز: [۱۱۸ اکتوبر ۱۰ء] واہ جناب کمال کی کہانیاں ہیں۔اور بعض جو مجھے بہت زیادہ پسند آئیں وہ قیامت کی ہیں۔آپ اپنے اندرون میں کھوئے ہوئے ادیب نہیں ہیں۔آپ اپنے اردگرد سے باخبر ہیں۔آپ کی آنکھیں بند نہیں بلکہ کھلی ہیں۔

سرپرائز/انتظار/پرتیکشا [یہ کہانی پہلے انتظار کے عنوان سے چھپی تھی]

سنجیو ہنگواسیہ: اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔ تھوڑی ادھوری رہ گئی۔ اب بات یہ ہے کہ آخر کار آگے کیا ہوا؟ کیا پتی کا شک بے بنیاد ہے یا پھر جو شک ہے وہی سچ ہے۔ کہانی اچھی ہے لیکن آخر میں سر کھجلا رہا ہوں کہ آگے کیا ہوا ہوگا۔ آئی ایم ویری ایکسائیٹڈ ٹو نو اباوٹ رزلٹ!

اندرا پونا والا: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] بہت اچھی کہانی ہے خاص کر سگریٹ کے ٹکڑوں کو ڈسٹ بن میں رکھا دکھا کر آپ نے کہانی کو الگ موڑ دے دیا۔ اچھا لگا، دیپک۔

کاوش عباس: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] پلیز اسے 'میں' کر کے لکھ کر آپ نے دل میں تہلکہ مچا دیا۔ اوہ!!!... [میرا جواب پا کر] ہاں صاف ظاہر ہے۔ معلوم ہے مگر اس خاص موضوع سے فوراً جو ذہن میں جھٹکا لگا تو اس کا وہ تاثر تھا۔ آج کل فلم 'ایکشن ری پلے' کا گانا بھی تو چل رہا ہے ٹی وی پر 'زور کا جھٹکا ہائے زوروں سے لگا'...... ویسے میں سمجھتا ہوں کہ خاص اس کہانی کو آپ تھرڈ پرسن (واحد غائب) میں لکھتے تو یہ زیادہ گہرا اثر ہوتا، کیونکہ (آپ کو) سچ معلوم نہ ہونے کا غائب کا ایک تعلق تھرڈ پرسن سے بنتا ہے۔

عزیز علی: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] واہ کیا بات ہے افسانے میں کہ سگریٹ کی راکھ اس کی باتوں کو جھٹلا رہی تھی..کون جانے سچ کیا ہے؟ واہ حقائق کی جھلک ہے اس میں۔

سبودھ لال: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] اچھی کہانی ہے، دیپک۔ واہ! بار بار سچ کیا ہے یہ سوال آپ کے کلام میں کیوں آتا ہے؟

ارشد نیاز: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] آپ کے افسانوں میں لوگ کشمیر تلاش کرتے ہیں اور افسانے .....زندگی کے وہ حقائق ظاہر کرنے پر تلے ہوئے رہتے ہیں، جو ہماری زندگی کی سچائی ہے۔ ویسے مرد کی فطرت ہے کہ.....وہ اپنی بیوی پر شک کرے۔ پتا نہیں چھپ کر سگریٹ پینے والی بیوی کا کیا حال ہوا ہوگا جب اچانک اس کا شوہر اس کے روبرو کھڑا ہوا ہوگا۔ بہر حال یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔

مہ وش آمنہ: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] واہ بہت خوبصورت، دیپک اس کو بنائے رکھیے، مجھے آپ کا اسٹائل پسند ہے۔

مرزا یسین بیگ: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] کہتے ہیں شوہر جب بیوی کے لیے غیر متوقع تحفے لانے لگے یا بیوی اچانک سے غیر معمولی پیار جتانے لگے تو دال میں ضرور کالا ہوتا ہے۔

خورشید حیات: [۲۵ دسمبر ۲۰۱۰ء] لفظوں کو زبان عطا کرنے کا ہنر آپ کو آتا ہے، آج کی تہذیب کی قندیلیں دکھائی دے رہی ہیں کہانی کی زمین پر/ فلک پر۔ اچھی کہانی ہے۔

ایم اے حق: [۷ جنوری ۲۰۱۰ء] کلائمکس کا انداز بہت یکتا ہے۔ بہت اچھی کہانی ہے۔

گمشدہ کی تلاش:

سہیل احمد صدیقی، کراچی: [۲۹ جنوری ۲۰۱۲ء] افسانے میں چونکانے کا عنصر قدرے کم ہے۔

عالم خورشید: [۲۲ ستمبر ۲۰۱۰ء] بدلتے ہوئے اقدار اور انداز فکر کی اچھی عکاسی ہے۔ واہ!

ٹھیس:

جاوید دانش: [۲۱ ستمبر ۲۰۱۰ء] ایک منی کہانی میں آپ نے ایک سمندر سمو دیا۔ کلائمکس اچھا ہے۔

ظہیر جاوید: [۲۲ ستمبر ۲۰۱۰ء] دیپک جی زندگی کی ایک پرت یہ بھی ہے۔ میں اسے آپ کے قلم کی ابتدا سمجھوں گا، انتظار رہے گا آپ کے مختصر افسانے کا۔...... [ادبی زندگی کے بارے میں میرا جواب پڑھ کر] بہت خوب، مجھے دنیا ترک کیے ہوئے ۱۵ سال ہو گئے۔ اس لیے معذرت خواہ ہوں۔...... میں نے آپ پر طنز کیا نہ تنقید کی۔ یہاں آپ پہلی بار آئے ہیں۔.... میں نے آپ کی تعریف کی اور کہا مزید کا انتظار رہے گا.. خوشی کی بات ہے کہ افسانے میں آپ کا مقام ہے... ہم تو سڑک چھاپ لوگ ہیں.. آپ سورج ہیں.. اور ہم سادھو، سنت، فقیر... ہم کو ہماری پاگل پن کافی ہے۔ شکریہ۔

تصنیف حیدر: [۲۲ ستمبر ۲۰۱۰ء] ایک بہترین اور جامع افسانہ ہے.. آپ جس طرح افسانوں کا اختتام کرتے ہیں وہ واقع تعریف کے لائق ہے۔.... مجھے بہت پسند ہے۔

عذرا قیصر نقوی: [۲۲ ستمبر ۲۰۱۰ء] بہت خوب۔ مختصر افسانے کی ایک بہترین مثال۔

شکیلہ رفیق: [۲۲ ستمبر ۲۰۱۰ء] اس عورت نے صحیح کہا۔ ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں ہے... [میرے ردعمل کے بعد] سوری دیپک جی میں نے بس اٹھتے ہوئے لکھا تھا۔ چونکہ میں ایک افسانہ نویس ہوں (شاید آپ جانتے ہوں) وہ بات میں نے اس حوالے سے کی تھی۔ دیکھیے ہر تخلیق کار کی تخلیق میں اس کی شخصیت کہیں نہ کہیں ضرور چھپی رہتی ہے۔ آپ کا اینڈ [اختتام] (جیسا کہ آپ نے بھی لکھا) آپ کی شخصیت کی عکاسی کر رہا ہے۔ وہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اگر میں ہوتی تو اس کہانی کو وہاں ختم کر دیتی جہاں اس

عورت کا آخری ڈائیلاگ تھا یعنی "میں اس ...... کہا کہہ سکتی تھی"۔ اس کے آگے کی بات میں قارئین پر چھوڑ دیتی۔ یہ میرا ادنیٰ سے خیال ہے۔ پلیز آپ مائنڈ نہ کریں۔ میں تعمیری تنقید کی قائل ہوں اور اپنی کہانیوں پر کی گئی تعمیری تنقید کو کھلے دل سے قبول کرتی ہوں۔ پھر بھی اگر آپ نے محسوس کیا ہے تو معذرت خواہ ہوں۔

مدیر، ویکلی احتساب: [۲۳ ستمبر ۲۰۱۰ء] دیپک صاحب، معاف کیجیے گا، افسانوی ادب میں بھی اخلاقیات کا چابک گھومنے لگ جائے گا تو من مندر کے آبگینوں کو ٹھیس لگ ہی جائے گی۔ بھلے مانس کا چہرہ ویسے کا ویسے ہی رہنے دو۔ غازہ ملو گے تو اصلیت کا جنازہ اٹھ جائے گا۔

ارشد جمال ہاشمی: [۱۴ جنوری ۲۰۱۱ء] دلچسپ بحث ہے سو میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ میں بھی شکیلہ صاحبہ کی رائے سے متفق ہوں۔ افسانہ نگار جب افسانے میں وضاحتی انداز اختیار کرتا ہے تو افسانے کی معنویت محدود ہو جاتی ہے۔ اور افسانے کی دھار کند ہو جاتی ہے۔ خصوصاً منی افسانے میں تو وضاحت کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ میں اپنی بے لاگ رائے کے لیے دیپک صاحب سے معذرت خواہ ہوں۔ میرا مقصد نہ شکیلہ صاحبہ کی حمایت ہے نہ دیپک صاحب کی تنقیص۔ دونوں بہت سینئر افسانہ نگار ہیں۔ میں دونوں کو برسوں سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ بس جو کچھ میں نے درست سمجھا وہ کہہ دیا۔ مجھے یقین ہے دیپک صاحب اس کا برا نہیں مانیں گے۔

احمد سہیل: [۱۸ جنوری ۲۰۱۱ء] بہت اچھی کہانی ہے۔ ناسٹلجیائی اور حقیقت پسندانہ کہانی ہے۔

سلیم آذر: [۱۱ جنوری ۲۰۱۲ء] واقعی آدمی بعض اوقات ہماری توقعات کے برعکس نکلتا ہے۔

جرم :

زاہد مختار: [۱۱/۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء] کہانی ...اور اس کا موضوع ...دونوں بحث طلب ہیں جن پر فیس بک کے سکرین پے نہیں بلکہ قرطاس پے کچھ لکھنا پسند کروں گا۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس موضوع کی منطق تک پہنچنا اتنا آسان نہیں ہے۔ شیطانیت اور رحمانیت دو الگ پہلو ہیں۔ قابیل اور ہابیل کی اپنی کہانی ہے۔ کچھ اپنی الگ تفصیل لے آئے۔ خیر پھر کبھی۔... [استفسار کے بعد جواب] انشاءاللہ برادر اکبر ..اس پر ہم تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ میں تو طفل مکتب ہوں۔ آپ سے فیض یاب ہونے کی تمنا تو

میرے دل میں پنہاں ہے۔آپ کہانیوں کے معاملے میں ایک معتبر نام ہیں۔میں موضوع کی بات کر رہا ہوں۔یہ نکتہ چونکہ بڑا نازک ہے۔بہتر ہے اسے ادبی پیراہن میں ہی سجایا جائے۔یوں سر عام نا اچھالا جائے۔یہی تقاضائے ادب ہے اور یہی مناسب بھی۔میں یہ بھی بتا تا چلوں کہ ان کرداروں کی اپنی ایک کہانی ہے۔اس کہانی پہ کوئی فیصلہ..بس آپ سمجھ گئے ہونگے میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

عالم خورشید:[۱۱/۱اکتوبر ۲۰۱۰ء] آپ کی یہ منی کہانی غور وفکر اور مباحثے کی فضا کو ہموار کرنے میں کامیاب ہے۔

اندرا پونا والا (اندرا شبنم اندو):[۱۴/۱اکتوبر ۲۰۱۰ء] یہ منی کہانی بہت ہی چھو جانے والی ہے، تاثیر چھوڑ جاتی ہے، لکھتے رہیے۔تسی چھاگئے آن کمپیوٹر ورلڈ آلسو۔

خورشید حیات:[۹ جنوری ۲۰۱۱ء] جرم نے متاثر کیا۔آپ کی تمام کہانیوں کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا ’کتھا راگ‘ ہمیشہ ارتقا کی جانب مائل رہا ہے۔آپ کو حیات انسانی سے گہری محبت ہے۔عام طور پر دیپک بدکی جی آپ کی کہانی کا موضوع آج کا آدمی ہے۔آدمی (؟) کہانی کی زمین سے ہم سب کا ’گاؤں‘ غائب ہوگیا، دیپک بدکی ۔...[میرے جواب کے بعد]۲۱ویں صدی میں اردو کہانی سے گم ہوتا ’گاؤں‘ کون دشا میں لے کے چلا رے.....!وہ سہانی سی ڈگر...!

ایم اے حق:[۱۳اکتوبر ۲۰۱۱ء] آپ کی اس منی کہانی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔آپ نے اس مختصر سی تحریر میں حکومت، عدلیہ، سماجک سنگٹھن، روحانی رہنماؤں وغیرہ کو کٹگھرے میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔بدکی، آپ عظیم ہو!

منتظر نیاز علی پرا:[۱۳ اگست ۲۰۱۲ء] کہانی میں ابھارا گیا سوال لاجواب ہے۔کہانی پڑھ کر قاری ایک لمحے کے لیے سوچنے لگتا ہے.... ہاں سچ تو ہے۔

شناخت :

فرحت پروین:[شناخت ۹ جنوری ۲۰۱۱ء] اچھی مختصر کہانی ہے۔

مہرباں میرا ہی حائل ہے نمو میں میری پودا چھتنار کے سائے میں کہاں پھلتا ہے

بیوی کی کمائی :

ارشد نیاز: [۲۴ مئی ۲۰۱۱ء] کہانی لکھنے کے طریقے کیا کیا ہیں وہ یہاں سمجھ میں آ رہا ہے۔

قمر سبزواری: [۱۵ جنوری ۲۰۱۲ء] بہت خوب بُدکی صاحب، بہت اچھے ...آپ کی مختصر مختصر کہانی الفاظ میں تو مختصر ہوتی ہے پر تاثر میں بہت دور تک جاتی ہے۔

لکشمی کا سواگت:

زاہد مختار: [۱۲ اکتوبر ۲۰۱۰ء] بدکی صاحب، میں برسوں سے یہ نہ سمجھ پایا کہ سرسوتی اور لکشمی دور دور کیوں ہیں۔ کیا اس کے پیچھے واقعی کوئی حقیقت ہے یا ایک مفروضہ ہے۔ آج کے دور میں تو سرسوتی کے پجاریوں کے گھروں میں کافی لکشمی ہے۔ کہانی پھر سمندر اور کوزے کی مثال کے مصداق ہے۔

عالم خورشید: [۳ر اکتوبر ۲۰۱۰ء] بدکی صاحب میں نے اس سے قبل آپ کی ایک منی کہانی پر تبصرہ کرتے وقت یہ لکھا تھا کہ آپ نے اس میں شاعری کے ٹولس استعمال کیے ہیں۔ اس کہانی سے بھی مجھے اس رائے کی تصدیق ہوتی لگ رہی ہے۔ مجھے یہ بات اچھی لگ رہی ہے کہ بہت کم الفاظ میں ہنر مندی سے آپ اپنی بات کہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی تخلیق پر اچھی بری رائے آتی رہتی ہے۔

رضیہ مشکور: [۴ر اکتوبر ۲۰۱۰ء] میں آپ کی بات سے صدفی صد متفق ہوں دیپک صاحب۔ بلکہ بغیر تنقید کے تو تخلیق میں نکھار آ ہی نہیں سکتا۔ مگر اب دیکھا یہ جا رہا ہے کہ تنقید 'واہ واہی' کی حد سے آگے بڑھتی ہے تو ذاتیات میں داخل ہو جاتی ہے۔ پھر وہ یقیناً مثبت نہیں رہتی۔ الّا یہ کہ چند صاحب اہل علم کے جن میں ذاتی انا کا کانٹا نہیں لگا ہوا ہے۔ باقیوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ تنقید ذاتیات سے ہی شروع کرتے ہیں اور ان کی تان بھی ذاتیات پر ہی ٹوٹتی ہے۔ بہر حال مجھے عالم خورشید صاحب ک بات سے اتفاق ہے۔ آپ کی ان کہانیوں میں 'اختصار' نے شعریت ضرور پیدا کی ہے مگر جانے کیوں؟ مجھے ان کے کلائمکس پر تشنگی کا احساس ضرور ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ میرا احساس ہے۔ باقی آپ کی مختصر کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔

ارشد نیاز: [۲۴ مئی ۲۰۱۱ء] لکشمی کا سواگت ....بہو ہی دھن لاتی ہے۔ خوشی کی یہ بات ہے مگر چند دہائیوں قبل اسی زمین کے کسی گھر میں بیٹی پیدا ہوتی تھی تو یہی جملہ ادا کیا جاتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہم کہاں آ گئے.....سرسوتی کا روپ لکشمی کیسے لے سکتی ہے۔ اسے تو گیان چاہیے، دھیان چاہیے اور تیاگ چاہیے....ودیا ساگر نے اپنی پیاس بجھانے کے لیے آشرم کا راستہ اپنایا کہ اس کی خوشی اسی میں شامل ہے،

جب کہ اس کے پتا جی کی خوشی اس کی پیاس میں موجود نہیں ہے۔ اچھی کہانی ہے۔۔۔۔[۱۱ جنوری ۲۰۱۲ء، انگریزی سے ترجمہ] کہا جاتا ہے کہ لکشمی اور سرسوتی ایک دوسرے کی دشمن ہیں اور دونوں ایک ہی ساتھ ایک گھر میں نہیں رہ سکتی ہیں۔ لکشمی کو ایسی دنیا کی ضرورت ہے جہاں وہ لوگوں کو دھوکا دے سکے جبکہ سرسوتی کو مجرد اور حقیقی زندگی سے محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ودیا ساگر بھاگ کر ایک معمولی تنہا جھونپڑے میں پناہ لیتا ہے۔ سچ مانیے یہ ایک کامیاب مختصر ترین کہانی ہے۔

نادرانا: واہ بہت عمدہ و پراثر کہانی۔ آپ کے اچھوتے اور گہری سوچ کے دھارے ایک دفعہ میں ہی بندے کو جکڑ لیتے ہیں۔

سنجیو ہنگواسیہ: [لکشمی کا سواگت، ۱۱ جنوری ۲۰۱۲ء] کہا جاتا ہے کہ ''تعلیم نہ ہو تو عقل نہیں ملتی، عقل نہ ہو تو دولت نہیں ملتی، دولت نہ ہو تو دوست نہیں ملتے اور دوست نہ ہوں تو سکھ نہیں ملتا۔'' جیسے کہ آپ کی منی سٹوری ہے، اس کے مطابق اگر سرسوتی گھر میں ہو تو لکشمی خود بہ خود چلی آئے گی۔ کافی عمدہ بات کہی ہے آپ نے اس افسانچے میں۔ (ہندی سے ترجمہ)

پانی تو پلا دے یار:

ارشد نیاز: [۲۴ مئی ۲۰۱۱ء] واہ، کیا زمانہ تھا۔ اور اب نفرت ہی نفرت کے پیڑ اگے ہوئے ہیں۔ اسے بویا کس نے؟ اس میں کھاد اور پانی دیا کس نے۔ یہ بھی اس کہانی سے واضح ہو رہا ہے۔

اعجاز خان: [۶ مارچ ۲۰۱۲ء] کہانی پسند آئی۔ سچ مانیے میری آنکھیں یہ سوچ کر نم ہو گئیں کہ کشمیر ماضی میں کیا تھا اور اب کیا ہو چکا ہے۔ پھر بھی روشن خیال ہونے کے سبب میں پر امید ہوں کہ یہ پاگل پن جلدی ہی بھاپ بن کر اڑ جائے گا، کشمیر دوبارہ گلزار بن جائے گا اور امن، سکون، اور ملواں تہذیب پھر سے نمودار ہوگی اور اس سے بھی بڑھ کر پرانا کشمیری کلچر پھر سے دیکھنے کو ملے گا۔۔۔۔۔[۶ مارچ ۲۰۱۲ء] اس بندے کو پیٹ کر کسی کو یہ خیال آیا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے اور بھاگنے کے بجائے وہ واپس آئے اور اس بندے کی ہمت بندھائی، اور اس کو واپس ہوش و حواس میں لے آئے۔ یہی کشمیری کلچر کا وہ جوہر ہے جس کی میں قدر کرتا ہوں اور جسے لوگ 'کشمیریت' کہتے ہیں۔ میری آنکھیں اس جوہر کا، جو کشمیر کی تخصیص تھی، سوچ کر ہی بھیگ گئیں۔ چونکہ آپ وہاں بہت برسوں رہے ہیں، اس لیے آپ نے اس جوہر

کوقریب سے محسوس کیا ہوگا۔ پھر ایک بار شکریہ کہ آپ نے اس جوہر کو سامنے لا کر رکھ دیا۔ (ترجمہ)

خود کشی :

ارشد نیاز: [۱۹ دسمبر ۲۰۱۰ء] بہترین افسانہ۔ آخری جملہ جھٹکا دے رہا ہے۔

پرویز بلگرامی، کراچی: [۱۹ دسمبر ۲۰۱۰ء] واہ جناب کیا خوب لکھ گئے۔ بہت عمدہ۔ جھٹکے سے خیالات پلٹ دینا ہی فن کی بلندی ہے۔ واہ!

سوہن راہی: [۱۹ دسمبر ۱۰ء] مجھے یہ پسند ہے۔ کیا طریقہ ہے زندگی اور موت کا۔ بہت خوب۔

عزیز نبیل: [۱۹ دسمبر ۲۰۱۰ء] کیا بات ہے دیپک صاحب.. آخری جملے پر ہنسی بھی آئی اور اس کی تہہ میں موجود اس مجبور شخص کا کرب بھی محسوس کیا جسے پتا نہیں کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

سنجیو ہنگواسیہ: [۲ فروری ۲۰۱۲ء] ایسا ہوتا ہے کہ کئی بار ہمارے اندر کے مثبت خیالات زندگی کی جنگ میں دب جاتے ہیں۔ لیکن یہ خیالات صرف دب جاتے ہیں، ختم نہیں ہوتے۔ جب ہم اپنی صورت کسی دوسرے کے روپ میں دیکھتے ہیں تو یہ خیالات جاگرت ہو جاتے ہیں اور زندگی کی جنگ میں ایک ہتھیار کے روپ میں کام آتے ہیں۔ اس لیے تو کہا جاتا ہے کہ ہمیشہ مثبت سوچیں... سوچ مثبت رکھیں اور روشن خیال رہیں۔ یہ آپ کی منی سٹوری مجھے کافی پسند آئی۔ پڑھنے کے بعد کہیں نہ کہیں کچھ سیکھنے کو ہی ملا۔ (ہندی سے ترجمہ)

نعیم بیگ: [۳۱ جنوری ۲۰۱۵ء] لگتا ہے کہ بطور دلچسپی و نفسیاتی عمل کے تحت الشعور اچانک فیصلہ لے لیتا ہے اور ذہن کے مونولوگ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس منی افسانے کا کرافٹ (صنعت گری) حیرت انگیز اور قابل تعریف ہے۔ افسانہ نگار کے لیے بہت ساری آفرین و تحسین۔ (انگریزی سے ترجمہ)

نیلامی:

اختر صاحب: [۹ جنوری ۲۰۱۱ء] غریب کا استحصال جاری ہے ازل سے اور یہ ہمیشہ غریب کی خوشی سے ہوتا ہے، اس لیے اسے آئی پی ایل (IPL) کا لطف اٹھانے دو۔ ایک اچھی بات ہے کہ آئی پی ایل میں عورتوں کی نیلامی نہیں ہوتی۔...... غریبوں کو ہمیشہ امیروں نے کسی نہ کسی طریقے سے استحصال کیا ہے۔ عربوں غربا امیروں کی جھولی میں کھربوں بھر دیتے ہیں۔... بدکی صاحب آپ کی کہانی میں معنویت

ہے اور آج کے دور میں اسی کو اصلی ادب کہتے ہیں.... تب لوگ مجبوری میں بکے اور آج مرضی سے۔

عالم خورشید: [۹ جنوری ۱۱ء] زندگی کی تصویر کو دو زاویے سے اچھی طرح فوکس کیا ہے۔ لہجہ بہت ہی نرم ہے مگر زیریں لہروں میں جو تیکھا پن ہے اس کی داد قبول کریں۔

پرویز بلگرامی: [۹ جنوری ۱۱ء] واہ بہت خوب... اسے میں تیر سہ شعبہ کہوں گا۔ تین پھل والا تیر ۔ایک کہانی میں تین رخ پیش کر دیے.... حالات کی سچی تصویر کشی ہے۔

خورشید حیات: [۹ جنوری ۱۱ء] آپ کی فلک فلک سوچ اور بیان کرنے کا انداز اچھوتا اور نرالا ہے۔ قصہ گو کے اس انداز کو میں کیا نام دوں؟ میں ٹھہرا آدھا ادھورا آدمی، اپنے آپ کو مکمل کرنے کے پروسیس میں زندگی مختصر سی لگتی ہے۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی: [نیلامی ۱۱ جنوری ۱۱ء] افسانہ نیلامی جس استحصال کا اظہاریہ ہے اس کی طرف کم ہی لوگوں کا دھیان جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ استحصالی عناصر جدید دور کے شریف لٹیرے ہیں۔

امین بنجارا: [۱۱ جنوری ۱۱ء] بہت عمدہ افسانہ ہے۔ اس مختصر سی تخلیق میں آپ نے اس کائنات کی ہر شے کی نیلامی کو زیر بحث لایا ہے۔ غرض کہ خواہشیں اور ضرورتیں بھی غیر محسوس طریقے سے نیلام ہوتی ہیں۔

عبدل باری: ہم سب کسی نہ کسی روپ میں کسی نہ کسی طریقے سے زندگی میں کبھی نہ کبھی نیلام ہو جاتے ہیں.. سر یہ سچ مچ ایک چھو جانے والی اور معنوی کہانی ہے۔

اسرار احمد رازی: مختصر مگر متاثر کرنے والا افسانچہ ہے۔ آپ کے افسانوں کا ایک الگ مزہ ہوتا ہے۔ ان کی انفرادیت قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

ووٹ :

ایم اے حق: [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] ہندستان کی موجودہ جمہوریت کی ایک ننگی تصویر پیش کی ہے آپ نے جناب۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے ہاتھ کو چوم لوں۔ آپ مہان ہیں بدکی جی۔

عالم خورشید: [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] بے حد شائستہ اور نرم لہجے میں تیکھا اور سچا طنز۔ بہت خوب واہ۔

جنید جاذب: [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] فنی بھرپوریت، سادہ کاری سے مزین، نرم متوازن لہجہ۔

خوبصورت کہانی۔

حامد اقبال صدیقی:[۳۰ جون ۲۰۱۱ء] کہانی بہت عمدہ ہے۔

خورشید حیات:[۳۰ جون ۲۰۱۱ء] کم لفظوں میں آج کا سیاسی، سماجی منظر نامہ۔ جہاں پے کہانی ختم ہوتی ہے وہاں سے اک نئی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ میرا ووٹ آپ کی منی کہانی کے نام۔

ملک زادہ جاوید:[۳۰ جون ۲۰۱۱ء] بہت خوب، یہ کہانی ایک لمحہ فکریہ ہے۔

ارشد نیاز:[۵ جنوری ۲۰۱۲ء] بہت مختصر کہانی میں ہم اپنے تجربے کی عکاسی کرتے ہیں اور اپنے قارئین تک بڑی سادگی سے پہنچاتے ہیں جیسے اس فکشن میں ظاہر ہے۔ یہ حقیقی خیالات کی سچائی سے ترجمانی ہے۔..... [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] جمہوریت میں یہی ہو رہا ہے۔ حقدار گھر میں رہتا ہے اور ووٹ دوسرے دے دیا کرتے ہیں۔ سیاست کی کرسی ہتھیانے کے لیے ہمارے ملک میں یہ سب سے بڑا کرپشن ہے۔ حال فی الحال اس میں کچھ سختی کی گئی ہے تاکہ کمزور اور غریب بھی اپنا ووٹ ڈال سکیں۔ مگر ابھی بھی کامیابی نہیں ملی ہے۔ وجہ یہی ہے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے کچھ افسران بھی سیاست کا مہرہ بنے ہوئے ہیں۔ اس کہانی میں جیت حقیقتاً آپ کی نہیں ہوئی ہے۔ آپ کا احتجاج بے معنی رہا مگر اصلیت کا بے لاگ انکشاف ہی اس کہانی کی کامیابی ہے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

نصیر احمد ناصر: [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] بالکل سچ ہے۔

ایم اے حق:[۳۰ جون ۲۰۱۱ء] ارشد نیاز کی باتوں سے متفق ہوں۔ دراصل جیت اس کرپٹ شخص کی ہوئی جس نے غلط ڈھنگ سے ووٹ ڈلوا دیا۔

جان عالم: [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] آپ بھی ہارے اور وہ بھی ہارے۔ جنھوں نے آپ کا ووٹ ڈالا، وہ بھی ہارے۔ اور آپ جیتے۔ اس طرح کہ آپ نے جس اجتماعی ہار کو بتانا تھا، بتا دیا۔

ہری کشن رازدان راز: [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] آپ نے لڑائی ہاری مگر جنگ جیت لی جو شروع ہو چکی ہے حالانکہ ابھی کمزور ہی ہے۔ ایسے ہی یہ مصر میں حال ہی میں شروع ہوئی۔ ضرور کہوں گا کہ اتنی چھوٹی سی کہانی میں اتنی بڑی بات کہی ہے آپ نے۔ کہتے رہیے۔ اچھی باتیں دیر سے سمجھ آتی ہیں لیکن کبھی بیکار نہیں جاتیں۔

عزیز نبیل: [یکم جولائی ۲۰۱۱ء] بدکی صاحب، بہت خوب..عام سے موضوع کو آپ نے ایک فن کار کی نظر سے دیکھا اور برتا ہے۔ عمدہ افسانچہ۔

ممتاز نازا: [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] واہ کیا کہنے، آج دیش میں لوک تنتر کی یہی حالت ہے اور ہم تماشہ دیکھنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔

گارنٹی:

خورشید حیات: [۲۱ اگست ۱۱ فیس بک] آج کا سماج اور مشکوک نگاہوں کے عمل سے گزرتی ہوئی یہ مختصر کہانی اپنی سادگی کے باوجود ایک تاثیر رکھتی ہے۔ ایک مکالمے کی صورت میں کہانی آگے بڑھتی ہے اور متاثر کر جاتی ہے۔ بہت عمدہ۔

ظہیر جاوید (چراغ حسن): [۲۱ اگست ۱۱ء، فیس بک] شکریہ، بہت اچھی تحریر... آج کے دور کی صحیح عکاسی۔

عالم خورشید: [۲۱ اگست ۱۱ء، فیس بک] بے حد نرمی اور آہستگی سے کیا خوب طنز ہے۔

امین بنجارا: [۲۱ اگست ۱۱ء، فیس بک] اچھا موضوع اور اچھا اسلوب۔ تخلیق اپیل کرتی ہے۔

اویس جمال شمسی: [۲۴ اگست ۱۱ء، فیس بک] میرا خیال ہے کہ اگر آپ جیسے حضرات ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسی طرح قلم اٹھاتے رہیں تو سماج میں کافی حد تک سدھار لایا جا سکتا ہے۔ آپ نے یقیناً ہم سب کو اور سارے سماج کو آئینہ دکھایا ہے۔... آپ نے بڑی سادگی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ مشورہ دینا کتنا آسان ہے اور عمل کس درجہ دشوار۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

نادرا ہما احمر: [۲۴ اگست ۱۱ء، فیس بک] دکھ بھری مگر حقیقت۔ سنجیدہ سماجی مسئلے کی عمدہ عکاسی۔

وسیم حیدر ہاشمی: [۲۶ اگست ۱۱ء فیس بک] یہی زمینی حقیقت ہے اس ملک کی، دیپک صاحب۔ خیال جتنا عمدہ ہے پرابلم اتنی ہی بھاری ہے، شاید فی الحال اس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔

سید نور الحسنین: [۲۱ اگست ۲۰۱۱ء] افسانچہ دل کو چھو گیا۔ کچھ مہینے پہلے اسی موضوع پر قدیر زمان کی کہانی پڑھ چکا ہوں۔ یہ ہمارے ملک کا ہی نہیں ساری دنیا کا مسئلہ ہے۔ آپ نے اختصار کے ساتھ بھرپور تاثر پیدا کر دیا۔

کتابی محبت:

خورشید حیات: [۲۱ اگست ۲۰۱۱ء] دیپک بدکی چیخنے چلانے، کہانی چوراہے پے، اپنی ڈفلی بجانے والے کہانی کار نہیں.... مگر ان کی سوچ گھمایا پھر سوچ کینو اس میں بہت کچھ ہے۔ ان کی فکر عقلیت کی تابع ہے..... کتابی محبت، محبت کے نصیب میں آئی بدنصیبی کی مثال ہے۔

منتظر نیاز علی پرا: [۲۱ اگست ۲۰۱۱ء] میں کچھ مختلف اختتام کا انتظار کر رہا تھا۔... [۲۲ اگست ۱۱ء] کہانی کی شریانوں میں ایک عجیب سی معصومیت گردش کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جب تک اختتام تک پہنچتے ہیں اور پھر کچھ اور ہی انجام ہمارے سامنے آتا ہے۔ میں ان دو کے درمیان کسی بھی واسطے کا اندازہ نہیں لگا پایا۔ (یہ سچ ہے کہ میں ابھی طفل مکتب ہوں، شاید وہی ایک وجہ ہو کہ میں آگے کیا ہوگا نہیں دیکھ پایا ۔) ارشد نیاز اختتام کو بجا فرماتے ہیں اور اس کی وجہ محبت کے ناموں کو بتلاتے ہیں۔ پر کیسے؟ ہوسکتا ہے کہ ان کے سبب وہ جسمانی طور پر ایک دوسرے کے قریب آچکے ہوں۔ مگر غربت کے بغیر اور کون سی شے ہوسکتی ہے جو آدمی کو ایسا کرنے پر مجبور کرلے جو کہ کہانی کے آخر میں کردار کرتے ہیں۔ وہ مرکزی فکر سے کیسے جڑا ہے، میری سمجھ سے باہر ہے؟ (انگریزی سے ترجمہ)

غلام محمد شاہ: [۲۹ فروری ۲۰۱۲ء] آپ کی نگارشات مجھے ہمیشہ متاثر کرتی ہیں۔ سہارا میگزین میں چھپی آپ کی کہانی بہت اچھی ہے۔

ارادے جن کے پختہ ہوں، نظر جن کی خدا پر ہو تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

ایم اے حق: [۲۱ اگست ۲۰۱۱ء] بہت اچھی لگی۔ میرے خیال میں بدکی صاحب نے ایک انوکھے انداز میں 'غیر سنجیدہ' محبت کی (جیسا کہ عنوان سے بھی ظاہر ہے) ایک بہترین مثال پیش کی ہے۔

اسحاق ساجد: [۲۱ اگست ۲۰۱۱ء] یہی پرابلم ہے۔ کیا خوبصورت افسانچہ لکھا آپ نے۔

ارشد نیاز: [کتابی محبت، ۲۲ اگست ۲۰۱۱ء] مختصر ترین کہانیوں میں یہ المیہ ہے کہ فن کار تفصیلی متن سے پرہیز کرتا ہے اور اسے کم سے کم جملوں میں بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ نتیجتاً کبھی کبھی اسے ترسیل کی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس کہانی میں ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ کہانی بالکل سیدھی سادی ہے اور کہانی کا motive بھی واضح ہے۔ دلی کی سڑکوں پر جیب کترنا اور فلمی دنیا میں پانچ ہزار کے

عوض جسم کی نمائش کرنا عشقیہ خطوط کے اثرات ہیں۔ یہ سچ ہے کہ عشقیہ خطوط کی کتابوں نے ان گنت لڑکوں ولڑکیوں کو غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ بدکی صاحب کی یہ کہانی میری نظر میں ایک کامیاب کہانی ہے۔

زلزلہ :

وسیم احمد فدا: [۲۲ مئی ۲۰۱۲ء] اس کہانی کے توسط سے آپ نے بے حد گھمبیر سوال اٹھایا ہے۔ بے حد متاثر کیا اس مختصر کہانی نے۔ ناچیز نے اپنا پہلا افسانہ (۲۰۰۵ء میں ۹ گجرات کے اسی زلزلے سے متاثر ہو کر لکھا تھا جس کا عنوان تھا 'دھوپ رہتی ہے نہ سایہ'۔

عمران یونس: [۲۲ مئی ۲۰۱۲ء] پاکستان میں جب بھونچال آیا تو ایک مارکیٹ کو تھوڑا کم نقصان پہنچا، تو لوگوں نے کہا اس مارکیٹ میں کوئی بے حیائی والی دُکان نہیں تھی جیسے ویڈیو وغیرہ کی تو اس لیے اس کی بچت ہوگئی۔ دیپک بدکی: [جواب]: گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتی ہے۔ اکتوبر میں آئے زلزلے میں سرحد کی دونوں طرف بہت جانی اور مالی نقصان ہوا۔ ایسے سانحات میں کہاں برے اور بھلے کی تمیز ہو سکتی ہے۔ انسان خود کو محض تسلیاں دیتا رہتا ہے۔

جھوٹی امارت :

وسیم احمد فدا: [۲۲ مئی ۱۲ء] مختصر الفاظ میں آپ نے بہت عمدہ کہانی کہی ہے۔ بے حد پسند آئی۔

طوق اطاعت :

سہیل احمد صدیقی [۳۰ مئی ۲۰۱۴ء]: جھک کر سلام کرنا اسلامی تعلیمات کے منافی فعل ہے۔ یہ طریقہ عجم کے بادشاہوں سے مسلم حکمرانوں نے نقل کیا اور رائج کیا تھا۔

سگریٹ/اندھے کی لاٹھی :

یوگیندر بہل تشنہ : آپ کے منی افسانے پڑھ کر اچھے لگے۔ سگریٹ اور طوائف والا کچھ زیادہ دل کو بھا گیا۔

تنقیدی مضامین و تبصرے:

کرشن چندر کے ادھورے سفر کی پوری داستان

(مطبوعہ شعر و سخن، مانسہرا، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵ء، جلد ۱۶ شمارہ ۶۴)

☆ مدیر کے نام خطوط (مطبوعہ شعر و سخن، مانسہرا، جنوری تا مارچ ۲۰۱۶، جلد ۱۷ شمارہ ۶۵)

آصف ثاقب، بوئی، ایبٹ آباد، پاکستان؛ ۲۳ نومبر ۲۰۱۵ء، ص ۸۶: ..... 'کرشن چندر کے ادھورے سفر کی پوری داستان' دل میلا نہ کرے تو خاصے کی چیز ہے۔ کرشن چندر بڑا رائٹر تھا۔ اس نے ادب فلم اور سیاست میں اپنی سی کر دیکھی۔ سیاست میں اگرچہ اس کا کردار اہم نہیں، تاہم اس کی تحریروں کے اثرات یہاں بھی کہیں نہ کہیں در آتے ہیں۔ کرشن چندر کو سب نے مانا۔ تسلیم و رضا کے پیرائے کبھی محو نہ ہونگے۔ اس کی زندگی میں سلمیٰ صدیقی کا چیپٹر تشویش ناک ضرور ہے مگر انسانی خطاؤں اور مجبوریوں پر دال ہے۔ وہ آخری دموں مسلمان ہوا کہ نہیں ہوا، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ اس نے افسانے کے باب میں اردو ادب کو سرخ روئی عطا کی ہے۔ جو اپنے انداز میں منفرد اور عظیم ہے۔

احمد صغیر صدیقی، کراچی؛ ص ۸۷: اس شمارے میں دیپک بُدکی صاحب نے کرشن چندر کے بارے میں بہت دلچسپ مضمون دیا ہے۔

طالب انصاری، واہ کینٹ، پاکستان: شعر و سخن کا شمارہ ۶۴ ملا۔..... دیپک بُدکی نے کرشن چندر کی زندگی سے روشناس کرایا۔ دلچسپ مضمون تھا۔ لیکن کرشن چندر جیسی مہان شخصیت کی زندگی کے سفر کو پوری طرح محیط نہیں تھا۔ لکھتے ہیں کہ دوستی، یاری اور ملنساری میں کرشن چندر کا جواب نہیں تھا۔ اس کے ثبوت میں وہ چند سطریں ہی پیش کر سکے جب کہ یہ وہ اوصاف ہیں جو کرشن چندر کی شخصیت میں بہت اہم ہیں۔ ان خصوصیات کے حوالے سے مزید لکھنا چاہیے تھا۔ کم سے کم مجھے یہاں تشنگی محسوس ہوئی۔

وشوامتر عادل کرشن چندر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کرشن چندر کا مکان بمبئی کے ہر بے گھر، آوارہ ادیب، فلمی سکرپٹ رائٹر، مصور اور شاعر کی آماجگاہ تھی۔ جس کا ممبئی میں کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا وہ کرشن چندر کے گھر کا رخ کرتا۔ گھر کا بالائی حصہ انہی لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ رات بھر گھر کے اس حصے میں دھما چوکڑی مچی رہتی۔ کوئی رات کو بارہ بجے آ رہا ہے.... کوئی اس سے بھی دیر سے... میرا جی بھی یہیں رہے اور رات گئے لوٹتے۔ کبھی کبھی تو رات کو بالکونی میں ٹہلنے لگتے۔ لکڑی کے فرش پر آواز گونجتی مگر مجال ہے کرشن چندر نے ان لاابالی دوستوں کا برا مانا ہو۔ اس طرح کی باتوں کا اظہار اصل میں کرشن کی ملنساری کے وصف کو نمایاں کرتا ہے۔

(دیپک بدکی نمبر)

سلیم آغا قزلباش، چک نمبر ۵۶، جنوبی سرگودھا پاکستان، ص ۸۹: سہ ماہی شعر و سخن کا تازہ شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵ء نظر نواز ہوا۔ اس شمارے میں دیپک بُدکی کا تحریر کردہ مضمون 'کرشن چندر۔ ادھورے سفر کی پوری کہانی' ان کی شخصیت کو سمجھنے میں معاونت کرتا ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اول تا آخر دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ مشاہیر ادب کے بارے میں اس طرح کے مضامین عام قارئین ادب کے لیے وقتاً فوقتاً شائع ہونے چاہئیں۔

عامر سہیل، ایبٹ آباد، ص ۹۱: دیپک بُدکی کا مضمون 'کرشن چندر۔ ادھورے سفر کی پوری داستاں' ایک خالص تحقیقی تحریر ہے۔ معلومات افزا ہے۔ تاہم ان کا یہ دعویٰ محل نظر ہے کہ پریم چند کے بعد کرشن چندر کو اردو فکشن میں بے انتہا شہرت حاصل ہوئی۔ کرشن چندر اردو افسانے کا اہم نام ضرور ہے لیکن انھیں پریم چند کے بعد مسندِ تکریم پر فائز کرنا کچھ زیادہ بہتر فیصلہ نہیں لگتا۔ بہر حال یہ ان کا ذاتی تحقیقی وژن ہے۔ جس کا وہ حق رکھتے ہیں۔

کرشن چندر اور کشمیر:

سہیل احمد صدیقی، نہایت وقیع اور جامع نگارش ہے۔ بہت خوب۔ پاکستان میں اشاعت کے لیے سہ ماہی الدبیر (بہاول پور) کو ارسال کیجیے۔

مہر افروز، ایڈیٹر خرمن انٹرنیشنل انڈیا [افروزہ کاٹھیاوارڈی]: اچھا جامع مضمون ہے۔ کرشن چندر کے مطالعہ میں زریں اضافہ ہے۔

خلوص و انکسار کا پیکر - اظہر جاوید:

فہیم انور: [۱۷ اگست ۲۰۱۲ء] تخلیق لاہور کے مدیر، شاعر، ادیب اور مترجم جناب اظہر جاوید کے فن و شخصیت پر آپ کا یہ بسیط مقالہ لائق ستائش ہے۔ نیز اظہر جاوید صاحب کو بہترین تحسین بھی۔

امین بنجارا (ناصر احمد قریشی): [۱۸ اگست ۲۰۱۲ء] بہت عمدہ لکھا ہے آپ نے۔ آپ کی اس تحریر میں خلوص اور انکسار کی لہریں موجزن ہیں۔

ایم اے حق کے افسانچوں کی دنیا:

فہیم انور، کولکتہ، مغربی بنگال: [۲۰ ستمبر ۲۰۱۲ء] ایم اے حق کی افسانچہ نگاری پر لکھا گیا یہ آپ کا

ایک اچھا تنقیدی مضمون ہے۔ ابتدا میں افسانے سے متعلق سمرسٹ مام کی نقل کردہ بات اچھی لگی۔

کرشن چندر کا ناول 'غدّار' - ایک تجزیہ :

انور احمد، کراچی (۲۰ راپریل ۲۰۱۶؛ مسینجر) آج آپ کا تجزیہ 'ارتقا' (کراچی) میں پڑھا جو آپ نے کرشن چندر کی کہانی 'غدار' پر کیا تھا۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اس خوبصورت اور بے لاگ تبصرے پر۔ غدار میری پسندیدہ کہانی ہے اور میں نے بار بار اسے پڑھا۔ کرشن نے کمال کا لکھا ہے۔ یہ کہانی آج بھی دونوں ملکوں میں دہرائی جارہی ہے۔ نہ جانے ہم کب انسان بنیں گے۔..... ارتقا بائیں بازو اور آزاد سوچ رکھنے والوں کی بیباک آواز ہے۔

تبصرے :

اپنی مٹی کی مہک (اشفاق برادر):

عالم خورشید: [۴ جون ۲۰۱۲ء] سنجیدگی سے مطالعہ کے بعد غور و فکر سے لکھا گیا منصفانہ تبصرہ، یہ بات آپ کے تمام تبصروں اور مضامین سے جھلکتی ہے۔ یہ بات لکھنے کی ضرورت یہاں اس لیے ہوئی ہے کہ آج کل عام طور پر کتابیں الٹ پلٹ کر تبصرے اور مضامین لکھنے کا چلن عام ہے۔

جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار (نور شاہ):

اسرار احمد رازی: [۸ جنوری ۲۰۱۲ء] آپ نے جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار نامی کتاب پر بہت عمدہ تبصرہ فرمایا ہے۔

ارشد نیاز: [۸ جنوری ۲۰۱۲ء] بہت ہی مختصر اور عمدہ تبصرہ ہے۔

نقوش دل (دل تاج محلی):

شمیم فاروقی: [۹ ستمبر ۱۱، فیس بک] واہ، بہت عمدہ تبصرہ۔ کتاب کا گویا نچوڑ پیش کردیا آپ نے

خورشید حیات: [۸ ستمبر ۲۰۱۱ء، فیس بک] افسانوی مجموعہ 'نقوش دل' پر تبصرہ معتبر افسانہ نگار دیپک بدکی کر رہے ہوں تب تبصرہ صرف تعارف نہیں رہتا (جیسا کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے) بلکہ تبصرہ میں ہر کہانی کا چہرہ بہت قریب سے دِکھ جاتا ہے۔ اور پھر ہوتا یہ ہے کہ کہانی سے اور اس کے کردار سے ملنے کی تمنا جاگ جاتی ہے۔ اس تبصرہ کو پڑھنے کے بعد کچھ ایسا ہی ہوا۔

امین بنجارا: [۹ ستمبر ۲۰۱۱ء، فیس بک] آپ نے اس مختصر سے تبصرے میں ایک نہیں کئی سمندر بند کردیے ہیں۔ دل تاج محلی کی تحریروں اوران کی زندگی کے کئی پہلو قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔

عالم خورشید: [۹ ستمبر ۲۰۱۱ء، فیس بک] بے حد کسا ہوا منصفانہ جائزہ، نثر بے حد صاف شگفتہ، عمدہ پیش کش۔

ھے رام کے وجود پر ھندستان کو ناز (ڈاکٹر اجے مالوی):

سہیل احمد صدیقی: [۲۴ جون ۲۰۱۲ء] بہت جامع تبصرہ حسب دستور، ڈاکٹر اجے مالوی کی علمیت اور علم دوستی کا مداح ہوں۔ انھوں نے مجھے اپنی کتاب ویدک ادب اور اردو کا پورا مسودہ ای میل کے ذریعے ارسال کیا تھا۔ میں نے اس کی مدد سے دیگر مواد جمع کرتے ہوئے اردو اور دیگر زبانوں میں تعلق و اشتراک پر تحقیق شروع کی تھی جو ادھوری ہے۔ [۹ ستمبر ۲۰۱۲ء] یہ ایک متوازن نقطۂ نظر ہے۔ ایک تبصرہ نگار کو اسی طرح معروضیت سے کام لینا چاہیے خاص کر جب وہ ایسی تصانیف پر تبصرہ کرتا ہے۔ پڑھنے میں اچھا لگا۔ (انگریزی سے ترجمہ)

شکسته ساز (عباس عراقی):

سہیل احمد صدیقی: [۵ جون ۲۰۱۴ء] بہت عمدہ اور جامع تبصرہ فرمایا جناب من۔

دست حنائی (منظور پروانہ):

سہیل احمد صدیقی: [۸ جولائی ۲۰۱۴ء] بہت خوب... آپ واقعی دیانت دارانہ تنقید سے بخوبی واقف اور اس پر عمل پیرا ہیں۔

مدھیه پردیش میں اردو تحقیق (مختار شمیم):

سہیل احمد صدیقی [۲۹ اکتوبر ۲۰۱۴ء] بہت جامع اور بھرپور تعارفی تبصرے کے لیے مبارکباد۔ [۱۶ اگست ۲۰۱۵ء] بہت عمدہ موضوع پر جامع تبصرہ ہے۔ کاش مجھے یہ کتاب نصیب ہوجائے۔

بیرونی ممالک کے شاهکار افسانے (رفیق شاہین):

سہیل احمد صدیقی [۳۱ جولائی ۲۰۱۵ء] بہت عمدہ تعارف و تبصرہ فرمایا ہے آپ نے۔ ہمیشہ کی طرح۔

اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ (ڈاکٹر سلیم احمد رضوی):

سہیل احمد صدیقی: [۳ر اگست ۲۰۱۵ء] بہت خوب، منفرد موضوع پر منفرد کتاب۔ اور اس پر آپ کا منفرد تبصرہ مستزاد۔

ادراک اور امکان کے مابین (ڈاکٹر محمد کلیم ضیا):

سہیل احمد صدیقی [۲۶ اگست ۲۰۱۵ء] حسب معمول بہت خوب اور برمحل تبصرہ ہے۔

عبدالاحد آزاد - تحقیقی آئینے میں : (اے این پرشانت)

اومکار کول: [بلاگ، بدکی کی دنیا] کتاب پر ایک بہت ہی عمدہ تبصرہ ہے۔ میں نے یہ کتاب پہلے ہی پڑھی ہے۔

نظمیں :

برسوں پہلے :

نصیر احمد ناصر: [۴ نومبر ۲۰۱۰ء] بڑی دل گداز نظم ہے، اداسی اور ناسٹلجیا میں ڈوبی ہوئی۔ بس زندگی ایسے ہی ہے دیپک صاحب!

سید پرویز احمد: [۴ نومبر ۱۰ء] پھونک سے سحر بنا دیتی ہیں پتھریادیں۔ آپ کی نظم میں بھی وہ سحر، وہ جادو ہے جو انسان کو دور بہت دور یادوں کے دھندلکوں میں لے جاکر بنا دیتی ہیں پتھر، امٹ اور امر۔

اینی شاہ: [۵ نومبر ۱۰ء] دل گداز نظم لکھی ہے آپ نے۔ مجھے ایک شعر کہنے کی اجازت دیجیے۔

؎ اک بار بچھڑ گیا جو وہ پھر نہ مل سکا اے دوست تیرے شہر میں کتنا ہجوم ہے۔ (نامعلوم)

ابرار مجیب: [۲۲ اگست ۲۰۱۱ء] اچھی المیہ نظم ہے، جمالیاتی طور پر خوبصورت۔

شفیق شاہ: اچھی لگی۔ پر آج نم آنکھوں سے جو دیکھتا ہوں/ دنیا کی بھیڑ میں کھو چکی کہیں۔

اجے مالوی: بہت لاجواب نظم ہے۔

فیض احمد فیاض۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ شاعری بھی کرتے ہیں۔ بہت خوب۔

ہنڈو وجے: [۱۷ فروری ۲۰۱۲ء] بہت خوب! ماشا اللہ، بڑے ہی انداز میں تیر نشتر چلاتے ہیں آپ۔ اندازِ بیان آپ کا دل چیرتا ہے۔ یہیں کہیں ہم آپ سے ملے تھے کبھی/ نہ جانے کس موڑ پر بچھڑ

گئے ہم کہیں/ قدرت کی بے رخی سے بے خبر/ اکثر گئے ہم کس قدر/ نہ تم جانو نہ ہم جانیں۔گاڈ بلیس!

قاسم بن ظہیر: [۱۷فروری ۲۰۱۲ء] آپ کی اس نظم کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ دنوں کے بعد آپ کی افسانہ نگاری پر آپ کی نظم نگاری غالب آجائے گی (اگر نظم پر قرارِ واقعی ملتفت رہے) گو کہ آپ کی پہچان ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے مگر (اس نظم کو پڑھ کر) ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کے سینے میں ایک افسانہ نگار سے زیادہ ایک شاعر کا دل دھڑکتا ہے۔آپ کی یہ نظم اس موضوع پر حرف آخر ہے۔ایسی بے نظیر نظم پیش کرنے کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔آمین۔

سنجیو ہنگواسیہ: [۱۶فروری ۲۰۱۲ء] بہت اچھی نظم۔آپ کا ہر شبد پتھر دل کو بھی جیونت کر دیتا ہے۔(ہندی)

وسیم احمد فدا: [۱۵فروری ۲۰۱۲ء] آج تک میں نے صرف آپ کی نثری جولانیاں ہی دیکھی تھیں، آج پہلی دفعہ آپ کی نظم پڑھی۔موضوع، تکنیک، اسلوب، زبان وبان ہر اعتبار سے ایک شاہکار نظم ہے۔یہ نظم اپنے ارتقا سے آخر تک سحر انداز بیانیہ کی مظہر ہے، کلائمکس تک آتے آتے نظم اپنی داد خود وصول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اس بہترین نظم کے لیے آپ کی قلمی رفعتوں کو سلام کرتا ہوں۔

اسرار احمد رازی: [۱۳فروری ۲۰۱۲ء] عمدہ نظم ہے۔آپ نے کچھ مناظر کو بڑی خوبصورتی سے الفاظ کا پیکر دیا ہے۔بہت عمدہ۔

نادرا ہما احمر: خوبصورت!

رفیق راز: [۲۷اگست ۲۰۱۱ء، فیس بک] بہت ہی متاثر کرنے والی نظمیں ہیں۔(انگریزی)

بابا سچ بولو تم آج:

قاسم بن ظہیر: [۲۷فروری ۲۰۱۲ء] بہت عمدہ نظم ہے۔تہنیت قبول فرمائیں۔میں آپ کو صرف بحیثیت افسانہ نگار جانتا تھا، یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ افسانہ نگاری کے علاوہ نظم نگاری بھی کرتے ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

ممتاز نازاں: [۱۴دسمبر ۲۰۱۱ء] واہ، بہت خوب۔دیدہ زیب بھی ہے۔اور تسکین روح بھی۔

اٹل پرکاش ترویدی: [۱۳دسمبر ۲۰۱۱ء] خوب، بہت عمدہ، سندر لکھا ہے۔اور آگے جیسی گفتگو

ہوئی تھی آپ سے آدم اور حوا کی جنت سے رخصتی پر میرا ایک نظم ہے۔ آپ کو بتاؤں گا۔ (ہندی)

للت امبار دار: [۱۲ دسمبر ۲۰۱۱ء] فکر انگیز نظم جوان لوگوں کی کسمپرسی کی تصویر پیش کرتی ہے جنھیں جبراً اور بہیمی طور پر اپنی دھرتی سے بے دخل کردیا گیا۔ (انگریزی سے ترجمہ)

نادر انا: [۱۲ دسمبر ۲۰۱۱ء] بہت سچا کلام، بدکی صاحب!

عالم خورشید: [۱۱ دسمبر ۲۰۱۱ء] واہ...آپ نے تو حیران کردیا۔ اچھی نظم ہے، بے حد رواں اور پوری طرح بحر میں۔ بس ایک آدھ جگہ لکنت کا احساس ہوا لیکن وہ بھی کوئی خاص نہیں۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنے اندر کے شاعر کو ڈھونڈ نکالا۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

بشیر بڈگامی: [۱۱ دسمبر ۲۰۱۱ء] خوبصورت نظم ہے اگر چہ بقول عالم خورشید کہیں کہیں لکنت ہے۔ ایک آدھ نظر ثانی سے بہتری کی توقع ہے۔ نظم کا آہنگ متاثر کن ہے اور اس کے امپیکٹ میں اضافہ کرتا ہے۔ کہیں کہیں بڑی زبردست روانی ہے۔ نظم کا حزنیہ لہجہ خوب ہے۔ بحثیت مجموعی ایک کامیاب نظم ہے۔

وجے بدکی: [۱۱ دسمبر ۲۰۱۱ء] بہت ہی خوبصورت نظم۔ ایک شاعر کے لباس میں اتنے ہی جاذبِ نظر ہو جتنے ایک افسانہ نگار کے روپ میں۔ ہر فن پر آپ کی گرفت مضبوط ہے۔ آفرین!!!

کے ایم خالد: [۲۳ دسمبر ۲۰۱۱ء] خیالات کی اڑان اوجِ ثریا پر ہے۔

منوج ابودھ: [۱۶ دسمبر ۲۰۱۱ء] بہت خوب ہے۔ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ساتھ ساتھ ہندی دیوناگری میں بھی دیں۔

اے میرے بھیشم پتامہ:

نینا سپرو ترسل (نامور گلوکار): [۳۱ اگست ۲۰۱۱ء، فیس بک] سمویدھناؤں سے پری پورن اس ویتھا کتھا کی جتنی پرشنسا کروں، کم ہے۔ آج دو دن بعد ایف بی پر آنے کا سمئے ملا تو سب سے پہلے آپ کی کویتا پڑھی اور آنکھیں نم ہوگئیں۔ (ہندی)

ستیندر سینگر: [۲۰ ستمبر ۲۰۱۱ء، فیس بک] تم اس وقت بس دیکھ رہے تھے/ بے بس اور لاچار کھڑے تھے/ بھیشم پتامہ کھڑے ہو جیسے......واہ کیا بات ہے۔ ہم سب جیون میں کئی بار بھیشم پتامہ بنتے ہیں.....بے بس اور لاچار.....شاید اسی کا خمیازہ یہ دیش بھوگ رہا ہے۔

ابرار مجیب: [۲۶/اگست ۱۱ء فیس بک] مہا بھارت کے کرداروں کے پس منظر میں آج کا المیہ بہت ہی فنکارانہ مہارت سے بیان کیا ہے آپ نے۔ایک اچھی نظم کی تخلیق پر آپ کو مبارکباد۔

وسیم حیدر ہاشمی: [۲۶/اگست ۱۱ء فیس بک] ایسی جاذب اور جالب تحریر کم ہی نظر آتی ہے۔

رضیہ مشکور: [۲۸/اگست ۱۱ء، فیس بک] سلام مسنون بدکی صاحب۔نظم خوب ہے۔وہ جو تاریخی پس منظر اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے اور جو لفظوں کا انتخاب ہوا ہے، بہت خوب ہے۔

اقبال نیازی: [۲۶/اگست ۱۱ء] شاندار نظم ہے......اسے اردو، ہندی کے رسائل میں بھی چھپنا چاہیے۔

عالم خورشید: [۲۵/اگست، فیس بک] بہت خوب جناب۔دل کو چھو لینے والی نظم۔واہ!!!

فاطمہ زہرہ جبیں: [۲۶/اگست، فیس بک] بہت خوب۔ایسی نظم جو ناامیدی کو امید کی کرن دیتی ہو اور دل کو چھوتی ہو۔داد قبول کیجیے۔بے کتبہ قبروں میں دبا ہو!

آفتاب احمد آفاقی: [۲۶ اگست، فیس بک] عہد حاضر کا منظر نامہ ہے۔

پروین طاہر: [۲۶/اگست، فیس بک] بہت خوب دیپک، ہندستانی متھ سے آپ نے ایک علامتی نظم تخلیق کی ہے۔دل کو چھو لینے والی نظم ہے۔

پرویز بلگرامی: بہت خوب۔دل کو چھو گئی۔

وہ کہانی بھول جا

وجے بدکی: [۱۱دسمبر ۲۰۱۱ء] الفاظ کو جس انداز سے تحریر کی لڑیوں میں پرویا گیا ہے اس کی ستائش کیے بنا نہیں رہا جا سکتا ہے۔بہت عمدہ!!!

دیپک بدکی کی شخصیت اور فن پر مضامین

افسانوں کا بادشاہ : دیپک بُدکی (ایم اے حق):

اقبال حسن آزاد: [۱۱/اگست ۲۰۱۱ء] بے شک، دیپک بُدکی صاحب ایک منفرد افسانہ نگار ہیں ۔...[۱۷ اگست ۲۰۱۱ء] دیپک بُدکی کی فن افسانہ نگاری پر مضبوط گرفت ہے اور وہ واقعے کو افسانہ بنانے کا

گر اچھی طرح جانتے ہیں۔

پرویز ملک زادہ: [۱۱راگست ۲۰۱۱ء] میرا تو شروع سے ہی یہ خیال ہے۔ میں ڈاکٹر حق کی باتوں کی تائید کرتا ہوں۔

ارشد نیاز: [۱۳راگست ۲۰۱۱ء] دیپک بُدکی کی کہانیوں سے یہ ثابت کرنا کہ ان کا رشتہ کس کس سے زیادہ استوار ہے، ایک اچھی کوشش ہے۔ میں جہاں تک جانتا ہوں کہ ہر کہانی کے کردار کی زبان سے فن کار ہی بولتا ہے۔ وہی وجود میں آتا ہے اور وہی اپنے آپ کو اختتام تک پہنچاتا بھی ہے۔ کسی فن کار کی کہانیوں سے ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اس کے وجود کے کارخانے میں کون سا سامان تیار ہو رہا ہے۔ دیپک جی میری نظر میں ایک منجھے ہوئے کہانی کار ہیں۔ ان کی کہانیاں سماج کی آئینہ ہوتی ہیں اور وہ ان کہانیوں سے جو پیغام قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں، وہ آسانی سے پہنچا دیتے ہیں۔ ان کے یہاں الجھاو نہیں ہے، اور نہ وہ لفظوں کے سہارے دقیانوسی محل تیار کرتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں اور آسانی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

ایوب سلامت: [۱۶راگست ۲۰۱۱ء] حق صاحب کا تبصرہ پڑھ کر آپ کے افسانے پڑھنے کا اشتیاق بڑھ گیا ہے۔ آپ اگر اپنے افسانے جو فیس بک میں موجود ہیں ٹیگ کر دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔

فاروق نازکی: [۱۶راگست ۲۰۱۱ء] میرے لیے دیپک بُدکی ایک خود تراشیدہ پیکر ہے۔ اس نے پورا تخلیقی عمل اپنی نوک پلک درست کرنے میں صرف کیا۔ اپنی تعمیر کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

اسحاق ساجد: [۱۰راگست ۲۰۱۱ء] ماشا اللہ، ڈاکٹر حق صاحب نے حق ادا کیا ہے اور بُدکی صاحب کے کچھ پہلو جو نظروں سے بعض لوگوں سے اوجھل تھے وہ سامنے آئے ہیں۔ میرے نزدیک محترم بدکی صاحب ان چند افسانہ نگاروں میں شامل ہیں کہ افسانہ پڑھنے کے مدتوں بعد بھی افسانے کا لطف اسی طرح رہتا ہے جیسے آپ اب پڑھ رہے ہوں۔ میں نے ان کے کئی افسانے پڑھے ہیں۔ آپ کمال کا لکھتے ہیں۔ ان کا ایک آدھ نہیں بلکہ درجنوں ایسے افسانے ہیں جو ہمیشہ دل پر اثر چھوڑتے ہیں۔

☆☆☆☆☆
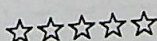
سوری میڈم

بہت پرانا واقعہ ہے جو میرے ذہن پر اس دن سے سوار ہے جس دن یہ وقوع پذیر ہوا تھا۔کئی بار اس سانحہ نے میرے ذہن پر دستک دی۔ ''تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے قرطاس پر ضرور اتاروگے پھر بھی اب تک ٹال مٹول کرتے رہے۔''

یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس حادثے کو کئی بار قلم بند کرنے کی شعوری کوشش کی مگر جب بھی قلم ہاتھ میں اٹھاتا ہوں سارا وجود لرز جاتا ہے۔کچھ مہیب سے سائے میرے دل و دماغ کا احاطہ کرتے ہیں۔ آنکھیں یکا یک بند ہوجاتی ہیں اور ایک ننھی منی پیاری سی بچی بانہیں پھیلا کر میرے سامنے ظاہر ہوجاتی ہے۔ وہ مدد کے لیے چیختی ہے، چلاّتی ہے اور پھر بے بس ہوکر خاموش ہوجاتی ہے۔ وہ زبان سے کچھ بولنے کی مسلسل کوشش کرتی ہے مگر خوف و وحشت کے باعث بول نہیں پاتی۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آتا ہے اور انگلیاں کانپنے لگتی ہیں۔قلم آگے بڑھنے سے انکار کرتا ہے اور خود بخود رک جاتا ہے ۔میں قلم کو اپنی جگہ پر رکھنے کے لیے مجبور ہوجاتا ہوں اور پھر خیالوں میں گم ہوجاتا ہوں۔

میرے ساتھ کئی بار ایسا ہوا ہے۔کئی بار ہی کیوں، بیسیوں بار ہوا ہے۔دن میں، رات میں، جاگتے ہوئے، سوتے ہوئے....کوئی میرے ذہن پر دستک دے کر مجھے پکارتا ہے، ''اٹھو کہانی لکھو...اٹھو ....بہت دیر ہوگئی...اب تو لکھ ڈالو۔'' میں اٹھتا ہوں، ہاتھ میں قلم اور کاغذ اٹھاتا ہوں۔لیکن یکا یک وہی کنپن...وہی لرزش.....وہی تھرتھراہٹ محسوس کرتا ہوں اور پھر قلم میز پر رکھ دیتا ہوں۔اب تک میں نے ایک سو سے زائد کہانیاں رقم کی ہیں لیکن ایسی کیفیت سے کبھی دوچار نہیں ہوا۔

اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔ مجھے وہ واردات پھر یاد آئی ہے جو مجھے بار بار تڑپاتی ہے۔میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس کو قلمبند کرکے ہی دم لوں گا، چاہے کچھ بھی ہوجائے۔

نیند آہستہ آہستہ آنکھوں سے غائب ہوتی جارہی ہے۔ میں بستر ہی میں اٹھ بیٹھا ہوں اور کہانی لکھنے لگا ہوں

اس کو شاید کہانی کہنا غلط ہوگا۔ یہ ایک سچا واقعہ ہے جو برسوں پہلے پیش آیا تھا۔ میں ان دنوں بریلی میں تعینات تھا۔ میری بیوی ایک مقامی سکول میں پڑھاتی تھی۔ صبح سویرے اخبار پڑھنے لگا تو ایک نہایت ہی دل خراش خبر پر آنکھ ٹھہر گئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بیوی کو آواز دی اور اس خبر کے بارے میں پوچھ لیا۔ مگر اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ البتہ اس روز وہ سکول سے جلدی واپس آئی اور جونہی میں آفس سے لوٹا تو ایسے مخاطب ہوئی جیسے میرا ہی انتظار کر رہی ہو۔ ''آپ نے صبح جس خبر کے بارے میں پوچھا تھا، سکول میں دن بھر صرف اسی کا چرچا ہوتا رہا۔ پرنسپل نے آدھی چھٹی کے بعد ہی سکول بند کرنے کا حکم دیا۔''

پھر اس نے سارا واقعہ بیان کیا۔ کچھ معلومات تو مجھے پہلے ہی اخبار سے معلوم ہو چکی تھیں۔ اس لیے دونوں بیانات کا موازنہ اور تقابل کر کے سارے ماجرے کا تصوراتی خاکہ کھینچ لیا۔

میری آنکھوں کے سامنے بلیو بیلز سیکنڈری سکول کی چوتھی جماعت کا بڑا سا کمرہ نمودار ہوا۔ ڈیسکوں کے پیچھے چھوٹی چھوٹی کرسیوں پر سفید بلاؤز اور نیلی سکرٹ میں ملبوس پریوں ایسی نرم و نازک لڑکیاں براجمان تھیں۔ چوٹیاں بندھی ہوئیں، کسی کی دو اور کسی کی ایک، ہنستی کھیلتی معصوم بچیاں، بالکل گلاب کی کلیوں جیسی، خوبصورت اور بے ریا۔ سبھی لڑکیاں چڑیوں کی مانند چہچہا رہی تھیں۔ شور و غل اتنا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پھر ایک دم ہر طرف خاموشی سی چھا گئی۔ لڑکیوں کے لب سل گئے اور وہ اپنی وردی کو ٹھیک ٹھاک کر کے کرسیوں پر تن کر بیٹھ گئیں۔

سامنے دروازے سے ایک فربہ اندام، رعب دار چہرے مہرے والی، ساڑی میں ملبوس، بال جوڑے میں گندھے ہوئے، آنکھوں پر ایک بڑی سی عینک چڑھائے، ہونٹوں پر ہلکی گلابی لپ اسٹک لگائے، ایک ہاتھ میں پرس اور دوسرے ہاتھ میں چند کاپیاں لیے، تیس پینتیس سال کی عورت اندر آئی۔ یکایک جماعت کی ساری لڑکیاں کھڑی ہو گئیں اور پھر آرڈر ملتے ہی واپس اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ استانی کا نام مالتی تومر تھا اور وہ ایک نو دولتیے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ بی اے بی ایڈ پاس کر کے والدین نے مقابلے کا نو دولتیا گھر ڈھونڈ کر اس کی شادی کر لی۔ سسرال میں ساس سسر اور نند دیور تھے مگر سبھی نے اس کو آنکھوں پر بٹھا دیا۔ گھر میں ایک کے بدلے دو نوکر تھے اور ڈرائیور الگ۔ نوکر گھر کا کام کر لیتا اور نوکرانی دو بچوں کو

سنبھال لیتی۔ پھر ساس بھی تو تھی جس نے گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ مالتی کو بچوں کے بڑھنے کا احساس ہوا نہ تجربہ۔ چند مہینے دودھ پلایا پھر اشرافی ماؤں کی طرح وہی لیکٹوجن اور سیری لیک ڈِبے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

کچھ برس گزرنے کے بعد مالتی کے بدن میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ بوریت سی محسوس کرنے لگی۔ شام کو کٹی پارٹیوں میں جایا تو کرتی تھی مگر وہاں سبھی سہیلیوں سے یہی سننے کو ملتا تھا کہ عورت کو گھر میں قید نہیں ہونا چاہیے، دن میں کوئی کام کرنا چاہیے۔ موجودہ زمانے میں عورت کسی کی غلام نہیں ہے، اسے اپنے ڈھنگ سے جینے کا پورا پورا حق ہے۔ پانی کی بوند بوند گرنے سے تو پتھر پر بھی نشان پڑ جاتا ہے۔ مالتی نے بھی فیصلہ کر لیا کہ تفریح کے لیے ہی سہی، وہ کسی سکول میں ضرور نوکری کر لے گی۔ اثرورسوخ تو تھا ہی، اِدھر دماغ میں خیال آیا، اُدھر بلیو بیل سکول کے انتظامیہ نے جوائن کرنے کی دعوت دی۔ سکول میں بھی وہ اپنی ہی دنیا میں مست رہتی تھی۔ بچے تو بس اس کے لیے کھلونے تھے، ان کے ساتھ کچھ گھنٹے کھیل لیتی اور پھر واپس اپنے گھر۔

اس دن کا وہ آخری پیریڈ تھا۔ دوسرے روز سے چار دن کے لیے سکول بند ہونے والا تھا۔ سنیچر، اتوار اور دو چھٹیاں! چھٹیوں کا کیا، ہندستان میں ہر روز کوئی نہ کوئی تیوہار منایا جاتا ہے۔ مالتی نے طالبات کے ماہانہ ٹیسٹ کی کاپیاں لوٹا دیں اور جن طالبات کے بہت کم نمبر آئے تھے ان کی سرزنش کی۔ نیہا نے تو کمال ہی کر دیا تھا۔ نوٹ بک پر کچھ لکھا ہی نہ تھا۔ مالتی اسے بہت ناراض ہوگئی۔ پہلے کھڑے ہونے کو کہا۔ نیہا کھڑی ہوگئی۔ پھر اسے سوال پوچھا۔ ''نالج کے سپیلنگ بتاؤ؟''

نیہا چپ چاپ کھڑی رہی اور کچھ بھی نہ بولی۔ اس نے آج بھی سبق یاد نہیں کیا تھا۔ کرتی بھی کیسے؟ ٹیسٹ سے ایک روز پہلے دادی گھر پر باتھ روم میں نہاتے نہاتے گر پڑی تھی اور اس کی داہنی ٹانگ ٹوٹ گئی تھا۔ وہ کراہ رہی تھی۔ والدین اسے فوراً اسپتال لے گئے جب کہ پریشان نیہا اکیلی ہمسائے کے گھر میں پڑی رہی۔ کچھ پڑھ ہی نہ پائی۔ پھر سکول کا کام کرنے میں ماں اس کی رہنمائی کرتی تھی مگر وہ تو رات بھر اسپتال میں رہی۔ دادی اب بھی پلستر باندھے ہسپتال میں پڑی ہوئی ہے۔

ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی نیہا۔ بڑے نازوں میں پلی ہوئی۔ والدین نے کتنے خواب سنجوئے

تھے اپنی بیٹی کے لیے۔ حالانکہ متوسط طبقے کی اڑانیں محدود ہوتی ہیں۔ بیٹی اچھی تعلیم پائے، اچھی نوکری کرے اور پھر اچھے گھر میں بیاہ کر کے چلی جائے۔ اس سے آگے تو وہ کبھی سوچتے بھی نہیں۔ انھی خوابوں کی تعبیر کے لیے انھوں نے بڑے جتن کر کے اس کو شہر کے اس نامور سکول میں داخل کروایا تھا۔ داخلے کے وقت وہ محض پانچ سال کی بچی تھی۔ انٹرویو ہوا۔ اسے اپنا اور والدین کا نام پوچھا گیا اور اس نے توتلی زبان میں پھٹا پھٹ جواب دیا تھا۔ والدین سے بھی کئی سوالات پوچھے گئے جیسے ان کا ہی داخلہ ہونے والا ہو۔ بے چاروں نے جوں توں کر کے سوالوں کے جواب دیئے۔ پھر فیس اور تعمیری فنڈ کی طلب ہوئی۔ کُل ملا کر تیس ہزار آفس میں جمع کیے۔ کچھ دنوں کے بعد نیہا کا ایڈمشن ہوا اور والدین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ نیہا کو سکول بھیجنے میں جو خرچہ برداشت کرنا پڑ رہا تھا اس کے لیے والدین کو اپنا پیٹ کاٹنا پڑا۔ سب ضروری اور غیر ضروری اخراجات میں کٹوتی ہونے لگی۔ یہ سلسلہ چار سال تک یونہی چلتا رہا اور نیہا چوتھی جماعت تک پہنچ گئی۔ روپیہ پانی کی طرح بہہ تو رہا تھا لیکن تسلی اس بات کی تھی کہ سال کی اخیر میں سند مل جاتی تھی جس میں لکھا ہوتا تھا کہ نیہا امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئی ہے۔

''اچھا، ٹیچر کے سپیلنگ بتاؤ'' معلّمہ نے اپنی آواز کو اور زیادہ بھاری اور کرخت بنا کر پوچھ لیا۔

نیہا پھر بھی خاموش اپنی ٹیچر کو دیکھتی رہی اور اس کے منہ سے کوئی لفظ بھی نکل نہیں پا رہا تھا۔

مالتی تومر کا پارہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔ ویسے ہی جھلائی ہوئی تھی۔ صبح گھر سے نکلتے وقت اس نے اپنے پتی کو سکول سے گھر لے جانے کے لیے کہا تھا مگر اس نے منع کیا۔ شام کو ریل گاڑی سے ڈیرہ دون جانا تھا۔ ٹکٹیں بک ہو چکی تھیں۔ وہاں سے مسوری جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔ ابھی اسے گھر جانا تھا، پیکنگ کرنی تھی، بچوں کو تیار کرنا تھا اور پھر شام کو چھ بجے ریلوے سٹیشن پہنچنا تھا۔ ویسے بھی آخری پیریڈ تھا اور اسے گھر جانے کی ہمیشہ جلدی پڑی رہتی تھی۔ نیہا کی مسلسل چُپی نے اس کے ذہن کو مختل کر دیا۔ مالتی نے اس معصوم بچی کو پھٹکارتے ہوئے کہا۔ ''لاسٹ روم میں چلی جاؤ اور دیوار کی طرف منہ کر کے وہاں بینچ پر کھڑی ہو جاؤ۔ جب تک میں نہ کہوں گی، نیچے نہیں اترنا۔''

نیہا کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر اُمڈ آیا۔ مارے خوف کے وہ کچھ بھی نہ کہہ پائی۔ چپ چاپ اپنی قطار سے باہر نکل کر آخری بینچ پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی اور دیوار کی طرف اپنا منہ کر لیا۔

مالتی تو مر نیا سبق پڑھانے میں منہمک ہوگی۔ قریب بیس منٹ کے بعد سکول کی آخری گھنٹی بج گئی اور ساری لڑکیاں کمرے سے یوں دوڑتی ہوئی باہر نکل گئیں جیسے کسی جیل خانے سے قیدی چھوٹ گئے ہوں۔ مالتی کو ان سے بھی زیادہ تعجیل تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا پرس اٹھایا اور طالبات سے پہلے کمرے سے باہر چلی گئی۔ کسی نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی کو نیہا کی طرف دھیان گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سارا اسکول خالی ہوگیا۔ نیہا کلاس کے آخری بنچ پر دیوار کی طرف منہ کر کے خاموش ایسے کھڑی رہی جیسے ڈوروتھی براؤن ہیمانز کی نظم میں کسابلانکا جلتے ہوئے عرشہ جہاز پر کھڑا رہا تھا۔ اس کو اتنا تو احساس ہو رہا تھا کہ سارا کلاس خالی ہوتا جا رہا ہے مگر وہ مڑنے یا بینچ سے اترنے سے ڈر رہی تھی کہ کہیں ٹیچر اور ناراض نہ ہو جائے اور سزا بڑھا دے۔

کچھ دیر کے بعد سکول کا چوکیدار کمروں کے دروازے بند کرنے کے لیے گشت لگانے لگا۔ چنانچہ کمروں کی کھڑکیاں رات بھر کھلی رہتی تھیں اس لیے اس کو کمرے کے اندر جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بس کمرے کے دروازے پر پہنچتا گیا، دونوں پٹ بند کر دئے اور پھر باہر سے کنڈی لگا دی۔ صرف پرنسپل کے کمرے اور سائنس لیبارٹری کی پوری طرح سے چیکنگ کر لی۔ چوکیدار اس کمرے کے پاس بھی پہنچا جہاں نیہا سزا بھگت رہی تھی۔ چنانچہ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی اس لیے اس نے دروازہ بھیڑ کر باہر سے کنڈی لگا دی۔

آہستہ آہستہ کلاس روم میں اندھیرا بڑھتا گیا اور نیہا گھبرانے لگی۔ تھوڑی بہت چاندنی کی روشنی چھن چھن کر کمرے میں اب بھی آ رہی تھی۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ بہت کوشش کے باوجود وہ زیادہ دیر بنچ پر کھڑی نہ رہ سکی۔ وہ رونے لگی۔ زار و قطار رونے لگی۔ مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ سارا اسکول خالی ہو چکا تھا۔ چوکیدار ہاتھ میں ڈنڈا لیے نیچے بہت دور مین گیٹ پر سٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ اگلے چار دن سکول بند تھا۔

معصوم نیہا نے ہاتھ میں چاک اٹھایا اور کرسی پر چڑھ کر بلیک بورڈ پر ہندی میں لکھنے لگی۔

''ممی... ممی... مجھے ڈر لگ رہا ہے!''

''پاپا... پاپا... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے!''

''سوری میڈم... سوری میڈم... اب میں پاٹھ یاد کر کے آیا کروں گی... میڈم مجھے معاف

کردو... سوری میڈم... سوری میڈم... میں کل سے بھی بناپاٹھ یاد کیے نہیں آؤں گی... سوری میڈم... سوری میڈم... سوری میڈم.... مجھے گھر جانے دو... میڈم مجھے گھر جانا ہے... میڈم مجھے ڈر لگ رہا ہے.... سوری میڈم... سوری میڈم.....!''

''ممی مجھے بچاؤ.... پاپا مجھے یہاں سے لے جاؤ۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پاپا۔ آپ کہاں ہو؟''

''پاپا، جلدی آجاؤ....!''

وہ بلیک بورڈ پر تب تک لکھتی رہی جب تک پورا بلیک بورڈ اس کی لکھی ہوئی عبارت سے بھر گیا۔ اب بلیک بورڈ پر کہیں کچھ بھی لکھنے کے لیے جگہ نہ تھی۔

بہت دیر کے بعد تھک ہار کر نیہا وہیں فرش پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔

اُدھر گھر میں ماں باپ دونوں پریشان ہوئے کہ نیہا سکول سے واپس کیوں نہیں آئی؟ جس رکشا پر وہ گھر لوٹتی تھی اس سے رابطہ کیا مگر رکشا والے نے بتایا کہ بٹیا تو میرے ساتھ واپس گھر نہیں آئی ۔میں نے تو بہت دیر تک اس کا انتظار کیا۔ پھر میں نے سوچ لیا شاید آپ لوگ خود ہی اس کو گھر لے گئے ہوں گے۔ سکول میں دریافت کرنے گئے تو چوکیدار نے بتایا کہ سارے بچے کب کے چلے گئے۔ پرنسپل سے رابطہ کیا تو اس نے بھی کورا سا جواب دیا کہ سارے بچے چھٹی ہونے کے ساتھ ہی چلے جاتے ہیں۔ کوئی سکول میں کیسے رہ سکتا ہے اور پھر رہے گا بھی کیوں؟ کسی کے وہم و گماں میں بھی نہ تھا کہ وہ معصوم بچی سکول میں سزا کاٹ رہی ہے۔

جس معلمہ نے سزا سنائی تھی وہ خود مسوری کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ والدین کو سزا کے بارے میں کسی نے بتایا بھی نہیں۔ ان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ مایوس ہو کر والدین نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ انھوں نے آشواسن دیا کہ وہ جلدی ہی بچی کا پتا لگائیں گے۔ تھانے دار نے ماں باپ سے طرح طرح کے سوالات پوچھے تا کہ کوئی سراغ مل جائے مگر وہاں نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ پھر کہنے لگے آپ گھبرائے نہیں، ہم ایک دو روز میں اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ بہت ممکن ہے کسی نے کچھ لالچ دے کر اغوا کر لیا ہو۔ علاوہ ازیں انھوں نے والدین کو خبردار رہنے کو کہا کہ اگر کسی کا فون آتا ہے یا فروتی کی مانگ ہوتی ہے

تو پولیس کو ضرور خبر کر دیں۔ والدین گھر جا کر ٹیلی فون کے پاس یوں بیٹھ گئے جیسے ابھی گھنٹی بجنے والی ہو۔ کبھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تو دونوں چیتے کی طرح اس پر لپکتے۔ پھر نراش ہو کر واپس اپنی جگہ بیٹھ جاتے۔

اُدھر نیہا بے ہوش ہو کر فرش پر کیا گری کہ پھر کبھی نہیں اٹھی۔ چار روز پڑے پڑے اس کا بدن اینٹھ گیا تھا۔ سارے جسم کا رنگ کچھ عجیب سا زرد ہو گیا تھا۔ اس کے بند مٹھی میں وہی چاک تھا جسے اس نے سیاہ تختے پر لکھ لکھ کر اپنی جان گنوائی تھی۔

ماں باپ نے ایک ایک لمحہ، ایک ایک گھڑی اور ایک ایک دن کیسے گزارے اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ البتہ انھیں موہوم سی امید تھی کہ کوئی نہ کوئی نیہا کی خبر ضرور لے کر آئے گا۔ وہ اپنی ساری جائیداد اغوا کرنے والے کو سونپنے کے لیے تیار تھے اگر وہ ان کی نیہا لوٹا دیتا۔ مگر کہیں سے کوئی فون نہیں آیا۔ نیہا کے پتا جی ہر گھنٹے پولیس سٹیشن فون کر کے پوچھ لیتے اور دن میں ایک دو بار خود بھی پولیس سٹیشن چلے جاتے ۔وہ پولیس کے اعلیٰ افسروں سے بھی ملے لیکن ناکام رہے۔

بدھوار کی صبح حسب معمول سکول کھولا گیا اور صفائی کرمچاری کمروں کی صفائی میں جٹ گئے۔ جونہی ہاتھ میں جھاڑو لیے ایک صفائی کرمچاری نے چوتھی جماعت کے کمرے میں قدم رکھا، اندر سے سڑاند کے بھبکے نے اس کا استقبال کیا۔ دفعتاً اس کی نظریں سامنے بلیک بورڈ کے پاس فرش پر پڑی ہوئی ایک چھوٹی سی لڑکی کی لاش پر پڑی۔ وہ گھبرا گیا اور دوڑتا بھاگتا چوکیدار اور دوسرے صفائی کرمچاریوں کو بلا کر لے آیا۔ پھر پرنسپل، پولیس اور نیہا کے والدین کو خبر کر دی گئی۔ کمرے کے اندر جاتے ہی سب کی نظریں فرش پر پڑی ہوئی معصوم نیہا پر پڑیں جو ابدی نیند سو رہی تھی۔ پھر ان کی نظریں بلیک بورڈ پر پڑیں جس پر اس معصومہ نے بار بار ایک ہی بات دہرائی تھی۔

''ممی...ممی... مجھے ڈر لگ رہا ہے! پاپا... پاپا... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے! سوری میڈم... سوری میڈم...اب میں پاٹھ یاد کر کے آیا کروں گی۔ میڈم مجھے معاف کر دو... سوری میڈم... سوری میڈم... میں کل سے کبھی بنا پاٹھ یاد کیے نہیں آؤں گی... سوری میڈم... سوری میڈم... سوری میڈم... مجھے گھر جانے دو.. میڈم مجھے گھر جانا ہے... میڈم مجھے ڈر لگ رہا ہے.... سوری میڈم... سوری میڈم.....! ممی مجھے بچاؤ... پاپا مجھے یہاں سے لے جاؤ... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پاپا... آپ کہاں ہو؟ پاپا... جلدی آجاؤ!'' ☆☆☆

اب میں وہاں نہیں رہتا

ڈاکیہ تین بار اس ایڈرس پر مجھے ڈھونڈنے گیا تھا لیکن تینوں بار مایوس ہو کر لوٹ آیا۔

اس نے دروازے پر کئی بار دستک دی تھی، بلند آواز میں میرا نام پکارا تھا اور پھر دائیں بائیں دیکھ لیا تھا کہ شاید کوئی پڑوسی آواز سن کر گھر سے باہر نکل آئے اور اسے بتلا دے کہ میں گھر میں موجود ہوں یا نہیں اور اگر نہیں ہوں تو کہاں مل سکتا ہوں۔ مگر کوئی پڑوسی نہ گھر سے باہر نکلا اور نہ ہی کسی نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔

شاید اڑوس پڑوس کے سبھی گھر خالی تھے۔ سارا محلّہ قبرستان کی مانند سنسان پڑا تھا۔ کہاں تو ہر نکڑ پر بے شمار کُتے مل جاتے تھے جو گھروں سے پھینکے ہوئے ٹکڑوں پر پلتے تھے اور کہاں یہ منظر کہ کہیں کوئی کتا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جیسے سبھی کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

میرے مکان سے ٹپکتی ہوئی غمزدہ خاموشی دیکھ کر وہ ہر بار بوجھل قدموں سے واپس مڑ جاتا۔

ایک زمانہ تھا کہ سردی اور گرمی کی چھٹیوں میں بس صدر دروازے پر دستک دینے کی ضرورت تھی کہ دروازے کے دونوں پٹ کھل جاتے اور وہ مجھے اپنا منتظر پاتا۔ اس کو میرا نام لینے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ دستک سن کر ہی میں سمجھ جاتا کہ ڈاکیہ آیا ہوگا۔ پھر دونوں برآمدے میں بیدکی کرسیوں پر بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگاتے اور بہت دیر تک باتیں کرتے۔ وہ طرح طرح کی کہانیاں سناتا۔ عطر چھڑکے لفافوں کی، خون سے لکھے ایڈریسوں کی، منی آرڈر پاتی بیواؤں کی، برسوں بعد لکھے بیٹے کے خطوں کی اور خدا کے نام لکھی گئی چھٹیوں کی۔ ایک عجیب بے نام سا رشتہ تھا ہم دونوں کے درمیان۔ باقی دنوں میں کالج جانے کے سبب گھر پر نہیں ملتا پھر بھی نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں مجھ کو ڈھونڈتی رہتیں۔ میرے خاندان کا کوئی فرد صدر دروازہ کھول کر کہہ دیتا۔ ''وہ آج یہاں پر نہیں ہے۔ کالج چلا گیا ہے۔ آپ اس کی چھٹیاں مجھے دے

دیجیے۔'' مانگنے والا اگر گھر میں آیا کوئی مہمان ہوتا تو ہم دونوں کے بیچ کا رشتہ بھی بتلا دیتا۔ دراصل ڈاکیہ میرے رشتے داروں سے مانوس ہو چکا تھا اور ان کو میری ڈاک سونپنے میں سنکوچ نہیں کرتا تھا لیکن غیر شناسا چہرہ سامنے پا کر کچھ ہچکچاہٹ ضرور ہوتی۔ یہ میری ہی ہدایت کا اثر تھا کہ وہ میری ڈاک کسی ایرے غیرے کو نہیں دیتا تھا۔ بہت ایمان دار اور فرض شناس ڈاکیہ تھا۔ یوں بھی دیانت داری اور بھروسے کے اعتبار سے ڈاکیے بے نظیر ہوتے ہیں۔ خط کو دیکھتے ہی مضمون کا اندازہ لگاتے ہیں۔ عطر بیز خط کو مسکراہٹ کے ساتھ تھما دیتے ہیں جبکہ بری خبر والے خط کو انگارے کی مانند اپنے ہاتھ سے جھٹک دیتے ہیں۔

مگر اب.....! اب تو میں وہاں نہیں رہتا۔ میں کہاں رہتا ہوں مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ میرے اپنے جہاں لے جاتے ہیں، چلا جاتا ہوں۔ نئی جگہیں، نئے شہر، نئے ممالک....! طالب علمی کے زمانے میں ان جگہوں کے نام سنا کرتا تھا مگر وہاں جانے کا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

چار منزلہ لکھوری اینٹوں کا میرا ڈھنڈار مکان، جس کے در و دیوار سے سوندھی سوندھی مٹی اور دیودار کی بو آتی تھی، خاموشی سے ڈاکیے کو تکتا مگر کوئی جواب نہیں دے پاتا۔ دیتا بھی کیسے؟ اسے کیا معلوم تھا کہ میں کہاں رہتا ہوں؟ جس وقت میں اس کو چھوڑ کر گیا تھا سارا مکان اندھیروں میں ملفوف تھا۔ اندھیرا ....گھٹا ٹوپ اندھیرا....! ایک ہاتھ کو دوسرا ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ پھر اس کو میرے جانے کی خبر کیسے ہوتی؟ خود اندھیروں میں گھرا ہوا دوسروں کی خبر گیری کیسے کر سکتا ہے؟ اس روز میں ڈرا سہما، پر اسرار خاموشی میں ڈوبا ہوا گھر کا سارا سامان ٹرک میں لاد کر نم آنکھوں سے اپنے مکان سے رخصت ہوا تھا۔ ویسے ہی جیسے گہری نیند میں سو رہے آدمی کی روح پرواز کر جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ میری اور اس کی آخری ملاقات ہے۔ اس دن کے بعد گھر کا ذرّہ ذرّہ مجھے ڈھونڈتا رہا۔

کتنا سمے بیت گیا ہوگا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ میرے لیے تو وقت اسی لمحے تھم چکا تھا جب میں نے اپنی جائے پیدائش کو خیر باد کہا تھا اور پھر در بدر پھرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وقت بھی کتنا ظالم ہوتا ہے، اپنی رفتار سے چلتا رہتا ہے۔ کبھی کسی کی فکر نہیں کرتا۔ کون مرتا ہے اور کون جیتا ہے، کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ البتہ مجھے ان لوگوں پر ترس آتا ہے جو انسانوں کو بے گھر کر کے یہ سوچتے ہیں کہ یہ خدا کی خوشنودی کے لیے کیا جا رہا ہے۔ مجھے اس خدا کو دیکھنے کا بڑا ارمان ہے جو خود ہی تخلیق کیے ہوئے انسان کو تباہ و برباد،

بے گھر و بے بس کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ کتنا بڑا ایذا رساں ہوگا وہ خدا جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کی تکلیف و درد سے محظوظ ہوتا ہوگا۔

یہ الگ بات ہے کہ میری زندگی کی گھڑی بند ہو چکی ہے یا پھر مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ پھر بھی کہیں کچھ احساس ابھی باقی ہے جو مجھے ہر روز تاکید کرتا ہے کہ ''تم زندہ ہو''۔ میرے ساتھ جو لوگ رہتے تھے وہ سب بکھر چکے ہیں۔ ہم ایک دوروز میں کہیں نہ کہیں مل ہی جایا کرتے تھے مگر اب تو برس ہا برس تک ہم مل نہیں پاتے۔ کوئی دنیا کے ایک کونے میں جا بسا ہے اور کوئی دوسرے کونے میں۔ بہت برس ہو گئے میں نے کسی کو اپنا ہم راز نہیں بنایا۔ سبھی نے اپنی زندگی کے خالی پن کو دور کرنے کے لیے نئے وضع قطع اپنائے ہیں۔ پھرن کے اندر کانگڑی اٹھائے برف سے ڈھکی سڑکوں کو ناپنے کے بجائے اب وہ ٹی شرٹ اور جینز میں سمندری ساحلوں پر گھومتے پھرتے ہیں۔ امریکا میں مجسمۂ آزادی کے نیچے، فرانس میں آئی فل ٹاور کے اندر یا پھر مصر کے اہرام کے پاس سیلفی لیتے نظر آتے ہیں اور دوسرے روز فیس بک پر پوسٹ کرتے ہیں۔ دیکھنے والے حسرت اور جلن سے سوچتے ہیں کہ کتنے خوش نصیب لوگ ہیں جو دنیا کے خوبصورت مقامات کی سیر کر رہے ہیں۔ کہاں تو کنویں کے مینڈک بنے پھرتے تھے، شہر سے باہر کی دنیا سے نابلد تھے اور کہاں تو یہ بے فکر و بے مدام سیاحت، نہ اپنی خبر اور نہ دنیا و مافیہا کی۔ البتہ کسی کو کیا معلوم کہ فیس بک پر چڑھائی گئی یہ تصویریں جھوٹ بول رہی ہیں۔ یہ سبھی پراگندہ زندگی کو بھولنے کی ناکام کوششیں ہیں۔ تصویریں دیکھنے والے اندر کے گھاؤ کہاں دیکھ پاتے۔ کوئی کسی کے زخم کرید کر تھوڑی ہی دیکھتا ہے۔ میں ان تصویروں کے اندر پل رہی بے بسی، تڑپ اور تنہائی کو محسوس کر سکتا ہوں۔

مصنوعی چہرے، مصنوعی ہنسی اور مصنوعی ٹھاٹ۔ اجنبی ساحل، اجنبی دھرتی اور اجنبی ممالک
!.....

گھر میں تھے تو فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ کبھی راشن گھاٹ سے راشن لانا، کبھی گھاسلیٹ کی خاطر قطار باندھے گھنٹوں کھڑے رہنا، کبھی دکانوں کی بھیڑ سے جوجھنا۔ نانبائی کی دکان، قصائی کی دکان، کنجڑے کی دکان، ادویات کی دکان، غرض ضروریات زندگی کی لمبی چوڑی فہرست اور اتنی ہی دکانیں۔ ہر جگہ قطاریں ہی قطاریں۔ طلب ہی طلب اور رسد کہیں نظر ہی نہیں آتی تھی۔

اب تو فراوانی ہے سب چیزوں کی مگر چین نہیں ہے۔ کوئی بے چینی دل کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔ سب کچھ دستیاب ہے اور وہ بھی گھر بیٹھے۔ ہوم ڈیلوری۔ کبھی امیزون، کبھی فلپ کارٹ اور کبھی سنیپ ڈیل۔ بس آرڈر کرنے کی دیر ہے کہ سامان گھر پر کوریئر دے کر جاتا ہے۔ کوریئر! نہ وردی اور نہ وقت پر دستک۔ وقت بے وقت کبھی بھی چلا آتا ہے اور سامان دے کر چلا جاتا ہے۔ موبائل بل، گیس بل، کتابوں کا پارسل، گفٹ پارسل۔ اور بھی بہت کچھ۔ مگر خط نہیں...!

اب خط نہیں آتے۔ وہ خون کو سیاہی بنا کر لکھے گئے خط، وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے خط، وہ آہوں اور اشکوں سے بھرے خط، وہ محبتوں اور نفرتوں بھرے خط، وہ برہ کے گیتوں سے بھرے خط، وہ انتظار کے خط، وہ وصل یار کے خط۔ وہ خط اب نہیں آتے۔ نہ میرے پاس اور نہ ہی میرے بال بچوں کے پاس۔

آئیں گے بھی کیونکر؟ عشق فرمانے کے لیے موبائیل جو ہیں۔ خط کے بدلے ای میل جو ہیں۔ تصویریں بھیجنے کے لیے وہاٹز اَپ جو ہے۔ پھر خط کے لیے کون انتظار کرے۔

اور مجھے اب خط لکھے گا بھی کون؟ یہ سچ ہے کہ ہماری نسل کو اب بھی خط ملنے کی آرزو رہتی ہے۔ خط پڑھنے میں جو مزہ آتا ہے وہ ای میل میں کہاں۔ مگر اب تو سب کو معلوم ہوگیا ہے کہ اب میں وہاں نہیں رہتا۔ اور پھر میں نے انھیں اپنا نیا ایڈریس بھی تو نہیں بتایا ہے؟

کیسے بتاؤں کہ میں کہاں رہتا ہوں؟ مجھے میرے بال بچوں نے بانٹ لیا ہے۔ کبھی بڑے بیٹے کے پاس تین چار مہینے گزار لیتا ہوں، کبھی منجھلے بیٹے کے پاس اور کبھی چھوٹے کے پاس۔ ایک عجیب سا ان کہا سمجھوتا ہوگیا ہے ان کے درمیان۔ یہی تین چار مہینے کا! کبھی کبھار بیٹی اپنے پاس بلاتی ہے جب اس کے ساس سسر اپنی بیٹی کے ہاں کچھ مہینے کے لیے چلے جاتے ہیں۔ بچپن میں میں نے زندگی اور موت کے درمیان تناسخ کے بارے میں سنا تھا لیکن اس دنیاوی آواگون کا تجربہ بھی ہوگیا۔ شاید فطرت کے اصول کے عین مطابق ہے یہ۔ موسم بھی تین مہینوں میں بدل جاتے ہیں۔ یکسانیت ہوتی تو کتنی اکتاہٹ ہو جاتی۔ زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے تغیر بہت ضروری ہے۔ یک رنگی تو کھانے کو دوڑتی ہے۔

گذشتہ سال میں نے طے کرلیا کہ میں کچھ دنوں کے لیے اپنے آبائی وطن جاؤں گا اور مرنے

سے پہلے اپنے چھوڑے ہوئے مکان کو نظر بھر دیکھ لوں گا۔ سو میں نے بیٹے سے درخواست کی اور ہم سب چلے گئے۔

شہر میں سب لوگ ہمیں ٹورسٹ سمجھنے لگے ہیں۔ کسی کو یقین ہی نہیں آتا کہ ہم وہاں کے بسکین ہیں، سیاح نہیں۔ کوئی ہمیں پہچانتا بھی نہیں۔ پچیس سالوں میں ایک پوری نسل بدل چکی ہے۔ شاید ہمارے وقت کے لوگ اب نہ رہے ہوں یا پھر بڑھاپے کے باعث گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلتے ہوں۔

اسی لمحے جب میں اپنے پرانے مکان کے پاس چہل قدمی کر رہا تھا، پیچھے سے کوئی مانوس سی آواز آئی۔ ''صاحب.... صاحب.... ارے صاحب آپ یہاں کیسے؟''

میں اس کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خضاب لگی ڈاڑھی تھی۔ آنکھوں پر موٹی فریم کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ بال سفید ہو چکے تھے جن کو ڈھکنے کے لیے بھیڑ کی کھال کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ کینسر کے آپریشن کے سبب چہرہ بالکل مسخ ہو چکا تھا مگر پھر بھی کچھ کچھ مانوس سا لگ رہا تھا۔ میں اس کو پہچان نہیں پایا اور بلا جھجھک اعتراف کیا۔ ''بھائی صاحب، معاف کرنا، میں آپ کو پہچان نہیں پایا۔''

''وہ ہلکی سی ہنسی ہنس کر میری بات ٹال گیا اور پھر کہنے لگا۔ ''صاحب کیسے پہچانو گے تم۔ بہت عرصہ جو ہوا۔ میں آپ کا ڈاکیہ ہوا کرتا تھا۔ محلے میں ایک آپ ہی تھے جس کی ڈاک کم و بیش روزانہ آیا کرتی تھی اور آپ چھٹیوں کے دنوں میں روزانہ میرا انتظار کرتے تھے۔''

''اوہ تم......! میرے ذہن نے اس کے چہرے کی از سر نو تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ اس کی صورت کو دوبارہ جوڑ کر اکٹھا کرنے لگا اور کچھ ہی ثانیوں میں وہی پرانی شبیہہ میری آنکھوں کے سامنے ابھر آئی۔

''بھائی، سچ مانو تو میں تمھیں پہچان ہی نہ پایا۔ تمھاری تو شکل و صورت ہی بدل چکی ہے۔''

''صاحب، کیسے پہچانتے۔ اب تو میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور ریٹائر بھی۔ اس سے بھی بڑھ کر میرے گلے میں کینسر ہو چکا تھا جس کے سبب آپریشن کرنا پڑا۔ تب سے میرا حلیہ ہی بگڑ گیا ہے۔ اور پھر

وقفہ بھی تو بہت ہو چکا ہے۔ خیر یہ بتائیے کہ آپ کہاں رہتے ہیں آج کل؟

''بھائی تم سے کیا چھپانا۔ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ میں کہیں بھی نہیں رہتا۔ خانہ بدوش بن چکا ہوں۔ اپنی زمین جب ٹھکراتی ہے اور مسکن جب کھو جاتا ہے تو آدمی خانہ بدوش ہو جاتا ہے۔ وہ پھر کہیں کا نہیں کہلاتا۔''

''اتنے برسوں کے بعد یہاں آنے کی کیسے سوجھی صاحب؟''

''بس یاد ستانے لگی۔ اپنی جڑوں کی یاد...! سوچا چلو اپنی جڑوں کی کھوج میں نکل جاؤں۔ مگر یہاں مایوسی ہاتھ لگی۔ جڑیں تو سب کی سب اکھڑ چکی ہیں۔''

''صاحب، آپ کے جانے کے بعد میں کئی روز آپ کی ڈاک لے کر آپ کے گھر پر جاتا رہا۔ وہی ریڈرس ڈائجسٹ، بیسویں صدی، تحریک، کتاب... اور بھی نہ جانے کون کون سے میگزین ہوتے تھے ...... مگر دیتا کس کو؟ مکان میں تو تالا لگا ہوا تھا۔ کوئی یہ بھی نہیں بتا پا رہا تھا کہ آپ کا نیا ایڈریس کیا ہے ورنہ وہیں ری ڈائریکٹ کر کے بھجوا دیتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو وہ میگزین جان سے بھی پیارے تھے۔ آپ انھیں پڑھتے نہیں بلکہ چاٹ جاتے تھے۔''

''بھئی، کن میگزینوں کی بات کر رہے ہو۔ تم نے جتنے بھی نام لیے وہ سب کے سب نابود ہو چکے ہیں۔ وہ بھی وقت کے تھپیڑوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور ایک ایک کر کے بند ہو گئے۔ اب تو وہ نام سننے کو بھی نہیں ملتے۔ اب ان کی جگہ نئے رسالے نکلتے ہیں لیکن وہ بات کہاں۔ رہی بات میرے ایڈریس کی، میں تمھیں اپنا ایڈریس کیسے بتا دیتا۔ کوئی موقع ہی نہ ملا۔ سرکاری کرفیو... سول کرفیو.... بند..... ہڑتال ....اور پھر مجھے تو رات کے اندھیرے میں غائب ہونا پڑا تھا۔''

''پوسٹ ماسٹر کے نام ہی کوئی خط لکھا ہوتا تو ہم آپ کے نئے ایڈریس پر بھجوا دیتے۔ بہت دنوں تک آپ کے کئی دوستوں کے خط آتے رہے۔ اور وہ عطر میں ڈوبے ہوئے خط بھی دو تین آئے تھے .....! میں نے سبھی ڈاک خانے میں جمع کروا دیے اور وہاں سے وہ ریٹرن لیٹر آفس چلے گئے۔''

''وہ میرا ماضی تھا بھائی! بھول چکا ہوں میں اپنے ماضی کو۔ وقت کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ کون کہاں لڑھک جائے کسی کو پتا نہیں۔''

''صاحب، آپ کا وہ ایک دوست تھا نا جو آپ کے ساتھ اکثر دکھائی دیتا تھا۔ وہ... کیا نام تھا اس کا......؟ میں تو بھول ہی گیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ وہی پروفیسر صاحب۔ معلوم ہے وہ بہت عرصہ پہلے مر گیا۔ صاحب اس کا جواں بیٹا چوک میں مارا گیا۔''

''پروفیسر کا بیٹا مر گیا! مجھے تو معلوم ہی نہیں۔ وہ کیسے؟''

''اس روز کسی لیڈر نے ہڑتال کا اعلان کیا تھا۔ لوگوں نے موبائیل سے ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر لیا اور چوک میں جمع ہونے کی تلقین کی۔ شہر کی تمام دکانیں بند رہیں۔ پھر شہر کے پائیں علاقے سے جلوس نکلا جو رفتہ رفتہ چوک تک پہنچ گیا۔ جلوس میں اکثر و بیشتر نوجوان تھے۔ ہاتھوں میں طرح طرح کے جھنڈے لیے ہوئے۔ فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے۔ سامنے سے پولیس آئی اور جلوس کو آگے بڑھنے سے روک لیا۔ دونوں فریق ایک دوسرے پر پہلے غرائے، پھر محاذ آرائی پر اتر آئے۔ ہجوم میں جس کو جہاں کوئی پتھر یا اینٹ مل گئی پولیس پر پھینک دی۔ پولیس اپنے بچاؤ کے لیے حفاظتی ساز وسامان سے لیس تھی۔ تاہم برستے پتھر دیکھ کر ان کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور انھوں نے جواب میں آنسو گیس کے گولے داغ دیے۔ ہر طرف آنسو لانے والی گیس پھیل گئی اور مجمع تتر بتر ہوتا گیا لیکن ساتھ ہی مشتعل بھی ہو گیا۔ جب بھیڑ قابو سے باہر ہو گئی تو پولیس نے بندوقیں سنبھالیں اور دھڑ ادھڑ گولیاں برسائیں۔''

''گولیاں! یہ تو زیادتی ہے۔ انھیں پہلے ہوا میں فائر کرنا چاہیے تھا۔''

''صاحب جب حالات بے قابو ہو جاتے ہیں اور معاملہ برداشت سے باہر ہو جاتا ہے تو قائدے قانون دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ پولیس نے براہ راست احتجاج کر رہے نوجوانوں کو نشانہ بنا لیا۔ چار پانچ تو وہیں پر ڈھیر ہو گئے جبکہ پندرہ بیس زخمی ہو کر ہسپتال پہنچائے گئے۔ انھی میں پروفیسر صاحب کا اکلوتا بیٹا بھی تھا۔ اس نے تو سڑک پر ہی دم توڑ دیا۔ پروفیسر صاحب لاش کو دیکھ کر پاگل ہو گئے۔ اس دن سے کھانا پینا سب کچھ ترک کر دیا۔ رات دن بس عبادت میں جٹے رہے۔ مہینے بھر کے بعد بیوی اور تین لڑکیوں کو چھوڑ کر رحمت حق ہو گئے۔ اس روز مجھے آپ کی بہت یاد آئی۔ پروفیسر صاحب آپ کو دیکھنے کے لیے ترستے تھے۔ میں نے کئی بار اس کو آپ کے مکان کے سامنے کھڑا پایا۔ وہ مکان کو یونہی ٹکر ٹکر دیکھتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس کی گویائی چلی گئی تھی اس لیے مجھے دیکھ کر صرف گھورتے جیسے کہہ

رہے ہوں، ''بھائی کس لیے اس گھر کا طواف کر رہے ہو۔ اب وہ یہاں نہیں رہتا۔ وہ اب واپس کبھی نہیں آئے گا۔ اب تو ہماری ملاقات اوپر ہی ہوگی۔''

پھر ڈاکیہ ہاتھ ملا کر چلا گیا اور نہ جانے کن گلیوں میں کھو گیا۔ میں اکیلا اس مانوس اجنبی سڑک پر اس کو دیر تک دیکھتا رہا۔ تبھی میرے بیٹے نے پکارا۔ ''پاپا، دیر ہو رہی ہے۔ ہوٹل جانا ہے، سامان پیک کرنا ہے اور پھر ائیر پورٹ بھی پہنچنا ہے۔ تین بجے کی فلائیٹ سے واپس جانا ہے۔''

میں تو بھول ہی گیا تھا کہ مجھے واپس بھی جانا ہے کیونکہ یہ گلی کوچے، یہ بازار، یہ دُکانیں، فضا میں تحلیل یہ بوُ اور یہ شور شرابہ سب کچھ اپنا سا لگ رہا تھا۔ میں پل بھر ہی میں ان میں کھو سا گیا تھا اور وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔ مجھے اس بات کا خیال ہی نہ رہا کہ مجھے واپس سفر کرنا ہے اور اجنبی دیس میں باقی ماندہ سانسیں گنتی ہیں۔ بس اسی طرح جیسے اس رنگ و بو کی دنیا میں انسان کھو کر واپسی کے سفر کی سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔ اسے بھی خیال نہیں رہتا کہ اس کو کبھی واپس جانا ہے۔

کچھ دیر میں ہم دونوں واپس ہوٹل اور پھر ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ وہاں ہوائی جہاز ایک گھنٹہ لیٹ تھا۔

اور میں ....نہیں ہم سب اس وقت کا انتظار کرتے رہے جب واپس جانے کے لیے اڑان بھری جائے گی۔ واپسی کا سفر اتنا تکلیف دہ نہیں تھا جتنا کہ اس سفر کا انتظار!

☆☆☆☆☆

ڈاگ ہاؤس

مجھے بچپن ہی سے جانور پالنے سے سخت نفرت تھی۔ بات یوں ہے کہ میں نے آٹھویں جماعت میں ایک انگریزی کہانی 'سب سے بہتر آزادی' (Freedom Above All) پڑھی تھی جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ کہانی میں ایک جنگلی بھیڑیے اور ایک پالتو کُتّے کی دوستی ہو جاتی ہے۔ کُتّے کو زندگی کی تمام تر آسائشیں اور سہولتیں میسر ہیں اس لیے وہ ہر دم ان کا بکھان کرتا رہتا ہے۔ کئی بار اس نے اپنے دوست سے کہا۔

''یار تمھاری زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ جنگلوں میں در بدر بھٹکتے رہتے ہو۔ گھر نہ ٹھکانہ۔ پیٹ بھرنے کے لیے مارے مارے پھرتے ہو۔ میری طرف دیکھو۔ خدا نے سب کچھ دے دیا ہے۔ میرا مالک بہت ہی امیر، نیک اور رحم دل آدمی ہے۔ میرے لیے ہر روز ہڈیوں والا گوشت منگواتا ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں آرام دہ بستر پر سلاتا ہے۔ روزانہ مجھے نہلاتا ہے۔ میرے بالوں پر طرح طرح کے پاؤڈر ڈالتا ہے۔ بیمار ہو جاؤں تو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔ اس کے عوض مجھے صرف رات بھر پہرے داری کرنی پڑتی ہے تاکہ اس کی جان و مال کی حفاظت ہو۔ اتنی تھوڑی سی محنت کرنے میں کوئی حرج تو ہے نہیں۔''

''تم سچ کہتے ہو دوست، تمھاری باتیں سن کر مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ تمھیں تو دنیا کی سبھی نعمتیں دستیاب ہیں جبکہ مجھے جینے کے لالے پڑے ہیں۔ پیٹ بھرنے کے لیے خود ہی شکار کی تلاش میں جانا پڑتا ہے۔ کبھی کبھار جب کسی ریوڑ سے بچھڑی بھیڑ یا بکری دیکھ لیتا ہوں تو فوراً اس پر جھپٹتا ہوں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ چرواہے یا اس کے شکاری کتوں کو مجھ پر نظر پڑتی ہے اور وہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔ آج تک جیسے تیسے میں نے خود کو ان کے چنگل سے بچا لیا لیکن آگے کی خدا جانے۔''

''اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ تم بھی میری طرح کسی مالک سے وفاداری کرنا سیکھو تا کہ زندگی

آرام سے کٹ جائے۔''

''تمہارا مشورہ معقول ہے....'' بھیڑیا تذبذب میں پڑ گیا مگر اچانک اس کی نظر کتے کی گردن میں پھنسے طوق پر پڑی۔ وہ استفسار کرنے لگا۔ ''یار، تمھارے گلے میں یہ پٹا کس لیے بندھا ہے؟''

''اسے کالر کہتے ہیں۔ یہ میرے مالک نے پہنایا ہے۔ یوں تو میں گھر کے سبھی افراد سے مانوس ہو چکا ہوں اور گھر کی چار دیواری میں کھلا پھرتا رہتا ہوں تاہم گھر میں جب کبھی کوئی مہمان آتا ہے یا پھر مالک مجھے سیر کرانے کے لیے باہر لے جاتا ہے تو اس کالر اور زنجیر کی ضرورت پڑتی ہے۔''

''مطلب یہ کہ تم اپنی مرضی سے جی نہیں سکتے۔ یہ کالر تمھاری گردن میں اس لیے ڈالا گیا ہے کہ تم اپنے مالک کے اشاروں پر زندگی بسر کرلو۔ نہیں بابا نہیں، یہ تو غلامی کی نشانی ہے۔ مجھے اپنی آزادی زیادہ پیاری ہے چاہے وہ کتنی ہی جوکھم بھری کیوں نہ ہو۔''

اس کہانی کو پڑھنے کے بعد میں نے جانوروں کو پالتو بنا کر گھر میں قید کرنے سے توبہ کرلی۔ کہیں کسی پنجرے میں توتے یا مینا کو گرفتار دیکھتا تو مجھے کوفت ہو جاتی۔ اسی طرح زنجیروں میں بند کتوں کو دیکھ کر مجھے ان پر رحم آتا۔ البتہ ڈھلتی عمر میں بچوں کے سامنے کب کسی کی چلتی ہے۔ ایک روز میں اپنے بیٹے کو اکیلا چھوڑ کر دفتری کام سے ہفتہ بھر کے لیے دورے پر چلا گیا۔ موقع غنیمت جان کر وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ کسی نزدیکی پہاڑی مقام پر پکنک منانے چلا گیا۔ واپسی پر انھوں نے کسی حلوائی کے پاس کار روک لی اور چائے پینے بیٹھ گئے۔ گرل فرینڈ کی نظر حلوائی کی کتیا پر پڑی جس نے چند روز پہلے ہی چھ بچے جنے تھے۔ اس کا جی للچایا۔ فوراً اپنے بوائے فرینڈ سے فرمائش کی۔ ''دیکھو تو کتنے پیارے پیارے پپیز ہیں۔ تمھارے پاس اتنا بڑا امکان ہے۔ پھر کیوں نہ اس حلوائی سے ایک پپ مانگ لیں اور گھر میں پالیں۔''

حالانکہ میرے بیٹے کو اس بات کا احساس تھا کہ مجھے گھر میں کتے پالنے سے سخت نفرت ہے پھر بھی وہ اپنی معشوقہ کی بات نہیں ٹال سکا۔ ایک تو فرمائشِ محبوب اور پھر عمر کا تقاضا۔ بے چاری نے چاند ستارے لانے کی فرمائش تو کی نہیں تھی بس ایک پلاّ پالنے کو کہا تھا۔ اس لیے یہ سوچ کر جلدی راضی ہو گیا کہ پتا جی کو کسی نہ کسی بہانے راضی کرلوں گا۔ حلوائی نے بھی لڑکی کی فرمائش کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس طرح پلّے کو گود میں اٹھائے دونوں خوشی خوشی گھر لوٹے۔

رات گئے میرا موبائیل بجا۔ دوسری طرف میرا بیٹا مسرت اور خوف کے ملے جلے لہجے میں بول رہا تھا۔

''ہیلو پاپا، کیسے ہیں؟ اس وقت آپ کہاں ہیں اور کب تک لوٹ آئیں گے؟''

''تین دن اور لگیں گے۔ کوئی خاص بات؟'' میں نے جواب دیا۔

''پاپا، ہمارے گھر میں ایک نیا مہمان آیا ہے۔'' اس کے لہجے میں انکساری تھی۔

''کیوں، کون آیا ہے؟ مجھے بھی بتاؤ۔''

''میں نے ایک چھوٹا سا پپی گھر میں پالنے کے لیے لایا ہے۔ بہت اچھی نسل کا ہے، پاپا۔ دیکھ لیں گے تو حیران ہو جائیں گے۔ بالکل مفت میں مل گیا۔ کوئی پیسہ نہیں دینا پڑا۔''

''وہاٹ!'' میرا پارا ایک دم چڑھ گیا۔ ''تمھارا دماغ تو نہیں پھر گیا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ مجھے ان چیزوں سے سخت نفرت ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ جس سے لیا ہے اس کو واپس دے کر آ جاؤ۔''

''پاپا، وہ یہاں سے دو سو کلومیٹر دور ہے۔ اُدھر دوبارہ جانا مشکل ہے۔ آپ جب پپی کو دیکھیں گے تو خود ہی پسند کریں گے۔''

وقت کا پہیہ سچ مچ گھوم چکا تھا۔ جو ہو چکا اس کو بدلنا ممکن نہ تھا۔ نافرمانی کے اس بول نے مجھے یہ احساس کرایا کہ اب میں حاشیے پر براجمان ہوں اس لیے کوئی مزاحمت واجب نہیں۔ میں نے اپنا غصہ تھوکنے کی کوشش کی گو ذہن ابھی بھی مفاہمت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ رہی بات نسل کی۔ دیکھنے میں تو اچھی نسل کا کتا نظر آ رہا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ اسے 'راڈ وھیلر' کہتے ہیں اور اس کے خطرناک رویے کے سبب کئی یورپی ملکوں میں اس نسل کے کتوں کو پالنے کی سخت مناہی ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کے آگے ہتھیار ڈال دیے کیونکہ اس عمر میں کسی احتجاج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کتے کا نام 'ٹائیگر' رکھا گیا اور وہ بڑھتے بڑھتے سچ مُچ باگھ کی مانند پھرتیلا اور خونخوار بن گیا۔ کیا مجال کوئی آدمی گھر کے اندر یوں ہی چلا آئے یا پھر مالک کے پاس پھٹکے، اس کی تو شامت آ جاتی۔ ٹائیگر جب تک زندہ رہا دس پندرہ لوگوں کو زخمی کر چکا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں ٹائیگر کے ساتھ مانوس ہوتا چلا گیا۔ اب وہ پہلی سی کدورت

دل میں نہیں رہ گئی تھی۔ جب بھی میں گھر میں ہوتا وہ میری ٹانگوں کے ساتھ چمٹا بیٹھا رہتا۔ بارہا میرے بستر کے اوپر بھی براجمان ہو جاتا۔ ایسی اپنائیت میں نے انسانوں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اب ہمارے کنبے کا فرد بن چکا تھا۔

بہت عرصہ بعد ہمیں ایک قریبی رشتے دار کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے جموں جانا پڑا۔ اس وقت میں ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا اور وہ پرانی ٹھاٹ باٹ باقی نہیں رہی تھی۔ نہ وہ گورنمنٹ کے بنگلے تھے اور نہ ہی وہ سہولتیں۔ ہم نے دہلی کے قریب ایک فلیٹ خریدا تھا جس میں ٹائیگر کو پالنا مشکل ہو رہا تھا۔ جموں جانے اور واپس آنے میں دو دن لگ جاتے جبکہ وہاں بھی تین چار دن کا قیام ضروری تھا۔ میں تردّد میں پڑ گیا کہ ٹائیگر کو کہاں رکھیں؟ اسے خون کا رشتہ نہ سہی لیکن درد کا رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ کسی رشتے دار یا دوست کے پاس تو رکھ نہیں سکتے تھے اور نہ ہی ساتھ لے جانا ممکن تھا۔ اس لیے میں نے اپنے بیٹے سے پوچھ لیا۔

''بیٹے شادی میں شرکت کرنا تو ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ ٹائیگر کو کہاں رکھ چھوڑیں؟''

''پاپا، آپ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیوں پریشان ہوتے ہیں؟'' بیٹے کے بجائے اس کی گرل فرینڈ، جواب اس کی بیوی بن چکی تھی، نے ٹوک کر کہا۔ ''میں گذشتہ تین چار دن سے سوچ رہی تھی کہ آپ کا چہرہ اُترا اُترا سا کیوں لگ رہا ہے۔ پاپا یہ کوئی بڑی پرابلم نہیں ہے۔''

''کیسے پرابلم نہیں ہے۔ تم لوگ اسے چھوٹی بات سمجھتے ہو۔ یہ بے زبان کہاں جائے گا؟ گھر میں اکیلا تو رہ نہیں سکتا اور پھر کسی دوسرے کے گھر میں بھی نہیں رکھ سکتے ہیں۔ کھانا، پینا اور حاجات ضروریہ ......ان سب کا انتظام کیسے ہوگا؟'' میرے لہجے میں خفگی تھی۔

''پاپا، آپ تو دقیانوسی باتیں کرتے ہیں۔ آج کل جیب میں پیسہ ہونا چاہیے ہر چیز مل جاتی ہے۔ شہروں میں جگہ جگہ 'ڈاگ ہاؤسز' کھل چکے ہیں جن کا انصرام پیشہ ور ویٹرنری ڈاکٹر کرتے ہیں۔ ہم ٹائیگر کو کسی قریبی سگ خانہ میں ڈال دیں گے اور جب لوٹیں گے تو واپس گھر لائیں گے۔'' بہو نے تیقن کے ساتھ جواب دیا۔

''ڈاگ ہاؤس...! سگ خانہ...! کیا بولتے ہو! کیا وہاں پر کتوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے؟''

''کیوں نہیں، جب چڑیا گھروں میں وحشی جانور پالے جا سکتے ہیں تو پھر سگ خانہ میں پالو کتوں کی دیکھ بھال کیوں نہیں ہو سکتی ہے۔''

جس روز ہمیں جموں جانا تھا اسی روز میرے بیٹے نے ٹائیگر کو 'موڈرن ڈاگ ہاؤس' میں ڈال دیا۔ رات کو ہم ریل گاڑی میں بیٹھ کر جموں روانہ ہو گئے۔ البتہ مجھے یہ غم ستائے جا رہا تھا کہ نہ جانے ٹائیگر نے کھانا کھایا ہو گا یا نہیں۔ اس کی اچھی طرح دیکھ ریکھ ہو رہی ہو گی یا نہیں۔ کہیں اس کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہو رہی ہو گی؟'' اس دن مجھے احساس ہوا کہ پالا پوسا خون کے رشتے سے بھی زیادہ دل کے قریب ہوتا ہے۔

ہفتے بھر کے بعد ہم لوٹ آئے۔ میرے بیٹے نے سب سے پہلے ٹائیگر کو سگ خانہ سے واپس لایا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے بشاشت ہوئی جیسے میں اپنے لخت جگر سے مدتوں بعد مل رہا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر میرے پاؤں کے ساتھ دیوانہ وار لڑھکنیاں کھانے لگا۔ عام والدین کی مانند مجھے یوں لگ رہا تھا کہ ٹائیگر پہلے سے کافی دبلا ہو چلا ہے۔ میں چپکے سے بازار چلا گیا اور اس کے لیے ہڈیوں والا گوشت لے کر آ گیا۔

اس ابتدائی تجربے کے بعد ٹائیگر کو کئی بار ڈاگ ہاؤس میں رہنا پڑا۔ ہم کبھی تفریح کے لیے پہاڑوں پر چلے جاتے یا پھر کبھی کسی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے چلے جاتے تو اسے ڈاگ ہاؤس میں چھوڑ جاتے۔

یوں ہی آٹھ سال گزر گئے۔ اب وہ بوڑھا ہو چلا تھا۔ کھانے پینے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اب نہ وہ پہلے جیسی پھرتی تھی اور نہ ہی آنکھوں میں وہ چمک۔ ایک روز ہم پھر اسے ڈاگ ہاؤس میں چھوڑ کر پونا چلے گئے۔ تین دن کے بعد ڈاگ ہاؤس کے مالک کا ٹیلی فون آیا کہ ٹائیگر کی صحت بہت بگڑ چکی ہے۔ سفر ادھورا چھوڑ کر ہم سب واپس چلے آئے۔ تین ہی دنوں میں ٹائیگر پنجر بن چکا تھا۔ نہ کچھ کھاتا تھا اور نہ ہی پیتا تھا۔ اسپیشلسٹ ڈاکٹر کو دکھایا تو پتا چلا کہ اس کی آنت میں ٹیومر ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے عین مطابق اس کا آپریشن ہوا لیکن ٹائیگر آپریشن ٹیبل سے پھر کبھی زندہ واپس نہیں آیا۔

اس حادثے کو پیش آئے کئی سال بیت گئے۔ گاہ بہ گاہ مجھے ٹائیگر کی بہت یاد آتی رہی۔ اس کی

صورت میری آنکھوں کے سامنے بار بار پھر جاتی اور دل میں آنسوؤں کا غبار چھوڑ جاتی۔ وقتاً فوقتاً مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ گھر کے کسی کونے سے اچانک نکل کر آئے گا اور میری ٹانگوں کے ساتھ لپٹ جائے گا۔ کہیں دور سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آجاتی تو مجھے لگتا کہ وہ مجھے پکار رہا ہے۔

کئی بار میرے بیٹے نے ایک اور کتا لانے کی بات چھیڑی مگر میں نے منع کر دیا۔ ایک تو یہ کہ ٹائیگر کی موت سے میرا دل رنجیدہ ہو چلا تھا اور دوسرے یہ کہ ہم جس فلیٹ میں رہ رہے تھے وہاں انسان قیدی بن کر جی رہے تھے، کتے کی تو بات ہی نہیں۔

وقت گزرنے کا کچھ پتا ہی نہ چلا۔ یوں بھی صدیاں بے صوت وصدا گزر جاتی ہیں۔ مجھے سبکدوش ہوئے پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ ضعیف العمری نے مجھے ناکارہ بنا دیا ہے۔ چلنا پھرنا تو دور، اب سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں بچوں پر بوجھ بنتا جا رہا ہوں۔ موت کو جس قدر بلاتا ہوں وہ اتنی ہی دور چلی جا رہی ہے۔

چند روز پہلے بچوں کی سرگوشیاں کانوں میں پڑ گئیں۔ بہو اپنے پتی سے کہہ رہی تھی۔

''بنگلور میں میری بہن کی بیٹی بیاہی جا رہی ہے۔ آنے والی بیس تاریخ کو شادی کی تقریب ہے۔''

''تو پھر....؟'' میرے بیٹے نے پوچھ لیا۔

''ہم سب کو جانا پڑے گا۔ وہ لوگ بھی تو میری شادی پر آچکے تھے۔ ریل کی ٹکٹیں بک کرنی پڑیں گی۔ چار روز کا سفر ہے اور وہاں چار پانچ دن اور لگ جائیں گے۔ پھر اتنی دور جا رہے ہیں تو آس پاس کی جگہیں۔ میسور، اوٹی اور کوڑائی کنال۔ بچوں کو دکھا کر ہی آئیں گے۔ بار بار تھوڑے ہی جا پائیں گے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس کے لیے پندرہ دن سے کم کیا لگیں گے۔''

''ہاں، میں نے پندرہ دن کا ہی پروگرام بنا لیا ہے۔ مگر ایک پرابلم ہے....'' وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

''رُک کیوں گئی۔ بولو کیا پرابلم ہے؟''

''پاپا کا کیا ہوگا؟'' بہو نے پوچھ لیا۔

''ڈونٹ یو وری۔ یہ کوئی بڑی پرابلم نہیں ہے۔''

''کیا کہتے ہو۔ پاپا تو اب چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ ہم انھیں سنبھال نہیں پاتے، پھر کسی اور کے پاس کیسے رہ سکیں گے؟''

''ارے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہاں پاس ہی میں ایک 'اولڈ ایج ہوم' ہے۔ وہاں فیس دے کر بوڑھے ضعیف لوگوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ پندرہ بیس روز کے لیے پاپا کو اسی وردھ آشرم میں ڈال دیں گے۔ وہاں کہن سال لوگوں کی بہت ہی سلیقے سے دیکھ بھال کی جاتی ہے۔''

اور پھر وہ مجھے 'سپیشل کیئر اولڈ ایج ہوم' میں چھوڑ کر بنگلور چلے گئے۔

میں جتنے بھی دن اس وردھ آشرم میں رہا ہر پل ٹائیگر کو یاد کرتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ اس بے زبان نے اپنوں کے بغیر کیسے اس انجانے ڈاگ ہاؤس میں اتنے سارے دن کاٹ لیے ہوں گے؟

برسوں پہلے

یہیں کہیں ان پتھروں کے درمیاں
اسی ٹوٹے پھوٹے مقبرے کے سامنے
ملے تھے پہلی بار
اور وعدے کیے تھے ساتھ جینے اور مرنے کے
یہیں کہیں اسی مقبرے کی دیوار پر
نقش کیے تھے ہم نے اپنے نام اس طرح
مٹا سکے گا نہ کوئی ہزار کوشش بھی کرے
پر آج نم آنکھوں سے جو دیکھتا ہوں میں
برسوں کی دھول مٹی اوڑھے ہوئے
یہ نام اب بھی ہیں محو گفتگو
وہی آشنائی، وہی دلربائی
انھیں شاید یہ معلوم بھی نہیں
ان ناموں کے پیچھے جو دل دھڑکتے تھے کبھی
دنیا کی بھیڑ میں کھو چکے ہیں کہیں
اور انھیں ایک دوسرے کی خبر بھی نہیں

☆☆☆

بابا سچ بولو تم آج

بابا سچ بولو تم آج
حکم عدولی کی تھی تم نے؟
باغِ عدن میں بیٹھ کے تم نے
شجرِ علم کا پھل کھایا تھا؟
اِک شاہمار کے بہکاوے پر
کیا ڈولی تھی نیت تیری
یا پھر حوا کا دل رکھنے کو
قہرِ خدا کو دعوت دی تھی؟
بابا سچ بولو تم آج

اس نافرمانی کے باعث
حکم ملا تھا سفر کا تم کو؟
وہ ہجرت، وہ پہلی ہجرت
اتنی مسافت کیسے طے کی؟
اس دن بھی کیا سورج یوں ہی
انگاروں سے کھیل رہا تھا؟
اس دن بھی مخلوق زمیں پر

گرم ہوا سے جو جھر رہے تھے؟

اس دن بھی قدموں کے نیچے

سانپ اور بچھو رینگ رہے تھے؟

اس دن تم بھی بے گھر ہو کر

کیا ہر لمحے جیتے مرتے؟

کیسے بیتی، کیسے کاٹی؟

دل کی گرہ تم کھولو آج

بابا سچ بولو تم آج

عرصہ بیتا، صدیاں گزریں

محوِ سفر، ہجرت کا مارا

بدقسمت تیرا یہ بیٹا

آج بھی در در بھٹک رہا ہے

شراپ خدا کا جھیل رہا ہے

نئے سہارے کھوج رہا ہے

نئے ٹھکانے ڈھونڈ رہا ہے

پھر تھک ہار کے خود سے کہتا

کیوں بے گھری ہے قسمت میری؟

کیوں مجھ کو آرام نہیں ہے؟

کیوں دنیا اجنبی سی لگتی؟

شیطانوں کا کیوں ہے راج؟

بابا سچ بولو تم آج

ذہن میں بس الفاظ ہیں اُگتے

بے ترتیب، بے ربط پھپھولے

نسل، ذات، رنگ اور مذہب کے

یا پھر دھوتی، دھان اور چھت کے

ان الفاظ پہ پردے ڈالے

تہذیبیں اب چیخ رہی ہیں

برسوں استحصال ہوا ہے

بگل یہ آزادی کا بجا ہے

امن کی خاطر جنگ لڑی ہے

پیٹ کی خاطر خون بہا ہے

ظالم کی تاویل یہ کیسی؟

قاتل کا یہ جواز کیسا؟

دنیا کو کرتے تاراج

بابا سچ بولو تم آج

پھر کچھ دور چلا جاتا ہوں

پھر تھک کر جو دم لیتا ہوں

پھر تصویریں بول اٹھتیں ہیں

ان کی جنھوں نے باری باری

تہذیبوں کا ریپ کیا ہے

تقریروں پر تالے ڈالے

خوابوں کا اسقاط کیا ہے

تاویلوں پر دھرم کی مہریں

تعبیروں کو مسخ کیا ہے

وہ جو کل تک خون کی ہولی

کھیل کے اٹھلایا کرتے تھے

لہو آستینوں پر ان کے

پھر بھی حق کی باتیں کرتے

امن کی دہائی دیتے ہیں آج

بابا سچ بولو تم آج

محافظ نام کے تیرے کتنے

تپتے صحرا میں پیاسے اکیلے

نعرہ حق کا لگاتے پھرتے

اپنی صلیبیں اٹھائے پھرتے

سر پر ہے کانٹوں کا تاج

بابا سچ بولو تم آج

☆☆☆☆☆

اے میرے بھیشم پتامہ!

اے میرے بھیشم پتامہ!

تم نے مجھ سے کیوں یہ پوچھا

میرا 'کشلئے' کہاں ہے؟

مجھ کو تب سے نیند نہ آئی

کروٹ کروٹ بدل رہا ہوں

دل بے چین ہے، آنکھیں پرنم

فضا بھی ہے بھاری بھاری

کہاں کہاں نا ڈھونڈا اس کو

گلیوں گلیوں بستی بستی

صحرا جنگل، مندر مسجد

گجرات کی بیکری میں بھی جھانکا

شاید جل کر راکھ ہوا ہو

یا پھر مسجد کے گنبد پر

بابر کو للکار رہا ہو

کابل اور قندھار میں پہنچا

ہو سکتا ہے یرغمال ہوا ہو

کرگل پہنچا، دراس میں پہنچا

تابوت میں شاید مرا پڑا ہو

پھر جا کر کشمیر میں ڈھونڈا

بے کتبہ قبروں میں دبا ہو؟

لاہور کی بس میں ڈھونڈا شاید

امن کا پرچم لیے کھڑا ہو

ہاتھ ابھی تک کچھ نہ آیا

آس مگر پھر بھی ہے باقی

پھر اک دن یوں سوچ رہا تھا

کرسی پر تم بھی تھے بیٹھے

پانچ سال کچھ کم نہیں ہوتے

کتنے ۔کشلے اپہرن ہوئے تھے

کتنوں کی لی گئی سپاری

کتنوں کا یوں لہو بہا تھا

تم اس وقت بس دیکھ رہے تھے

بے بس اور لاچار کھڑے تھے

بھیشم پتامہ کھڑا ہو جیسے

وہی تھا منظر، لوگ وہی تھے

چیر ہرن ہو رہا تھا جس کا

اس کو غور سے دیکھا میں نے

شاید دروپدی نام تھا اس کا

☆☆☆

☆نوٹ ۔کشلے نام تھا اس لڑکے کا جس کا اغوا بہار میں ہوا تھا اور واجپئی دہلی سے اس کو ڈھونڈنے گئے تھے

پیرس کے نام

مجھے یہ نہیں معلوم کون تھا مارنے والا
اور کون تھا جو مر گیا
میں نے نہ گولیوں کی آوازیں سنی تھیں
اور نہ بم پھٹنے کا منظر دیکھا تھا
پھر بھی نہ جانے کیوں میری روح کانپ رہی ہے
کیوں مجھے شدید گھٹن سی محسوس ہو رہی ہے
کیوں بارود کی بو میرے سانسوں میں سما گئی ہے
کیوں میرے وجود پر دہشت کے بادل چھا گئے ہیں
جسے دیکھو وہ صحیفہ ہاتھ میں اٹھائے ہوئے پھر رہا ہے
کوئی اپنی سلامتی کی دعائیں کر رہا ہے
کوئی بچھڑوں کی مغفرت چاہتا ہے
اور کوئی جنت کے خواب دیکھ رہا ہے
مگر میں
نہ جنت کا متقاضی اور نہ امارت کا طلبگار
بس کچھ دن اور جی لینا چاہتا ہوں
اس ارض خاک پر
جو نہ جنت ہے اور نہ جہنم ☆☆☆

راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ 'لمبی لڑکی' - تجزیاتی مطالعہ

افسانہ 'لمبی لڑکی' راجندر سنگھ بیدی کے چوتھے افسانوں کے مجموعے 'اپنے دُکھ مجھے دے دو' (سن اشاعت: اگست ۱۹۶۵ء) میں شامل ہے۔ان کے افسانے اپنی تہذیب میں رچے بسے، مذہب کے خمیر سے نمو پائے اور رسومات و توہمات سے جوجھتے ہوئے ملتے ہیں۔ترقی پسند تحریک کے چار ستونوں ،کرشن، بیدی، منٹو اور عصمت میں وہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور کئی ناقدوں نے انھیں کرشن اور منٹو پر فوقیت دی ہے۔غالب کی طرح انھوں نے بہت کم لکھا مگر جو لکھا سوچ سمجھ کر لکھا۔کلیات راجندر سنگھ بیدی میں خاکوں اور مضامین کے علاوہ ان کے صرف ۷۴/افسانے درج ہیں۔وہ دیہاتی زندگی کو مدنی زندگی پر اور انفرادیت کو اجتماعیت پر ترجیح دیتے تھے۔ان کے افسانے زندگی کے دکھ سکھ اور اتار چڑھاؤ کو منعکس کرتے ہیں۔بیدی کے یہاں منجھا ہوا سماجی شعور ملتا ہے اور وہ معاشرے کی بدعنوانیوں پر طنز کے نشتر چلانے سے دریغ نہیں کرتے۔حالانکہ کرشن چندر کی طرح وہ رومانی نثر نہیں لکھتے مگر ان کے یہاں سوچ و فکر، استعاروں، تشبیہوں اور لفظی پیکروں کی بہتات ملتی ہے۔بیدی روسی رائٹر چیخوف کی طرح 'خاموش اور شانت جذبات' کا افسانہ نگار ہے۔بقول وارث علوی:

> ''راجندر سنگھ بیدی تخیل کی آنکھ سے ظواہر کے پیچھے پنہاں ان الیموں اور طربیوں، آرزوؤں اور محرومیوں کا سراغ لگاتے ہیں جن کی تفہیم کے بغیر نہ تو ہم زندگی کو سمجھ سکتے ہیں، نہ انسان کو۔'' (وارث علوی، 'راجندر سنگھ بیدی کے افسانے-ایک تعارف'؛ کلیات راجندر سنگھ بیدی جلد اول، ناشر قومی کونسل ۲۰۰۸ء، ص ۱۶)

عورت بیدی کا غالب موضوع رہا ہے۔وہ منٹو کی مانند عورتوں کو ڈھونڈنے اندھیری گلیوں اور بالا خانوں میں نہیں جاتے ہیں بلکہ ان کی عورت عام گرہستن اور سماج کی اہم رکن ہے۔وہ عورت کے حسن، محبت، ممتا، ایثار نفسی اور پتیا کو اجاگر کرتے ہیں اور اس کی مثبت قوتوں پر فوکس کرتے ہیں۔اس کا

یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھوں نے نسوانی مسائل سے روگردانی کی۔اس کے برعکس وہ خواتین پر ہو رہے ظلم و ستم، استحصال اور حق تلفی کو بار بار اپنے افسانوں کی زینت بناتے ہیں۔افسانہ 'لمبی لڑکی' ایک ایسی لاچار لڑکی کی کہانی ہے جس کا قد اس کے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے حالانکہ یہ قدرت کی دین ہے اور لڑکی کا اس پر کوئی اختیار نہیں ہے۔اس افسانے میں بیدی نے کئی اور مسئلوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جیسے ازدواجی چپقلش جس سے سارا گھر پراگندہ ہوتا ہے اور مرد گھر کے باہر کوٹھوں کا سہارا لیتا ہے، شرابی اور اوباش خاوند کی وجہ سے گھریلو تشدد، فراریت پسند مردوں کا مذہب اور روحانیت کے تحت پناہ لینا اور بانجھ عورتوں کی نفسیاتی کشمکش کہ وہ ہمیشہ خود کو غیر محفوظ اور حاشیے پر سمجھتی ہیں اور اس کا ردِ عمل ہمیشہ خلاف معمول ہوتا ہے۔

افسانہ 'لمبی لڑکی' ایک دراز قد لڑکی، مُنّی سوہی کے گرد گھومتا ہے جو انچ انچ کر کے "8'5 سے بھی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔گو اس نے جینیاتی وراثت کے سبب یہ قد پایا ہے اور اس کے دادا وغیرہ نے اس کے تدارک کے لیے پست قد لڑکیوں سے شادیاں کی تھیں پھر بھی کہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ماہر جینیات مینڈل کے اصولوں کے مطابق غالب جین اکثر ظاہر ہوتا ہے اور بہت کم صورتوں میں اس کا اظہار نہیں ہوتا۔افسانہ نگار نے مُنّی سوہی کے کردار کو یوں بیان کیا ہے:

> ''مُنّی سوہی، خالی خولی لمبی ہی نہ تھی، بدن بھی بھرا ہوا تھا اور اس کا رنگ اپنے ہی لہو کی آگ میں جلتے رہنے سے تانبے کا سا ہو گیا تھا۔ کبھی تو وہ کونارک کے مندر کی، تانترک شلپیوں کے ہاتھ سے بنی ہوئی، بڑی سی یکشی معلوم ہونے لگتی اور کبھی ایک بڑی سی دیگ، بیاہ شادیوں میں جس میں حلوہ یا اُڑد پکائے جاتے ہیں اور جس کے نیچے برابر کی آنچ کے لیے منوں ہی لکڑیاں ڈالنی پڑتی ہیں اور پھر کیا حلوہ بنتا ہے، کیا اُڑد ہوتے ہیں..... گلی بازار میں نکلتی سوہی تو اپنے آپ سے بھی ایک فٹ آگے چلتی، جیسے کہہ رہی ہو- ہٹ جاؤ، میں آ رہی ہوں۔لوگ راستہ دے دیتے، پچھاڑیں کھا کھا کر پیچھے گرتے جیسے ڈپٹی جگن ناتھ کی نہیں، کسی راجا کی بیٹی ہو!
>
> (افسانہ 'لمبی لڑکی' مصنف: راجندر سنگھ بیدی)

مُنّی سوہی کی بیاسی سالہ دادی رُکمن اس کے دراز قد سے متفکر ہے۔والدین کی غیر موجودگی میں دادی اپنی پوتی مُنّی کو پالتی ہے۔رُکمن کو اس بات کا احساس ہے کہ اس بیچاری لڑکی کے لیے بَر ملنا ناممکن

ہے۔بقول رقمن ''پھر اتنا لمبا لڑکا ملے گا بھی کہاں سے؟ چھوٹے قد کا کوئی بیاہ ہے گا نہیں۔بیاہے گا تو بسائے گا نہیں۔''اس لیے ''وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ابھی کچھ کام تھے جو ادھورے رہ گئے تھے جنھیں وہ نپٹانا چاہتی تھی۔''رقمن دادی عزم کرتی ہے کہ تب تک نہیں مرے گی جب تک سوہی کے ہاتھ پیلے نہیں کرے گی۔اِدھر ہر کوئی عمر رسیدہ بیمار دادی کی موت کا طلبگار ہے ماسوائے اس کی پوتی کے جس کی وہ نگہبان ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھیا بستر کو بھی پلید کرنے لگتی ہے۔بہو شیلا تو ناک پر ڈوپٹہ رکھ کر نظریں پھیر لیتی ہے مگر مُنّی دادی کے پلید کیے ہوئے کپڑے دھوتی ہے۔یہ صورت حال دیکھ کر شیلا بپھر کر کہتی ہے کہ ''دونوں کے لیے جم راج کیا مجھے ڈھونڈنے ہیں۔''کئی بار ایسا ہوا کہ دادی کی موت کی خبر پڑوسیوں تک پہنچا دی گئی اور وہ فوراً حاضر ہو گئے، دادی کو ہندو رسم ورواج کے تحت کھاٹ سے اتار کر زمیں پر لٹایا گیا اور آٹے کا دیا جلا کر دیگر رسومات ادا کیے گئے یہاں تک کہ گیتا کا سترہواں ادھیائے بھی پڑھا گیا تا کہ دادی کی جان آسانی سے نکل سکے۔مگر دادی کو مرنا تھا اور نہ وہ مری۔اس کا عزم اتنا بلند تھا کہ وہ موت کو بھی ٹالتی رہی تا کہ اپنی پوتی کے ہاتھوں پر مہندی لگا کر اسے خوشی خوشی سسرال روانہ کر سکے اور اس طرح اپنا فرض نبھا سکے۔بڑھیا جب آنکھیں بند کر کے پھر سے ہوش میں آجاتی تو اکثر اس سندر واٹکا (چمن) کی باتیں کرتی جس کی وہ سیر کر کے آتی تھی اور جہاں اس کی ملاقات اپنے پتی سے ہو جاتی جو بہت پہلے مر چکا تھا مگر ابھی بھی دادی کے انتظار میں آنکھیں بچھائے تھا۔اس مُنّی سوہی خوب ہنستی اور دادی کا مذاق اڑانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑتی۔ماں فوت ہو چکی تھی اور باپ نے فرار اختیار کیا تھا جب کہ بھائی دیویندر کاہل، شرابی واوباش تھا اور اپنی بیوی شیلا سے ہمیشہ لڑتا جھگڑتا تھا جس کی وجہ سے گھر میں ہمیشہ ہنگامہ برپا رہتا۔شیلا بھی ردعمل کے طور پر جھنجھلاتی اور نہ صرف دادی بلکہ مُنّی سوہی کی موت کے لیے دعائیں کرتی۔

دریں اثنا مُنّی کے بھائی دیویندر نے سائیکل کی دکان کھول دی مگر وہ ایک نرس کے چکر میں بند ہو گئی۔کئی برس یوں ہی بیت گئے۔مُنّی سوہی کی سہیلیاں بیاہ کر کے سسرال چلی گئیں مگر سوہی کے لیے شوہر نہ ملا۔اتفاقاً ایک روز دیویندر کا ایک دوست، گوتم، کولکتہ سے ان کے گاؤں دینا پور آدھمکا تا کہ ہند سائیکل کی سب ایجنسی کھول دے۔افسانہ نگار نے گوتم کا حلیہ یوں بیان کیا ہے:

"گوتم قد کے اعتبار سے مشکل سے پانچ فٹ دو انچ کا ہوگا۔ لیکن تن و توش کے اعتبار

سے اچھا تھا۔ آکا باکا سا چہرہ۔ لال رنگ۔ معلوم ہوتا تھا گالوں میں دو ٹماٹر دبا کے
رکھے ہیں۔ بات بات پر اچھلتا، جیسے نہ جانتا ہو اس صحت کا کیا کرنا ہے؟"
(افسانہ 'لمبی لڑکی'، مصنف: راجندر سنگھ بیدی)

دیویندرا سے اپنے گھر چائے پر بلاتا ہے جہاں وہ شیلا بھابھی کے ساتھ بے تکلفی سے ہمکلام ہوتا ہے۔ وہ شیلا کو جلدی سے بچہ جننے کی صلاح دیتا ہے تاکہ اس کے بانجھ پن کا بہانہ بنا کر دیویندر دوسری شادی نہ کر لے۔ اس بات کا شیلا کے ذہن پر بڑی دیر تک اثر رہتا ہے۔ اُدھر شیلا نے مُنّی کو تنبیہ کی ہوتی ہے کہ وہ بیٹھک میں نہ جائے تاہم اس کا تجسس اس کو نیم چھتے پر لے جا کر کھلی کھڑکی سے گوتم کو دیکھنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اس دوران وہ ہسٹیریا کے دورے سے گر جاتی ہے اور بہت دیر کے بعد ہوش میں آجاتی ہے۔ اسے آئے دن غش کھا کر گرنے سے کافی ندامت ہوتی ہے۔

یہاں پر یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ افسانہ نگار نے نسوانی مصائب کو بڑی فنکاری کے ساتھ زیریں لہر کے طور پر پیش کیا ہے۔ ایک تو سن بلوغ کو پہنچ رہی لڑکیوں یا شادی نہ کر پا رہی جوان لڑکیوں کی ذہنی حالت کو منعکس کیا ہے کہ انھیں اکثر اختناق کے دورے پڑ جاتے ہیں۔ دوسرے بانجھ عورتوں کی نفسیات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ ان میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی طبعیت میں چڑچڑا پن عود کر آتا ہے۔ اعلیٰ فن کاری کی یہی تو خاصیت ہے کہ کسی میلوڈرامہ کے بغیر ہی افسانہ نگار ان مسئلوں پر غور کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

گوتم دور ہی سے سہی مگر مُنّی سوہی کو دیکھتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ وہ باضابطہ طور پر مُنّی کو بیاہ کر لے جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پھر بھی دادی کو یقین نہیں آتا اور اس کے دل میں وسوسے گھر کر جاتے ہیں۔ رُکمن پوتی کو اپنا وتیرہ ٹھیک کرنے اور جھک کر چلنے کی تربیت دیتی ہے اور کئی بار سرزنش بھی کرتی ہے۔ شادی سے کچھ دن پہلے گوتم سائیکل ایجنسی چھوڑ کر دیماپور کے نزدیک جنگلوں کا ٹھیکہ لینے میں کامیاب ہوتا ہے جس وجہ سے شادی التوا میں پڑ جاتی ہے۔ سن کر دادی بوکھلا جاتی ہے اور لڑکی کو منحوس سمجھتی ہے۔ خود مُنّی بھی اپنی قسمت پر روتی ہے۔ چنانچہ دوری کے سبب خط آنے جانے میں مہینوں لگ جاتے ہیں اس لیے ان کی

تشویش کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ بہر حال بہت عرصے کے بعد گوتم کا خط ملتا ہے جس میں شادی کی مہورت ایک سال کے بعد طے ہونے کی اطلاع دی جاتی ہے۔ دادی کی جان میں جان آتی ہے مگر اندیشے پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ دن گننے لگتی ہے۔ آخر کار جیسے تیسے کر کے مُنّی سوہی کی ڈولی اٹھ جاتی ہے۔ سبھی لوگ یہ احتیاط کرتے ہیں کہ سوہی کا قد مقابلتاً زیادہ نہ لگے اور شادی اچھی طرح پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔ اس دوران بھی شیلا یہی دعائیں کرتی رہتی ہے کہ دادی کی ڈولی بھی جلدی اٹھ جائے۔ مُنّی کے جانے کے بعد پاس پڑوس میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ دادی رقمن اب بھی ڈرتی ہے کہ کہیں گوتم مُنّی کو دور لے جا کر چھوڑ نہ دے اور اسے پتہ بھی نہ لگے۔ اس کا واہمہ روز بروز بڑھتا رہتا ہے کہ ان دور دراز جنگلوں میں جہاں سانپوں اور جنگلی جانوروں کی کثرت ہوتی ہے، نہ جانے مُنّی کا کیا حال ہوگا؟ ضرور وہاں کچھ گڑ بڑ ہوگی۔ رقمن اب بھی ماننے کو تیار نہ تھی کہ ۵ فٹ کا لڑکا ۶ فٹ کی لڑکی سے شادی کر کے خوش ہوگا۔ وہ بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہے کہ گوتم پر کچھ ایسا سحر ہو کہ اسے اپنی بیوی چھوٹی دکھائی دے۔ دریں اثنا مُنّی کا باپو جگن ناتھ بھی کوچ کر جاتا ہے۔ دادی مُنّی کے خط کا شدّت سے انتظار کرتی رہتی ہے مگر اسے کیا معلوم کہ خط اک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ دادی کے خدشات روز بروز بڑھ جاتے ہیں کہ نہ جانے مُنّی کبھی لوٹے گی بھی یا نہیں، اگر لوٹے گی تو کب لوٹے گی اور کس حال میں لوٹے گی۔

بہر کیف ایک روز مُنّی سوہی سچ مچ چلی آتی ہے اور دادی دیکھتی ہے کہ وہ بہت خوش ہے اور اس کی کوکھ میں سات مہینے کا بچہ پل رہا ہے۔ گوتم زچگی کے لیے مُنّی کو میکے میں چھوڑ کر کچھ دنوں بعد چلا جاتا ہے۔ البتہ اس بار دادی مطمئن اور بشاش نظر آتی ہے۔ وہ اب ملک عدم کا سفر کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس کی بیماری لوٹ آتی ہے اور وہی کارروائی کی جاتی ہے جو ہر بار کی جاتی ہے۔ مرتے دم اس کا بچپنا اور چلبلا پن لوٹ آتا ہے۔ اس لیے وہ مُنّی سوہی سے کان میں پوچھتی ہے: ''وہ تجھ سے پیار کیسے کرتا ہوگا''۔ اسی کے ساتھ دادی اپنے پران تیاگ دیتی ہے اور گیتا کا جاپ بھی اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی اور موت ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ 'موت' اکثر بیدی کے افسانوں میں استعارہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان کے کچھ افسانوں جیسے موت کا راز، لمبی لڑکی، ہم دوش، کشمکش، نامراد اور رحمان کے جوتے میں موت کو بلاواسطہ برتا گیا ہے جب کہ کئی دوسرے افسانوں

میں 'موت' کی طرف بالواسطہ اشارہ کیا گیا ہے۔ موت بیدی کے لیے ایک ایسی حقیقت ہے جس سے چھٹکارا نہیں مل سکتا مگر ان کی کہانیوں میں موت کے ڈر کے خلاف مختلف آدمیوں کا نفسیاتی ردِعمل مختلف ہوتا ہے۔ کوئی اس کے سامنے ہتھیار ڈالتا ہے، کوئی اس سے ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتا اور کوئی فرار کا راستہ ڈھونڈ لیتا ہے بقول وارث علوی:

''' لمبی لڑکی' اچھا افسانہ ہے، بیدی کو بھی پسند تھا، مجھے بھی پسند ہے اور دوسرے بہت سے لوگوں کو یقیناً پسند آیا ہوگا۔ یہ نہ دادی کا افسانہ ہے، نہ پوتی کا نہ شادی بیاہ کا، نہ گھریلو ناچاقیوں کا، یہ افسانہ بھی موت کا ہی ہے۔ موت آتی ہے پر نہیں آتی اور جتنی بار موت ٹلتی ہے، زندگی اپنی تمام خرافات کے ساتھ در آتی ہے۔'' (وارث علوی، 'راجندر سنگھ بیدی کے افسانے - ایک تعارف'؛ کلیات راجندر سنگھ بیدی، ناشر قومی کونسل ۲۰۰۸ء)

موت کے حوالے سے بیدی ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''سب سے اچھی موت 'لمبی لڑکی' میں رقمن دادی کی ہے جو اس وقت تک نہیں مرتی جب تک اپنی بن باپ کی پوتی، جو لمبی ہوئی جاتی ہے، کی شادی طے نہیں کرتی۔ ایک معنی میں رقمن دادی نے افسانہ کو مر مر کر چلایا ہے اور جب پوتی کے ہاتھ پیلے ہو جاتے ہیں اور وہ گود میں منا سا بچہ لے کر آتی ہے تو دادی کی موت بھی آتی ہے ہوا کے جھونکے کی طرح، جس سے تپائی پر پڑی ہوئی گیتا کے پنّے اڑنے لگتے ہیں اور وہاں آکر رک جاتے ہیں جہاں شبد 'سماپت' لکھا ہوتا ہے۔ (وارث علوی، 'راجندر سنگھ بیدی کے افسانے - ایک تعارف'؛ کلیات راجندر سنگھ بیدی حصہ اول، ناشر قومی کونسل ۲۰۰۸ء ص ۲۳)

'لمبی لڑکی' کے حوالے سے بیدی کے اسلوب پر ایک نظر ڈالنا ضروری بنتا ہے۔ ظاہر ہے کہ 'لمبی لڑکی' بہت ہی طویل افسانہ ہے اور اس خامی کو نقادوں نے اپنے حدف کا نشانہ بنایا ہے۔ بہت سوں کا ماننا ہے کہ اس افسانے میں غیر ضروری تفصیلات اور فالتو کی جھاڑ جھنکاڑ شامل ہے۔ اس بارے میں وارث علوی فرماتے ہیں:

''بیدی کے لگ بھگ تمام افسانے لفظوں کی کفایت شعاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔ 'لمبی لڑکی' میں بھی اسراف زبان کا نہیں۔ 'لمبی لڑکی' میں جسے رطب و یابس کہا گیا ہے، وہ عبارت ہے واقعات، کردار، جزئیات اور مناظر کی افراط سے۔ لیکن اگر 'لمبی لڑکی' میں یہ افراط نہ ہوتی تو کہانی مرجاتی۔ اگر بالفرض اشک کا یہ خیال درست ہے کہ 'لمبی لڑکی' میں تھیم کے انتخاب میں تھیم کی خامی رہ گئی ہے تو جو چیز اس خامی کو نباہ جاتی ہے وہ واقعات اور کرداروں کی وہی بھرمار ہے جسے حشو و زائد کہا جاتا ہے۔ اس جھاڑ جھنکاڑ کو نکال دیجیے تو لمبی لڑکی کی تھیم میں ایک اچھی کہانی بننے کی طاقت نہیں رہتی۔ گویا تھیم وہ بیج ہے جو کائی اور گھاس سے بھرے تالاب ہی میں کنول کی صورت کھلتا ہے۔......عجیب بات یہ ہے کہ اتنے حشو و زائد کے باوجود لمبی لڑکی کی مرکزی تھیم نہ صرف برقرار اور نمایاں رہتی ہے بلکہ افسانہ کے مرکز ہی میں رہتی ہے۔''

(وارث علوی، 'راجندر سنگھ بیدی کے افسانے - ایک تعارف'؛ کلیات راجندر سنگھ بیدی حصہ اول، ناشر قومی کونسل دہلی ۲۰۰۸ء؛ ص ۳۱)

آج کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ممکن ہے کہ افسانہ 'لمبی لڑکی' میں طوالت کا احساس ہو مگر جس وقت اسے لکھا گیا تھا طویل افسانوں کا رواج عام تھا اور افسانہ نگار کی یہ کوشش رہتی تھی کہ افسانے کے ماحول اور اس میں پنپتے کرداروں کے ہر گوشے پر نظر رکھی جائے تاکہ افسانے میں کلیت کا احساس ہو ادھورے پن کا نہیں۔ اس دور میں کئی ایسے افسانے ملیں گے جن پر افسانے کے بدلے ناولٹ کا شبہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ افسانہ 'لمبی لڑکی' میں غیر ضروری واقعات کو جگہ دی گئی ہے، صحیح نہیں لگتا۔

راجندر سنگھ بیدی کے یہاں افسانہ فکر و تردد کا آئینہ بن جاتا ہے۔ وہ ہمیں زندگی کے مختلف شعبوں پر سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور کہیں کہیں طنز کے تیر بھی ہمارے دماغ میں چبھوتے ہیں تاکہ وہ بیدار ہو۔ یہاں پر بیدی کی فکر و سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے چند قول درج کرتا ہوں:

☆ ''ہم عورتیں سبھی راج کی اِچھا کیا کرتی ہیں پر جب مل جاتا ہے تو سر پیٹ لیتی ہیں۔''

☆ ''نصیبوں جلی عورت نہ جھکے تو اس دنیا کا چکر نہیں چلتا۔ نویں سو گورا ہوئے۔ جو نیچا ہوتا ہے آخر وہی اونچا ہوتا ہے۔''

راجندر سنگھ بیدی اس کہانی میں بشر کی حماقتوں پر خوب خندہ زن ہیں۔ چھوٹے چھوٹے طمع، چھوٹی چھوٹی خودغرضیاں اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں ایک عام زندگی میں اتنی اہمیت رکھتی ہیں کہ حتمی موت کو بھی ٹالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دراصل وہ ہمیں پاس پڑوس سے آشنا کرنے کے متمنی ہیں جہاں عام سی زندگی ایک ندی کی طرح مدھم رفتار سے بہتی چلی جاتی ہے۔ وہ نہ ہمیں بساند بھرے کوٹھوں کی سیر کراتے ہیں اور نہ ہی مافوق الفطرت کرداروں سے تعارف کراتے ہیں۔ وہ نہ ہمیں اپنی تبحر علمی سے مرعوب کرتے ہیں اور نہ ہی نظریاتی الجھنوں میں ڈال دیتے ہیں۔ ان کا فن ادائیگی اتنا سیدھا سادا ہے کہ عام قارئین ان کی باتیں آسانی سے سمجھ جاتا ہے اور خود ان کی کہانی کا کردار بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'لمبی لڑکی' کی دادی بھی ہمیں اپنی زندگی میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موڑ پر مل ہی جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

==

کرشن چندر کی ذہنی تشکیل

--محمد اویس قرنی

محمد اویس قرنی کی تحقیقی کتاب بعنوان 'کرشن چندر کی ذہنی تشکیل' اردو کے مشہور و مقبول افسانہ نگار کرشن چندر کو ان کی صد سالہ سالگرہ پر بطور خراج عقیدت پیش کی گئی ہے اور وہ بھی پاکستان سے جہاں ان کے لاکھوں چاہنے والے اب بھی موجود ہیں۔ کتاب کی ضخامت اور مواد کو دیکھ کر یہ ظاہر ہے کہ یہ بہت محنت طلب کام رہا ہوگا۔ کرشن چندر، جن کی تقریباً ۱۰۰ر کتابیں، ۵۰۰ر سے زائد افسانے، متعدد ڈرامے اور انشائیے شائع ہو چکے ہیں، کے فن اور شخصیت کو اپنے حصار میں لینا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ اس کے لیے قرنی مبارکباد کے حق دار ہیں۔ البتہ یہ ایک خوش آئند بات ہوتی اگر ان کی یہ کوشش دو ملکوں کے درمیان کی رسہ کشی سے قطع نظر ہماری مشترکہ میراث کا گن گان کرتی مگر کتاب کو پڑھ کر تاسف کے بغیر اور کچھ ہاتھ نہ لگا کہ ایسے مشہور ترقی پسند، مذہبی و مسلکی تعصبات سے حاجز، آفاقی سوچ اور انسانیت کے علم بردار فکشن نگار کی شخصیت کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ 'کٹ اینڈ پیسٹ' کے اس دور میں کرشن چندر کی تحریروں سے صرف ایسے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں جن سے مصنف کا مدعا اور مخفی پیش نامہ پورا ہو جاتا ہے جبکہ اردو ادب کی اعلیٰ قدریں اور انسانیت کے مطالبات فوت ہوتے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس میں یا تو اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کی کوئی سیاسی مصلحت ہے یا پھر خود اپنے ذہنی تشخص، جو مصنف کو اندھیاری کی مانند اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتا، کا اظہار یہ ہے۔ پوری کتاب کرشن چندر کی شخصیت پر کم بلکہ محمد اویس قرنی کی شخصیت کا آئینہ بن کر سامنے آتی ہے۔ طوالت کے مدنظر میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ یہاں اس کتاب کے ہر مفروضے کا تجزیہ کر سکوں البتہ اس میں اٹھائے گئے چند اہم سوالات کا جواب دینا ضروری ہے۔

کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے: فکری جہتیں، سیاسی رجحانات، ذہنی میلانات، تقسیم

ہند، اور حرف آخر۔ پہلے باب میں کرشن چندر کی فکر کو اشتراکیت سے زیادہ روحانیت کی طرف مائل دکھایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ان کے سیاسی نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے باب میں کرشن چندر کے مذہبی کردار کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ چوتھے باب میں تقسیم ہند کے وقت ہوئے قتل عام پر پاکستان کے تئیں ان کی ہمدردی کو اجاگر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے اس بات کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ محمد اویس قرنی نے اکثر کرشن چندر کو 'کرشن دا' لکھا ہے جس کا جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ لفظ 'دا' بنگال میں 'دادا' یعنی 'بڑے بھائی' کی تخفیف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور ممبئی میں کئی فلمی شخصیات کے ناموں کے ساتھ لگانے کا چلن ہے جیسے اشوک دا، بمل دا وغیرہ مگر یہ لاحقہ ہندستان میں خاص کر کرشن چندر کے پنجاب میں مستعمل نہیں ہے۔ ممکن ہے گلزار کی کتابوں کا اثر ہو کیونکہ انھوں نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ بمل دا کا نام لیا ہے۔ دوسرے یہ کہ مصنف نے اردو کے جانے پہچانے سرقہ باز جگدیش چندر ودھاوان کی کتاب کے حوالے بار بار دیے ہیں جبکہ اس کی اوریجنلٹی مشکوک ہے۔ منٹو پر لکھی گئی ان کی کتاب میں پیراگراف کے پیراگراف ڈاکٹر برج پریمی کی کتاب 'سعادت حسن منٹو- حیات اور کارنامے' سے نقل کیے گئے ہیں جس پر اخباروں اور رسالوں میں اس وقت کافی لے دے ہوئی تھی اور مناظر عاشق ہرگانوی اور دیگر نقادوں نے جگدیش چندر کی زبردست ملامت کی تھی۔ اس کتاب کے سہارے مکالمہ کھڑا کرنا کوئی دانشمندی نہیں لگتی۔

حیرت اس بات کی ہے کہ کرشن چندر کے جنم اور جنم استھان پر اتنا بڑا تنازعہ کھڑا ہو گیا جب کہ ہندوؤں میں زائچہ بنانے کا رواج ہے اور بقول مصنف ان کی ماں کٹر ہندو عورت تھیں۔ کرشن چندر خود لاہور کہتا ہے، بھائی بھرت پور کہتا ہے اور کوئی وزیرآباد کہتا ہے۔ جنم دن ۲۳ر نومبر پر بھی سوال اٹھائے گئے ہیں۔ اس سے بھی بڑی بات یہ کہ کرشن چندر کا یہ کہنا کہ ان کا بچپن کشمیر میں گزرا ہے، جس کی تائید ان کے بھائی اور دوست احباب کرتے آئے ہیں، سراسر غلط ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کا بچپن وادی کشمیر سے دور جموں کے علاقے پونچھ میں گزرا جس کو بقول ڈاکٹر گیان چند جین، سابقہ پروفیسر جموں یونیورسٹی، 'چھوٹا کشمیر' سے جانا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ کشمیر کے بارے میں کرشن چندر نے جو بھی افسانے رقم کیے ہیں وہ دراصل پونچھ کے بارے میں ہیں، ان میں پونچھ کا سماجی، سیاسی اور معاشرتی منظرنامہ ملتا ہے نہ کہ کشمیر کی

وادی کا۔ ہاں کبھی کبھار وہ وادی کشمیر میں بحیثیت سیاح وارد ہوئے سیاحوں کی طرح کشمیر اور کشمیریوں کی کسمپرسی کا اندازہ لگاتے رہے جبکہ صحیح معنوں میں وہ وہاں کے حالات سے بالکل واقف نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر برج پریمی اپنے مضمون 'پریم ناتھ پردیسی' (مشمولہ کشمیر کے مضامین، ص۱۰۰) میں لکھتے ہیں کہ ''کرشن چندر کے وہ (پردیسی) مداح تھے لیکن کرشن چندر اور عزیز احمد نے جس طرح کشمیر کی زندگی کی غلط ترجمانی کی اور فرضی رومان تراش کر یہاں کی معصومیت کا مذاق اڑایا، پردیسی اس سے متنفر تھے۔ پردیسی کو ملال تھا کہ ان لوگوں نے اس قوم سے درد کا رشتہ پیدا نہیں کیا اور اس کا غم ٹٹول کر نہیں دیکھا جس نے اس کے انگ انگ کا رس چوس لیا تھا۔'' کرشن چندر کے اسلوب کو 'رومانی حقیقت نگاری' کہا گیا ہے۔ دراصل ان کے یہاں رومانس اس ماحول کی دین ہے جس میں وہ بچپن میں پلے بڑھے۔ جہاں برف سے ڈھکے پہاڑ تھے، قل قل کرتے جھرنے تھے، میوہ باغات تھے اور پرند وچرند تھے۔ ان کے اسلوب میں یہی سب کچھ رچ بس چکا تھا اور یہ اسلوب ان کے قارئین کو نشہ آور بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

پونچھ میں، جہاں کرشن چندر کا بچپن بیتا، مسلمان آبادی کی کثرت تھی اور ہندو بہت کم تھے۔ اس لیے بچپن میں کرشن چندر کا باہمی عمل زیادہ تر مسلمانوں سے رہتا تھا اور اکثر دوست بھی اسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ کرشن چندر مسلم معاشرے کے مثبت طور طریق کے ہمیشہ مدح خواں رہے اور ایک ہمہ جہت اور آفاقی افسانہ نگار کے لیے ایسا ہونا بھی چاہیے۔ البتہ قرنی کی یہ دلیلیں کہ وہ ہندوؤں سے نفرت کرتے تھے اور مسلمانوں کے دوست تھے حقیقت سے بعید ہے۔ قرنی نے جہاں عبداللہ کی باتیں کی ہیں وہاں بچپن کی ہم جولی چندر مکھی کا کہیں ذکر بھی نہیں کیا ہے کہ کس طرح اس نے بلک بلک کر جان دی تھی اور کرشن چندر کو تڑپتا چھوڑ گئی تھی۔ تعویزوں اور کرشموں، فقیروں اور قلندروں، قبروں اور مجاوروں کی باتیں کرنا بچپن میں ان کی سائیکی کا حصہ بن چکا تھا جس سے چھٹکارا پانا مشکل تھا۔ قرنی جس ماحول میں پلے بڑھے ہیں وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہندستان میں آج بھی ہزاروں لوگ دوسرے مذہب کے فقیروں اور درگاہوں میں حاضری دیتے ہیں اور منتیں مانگتے ہیں۔ بقول آچاریہ جے کرشنا مورتی: ''پیدا ہوتے وقت بچے کو نہ صرف جینیاتی وراثت ملتی ہے بلکہ اسے ہزاروں سالوں کی سماجی میراث بھی حوالے کی جاتی ہے جس سے چھٹکارا پانا مشکل ہوتا ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ ہمارے ترقی پسند قلم

کار عمر بھر اپنی مذہبی کینچلی پھینکنے میں ناکام رہے۔ بقول ساحرلدھیانوی ''وہ (کرشن چندر) کسی ایک قوم، ایک نسل یا ایک فرقے کا ادیب نہیں ساری انسانیت کا ادیب ہے۔'' اگر وہ مذہبی ہوتے تو کہیں خطبہ پڑھتے، مذہب کی ترویج میں حصہ لیتے، اس کے بدلے وہ ہر ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں حصہ لیتے رہے۔

اس بات پر بھی دھیان دینا ضروری ہے کہ کرشن چندر کی ماں عام ہندوؤں کی طرح سناتنی تھی جو مورتی پوجا اور ہندو رسم و رواج میں پکا یقین رکھتی تھی جبکہ پتا جی آریہ سماجی تھے اور ان رسموں کے برخلاف۔ شاید قرنی کو آریہ سماج سے زیادہ واقفیت نہ ہو۔ یہ وہ مسلک ہے جو سوامی دیانند نے شروع کیا تھا، جس میں مورتی پوجا، فضول کرم کانڈ اور ذات پات کو ختم کرنے پر زور دیا گیا اور جو ہندو مسلمان بن چکے تھے ان کا شدھی کرن کر کے واپس ہندو بنایا جانے لگا۔ اس مسلک کا زیادہ اثر شمالی ہند میں رہا۔ پریم چند اس کے حامی تھے۔ کرشن چندر اور ان کے بھائی بہن جو پڑھے لکھے نئی نسل کے افراد تھے اس مسلک سے کافی متاثر ہوگئے۔ ماں تو کٹر مذہبی، روایت پرست، ان پڑھ، سخت گیر اور نظم و ضبط کی قائل تھیں، اس کے برعکس ان کے پتا جی تعلیم یافتہ، روایت شکن اور نرم مزاج تھے اس لیے یہ بات فطری تھی کہ وہ اپنے پتا جی کے بہت قریب رہے۔ رہا میاں بیوی کے اختلافات کا سوال، وہ کس گھر میں نہیں ہوتے، صرف چوپڑہ خاندان مستثنیٰ نہیں تھا۔ اسی تربیت کے زیر اثر کرشن چندر نے ہندو سناتن دھرم کی غلط رسموں کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہ کثیر التعداد معبودوں اور ذات پات کے خلاف لکھتے رہے اور ان کے اس رویے میں مزید تیزی تب آئی جب وہ اشتراکیت سے وابستہ ہوگئے۔ اس میں کسی اور مذہب کے اثر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کرشن چندر ہندو معاشرے کے اہم رکن تھے اور اس کی بھلائی چاہتے تھے اس لیے ان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اس کی بہبودی کے لیے پریم چند اور دیگر ترقی پسند ادیبوں کی طرح ہی ہندو رسم و رواج، راجے مہاراجوں اور ٹھاکروں کی استحصالی کارروائیوں، برہمنی استحصال، کٹر پرستی، مہاجنی تہذیب، زمینداروں، جاگیرداروں، سیٹھوں اور ساہوکاروں کے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائیں۔ وہ شاید مسلم معاشرے کی بدعتوں کے بارے میں بھی لکھتے مگر وہ اس سماج کے رکن نہیں تھے اس لیے اس پر لکھنے سے گریز کرلیا۔ چنانچہ ساحرلدھیانوی کرشن چندر کے بارے میں رقم طراز ہیں۔ ''معمولی سے معمولی واقعہ

اس کے جذبات میں ہل چل پیدا کر دیتا ہے اور پھر وہ چیخ اٹھتا ہے، سماج کے خلاف، مذہب کے خلاف، حکومت کے خلاف، یہاں تک کہ خود اپنے خلاف۔''

دیکھنا یہ بھی ہے کہ کرشن چندر نے مسلم سماج پر نرم رویہ کیوں اختیار کیا تھا۔ وجہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ایک تو یہ کہ اردو کے قارئین اکثر و بیشتر مسلمان تھے اور ان کی خوشنودی کا خیال ہر اردو قلم کار کو رہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ مسلم معاشرے کی تنقید تو مسلمان افسانہ نگار کسی حد تک کر سکتا ہے مگر غیر مسلم افسانہ نگار کی ایسی کوشش کو فرقہ واریت کا لیبل لگا یا جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ سمجھنا اہم ہے کہ کرشن چندر کا ہر کردار اس کا یا اس کے نظریے کا ماؤتھ پیس نہیں ہے بلکہ وہ صرف اپنی ترجمانی کرتا ہے جو کرشن چندر کی سوچ کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ بہت کم ایسے کردار ہوتے ہیں جو مقصدی ادب کے تحت اپنے خالق کی زبان بن جاتے ہیں مگر ان کی پہچان کرنا دقیقہ شناسی کا کام ہے۔ کرشن چندر کا تعامل ہندو دھرم، آریہ سماج اور اسلام سے براہ راست رہا جبکہ بالغ ہو کر انھوں نے اشتراکی اور وجودی فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کی مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ عملی آدمی تھے جو انسان کی بہبودی کے خواہاں تھے، نہ فلسفی تھے اور نہ ہی مذہبی پیشوا۔ سائنسی طریقہ کار ان کی تربیت کا حصہ نہیں تھا نہیں تو وہ یہ نہیں کہتے کہ ''سائنس کی حد جہاں ختم ہوتی ہے، وہاں سے مذہب شروع ہوتا ہے۔'' سائنس کے تئیں ان کی تشکیک سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہ بات تو مانتے ہیں کہ مذہب کی برعکس سائنس کسی بھی نظریے کو حتمی نہیں مانتا ہے اور یہاں دریافت و ایجاد کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اسی حرکی سوچ کے نتیجے میں کرشن چندر کہتے ہیں ''انسان اس فلسفے کو کوڑے کے ڈھیر پر ڈال دیتا ہے...... ممکن ہے مارکسزم کو بھی ایک دن یہی کرنا پڑے۔'' بہر حال انھوں نے طبقاتی نظام کو نیست و نابود کرنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ ترقی پسندوں کے منشور پر عقیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ بھوپال ترقی پسندوں کی کانفرنس میں انھوں نے کہا کہ ہمارے افسانوں میں غریب مزدوروں اور عورتوں کی عکاسی نہیں ہوتی۔ اس حوالے سے خواجہ احمد عباس فرماتے ہیں کہ ''کرشن چندر بالکل معمولی آدمی تھا۔ ہمارے آپ جیسا انسان جس نے اپنی زندگی میں بہت سے پاپڑ بیلے تھے۔ جرنلسٹ رہا تھا۔ ایڈیٹری کی تھی۔ کالج کے لڑکوں کو پڑھایا تھا۔ ریڈیو کی نوکری کی تھی۔ فلم ڈائریکٹ اور پروڈیوس کیا تھا۔ فلم کمپنی کا دیوالہ نکالا تھا۔ دوسرے پروڈیوسروں کے لیے 'ہٹ'، سلور جوبلی تصویریں لکھی تھیں۔ بیکاری اور غریبی کے مزے چکھے

کارعمر بھراپنی مذہبی کینچلی پھینکنے میں ناکام رہے۔ بقول ساحرلدھیانوی "وہ (کرشن چندر) کسی ایک قوم، ایک نسل یا ایک فرقے کا ادیب نہیں ساری انسانیت کا ادیب ہے۔" اگر وہ مذہبی ہوتے تو کہیں خطبہ پڑھتے، مذہب کی ترویج میں حصہ لیتے، اس کے بدلے وہ ہر ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں حصہ لیتے رہے۔

اس بات پر بھی دھیان دینا ضروری ہے کہ کرشن چندر کی ماں عام ہندوؤں کی طرح سناتنی تھی جو مورتی پوجا اور ہندو رسم و رواج میں پکا یقین رکھتی تھی جبکہ پتا جی آریہ سماجی تھے اور ان رسموں کے برخلاف۔ شاید قرنی کو آریہ سماج سے زیادہ واقفیت نہ ہو۔ یہ وہ مسلک ہے جو سوامی دیانند نے شروع کیا تھا، جس میں مورتی پوجا، فضول کرم کانڈ اور ذات پات کو ختم کرنے پر زور دیا گیا اور جو ہندو مسلمان بن چکے تھے ان کا شدھی کرن کر کے واپس ہندو بنایا جانے لگا۔ اس مسلک کا زیادہ اثر شمالی ہند میں رہا۔ پریم چند اس کے حامی تھے۔ کرشن چندر اور ان کے بھائی بہن جو پڑھے لکھے نئی نسل کے افراد تھے اس مسلک سے کافی متاثر ہو گئے۔ ماں تو کٹر مذہبی، روایت پرست، ان پڑھ، سخت گیر اور نظم وضبط کی قائل تھیں، اس کے برعکس ان کے پتا جی تعلیم یافتہ، روایت شکن اور نرم مزاج تھے اس لیے یہ بات فطری تھی کہ وہ اپنے پتا جی کے بہت قریب رہے۔ رہا میاں بیوی کے اختلافات کا سوال، وہ کس گھر میں نہیں ہوتے، صرف چوپڑہ خاندان مستثنیٰ نہیں تھا۔ اسی تربیت کے زیر اثر کرشن چندر نے ہندو سناتن دھرم کی غلط رسموں کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہ کثیر التعداد معبودوں اور ذات پات کے خلاف لکھتے رہے اور ان کے اس رویے میں مزید تیزی تب آئی جب وہ اشتراکیت سے وابستہ ہو گئے۔ اس میں کسی اور مذہب کے اثر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کرشن چندر ہندو معاشرے کے اہم رکن تھے اور اس کی بھلائی چاہتے تھے اس لیے ان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اس کی بہبودی کے لیے پریم چند اور دیگر ترقی پسند ادیبوں کی طرح ہی ہندو رسم و رواج، راجے مہاراجوں اور ٹھاکروں کی استحصالی کارروائیوں، برہمنی استحصال، کٹر پرستی، مہاجنی تہذیب، زمینداروں، جاگیرداروں، سیٹھوں اور ساہوکاروں کے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائیں۔ وہ شاید مسلم معاشرے کی بدعتوں کے بارے میں بھی لکھتے مگر وہ اس سماج کے رکن نہیں تھے اس لیے اس پر لکھنے سے گریز کر لیا۔ چنانچہ ساحرلدھیانوی کرشن چندر کے بارے میں رقم طراز ہیں۔ "معمولی سے معمولی واقعہ

اس کے جذبات میں ہل چل پیدا کر دیتا ہے اور پھر وہ چیخ اٹھتا ہے، سماج کے خلاف، مذہب کے خلاف،

حکومت کے خلاف، یہاں تک کہ خود اپنے خلاف۔''

دیکھنا یہ بھی ہے کہ کرشن چندر نے مسلم سماج پر نرم رویہ کیوں اختیار کیا تھا۔ وجہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ ایک تو یہ کہ اردو کے قارئین اکثر و بیشتر مسلمان تھے اور ان کی خوشنودی کا خیال ہر اردو قلم کار کو رہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ مسلم معاشرے کی تنقید تو مسلمان افسانہ نگار کسی حد تک کر سکتا ہے مگر غیر مسلم افسانہ نگار کی ایسی کوشش کو فرقہ واریت کا لیبل لگایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ سمجھنا اہم ہے کہ کرشن چندر کا ہر کردار اس کا یا اس کے نظریے کا ماؤتھ پیس نہیں ہے بلکہ وہ صرف اپنی ترجمانی کرتا ہے جو کرشن چندر کی سوچ کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ بہت کم ایسے کردار ہوتے ہیں جو مقصدی ادب کے تحت اپنے خالق کی زبان بن جاتے ہیں مگر ان کی پہچان کرنا دقیقہ شناسی کا کام ہے۔ کرشن چندر کا تعامل ہندو دھرم، آریہ سماج اور اسلام سے براہ راست رہا جبکہ بالغ ہو کر انھوں نے اشتراکی اور وجودی فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کی مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ عملی آدمی تھے جو انسان کی بہبودی کے خواہاں تھے، نہ فلسفی تھے اور نہ ہی مذہبی پیشوا۔ سائنسی طریقہ کار ان کی تربیت کا حصہ نہیں تھا نہیں تو وہ یہ نہیں کہتے کہ ''سائنس کی حد جہاں ختم ہوتی ہے، وہاں سے مذہب شروع ہوتا ہے۔'' سائنس کے تئیں ان کی تشکیک سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہ بات تو مانتے ہیں کہ مذہب کی برعکس سائنس کسی بھی نظریے کو حتمی نہیں مانتا ہے اور یہاں دریافت و ایجاد کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اسی حرکی سوچ کے نتیجے میں کرشن چندر کہتے ہیں ''انسان اس فلسفے کو کوڑے کے ڈھیر پر ڈال دیتا ہے...... ممکن ہے مارکسزم کو بھی ایک دن یہی کرنا پڑے۔'' بہر حال انھوں نے طبقاتی نظام کو نیست و نابود کرنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ ترقی پسندوں کے منشور پر عقیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ بھوپال ترقی پسندوں کی کانفرنس میں انھوں نے کہا کہ ہمارے افسانوں میں غریب مزدوروں اور عورتوں کی عکاسی نہیں ہوتی۔ اس حوالے سے خواجہ احمد عباس فرماتے ہیں کہ ''کرشن چندر بالکل معمولی آدمی تھا۔ ہمارے آپ جیسا انسان جس نے اپنی زندگی میں بہت سے پاپڑ بیلے تھے۔ جرنلسٹ رہا تھا۔ ایڈیٹری کی تھی۔ کالج کے لڑکوں کو پڑھایا تھا۔ ریڈیو کی نوکری کی تھی۔ فلم ڈائریکٹ اور پروڈیوس کیا تھا۔ فلم کمپنی کا دیوالہ نکالا تھا۔ دوسرے پروڈیوسروں کے لیے 'ہٹ'، سلور جوبلی تصویریں لکھی تھیں۔ بیکاری اور غریبی کے مزے چکھے

تھے۔ پریم بھی کیا تھا۔ (یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پریم بھی کیسے تھے)۔ شادی بھی، شادیاں بھی۔ دل لگایا بھی تھا۔ توڑا بھی تھا۔ جوڑا بھی تھا۔ انقلابیوں کا ساتھ بھی دیا تھا۔ اور شاعروں کی محفل میں بھی وقت گنوایا تھا۔ وقت پڑنے پر کانگریسیوں کا ساتھ بھی دیا تھا، کمیونسٹوں کا بھی۔ وہ ہر ترقی پسند اور انقلابی پارٹی کے ساتھ تھا۔ وہ دھرم مذہب ذات پات کے بندھنوں سے آزاد تھا۔ سامراج اور فرقہ پرستی کا دشمن تھا، عوام اور اشتراکیت کا ساتھی تھا۔''

زیرِ نظر کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کرشن چندر کو اسلام سے جنون کی حد تک محبت تھی اور وہ ہندو مذہب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ساتھ ہی ان کا ذہنی میلان روحانیت اور درگاہوں کی جانب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی ہندو بیوی کو چھوڑ کر سلمیٰ صدیقی سے شادی کر لی۔ اس لیے وہ اصل میں مسلمان تھے۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ کرشن چندر ترقی پسند اور اشتراکی ذہنیت کے ادیب تھے۔ مصنف کا ص ۱۲۱ پر نقل کیا ہوا اقتباس غور سے پڑھیں جس میں کرشن چندر اشتراکیت کی بازگشت کرتے ہیں کہ ''میں ایک ایسا سماج چاہتا ہوں جہاں کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے، اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب سب انسان برابر ہوں۔ مساوات کے حامی ہوں۔'' اشتراکیت کی بنیاد جدلیاتی مادیت اور مارکسی نظریے کی دین ہے جس کے اہم ستون دہریت اور لادینیت ہیں۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ برصغیر ہندو پاک میں اشتراکیت محض روزی روٹی کا نظریہ بن کر رہ گیا۔ ہندو اشتراکی جنیو پہن کر مارکس کی باتیں کرتے رہے اور مسلمان اشتراکی ختنہ کروا کے داس کیپٹل کو تکیہ بناتے رہے۔ انجام تو خیر بعد میں جو ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ خود کرشن چندر 'آئینہ خانے میں' میں فرماتے ہیں کہ ''حالانکہ میرا خیال ہے کہ ایک ادیب اتنا ہی جھوٹا، لپاڑیا، دھوکے باز، خود غرض، کمینہ اور تنگ دل ہوتا ہے۔ جتنا کوئی دوسرا آدمی ہو سکتا ہے۔ اور مجھ میں یہ سب خوبیاں پائی جاتی ہیں۔'' بات صرف عمل کی نہیں ہے بلکہ طینت کی ہے اور کرشن چندر کو کئی بار بد خیالات نے گھیرا تھا جس کا اعتراف انھوں نے خود کیا ہے۔ بہرحال یہ بات ظاہر ہے کہ کرشن چندر اشتراکی نظریے کے قائل تھے اس لیے عالمی جنگوں سے متاثر ہونا اور فاشسٹ قوتوں سے مقابلہ آرائی فطری تھا۔ جہاں تک امن کی باتیں ہیں ہر کوئی وہ چاہے کرسچن ہو، مسلم ہو یا کمیونسٹ ہو، دنیا میں امن قائم کرنے کا دعویٰ کرتا ہے مگر اپنی شرطوں پر۔ ہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ اسی کے

پاس عصائے موسیٰ ہے جسے دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے حالانکہ لاشعوری طور پر ہر کوئی نفاق پیدا کر کے جلتی پر آگ چھڑکتا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگار بھی امن کی باتیں اس لیے کرتے رہے کیونکہ روس اور چین ایسی باتیں کرتے تھے جبکہ دونوں ممالک اسلحہ اور تنصیبات بنانے میں مشغول رہے۔ بٹوارے کا ذکر ہنگامی حالات کا ردعمل تھا جس میں انسانیت کا جنازہ اٹھ گیا تھا۔ اس بارے میں کرشن چندر نے وہی سب کچھ لکھا جو ان کو پاکستان سے آئے مہاجروں، اخبارات اور ریڈیو سے معلوم ہوا۔ انہوں نے تصور کی دنیا میں کھو کر اس کی عکاسی کی کیونکہ وہ ممبئی میں تھے اور اس سانحہ کا راست ان پر یا ان کے خاندان پر، جو دہلی میں قیام پذیر تھا، کوئی اثر نہیں پڑا۔ سنی سنائی باتیں تھیں جن کو انھوں نے کانٹ چھانٹ کر کے جذبات کی سان پر چڑھا کر اور اپنی نظریاتی عینک سے دیکھ کر قرطاس پر انڈیلا۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں کافی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ 'ہم وحشی ہیں' کے حوالے سے ان پر الزام لگایا گیا کہ انھوں نے ان تحریروں میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

جہاں تک کرشن چندر کی ازدواجی زندگی کا سوال ہے، اس کا کامیاب اور ثمر آور ہونا کسی مذہب سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ ہر مذہب میں شادیاں ہوتی ہیں، ٹوٹتی ہیں، 'قبول ہے' کی رسمیں ہوتی ہیں اور طلاق کے بول بھی پڑھے جاتے ہیں۔ پہلی بیوی سے دوری اور پھر سلمیٰ صدیقی سے دوسری شادی کا قصہ محض دو دلوں کے ان میل اور میل کا قصہ ہے کسی دینی اشتراک کی حکایت نہیں۔ یہاں یہ کہنا اہم ہے کہ آزادی کے بعد نہرو نے ہندوؤں کے ساتھ جو ظلم کیا اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ کوئی بھی ہندو عدالت سے باقاعدہ طلاق لیے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتا ہے۔ اور طلاق لینے میں اس کی آدھی عمر چلی جاتی ہے جب تک وہ ذہنی تلاطم کا شکار ہوتا ہے۔ اس کی عکاسی میں نے اپنی کئی کہانیوں خصوصاً بٹی ہوئی عورت میں کی ہے۔ مگر فلم نگری ممبئی میں اس قانون کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ جن ہندوؤں کو دوسری شادی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی خود یا دونوں مرد اور عورت مسلمان بن گئے اور اپنے نام بدل دیے۔ مثال کے طور پر دھرمیندر اور ہیما مالنی، بونی کپور اور سری دیوی۔ نہ جانے ایسی سیکڑوں مثالیں ہوں گی جن کی تشہیر نہیں ہوئی۔ اسلام قبول کرنا محض مصلحت تھی مگر کرشن چندر نے عملی طور پر اپنا عقیدہ نہیں بدلا۔ اس حوالے سے رام لعل نے 'کرشن چندر تیرے روپ انیک' میں ۲۴ نومبر ۱۹۶۲ء کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ اس دن عصمت چغتائی کو گھر پر رام

لعل نے چائے پر بلایا تھا۔ سجاد، رضیہ، ستیش بترا، مسز انستیسیا اور مس وسیم موجود تھیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''انھیں دنوں یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ کرشن چندر نے اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں اردو افسانہ نگار سلمٰی صدیقی کے ساتھ شادی کر لی۔ عصمت چغتائی سے اس شادی کے بارے میں پوچھا تو عصمت نے اس خبر کی تائید کی اور کہا کہ وہ بھی اس موقع پر موجود تھیں۔ میں نے پوچھا سنا ہے کرشن چندر نے اس شادی سے پہلے اپنا مذہب بھی تبدیل کر لیا تھا۔'' اس بات کی بھی انھوں نے تائید کی۔ میں نے کہا۔ ''ان کا نام کیا رکھا گیا'' تو وہ مسکرا کر بولیں ''نام بدلنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کرشن چندر، کرشن چندر ہی رہیں گے۔'' رام لعل نے اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بڑی بے مروتی سے کیا ہے کہ کرشن چندر نے جوانی میں بیڈ پارٹنر یا جسمانی تسکین کے لیے پہلی بیوی کو بیس برس تک ساتھ رکھا، اس کا ذہنی شعور ترقی کر گیا جبکہ بیوی وہیں رکی پڑی رہی۔ پھر ذہنی رفاقت کے لیے سلمٰی سے شادی کر لی ''مگر وہ بھی کہیں پیچھے ہی رہ گئی''۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین، ایک بار کرشن چندر نے رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں کہا۔ ''رشید صاحب کبھی میرا نام لینے کے روادار نہیں۔ میرا نام 'بمبئی' رکھ چھوڑا ہے۔ سلمٰی کو خطوط میں یہ لکھ کر پوچھتے ہیں 'بمبئی والوں کا کیا حال ہے۔ بمبئی کا مزاج کیسا ہے؟ وغیرہ''۔ مطلب یہ کہ ان کی دوسری شادی ان کے سسر کو بھی قبول نہ تھی۔ اور پھر سلمٰی کا یہ خاکہ بھی پڑھ لیں۔ ''اس عظیم اور شہرۂ آفاق مصنف کا زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں نہیں، بلکہ صرف کھانسنے، تھوکنے، یا اپنی عینک تلاش کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ عام طور پر بیماری یا مجبوری کے موقع پر کھانسا جاتا ہے، مگر کرشن چندر اپنے دل کے بہلانے، ذوق کی تسکین، اطمینان بخش وقت گزارنے کے لیے کھانستے ہیں۔'' (قلم کارٹون)

یہاں پر ایک اور جانب دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اگر کرشن چندر نے اسلام قبول کیا تھا اور وہ ہندو نہیں تھے (حالانکہ میں سمجھتا ہوں نہ ہندو تھے نہ مسلمان) تو انھوں نے عصمت چغتائی کی طرح اپنا وصیت نامہ درج کرایا ہوتا کہ انھیں بعد از مرگ قبر میں دفنایا جائے۔ ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی کہیں سے کوئی ایسی دلیل سامنے آئی کہ وہ دوسری شادی کے بعد صوم وصلواۃ کے پابند تھے۔ بقول دھرم ویر بھارتی (مضمون 'کرشن چندر') ان کے آخری رسوم ہندو ریتی رواج کے تحت سمپن ہوا تھا لکھتے ہیں۔ ''اس دن شانت اور ابدی نیند میں سوئے ہوئے ان کے جسد خاکی کو گھر میں لا کر رکھا گیا، ہلدی کی ایک لکیر فرش پر

کھینچی گئی اور جاوید، شکیل، للّو اور راہی اپنی طرف گنگا جل کی تلاش میں دوڑے۔ نگم صاحب، اوم، ریوتی اور مجروح بھائی انھیں کندھوں پر لے کر چلے۔'' شاید یہ پڑھ کر محمد اویس قرنی اپنا ارادہ بدل دیں کہ کرشن کی ارتھی ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک ساتھ اٹھائی تھی کہ وہ زمانہ کچھ اور تھا۔ اس میں ہوا میں اتنی زہر ناکی نہیں تھی جو اس کے بعد مذہب کے ٹھیکیداروں نے اس میں بھر دی۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ کرشن کی بانسری دنیا بھر کی گوپیوں کے لیے خواب جگاتی رہی۔ وہ سیتا پر ہو رہے اتیاچار کے خلاف آنسوؤں سے افسانے لکھتے رہے اور حق کے لیے ہزاروں ارجنوں کو اسلحہ اٹھانے کے لیے غیرت دلاتے رہے۔ کیونکہ وہ عظیم انسان تھے اور انسانیت ہی ان کا مذہب تھا۔

☆☆☆☆☆

☆ محمد اویس قرنی؛ مصنف 'کرشن چندر کی ذہنی تشکیل؛ ناشر: ملاقات پبلکیشنز، گل بہار، پشاور (پاکستان)؛ اشاعت: جون ۲۰۱۲ء؛ ضخامت: ۴۶۵ صفحات؛ قیمت: -/۴۰۰ روپے [پاکستان]؛ تبصرہ نگار: دیپک بدکی

سعادت حسن منٹو۔ایک نئ تعبیر

--پروفیسر فتح محمد ملک

تقسیم ہند سے پہلے سعادت حسن منٹو افسانوی افق پر ایک درخشاں ستارے کی مانند ابھرآئے۔ چنانچہ وہ ڈی ایچ لارنس کی طرح اپنے زمانے سے کہیں آگے سوچتے رہے اور مروّج قدروں سے بغاوت کرتے رہے اس لیے انھیں ادبی محازوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے فن کی پرکاری، صلابت اور جمالیاتی خوبیوں کا صحیح طور پر جائزہ نہیں لیا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ ان کو تنقید نگاروں کی برأت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ گذشتہ برس برصغیر ہندوپاک میں ان کی صد سالہ برسی منائی گئی مگر نہ وہ اہتمام اور نہ ہی وہ جوش و جنون نظر آیا جو غالبؔ اور اقبالؔ سے منسوب ہے۔ پابند مشرقی معاشرے میں ان کا نام آج بھی حرف ممنوع ہے اور ان کے افسانے نصاب سے خارج ہیں۔ البتہ حال ہی میں منٹو پر کئی تنقیدی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی پروفیسر فتح محمد ملک کی مذکورہ کتاب 'سعادت حسن منٹو۔ایک نئی تعبیر' بھی ہے۔ جس میں منٹو کے فکر وفن کو ایک نئی جہت عطا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بقول ملک ''اپنی وفات سے نصف صدی بعد بھی منٹو اپنے نقاد کے انتظار میں ہے۔''

فتح محمد ملک نے زیرنظر کتاب میں جہاں خود چھ مضامین رقم کیے ہیں وہیں انھوں نے 'ضمیمہ جات' کے تحت منٹو اور دیگر قلم کاروں کے دس مضامین بھی شامل کیے ہیں تا کہ ان کے اپنے خیالات، جو طے شدہ عقیدوں سے ہٹ کر ہیں، کی پشت پناہی ہو سکے۔

کتاب کے پہلے مضمون کا عنوان ہے 'منٹو کی پاکستانیت'۔ مصنف نے اس مضمون میں حتی الامکان کوشش کی ہے کہ میرِ جنسیات منٹو کو اس مذہبی نظریے کا حامی ثابت کرلے جس کی بدولت پاکستان وجود میں آگیا۔ یہ سچ ہے کہ منٹو بٹوارے کے بعد پاکستان چلے گئے مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان جانا ان کی سوشل مجبوری تھی۔ وہ پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے رشتے دار سب ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔ ہر طرف نفرت ولاچاری کا عالم تھا جس میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو اور سکھ بھی برابر تہ تیغ ہو رہے تھے۔ پھر وہ ایسے عدم تحفظ کے ماحول میں کیوں کر اپنی دھرتی اور اپنے رشتے داروں سے دور ممبئی میں رہنا پسند کرتے۔ شیام کے ساتھ ہوئی معمولی سی ظریفانہ چشمک کو فتح محمد ملک نے بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے جبکہ اس مکالمے میں چھپا ظریفانہ پہلو اجاگر نہیں ہوا ہے۔ اگر اس بات میں سچائی ہوتی تو شاید منٹو کراچی پہنچ ہی نہیں پاتے کیونکہ ان کے اکثر دوست ہندو تھے۔ علاوہ ازیں منٹو ہی کیا، ممبئی میں اور بھی سیکڑوں مسلمان ادیب تھے جو بٹوارے کے بعد بھی اپنی زمین سے جڑے رہے اور پھلتے پھولتے رہے۔ آج تک کسی نے ان کا بال بھی بیکا نہ کیا۔ اس ایک معمولی واقعے کو ہجرت کا سبب بتانا اور ہندو دوستوں کی سیکڑوں مہربانیوں کو بھلا دینا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ ان مہربانیوں کا ذکر کرنے کا یہاں پر محل نہیں ہے۔ البتہ یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس منٹو نے عمر بھر اسلامی قوائد کی پیروی نہیں کی، نہ کبھی نماز پڑھی اور نہ روزے رکھے، ساری زندگی سگریٹ نوشی اور شراب نوشی میں صرف کی، اس فرائیڈ کے چیلے کی سرشت مذہب پر استوار پاکستانی معاشرے میں کہاں کھپ جاتی۔ ان پر جتنے بھی مقدمے چلے سب کے سب پاکستانی شہروں میں چلائے گئے اور پھر اسی پاکستان میں وہ ایک شراب کی بوتل کے عوض اپنے فن کو بیچتا رہا، دس روپے یومیہ اُجرت پر کالم لکھتا رہا اور آخر کار ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ پاکستان کے حکمرانوں اور ادیبوں کو اس پر ذرا بھر بھی ترس نہ آیا نہیں تو ایسے نامور ادیب کو کوئی گورنمنٹ ملازمت دی جاسکتی تھی۔ میں اس مفروضے پر لبیک کہتا کہ منٹو کی روح پاکستانی تھی اگر منٹو نے ہجرت سے پہلے پاکستان کے حق میں افسانے یا مضامین لکھے ہوتے یا پھر محمد علی جناح کی کھل کر حمایت کی ہوتی۔ پاکستان جا کر ان پر تعریفی مضمون لکھنا اور نہرو اور ہندستان کے خلاف لکھنا فطری بات ہے جسے زمانہ سازی کہا جاسکتا ہے۔ خود مصنف صفحہ ۱۱ پر اس بات کا احیا کرتے ہیں کہ منٹو آفاقی طرز فکر اور سوچ کے ادیب تھے مگر اس

وقت کے حالات نے انھیں پاکستان جانے کے لیے مجبور کیا۔ مصنف اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ آخر کار وہ پاکستان نہیں بن سکا جس کی آرزو لے کر مسلمان سر پر کفن باندھ کر چلے تھے۔

دوسرے مضمون کا عنوان ہے۔ 'منٹو اور جنگِ آزادی کشمیر'۔ کشمیر سے متعلق منٹو کی نگارشات مثلاً یزید، ٹیٹوال کا کتا، دو قومیں وغیرہ بھی اسی مصلحت کا نتیجہ تھیں تا کہ وہ ایسی نگارشات سے مذہبی جنون میں گھرے لوگوں کے بیچ اپنی ساکھ بنا سکے اور اپنی روزی روٹی کی سبیل کر سکے نہ کہ وہ منٹو کے ایقان کا انجام تھیں جیسا کہ ملک صاحب بتلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہاوت ''نیا مُلاّ مسجد کو دوڑ دوڑ جائے'' اس دور کے منٹو پر صادق آتی ہے۔ منٹو کشمیری تھے اس بات میں کوئی شک نہیں مگر وہ جموں کے ضلع بٹوت سے آگے کبھی گئے ہی نہ تھے۔ انھوں نے کشمیر کے بارے میں اپنے اسلاف سے ماضی کی روداد سنی تھی جبکہ خود زمینی حقیقت سے نابلد تھے۔

ظاہر ہے کہ ملک صاحب کے یہاں عسکری کی طرح مذہب پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہے جس کا نتیجہ ان کا مضمون 'انقلاب پسند اور نام نہاد ترقی پسند' ہے۔ انھوں نے ترقی پسندوں پر برسوں کا جمع کیا ہوا غصہ اتارا ہے۔ پاکستان میں ترقی پسند قلم کاروں جیسے فیض کا کیا حشر ہوا کسی سے چھپا نہیں ہے۔ جوش ملیح آبادی نے بھی پاکستان کے بارے میں اپنی سوانح 'یادوں کی برات' میں کافی کچھ لکھا ہے۔ کئی ادیب تو پاکستان جا کر وہاں سے بیزار ہوئے اور ہندستان لوٹ آئے مگر منٹو گرتی صحت، مالی دشواریوں اور رشتے ناتوں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے حالانکہ ان کے وہی دوست جن پر ان کو دھمکانے کی تہمت لگائی جاتی ہے انھیں واپس بلاتے رہے اور مالی امداد بھی کرتے رہے۔ دیکھا جائے تو منٹو نے ادبی زندگی کی ابتدا ترقی پسندی اور روسی قلم کاروں کے قصیدے لکھ کر کی تھی مگر بچپن ہی سے ان کا رجحان عیاشیوں اور خرافات کی جانب رہا جس کی وجہ سے وہ اپنے خاندان میں بھی معتوب ٹھہرے اور پھر ممبئی کی راہ لے کر قحبہ خانوں اور شراب نوشی کی طرف راغب ہو گئے۔ انھیں دنوں فرائیڈ کا نظریۂ حیات اپنے عروج پر تھا جس سے منٹو کافی متاثر ہوئے اور وہ اسی راہ پر گامزن ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ ترقی پسندوں نے اس سے دوری اختیار کر لی۔ دیکھا جائے تو منٹو مرتے دم تک غریب طبقے کے ہمنوا رہے اور اس حساب سے ترقی پسند رہے۔ کہیں پر بھی انھوں نے مذہب کی آڑ میں کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ جنسی کجرویوں پر لکھے ہوئے افسانے ان کی طبیعت کو

ہمیشہ راس آئے اور ممبئی اس کے لیے زرخیز زمین ثابت ہوئی۔

مضمون 'منٹو کی فکری صلابت اور نظریاتی استقامت' میں رائٹر نے منٹو کے چند غیر افسانوی تحریروں کا حوالہ دے کر وہی راگ الاپنے کی کوشش کی ہے کہ منٹو کو پاکستان بننے کی بے انتہا خوشی ہوئی۔ بھلا ملک صاحب ہی یہ بتائے کہ پاکستان میں رہ کر جناح صاحب کا خاکہ لکھتے وقت ان کی تعریف نہ کرتے تو اور کیا کر سکتے تھے۔ یہ خاکہ منٹو کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے۔ منٹو نہ گاندھی سے ذاتی طور پر ملے تھے، نہ نہرو سے اور نہ ہی جناح سے۔ انھیں ایسی سیاسی شخصیات سے کبھی قربت حاصل نہیں ہوئی۔ پھر وہ ان پر معروضی سوانحی خاکے کیسے لکھ پاتے؟ یہ خاکہ موقع پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ ہاں منٹو کو، جو فلم کمپنیوں میں منشی کا کام کرتے تھے، ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا.... طوائف جدن بھائی سے، ان کی بیٹی نرگس سے، اشوک کمار سے، ایکٹریس نسیم سے، کے کے (کلونت کور) سے اور ترقی پسند ادیبہ عصمت چغتائی سے۔ اس لیے ان پر لکھے ہوئے خاکوں میں معروضیت صاف عیاں ہے۔

'ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ایک نئی تعبیر' میں بھی مصنف نے اس افسانے کو ایک نئی خود ساختہ خوردبین سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور من گھڑت بات کو منوانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ وہ اس افسانے کی روح تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنے آپ کو فکری اور نظریاتی بیڑیوں میں جکڑتے ہیں۔ ایک قلم کار آفاقیت کا علمبردار ہوتا ہے۔ وہ اگر فرقہ وارانہ فسادات پر بھی لکھتا ہے یا کسی فرقے کے ظلم یا مظلومیت کی نشاندہی کرتا ہے تو اس میں بھی اسی آفاقی نظریے کی زیریں لہر ہوتی ہے۔ منٹو کا یہ افسانہ انسانی رواداری کا منشور ہے۔ اس میں دھرتی سے بچھڑنے کا کرب ہے، بے گھری کا نوحہ ہے۔ اس میں نہ اشتراکیت پسندی ہے اور نہ ہی وطن پرستی، نہ سیکولرازم ہے اور نہ ہی مذہب پرستی۔ البتہ مضمون 'منٹو کی مثالیت پسندی' میں تنقید نگار نے منٹو کے ان نظریات کی طرف اشارہ کیا ہے جن کو ہم نظر انداز کرتے آئے ہیں اور جن پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

کتاب میں جو ضمیمہ جات شامل کیے گئے ہیں وہ پروفیسر فتح محمد ملک نے اپنے نظریے کی تائید میں اکٹھا کر کے پیش کیے ہیں۔ یہ چنندہ مضامین منٹو کی مکمل شخصیت پر روشنی نہیں ڈالتے۔ کیا ہی اچھا ہوتا

اگر دیگر ادیبوں اور نقادوں کی آراء سے بھی استفادہ کیا گیا ہوتا۔

زیر نظر کتاب منٹو کے فکر و نظر پر کم بلکہ پروفیسر فتح محمد ملک کے فکر و نظر پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔ اس لیے اس کا مطالعہ کرنا ضروری بن جاتا ہے تاکہ سوچنے کا دوسرا رخ بھی سامنے آئے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو جاننا اور اس کی قدر کرنا ہر اچھے قاری کے لیے ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی اردو حلقوں میں خوب پذیرائی ہوگی۔

☆☆☆☆☆

☆ پروفیسر فتح محمد ملک؛ مصنف: 'سعادت حسن منٹو-ایک نئی تعبیر'؛ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶، اشاعت: ۲۰۱۳ء؛ ضخامت ۱۷۶ اصفحات؛ قیمت ۲۰۰ روپے؛ مبصر: دیپک بدکی

علیم صبا نویدی

حمد

دھڑکنوں کو نور دینے والا تو
سب سے برتر اور سب سے اعلیٰ تو
تیرے آگے سجدہ زن یہ کائنات
دین و دنیا کا ہے محور ترے ہاتھ
جسم و جاں کی ڈور تیرے ہاتھ میں
تیرا پرتو دھوپ میں برسات میں
نور تیرا ذرّے ذرّے پر محیط
ذات تیری ساری دنیا پہ بسیط
کیا ثنا تیری ہو ربّ ذوالجلال
تیرے الطاف و عطا ہیں بے مثال
رحمتیں تیری ہیں ہر سو بے شمار
تجھ سے ضو لیتے ہیں یہ لیل و نہار
دامن رحمت میں تیرے دو جہاں
تو ہی تو ہے چار سو جلوہ فشاں
تو ہی تو ہے آب و تابِ دیدنی
تو ہی تو ہے آفتابِ دیدنی
تو ہی تو ہے واقف رمزِ حیات
تو ہی تو ہے نورِ ربّ کائنات

خالد محمود

نعتِ پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم

(یہ نعت شریف مسجدِ نبویؐ کی عطا ہے)

مدینے جا کے دَہَن مفصّل بند رہتا ہے
کہ ان کا دستِ سخاوت بلند رہتا ہے
مدینہ عشقِ نبی ہے ذرا سنبھل کے چلو
یہاں جنوں بھی سدا ہوش مند رہتا ہے
وہ اک خیال کہ محشر میں آپ بھی ہوں گے
وہی یہاں بھی مرا درد مند رہتا ہے
جو زیرِ عکسِ مہِ کاملِ مدینہ ہو
اُس اُمّتی کا ستارہ بلند رہتا ہے
مدینہ ایسی جگہ ہے کہ ذکر آتے ہی
سمندرِ شوق بھی مستِ زقند رہتا ہے
وہ ایک چاند کہیں نصف ہے کہیں پورا
سرِ مدینہ ہمیشہ دوچند رہتا ہے
خدا کے فضل سے ہم نے بھی جا کے دیکھ لیا
مدینے والوں کی باتوں میں قند رہتا ہے
اسے نا خواہشِ دنیا نہ شوقِ آزادی
جو دل کہ گنبدِ خضرا میں بند رہتا ہے
بہت عزیز ہے خالدؔ حضورِ والا کو
وہ پہلو جس میں دلِ درد مند رہتا ہے

سیفی سرونجی

اردو نظم کا ارتقائی سفر (قسط نمبر۔3)

قسط نمبر دو میں ہم نے مدھیہ پردیش کے چند نظم نگاروں پر گفتگو کی تھی جن میں خاص طور پر چندر بھان خیالؔ، خالد محمود، مختار شمیم، اقبال مسعود، علی عباس امید، رہبر جونپوری، نجیب رامشؔ وغیرہ کی نظمیں پیش کی تھیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مدھیہ پردیش کے نمائندہ نظم نگاروں میں چندر بھان خیالؔ، عتیق اللہ صادق، خالد محمود وغیرہ رہے ہیں۔ ان میں عتیق اللہ اور صادق کا تعلق یوں تو مدھیہ پردیش سے ہے لیکن وہ عرصے سے دہلی میں مقیم ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ دونوں ہستیاں شاید اپنا تخلیقی کام پورا کر چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برسوں سے ان کی کوئی نظم دیکھنے کو نہیں ملی۔ اس کے برعکس چندر بھان خیالؔ کی تخلیقی اڑان اپنے عروج پر ہے۔ حال ہی میں ان کی کئی بہترین نظمیں رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ اتفاق سے خالد محمود کی نظم ہم نے محمد سالم کی کتاب جو کہ انگریزی میں ہے اس کا ترجمہ ہم نے شامل کیا تھا۔ وہ نظم سالم صاحب کی کتاب میں بھی آدھی ادھوری چھپی ہے جس سے نظم کا پورا مفہوم ہی غلط ہو گیا ہے۔ اس لیے یہاں خالد محمود اور چندر بھان کی دوسری نظمیں پیش ہیں۔ اس سے پہلے کہ دونوں شاعروں کی نظمیں پیش کی جائیں یہاں ان کی نظم نگاری سے متعلق کچھ معتبر نقادوں کی رائے پیش ہے۔ خالد محمود کی نظم نگاری سے متعلق مشہور فکشن نگار قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں۔

''غزلوں کے علاوہ خالد محمود کی نظمیں بھی بڑی پُر اثر ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم چھ دسمبر اس اس لرزہ خیز واقعہ پر لکھی گئی نظموں میں ایک جاں سوز اضافہ ہے۔'' اسی طرح چندر بھان خیالؔ کی نظموں سے متعلق بہت سے نقادوں نے انہیں اس عہد کا بہترین نظم نگار تسلیم کیا ہے۔ ان کا نظموں سے متعلق کچھ قلم کاروں کی رائے پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں۔ ''آپ کی نظم ''لولاک''، پڑھی، جی خوش ہوا۔ بے ساختہ چاہا یہ داد رسمی نہیں نہ ہی اس لیے کہ کفر کچھ چاہئے اسلام کی رونق کے لیے بلاشبہ رسول اکرم ﷺ کی ذات ان کا دین ان کے پیغام کی آفاقیت آپ کی تعریف کسی تشریح کی محتاج نہیں نہ ہی شاید اس طویل نظم کا ایسا

کوئی محرک رہا ہے۔ مجھے تو ایسا لگا کہ یہ نظم امن و آشتی حسن اور پاکیزگی اور عظمت انسانی کے ایک مثالی مجسمہ کو دیکھ کر ایک شاعر کا بے ساختہ ردّعمل ہے۔'' اسی طرح چندر بھان کی اس شاہکار نظم پر تمام بڑے نقادوں نے لکھا ہے اور اس نظم کو چندر بھان خیال کی پوری شاعری کی اساس کہا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر صادق، پروفیسر اختر الواسع، سید حامد، مخمور سعیدی، نظام صدیقی جیسے بے شمار شاعروں ادیبوں نے چندر بھان خیال کو ایک بڑا نظم نگار قرار دیا ہے۔ اگر اس نظم کی تعریف کرنے والوں کی رائے شامل کی جائے تو یہ ایک ضخیم مقالے کی صورت اختیار کرلے لیکن ہمارے اس سلسلے وار مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ تفصیل سے گفتگو کی جائے۔ بہر حال یہاں ساری بحث کو چھوڑتے ہوئے نظموں کے اقتباس پیش ہیں۔

جہاد

صبحوں کے اجالے راس نہیں ظلمت کو کسی بھی صورت میں
تاریک شبوں کو ملتا ہے آرام جنوں کی صحبت میں

زنداں کی نحوست میں لپٹا ہر فتنہ ابھرنے کی خاطر
پُرامن فضا کے چہرے پر الزام اگلنے لگتا ہے

بیمار بدن سناٹے میں شیطان اچھلنے لگتا ہے
نیکی کو جلانے کی دھن میں خود آگ پہ چلنے لگتا ہے

زہریلا دھواں منظر منظر اُٹھ اُٹھ کے تھرکتا ہے اور پھر
احساس ستانے لگتا ہے باطل کو شکستہ پائی کا
ہر شام نظارہ کرتی ہے عفریت کی بزم آرائی کا
اور شرک جل کے ہونٹوں پر گن گان بہت صحرائی کا

ہوتا ہے سپیرے ناچتے ہیں اور سانپ کے پھن لہراتے ہیں
آنکھوں میں چمکتی ہے جن کے بے جان خداؤں کی وحشت

بعد پجاری کے ڈر سے ہلکان خداؤں کی دہشت
خیموں میں جہالت کے جیسے نادان خداؤں کی دہشت

حرکات کی ہر برکت کھوکر انسان بھی بُت بن جاتا ہے
اوصاف سبھی جل جاتے ہیں دہشت کے سلگتے آنگن میں

چھہ دسمبر

سنو! سنو سب مرے عزیزو
مرے رفیقوں
مرے وطن مادرِ وطن کے
عجیب لوگو!
تمہیں مبارک ہو! موت اپنی
کہ مر گئے ہو تو کتنے خوش ہو؟
کہ اب تمہاری طرف تو نالیں نہیں اٹھیں گی
تمہارے اپنے محافظوں کی
نہیں جلیں گے مکاں تمہارے
تمہارے بچے یتیم نہ ہوں گے
نہ ہوں گی بچوں کی مائیں بیوہ
تمہاری بہنوں کی عصمتیں بھی نہیں لٹیں گی
نہ تم جیوں گے نہ تم مرو گے
ڈر چکے ہو تو مطمئن ہو
تمہیں مبارک ہو موت اپنی!
مگر ہماری طرف تو دیکھو
ہماری حالت عجیب تر ہے

کہ ہم تو اب تک بھی جی رہے ہیں
وہیں کھڑے ہیں
اعادہ ان سب کا جھیلنے کو
جو ہو چکا ہے تمہارے آگے
تمہارے پیچھے
پھر اس سے پہلے
مگر سنو سب مرے عزیزو
مرے رفیقو!
مرے وطن مادرِ وطن کے
عجیب لوگو!
یہ ہم جو زندہ ہیں اس لیے ہیں
کہ اپنی باری کے منتظر ہیں
سب اپنی باری کے منتظر ہیں
ہم اپنی باری کے منتظر ہیں
وہ اپنی باری کے منتظر ہیں

خالد محمود کی یہ وہ شاہکار نظم ہے جسے قرۃ العین حیدر نے بہترین نظم قرار دیا ہے۔
مدھیہ پردیش کے ایک اور نمائندہ شاعر ہیں شاہد میر۔ ان کی نظمیں خاص طور سے منفرد ہیں کہ وہ سنگیت کے بھی ماہر ہیں۔ ان کی نظموں میں تازگی ہے، راگ راگنیوں پر بھی اُن کی نظمیں ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کی نظمیں خاص طور پر شب خون میں ہمیشہ شائع کی ہیں۔ باٹنی کے پروفیسر رہے ہیں اس لیے ان کی نظموں میں پیڑ پودے بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی کئی نظمیں درختوں کے نام پر ہیں۔ کئی پرندوں کے نام ہیں تو کہیں جگ جیت سنگھ کے نام۔ لتا منگیشکر، مہدی حسن، غلام علی وغیرہ کے نام ان کی ایک بہت ہی پیاری نظم کتابوں کے نام ہے۔ لیکن میں یہاں ان کی راگ راگنیوں پر چند نظمیں پیش کر رہا ہوں جو شب خون میں شائع ہوئی تھیں۔

راگ رنگ

(استاد امجد علی خاں کی نذر)

سرود بھی بج چکا
تار جھنجھنا بھی چکے
سبھا بکھر گئی سازندے گھر کو جا بھی چکے
ان انگلیوں سے الگ کب کا ہو گیا سفراب
مگر سلگتی ہوئی گونج ابھی فضا میں ہے
کسی کلی کی مہکتی ہوئی قبا میں ہے
کسی درخت سے لپٹی ہوئی ہوا میں ہے
کسی بزرگ کی شفقت بھری دعا میں ہے

راگ باگیشوری

کالی داس کی مدھر کلپنا
تلسی داس کی وانی
لفظ لفظ میں بھری نرمی
غالبؔ کی سلطانی
سا رے گا ما دھا نی
خوشبو رنگ پرندے تتلی
بوندیں بادل کا جل
پیاری چھب دلکش ہے کتنی
آنکھوں نے پہچانی
سا رے گا ما دھا نی
شور اٹھا رس رنگ ایسا
پتھر کا یا پگھلی

لہراتی بل کھاتی ایسے

جیسے بہتا پانی

سارے گاما دھانی

اس سے پہلے کہ ہم اردو نظم پر آگے کچھ لکھیں یہاں نظم سے متعلق ڈاکٹر خواجہ اکرام کے اداریے سے ایک اقتباس پیش ہے جو انھوں نے سہ ماہی فکر و تحقیق کے نئی نظم میں لکھا ہے۔

''۱۹۳۰ء کے بعد اردو شاعری میں دوبارہ ایک بڑی تبدیلی کے آثار نما ہوئے ہیں اور اردو شاعری نظم سے غزل کی جانب گامزن ہو جاتی ہے۔ لیکن جدید غزل اور جدید نظم دونوں میں ہیئت زبان اور فکر کی سطح پر نئے تجربے ہو رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شاعری میں نئے موضوعات کو بہتر طریقے سے برتا گیا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترقی پسند افکار سے متاثر شعراء کی دنیا مخصوص دائرے تک سمٹ کر رہ گئی تھی۔

ترقی پسند شاعری مخصوص مقصد کے تحت کی جا رہی تھی۔ اس لیے نظموں میں بیانیہ اسلوب اور خیالات و الفاظ کی تکرار کے انداز فروغ پانے لگے اور یہ اشتراکی نظریات کو عام کرنے کا محض نعرہ بن کر رہ گئی۔ یہ بھی سچ ہے کہ نچلے طبقے کو موضوع سخن بنانے سے اردو نظم ایک نئے تجربے سے آشنا ہوئی۔ شاعری میں مزاحمت و احتجاج کی بازگشت مضبوطی کے ساتھ سنائی دینے لگی۔ اشتراکی فکر کو عام کرنے میں فیض احمد فیضؔ، علی سردار جعفری، ساحرؔ لدھیانوی، مخدوم محی الدین، اسرار الحق مجازؔ، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، حبیب جالب احمد فراز وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ میراجی اور ن م. راشد جیسے کچھ شاعروں نے اس تحریک سے جلد ہی کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنا الگ انداز اور حلقہ ترتیب دیا۔ جدید نظم کے تحت نئے تجربے کئے گئے۔ عالمی ادب سے استفادہ کیا گیا۔ روایت و جدّت کا حسین امتزاج جدید شعراء میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اختر الایمان، ضیا جالندھری، یوسف ظفر، قیّوم نظر، سلیم احمد، بلراج کومل، جمیل الدین عالی، پروین شاکر، محمد امجد، منیر نیازی وغیرہ جدید نظم کے اہم شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جدید نظم میں کائنات زندگی کو مختلف زاویوں سے مختلف نظریات سے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انسانی شعور کو بیدار کرنے اور اپنے وجود کا ادراک کرنے کے لیے انسانی جذبات کی مختلف کیفیات کو نئی ہیئت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔''

اس طرح اردو نظم منزل بہ منزل ترقی کرتی ہوئی جدید اور پھر مابعد جدید تک

آ پہنچی۔ ہمارا مقصد بھی نئی نظم خاص طور پر ۱۹۸۰ء کے بعد کی نظم پر لکھنا ہے۔ اس لیے کہ ہمارے زیادہ تر نقادوں کے ترقی پسند نظم اور جدیدیت والوں پر تو بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس کے بعد نسل آئی ہے یا اب موجودہ ادبی منظرنامے پر اپنا نام درج کرا چکی ہے ان پر لکھا تو جارہا ہے لیکن یہاں بھی وہی معاملہ جس طرح ترقی پسندوں نے اپنے اپنے گروپ کے لوگوں پر خوب لکھا یا انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کیا اسی طرح جدیدیت والوں نے بھی اپنے اپنے حلقے کے شاعروں پر توجہ دی اور اب مابعد جدید والے بھی وہی کر رہے ہیں۔ کچھ مخصوص نام ہیں جو لکھ دئے جاتے ہیں، زبیر رضوی کی نئی نظم نمبر نکالا تو اس میں بھی وہ انصاف نہیں کر پائے اور جتنے بھی نئی نظم کے انتخاب شائع ہوئے ان میں وہی نام زیادہ نظر آتے ہیں جو پہلے کسی انتخاب میں شامل تھے۔ اچھی بری تخلیق پر تو کوئی غور ہی نہیں کرتا بس چراغ سے چراغ جلانے کی روایت پر عمل جاری رہتا ہے چاہے وہ ترقی پسندی کا انتخاب ہو یا جدید شاعروں کا انتخاب ہو یا مابعد جدیدیت کا ظاہر ہے کہ کون یہ کام کرے اور اتنی ایمانداری سے کیوں کرے۔ سب اپنے اپنے لوگوں پر ہی لکھتے ہیں۔ انہیں کے ناموں کو دہراتے ہیں۔ زبیر رضوی ہوں، عبدالحق احمد سہروردی یا نئے نثر نگار کوثر مظہری، ارشد انور راشد ہوں۔ میں بھی ظاہر ہے کوئی محقق نقاد نہیں ہوں میں نے تو اپنی پسند کے شعراء پر پہلے بھی لکھا ہے اب بھی لکھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ نہ تو تمام نقادوں کا لکھا سب سچ ہوتا ہے اور نہ آئندہ ایسی کوئی صورت نظر آتی ہے۔ ہاں اس ادب کا کاروبار اسی طرح چلتا ہے چلتا رہے گا۔ آگے اب کچھ اور نظمیں پیش کرتے چلیں۔ ڈاکٹر صادق کی یہ نظم استفسار کے تازہ شمارے میں شائع ہوئی ہے۔

ہوا کی حمد کیجئے

کتنے کرب ناک بن گئے ہیں دن اکال کے
سنکٹوں کے گشت میں ہر ایک سمت
مویشیوں کے ساتھ ساتھ
آدمی بھی ڈھونڈنے لگا شرن
تلاش......گھانس کی عبث ہے
پتھروں کی کائی بھی
کسی نے ان کے دیکھنے سے قبل چاٹ لی

زمین سوکھتے ہی ہر طرف
بھوک اور پیاس اور موت اُگ گئی
میرے مویشیوں کی ہڈیوں کے ڈھیر پر
کتنے اور گدھ جھپٹ پڑے تو دیر تک
ذہن نے سنی ہنسی اکال کی
نہ جانے کتنے لوگ
گانو، چھوڑنے سے قبل جان چھوڑ کر چلے گئے
کتنے کرب ناک بن گئے ہیں دن اکال کے
سنکٹوں کے گشت میں ہر ایک سخت یاس ہے
بھوک اور پیاس ہے
ہوائی حمد کہتے ہوا بھی تو پاس ہے
ہوا بھی تو ساتھ ہے

☆

کوئی بھی محفوظ نہیں

(ندا فاضلی)

اپنی طرح سے بولنے والا
اپنی طرح سے سوچنے والا
اپنی طرح سے اپنے گھر کے دروازوں کو کھولنے والا
اپنی طرح سے لکھنے والا
ٹی وی پر اپنے چہرے سے دیکھنے والا
پاکستان میں مسلم جیسا
ہندستان اب ہندو بھی
اپنے دیس کے ہتھیاروں کے گھیرے میں ہے
ہر آزادی پہرے میں ہے
ایک ہی جیسا ہر آنگن ہو

ایک ہی جیسا ہر جشن ہو
حکم ہے مٹھی بھر لوگوں کا
وہ ہوں جیسے
سب ہوں ویسے

☆

ہمارے مابین

(عتیق اللہ)

ایک خواب سے جب تم / دوسرے خواب میں قدم رکھو/ تو خیال رہے/ ایک زمین تمہارے اندر بھی/ اپنے لیے زمین بنا چکی ہے/ جس پر ہزاروں ننھی ننھی دعاؤں کی بالیاں پھوٹیں گی/ تم ان دعاؤں کی زبان سمجھنا/ ان لفظوں کو سننا جنہیں تم نے/ سفر کے گذشتہ مرحلے میں ادھر ادھر گما دیا ہے/ یہ دنیا/ محض ایک فاصلے کا نام ہے/ اور تمہارے پاؤں بہت چھوٹے ہیں/ ذرا لڑکر دیکھو/ تم اپنے خدا کو کہاں چھوڑ آئی ہو/ تمہاری نمازوں کا نور کہاں رہ گیا ہے/ دیکھو ہمارے مابین/ ایک دلدل ہے/ اور اس دلدل میں ایک چاند پھنسا ہوا ہے/ جو تمہارے قدم ناپ رہا ہے۔

اس طرح نئی نظم کا کینوس اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اس کے تمام رنگوں کو سمیٹنا کسی ایک لکھنے والے کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ تو بس علاقہ بہ علاقہ جائزے کی شکل میں ہی کام ہوسکتا ہے ورنہ دیکھیے اب تک اردو نظم کے بے شمار انتخاب شائع ہو چکے ہیں۔ کئی رسائل کے نظم نمبر بھی شائع ہو چکے ہیں مثلاً زبیر رضوی نے ذہن جدید کے حوالے سے نئی نظم کا انتخاب بھی دیا ہے اور مسلسل لکھتے بھی رہے ہیں۔ فکر و تحقیق کا نئی نظم نمبر بھی شائع ہو چکا ہے لیکن ہر انتخاب میں کچھ ضروری نام رہ گئے کہ بغیر ان کے نام کے نظم پر گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ یہاں مجھے نام نہیں دینا نہ کسی انتخاب پر تنقید کرنا ہے۔ میں تو بس زیادہ تر ۸۰ کے بعد کی نظم پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں وہ بھی موجودہ ان نظم نگاروں پر جو کہ مسلسل رسائل میں شائع ہو رہے ہیں ورنہ کئی کام تو ایسے ہیں کہ برسوں سے کوئی تازی تخلیق بھی ان کی دیکھنے کو نہیں ملی۔ بہر حال ابھی تو بہت کچھ لکھنا ہے جو انشا اللہ اگلی قسطوں میں آئے گا۔ فی الحال مضمون یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

باقی آئندہ۔

ڈاکٹر نریش

شاعری میں عروض کی پابندی

ابتدا ہی سے انسان پرندوں کی مترنم آواز سے لطف اندوز ہوتا آرہا ہے۔ کویل، مینا، طوطے، پپیہے جیسے پنچھیوں کی آواز آج تک انسان کے کانوں میں رس گھولتی آرہی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کے قدیم ترین شاعر بالمیکی نے جب کلول کرتے ہوئے کرونچ پنچھیوں کے جوڑے میں سے ایک کو شکاری کے تیر کا نشانہ بنتے ہوئے دیکھا تو ان کی روح تڑپ اٹھی اور ان کا ردِ عمل مترنم الفاظ کے پیکر میں ڈھل گیا۔ ہمارے معاشرے میں بھی صدیوں صدیوں سے غم یا خوشی کے اجتماعی اظہار کو مترنم آواز میں ڈھالنے کی روش موجود ہے۔ بچّے کی پیدائش ہو یا عہدِ طفلی سے متعلق کوئی رسم، شادی بیاہ کا موقع ہو یا موت کا سانحہ۔ ہمارے سماج میں ہر موقعے سے متعلق جذبات کا اظہار گیتوں کے ذریعے کرنا ہی مروّج ہے۔ کسی دریا کی طرح یہ خود ساختہ روایت ہمارے معاشرے میں مسلسل رواں ہے اور ہماری عورتیں بغیر کسی ترغیب یا تربیت کے از خود ہی اس روایت میں اس طرح شریک ہو جاتی ہیں کہ ان کی زبان بیاہ کے موقعے پر لامحالہ سہرے گھوڑیاں اور مرگ کے موقع پر بین کیرنے گانے لگ جاتی ہیں۔ چھوٹے بچے تعلیم کے مشکل نکتے شاعری کے ذریعے آسانی سے یاد کر لیتے ہیں۔ تاجر اپنی مصنوعات کے اشتہار کو منظوم کراتے ہیں چونکہ انہیں علم ہے کہ منظوم اشتہار سامع یا قاری کے دل پر اثر کرتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے دنیا کے اکثر مذاہب کی مقدس کتابیں

شاعری کی صورت میں نازل ہوئی ہیں اور بندہ جب اپنے خدا کو یاد کرتا ہے تو اس کی زبان ایک مخصوص لَے ہی میں خدا کو یاد کرتی ہے۔

اس کے برعکس نثر دل کے بجائے دماغ سے پیدا ہوتی ہے۔نثر میں چونکہ عقلیت جذبات پر غالب آجاتی ہے، اس لئے وہاں لفظوں کی بے ساختہ روانی دیکھنے کو نہیں ملتی بلکہ الفاظ کی سنجیدہ ترکیب اور ترتیب ہی دکھائی پڑتی ہے۔

مختصر یہ کہ لَے، تال یا وزن انسان کی فطری کمزوری ہے اور کسی بھی زبان کی شاعری کو انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے تال لَے یا وزن کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ہم اپنی اس گفتگو کو غزل کے پیرائے تک محدود رکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ دیگر اصنافِ شاعری کی طرح غزل کے شعروں کا بھی کسی خاص وزن، لَے یا تال میں ہونا ضروری ہے۔

علماء نے شعر کو کلام موزوں مقفا بالقصد کہا ہے۔اس اعتبار سے شعر کی تخلیق میں تین بنیادی شرطیں سامنے آتی ہیں۔اوّل یہ کہ کلامِ موزوں ہو۔کلامِ موزوں کا مطلب ہے کسی خاص وزن پر، کسی خاص بحر میں کہی گئی بات۔مقّفا کا مطلب ہے قافیے میں بندھا ہوا کلام اور بالقصد کا مطلب ہے قصد کر کے، ارادہ کر کے، یقین کے ساتھ کہا گیا کلام۔

جہاں تک کلامِ موزوں کا تعلق ہے، تو وزن ہی سے جو نظم کو نثر سے الگ کرتا ہے وزن کی عدمِ موجودگی میں نظم کا تصوّر ہی نہیں کیا جاسکتا۔شعر کے سلسلے میں وزن کی شرط اور بھی ضروری ہوتی ہے کیونکہ شعر کی تخلیق غزل کے لئے مقرر کئے گئے وزن پر ہی کی جاتی ہے۔ غزل کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس کے تمام اشعار کسی ایک وزن پر کہے گئے ہوں۔مطلب یہ کہ غزل کے تمام اشعار کا ہم وزن ہونا ایک لازمی شرط ہے۔شعر کے ہم وزن ہونے کے لیے اس کے دونوں مصرعوں کا ہم وزن ہونا لازمی ہوتا ہے۔دونوں مصرعوں کا وزن ایک جیسا ہوگا، تبھی شعر کا وزن دوسرے اشعار کے بروزن ہوگا۔بنیادی طور پر وزن شعر کا نہیں، مصرعے کا ہوتا ہے۔اگر دونوں مصرعے ہم وزن ہوں گے، تبھی شعر بحر میں ہوگا ورنہ شعر خارج از بحر رہے گا۔اگر شعر کے دونوں مصرعے ہم وزن نہیں ہیں تو اسے شعر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

اس گفتگو کی روشنی میں یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ میری نظر میں نثری نظم یا 'آزاد غزل' نام کی چیزیں اصنافِ سخن نہیں ہیں چونکہ ان تراکیب کے ناموں ہی سے تضادِ معنوی بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے اگر آپ نثر لکھ رہے ہیں تو وہ نظم کیسے ہوسکتی ہے اور اگر آپ غزل کہہ

رہے ہیں تو اس کی تخلیق میں آپ کو بنیادی لوازم سے آزادی کیسے مل رہی ہے؟ ظاہر ہے کہ نظم کہتے وقت آپ نثر سے مختلف چند ضروری اصولوں کی پابندی کا احترام کریں گے اور غزل کہتے وقت اپنے اشعار کو کلامِ موزوں، مقفا، بالقصد بنا کر بحر وزن ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ قافیہ، ردیف، مطلع اور مقطع کے اعتبار سے بھی غزل کی صورت عطا کریں گے۔

عربی زبان کے علما نے ایسی پندرہ بحروں کی نشاندہی کر کے شعر کے اوزان مقرر کئے تھے جن کے ذریعے غزل کی لے قائم ہوتی ہے۔ عربوں ہی نے اِن بحروں کو مختلف نام دیئے تھے جو آج تک مروج ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان بحروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ فارسی اور اردو کے شعراء نے اوزانِ شعر کے طریقوں میں وسعت پیدا کی اور زحانوں کی مدد سے ایک بحر میں سے کئی کئی نئی بحریں نکال کر بحروں کی تعداد میں خوب اضافہ کیا۔

قدیم ہندوستانی زبانوں کی شاعری میں غزل کا وجود تو ناپید تھا لیکن نظم کے مصرعوں کو کسی ایک لے میں رکھنے کے لئے متعدد اصول موجود تھے جن کو چھند شاستر یا پنگل کہا جاتا تھا۔ اکثر ہندوستانی زبانوں کی شاعری میں آج بھی پنگل کے اصول مروج ہیں۔ اردو شعراء نے شعر کی لے اور تال قائم کرنے کے اصول فارسی والوں سے مستعار لئے ہیں جنہیں علمِ عروض کہا جاتا ہے۔

حالانکہ اردو غزل ایک انتہائی طویل سفر طے کر کے اس منزل پر آ پہنچی ہے جہاں اس کی مقبولیت دیگر اصنافِ سخن کے لیے باعثِ رشک ہوگئی ہے لیکن علماء اردو نے ابھی تک اردو غزل کا کوئی آزاد پنگل تیار نہیں کیا ہے اردو کے شاعر کو آج بھی شعر گوئی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے فارسی علمِ عروض کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ پرانے زمانے میں جبکہ ہندوستان میں فارسی کا چلن عام تھا، اردو والوں کے لیے فارسی علمِ عروض سے استفادہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا لیکن آج جبکہ فارسی تو کیا، اردو ہی کا وجود خطرے میں ہے، اردو کے شاعر سے یہ توقع کرنا کہ وہ فارسی علم عروض کی باریکیوں کو سمجھ کر، مقررہ قاعدوں کے مطابق شعر کہے، اُس پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ اس حقیقت سے انکار کرنا بھی خود فریبی ہوگا کہ پرانی اردو خواں نسلوں کے پاس فارسی زبان وادب کا جو سرمایہ ہوا کرتا تھا، آج کی نسلوں کے تعلق سے ہندی زبان وادب کا سرمایہ اس کا قائم مقام بن چکا ہے۔ اور پھر یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ ترقی کے مختلف منازل سے گذرتی ہوئی اردو شاعری دھیرے دھیرے عربی فارسی کی روایتوں سے دامن چراتی رہی ہے۔ جدید اردو غزل کے تیور دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ فنی رکھ رکھاؤ کا قصہ تو قصہ پارینہ ہوگیا ہے۔

لیکن غزل چونکہ ایسی صنفِ سخن ہے جسے اردو نے فارسی سے مستعار لیا ہے، اس لئے غزل کے تعلق سے ان قاعدوں یا اصولوں کو خیر باد کہنا ممکن نہیں ہے جن کی عدم موجودگی میں غزل کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً بحر، وزن، قافیہ، ردیف، مطلع اور مقطع کے بغیر غزل غزل ہی کہاں رہے گی۔ اگر کسی شاعر کو غزل کے بنیادی اصولوں سے بغاوت کرنا مقصود ہو تو اس کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ وہ غزل ہی کہے۔ لہٰذا غزل کہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ شاعر کو فارسی علم عروض سے خاطر خواہ واقفیت حاصل ہو۔ اگر حالاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر اردو کے نئے شاعروں کو اس علم کے حصول میں دشواری محسوس ہو رہی ہو تو ان کے پاس اس کا بدل موجود ہے اور وہ ہے ہندی چھند شاستر۔ یہ بات میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندی چھند شاستر بہر صورت فارسی علمِ عروض کا نعم البدل ہوسکتا ہے۔ لیکن بغیر عروض کے عالم کے اور بغیر عروض کی پابندی کے شاعری کرنے کی کوشش سعیِ لاحاصل کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

پروفیسر محمد نعمان خاں

مدھیہ پردیش میں اردو غزل: ایک جائزہ

'ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں'

کے مصداق انسانی زندگی ابتدائے آفرینش سے ارتقا پذیر ہے۔ تغیر و تبدل کا یہ فطری ارتقائی عمل، زندگی اور سماج کے ہر شعبے میں اثر انداز ہوتا ہے اور اس کے عمیق اثرات شعر و ادب اس کے موضوعات، اصول و ضوابط، اسالیب، معائر اور زاویہ ہائے فکر و نظر پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ بعض دیگر اصناف ادب کی طرح اردو غزل کا ارتقائی سفر اس کا بین ثبوت ہے۔ اردو غزل کے طویل ارتقائی سفر کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی اور سماج کا کوئی بھی اہم مسئلہ یا موضوع ایسا نہیں ہے جو غزل کے اشعار میں نہ ڈھل سکا ہو۔ رمز و کنائے کی حامل اس صنفِ سخن میں حقیقی و مجازی، داخلی و خارجی، ارضی و سماوی، روحانی و مادّی، سیاسی و عمرانی، معاشی و اقتصادی، فلسفیانہ و نفسیاتی، سائنسی و تکنیکی انفرادی و اجتماعی، تہذیبی و ثقافتی، مقامی اور غیر مقامی غرض کہ مختلف و متضاد موضوعات پر غزل گو شعرا نے اپنے افکار و احساسات و جذبات کا اظہار فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ کیا ہے۔

غزل گوئی ایک فنّی اور لسانیاتی عمل ہے۔ اس کا سفرِ ارتقا صدیوں کو محیط ہے۔ اس بلبلِ ہزار داستان کے ذریعے جو وقیع شعری سرمایہ ہم تک پہنچا ہے اسے ہماری تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے بیش بہا ادبی اثاثے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اردو غزل نے ہر عہد کے مروجہ ادبی رجحانات، نظریات اور ادبی رویوں کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔

کلاسیکیت ہو یا نوکلاسیکیت، رومانیت ہو یا ترقی پسندی، جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت، غزل کا شعر ہر مکتبۂ فکر کا شعر ہے۔ بقولِ حسرت موہانی ؎

شعر وہ ہی ہیں دراصل حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

غزل اور اس کے اشعار کی مقبولیت کا راز، تہہ داری، دروں بینی، دردمندی اور

اثر انگیزی میں پنہاں ہے۔ یہی وہ اوصاف ہیں کہ جنھوں نے اسے عوام و خواص دونوں کے لیے مقبول ترین صنفِ سخن بنا دیا ہے۔ اسے مقبولِ خاص و عام بنانے میں عوامی ذرائع ابلاغ اور غزل گائیکی کی روایت نے تاریخ ساز کردار ادا کر کے نہ صرف غیر اردو داں حلقوں تک پہنچا دیا ہے بلکہ کئی ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں بھی غزل گوئی کی روایت کو عام کر دیا ہے۔ اب غزل مختلف زبانوں میں لکھی جا رہی ہے اور اس کی گونج فٹ پاتھ اور بازاروں سے گھروں تک نجی اور غیر نجی محفلوں سے اقتدار کے گلیاروں تک اس طرح صاف سنائی دیتی ہے کہ:

''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے''

کا مقولہ صادق آجاتا ہے۔ غزل کی حکمرانی ملک کے مختلف صوبوں، شہروں اور قصبات تک ہی نہیں، بیرون ملک اور اردو کی نئی بستیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ مقررہ ہیئت کے اعتبار سے اگرچہ اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس میں کئی اہم اور غیر اہم تجربے کرنے کی کوششیں بھی کی گئی ہیں۔ غیر مردف غزل، آزاد غزل، دوہا غزل، نثری غزل، مثلث غزل، مکالماتی غزل وغیرہ ہیئتی تجربے بھی کیے گئے ہیں۔

ملک کے وسط میں واقع ہونے کے سبب ریاست مدھیہ پردیش کو ہندوستان جنت نشان کے دل کی حیثیت حاصل ہے۔ آزادی سے قبل اس ریاست کے جن شہروں اور قصبات میں اردو زبان و ادب کا رواج عام تھا ان میں بھوپال کے علاوہ گوالیار، اندور، اجین، برہانپور، کھنڈوہ، جبلپور، ساگر، سرونج، مہو، جاورہ، رتلام، گھرگون رائے پور اور بلاس پور کے نام شامل ہیں۔ ریاست چھتیس گڑھ بن جانے کے بعد، آخر الذکر دو شہر یعنی رائے پور اور بلاسپور مدھیہ پردیش سے علاحدہ ہو گئے ہیں لیکن مذکورہ بالا بقیہ شہروں اور قصبوں اور ان کے اطراف و جوانب کے علاقوں میں اردو شاعری کا سلسلہ اور چرچا آج بھی عام ہے۔

مدھیہ پردیش میں اردو غزل کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے فنکاروں نے مروجہ صالح ادبی روایات کو ملحوظ رکھ کر روایتی کلاسیکی، نو کلاسیکی، رومانی، ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید ہر نوع کے انداز و اسلوب کے حامل اشعار کہہ کر ملکی یا بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہاں کے فنکاروں نے عروض کے اصولوں پر کاربند رہ کر نئے ادبی رجحانات و میلانات کی پیروی بھی کی ہے۔ مدھیہ پردیش کے غزل گو شعرا کے انقلابی تیور اور ان کا تیکھا لہجہ اس بات کا غماز ہے کہ ملک کو آزاد کرانے اور سماجی مسائل کی ترجمانی میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔

آزادی سے قبل و بعد، مدھیہ پردیش کے کلاسیکی یا نو کلاسیکی روایت کے حامل جن شعرا نے فکر وفن کی تابانی سے غزل کے فن کو نکھارا اور سنوارا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے یادگار اور سازگار فضا فراہم کی ہے اُن میں گوالیار کے سراج الدین علی خاں آرزو، شاہ مبارک آبرو، شاہ غمگین گوالیاری، غوث گوالیاری، مضطر خیرآبادی، شفا گوالیاری، فیاض گوالیاری، پریم کشیپ سوز، شکیل گوالیاری، اختر گوالیاری، وقار گوالیاری، بشیر گوالیاری۔ بھوپال کے جہانگیر محمد خاں دولہ، شاہجہاں بیگم تاجور، صدیق حسن خاں توفیق، عباس رفعت شیروانی، یار محمد خاں شوکت، یوسف قیصر، سراج میر خاں سحر بھوپالی، ذکی وارثی، منیر بھوپالی، سہا مجددی، محوی صدیقی، حامد سعید خاں حامد، باسط بھوپالی، رمزی ترمزی، عرشی بھوپالی، ملاّ رموزی، شعری بھوپالی، وکیل بھوپالی، سورج کلا سہائے سرور، عائشہ بیگم زلفی، عمران انصاری، فاطمہ قیصری، ریحانہ، درگا پرشاد شاد، ساحر بھوپالی، عظمت بھوپالی، ممتاز رسول یکتا، مقصود عرفان، ارشد صدیقی، شاہد بھوپالی، قاسم نیازی، افسر صہبائی، آنند موہن اعجاز، اویس کاوش، صابر نیازی، عابد اختر، کوثری صدیقی، یونس مخمور، محمد نعیم صبا۔ اندور کے قیصر اندوری، شاداں اندوری، کاشف اندوری، صادق اندوری، مضطر اندوری، عزیز اندوری، رونق القیصری، رہبر اندوری، محمود نشتری، رشید اندوری، سالک اندوری، نور اندوری۔ جبلپور کے چودھری جے کشن حبیب، پنّالال نور جبلپوری، باقی صدیقی، سوز جبلپوری، انجم جبلپوری، ایاز جبلپوری، تاباں جبلپوری، اجین کے باسط اجینی، صہبا قریشی، گویا قریشی، حسرت قریشی، بشر اجینی، عطا الٰہی، پربھودیال گوڑ اشعر، کاشف الہاشمی، قمر اجینی اور محمود ذکی وغیرہ۔ برہانپور کے برہان الدین غریب، خلیق برہانپوری، محمود شاد برہانپوری، ساغر خلیقی، فاضل انصاری، ناشر برہانپوری اور اختر آصف برہانپوری وغیرہ۔ کھنڈوہ کے قاضی حسن رضا کھنڈوی، خوشتر کھنڈوی، حسن بشیر کھنڈوی، حفاظت کھنڈوی سکندر عرفان کھنڈوی اور صفدر رضا کھنڈوی۔ ساگر کے مہر ساگری، سلام ساگری، مسلم ساگری، کوثر ساگری، دلکش ساگری اور آثر ساگری وغیرہ۔ سرونج کے مرمت خاں مرمت، اچھن میاں راز، ناطق مالوی، راہی قاسمی، میر عرفانی، سید احمد مرتضیٰ نظر، فخر سرونجی، دانش مالوی، اسمٰعیل ذبیح، کلیم سرونجی، ضیا اسدی۔ جاورہ کے محبت گلشن آبادی، خطیب گلشن آبادی، ساحر گلشن آبادی، وغیرہ کے نام بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا بیشتر شعراء امیر و داغ، حسرت و جگر سے متاثر نظر آتے ہیں تو بعض شعرا اپنی علیحدہ شناخت بھی رکھتے ہیں۔ معروف استاد شعرا سراج الدین علی خاں آرزو اور نجم

الدین شاہ مبارک آبرو کا وطن گوالیار تھا انھوں نے اسی سرزمین پر آنکھیں کھولیں اور ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ مذکورہ دونوں شعرا کا تعلق گوالیار کے مشہور صوفی حضرت محمد غوث گوالیاری کے خانوادے سے تھا۔ دونوں شعرا محتاج تعارف نہیں۔ دونوں کا ایک ایک شعر ملاحظہ کیجئے۔

ہر صبح آوتا ہے تیری برابری کو
کیا دن لگے ہے دیکھو خورشید آوری کو

(آرزو)

رہے ہے تیں دن مژگاں کی سنگت
کلیجہ آہنی ہے آرسی کا

(آبرو)

مضطر خیر آبادی اگرچہ خیر آباد میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ گوالیار ہی میں بسر ہوا اور وہ یہیں مدفون بھی ہیں۔ یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ بہادر شاہ ظفر سے منسوب غزل ۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

کے خالق دراصل مضطر خیر آبادی ہی ہیں۔ مضطر خیر آبادی پختہ کلام شاعر تھے۔ ان کے طرزِ کلام کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

صحنِ گلزار میں گھنگھور گھٹا چھائی ہے
کہہ دو تو بہ شکنوں سے کہ بہار آئی ہے
دونوں اعجاز برابر کے ملے ہیں ان کو
آنکھ میں موت ہے، ہونٹوں پہ مسیحائی ہے

شاداں اندوری اور کاشف اندوری، اندور کے مقبول ترین شاعر ہیں۔ درج ذیل اشعار سے ان کی پختہ کلامی اور ندرت فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تجربہ ہے مجھے محبت کا
میں تمہیں مشورہ نہیں دیتا

کہیں کھو نہ جاؤں میں راہ میں، مجھے لے لو اپنی پناہ میں
درِ یار تک مجھے چھوڑنے، مرے ساتھ دیر و حرم گئے

جہاں جہاں بھی ترے گیسوؤں کی بات چلی
تمام سلسلۂ گفتگو مہکتا ہے

(شاداںؔ اندوری)

دوستی خود ہے منشائے فطرت ہر جگہ یہ نظارے ملیں گے
پھول کے پاس بھنورا ملے گا، چاند کے پاس تارے ملیں گے

مجھ پہ الزام بلانوشی سراسر ہے غلط
جس قدر آنسو پیے ہیں اس سے کم پی ہے شراب

(کاشفؔ اندوری)

شہر اجین کو عہدِ قدیم سے ہی علم و عرفان کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ وہاں کے کئی شعراء نے ملک گیر شہرت حاصل کی ہے۔ درج ذیل اشعار سے اجین کے کلاسیکی شعرا کے معیارِ سخن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پھر وادی ہستی میں محبت کا گذر ہے
پھر دل میں وہی سوزِ دروں جاگ رہا ہے

(باسطؔ اجینی)

دولت کو نہ سمجھے کوئی اپنی دولت
مٹھی میں ہوا بند نہیں ہوسکتی

(حسرتؔ قریشی)

چشمِ بینا نہیں قمرؔ ورنہ
ان کے جلوے کہاں نہیں ہوتے

(قمرؔ اجینی)

خلیقؔ برہانپوری صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان اشعار سے ان کی طرزِ فکر کو سمجھا جاسکتا ہے۔

جس وقت خودی کی عظمت کا احساس فنا ہوجاتا ہے
شداد کی جنت بنتی ہے، نمرود خدا ہوجاتا ہے
یہ آج نہیں تو کل، بے درد زمانہ سمجھے گا
دہقاں کی کھیتی جلنے سے کیوں زخم ہرا ہوجاتا ہے

جبلپوری کے کلاسیکی شعرا کا کلام بھی خاص انداز کا حامل ہے۔مثال کے طور پر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

حدیثِ دلبراں ہے اور میں ہوں
جہاں اندر جہاں ہے اور میں ہوں

(جے کشن حبیبؔ)

وقت گردش ہوں صورتِ پرکار
دور مرکز کا فاصلہ نہ ہوا

(پنالال نورؔ جبلپوری)

شہر میں آ کے جھلس جائے گا گاؤں والا
کوئی بھی پیڑ نہیں ہے یہاں چھاؤں والا

(انجم جبلپوری)

صوبۂ مالوہ کا قدیم تاریخی قصبہ سرونج ماضی میں ریاست ٹونک کا حصّہ تھا اور اب مدھیہ پردیش کی ایک تحصیل ہے۔یہ مردم خیز خطّہ ابتدا ہی سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ سرونج کے نمائندہ کلاسیکی شعرا کے چند اشعار سے وہاں کے رنگِ سخن کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مرمت حاجتِ زنداں ہے نہ فصل کی پروا
مجھے کچھ کم نہیں بستر سے ہر کانٹا بیاباں کا

(مرمت خاں مرمتؔ)

سبق آموز ہے آب و ہوائے گلشن عالم
عداوت آتشِ گل کو ہے بلبل کے نشیمن سے

(سید احمد مرتضٰی نظرؔ)

عرفان محمد خاں ناطقؔ مالوی، سرونج کے مقبول ترین شاعر تھے۔ان کا دلنشین کلام ہر خاص و عام کو اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے۔دیکھیے یہ اشعار۔

شرر و شعلہ ملے، چاند ستارے نہ ملے
زندگی پائی تو جینے کے سہارے نہ ملے

فقط پا مردیٔ ذوقِ قلش تھی ہم سفر ورنہ
کہاں ناطق، کہاں صحرا، کہاں کانٹے، کہاں چھالا

پا کے مزاج یار کچھ اپنی طرف جھکا ہوا
میں نے کہا زہے نصیب دل نے کہا بُرا ہوا

مسکراتے ہوئے وہ جام بڑھانا ان کا
کوئی انکار کا پہلو ہی نہ تھا کیا کرتا؟

تم سے آنکھ چراتا کیا
تم جیسا ہوجاتا کیا؟

راہیؔ قاسمی کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ سرونج کے کئی نوجوان شعرا نے ان سے مشورۂ سخن کیا ہے۔ ان کا کلام ان کی شخصیت کی طرح سنجیدہ اور متاثر کن ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار پیش ہیں۔

کاش ہوتے وہ رموز چشم تر سے آشنا
درد دل سے آشنا، درد جگر سے آشنا
تیرگی کو روشنی سے جو بدل سکتے نہیں
وہ کبھی ہوں گے نہ پیغامِ سحر سے آشنا

میرؔ عرفانی، سرونج کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ ان کے اشعار ضرب المثل کے بطور پڑھے جاتے ہیں۔

جسے دیکھو خوشی کی جستجو ہے
خوشی اک مستقل غم ہوگئی ہے

اے میرؔ انھیں خط کیسے لکھوں، ہاتھ مرے تھرّاتے ہیں
یہ سادہ کاغذ دے دینا، پیغام زبانی کہہ دینا

دانشؔ مالوی کا شمار، سرونج کے تعلیم یافتہ، مفکر شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے اشعار تصنع سے پاک، ان کے دل کی آواز بن کر ابھرتے اور قاری یا سامع کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ ان اشعار سے مذکورہ باتوں کی تصدیق ہوسکتی ہے:

بے وفاؤں سے اور امید وفا
ریت پر بھی چلی ہے ناؤ کہیں

ترا آنا قیامت تھا، قیامت ہے ترا جانا
وہ قصہ دو گھڑی کا تھا، یہ قصہ عمر بھر کا ہے

دلِ برباد کا ثانی نہیں ہے
کہیں یہ خانہ ویرانی نہیں ہے

سرونج کے پختہ کلام شعرا میں اسمٰعیل ذبیح کا نام بھی اہم ہے۔ ان کا شعر ملاحظہ کیجئے:

ہر ایک شخص ہے چہرے پہ غم سمائے ہوئے
یہ زندگی ہے کہ زخموں کا سلسلہ بھائی

ساگر کے کلاسیکی شعرا کے ان اشعار سے وہاں کے طرزِ سخن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بہ رنگِ لالہ و گل آشکار ہیں ہم لوگ
ہمہ بہار، سراپا بہار ہیں ہم لوگ
(مہر ساگری)

گردشیں تیری تجلی کی کہیں رکتی ہیں
جس طرف دیکھتا ہوں طور نظر آتا ہے
(سلام ساگری)

سلگتے دامن، تڑپتے آنسو، مچلتے ارماں، سسکتی آہیں
یہی تو دولت ملی ہے مسلم، یہی ہے ورثہ دلِ حزیں کا
(مسلم ساگری)

شہر غزل بھوپال کی ادبی قدامت مسلّم ہے۔ ماضی میں اسے 'بغداد الہند' بیت الکمال، دارالاقبال، کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

بھوپال کے پہلے شاعر قاضی محمد صالح (خالق مثنوی اخلاق حسنہ، ۱۷۰۷ء) اور پہلے صاحبِ دیوان شاعر ریاست بھوپال کے آٹھویں فرمانروا نواب جہانگیر محمد خاں دولہ تسلیم

کیے جاتے ہیں۔ شاعرات میں نواب شاہجہاں بیگم تاجور و شیریں پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہیں۔ محمد عباس رفعت شیروانی یا رمحمد خاں شوکت، عالم گیر محمد خاں نمود اور نواب صدیق حسن خاں توفیق کا شمار اس عہد کے نامور شعرا میں ہوتا ہے۔

نواب جہانگیر محمد خاں دولہ کے دو دواوین 'دیوانِ دولہ' اور 'دیوان جہانگیری' میری نظر سے گزرے ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مومن دہلوی سے زیادہ متاثر تھے۔ معاملہ بندی، شوخی او رندرت خیال ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

چاہت کو میری جو پا گیا ہے
ہر بات پہ اب روٹھتا ہے

چھوٹی ہوئی مہندی جو ترے پاؤں کی ہاتھ آئے
ہوتا ہے تدارک ابھی یاں دل کی جلن کا

دل، یار کی زلفِ گرہ گیر سے اُلجھا
سودائی تھا، اچھا ہوا زنجیر سے اُلجھا

نواب شاہجہاں بیگم تاجور کے شاعرانہ ذوق کے سبب ان کے عہد میں کئی شاعرات مشقِ سخن میں مصروف نظر آتی ہیں جن میں حسن آرا بیگم نمکین، منور جہاں بیگم مسرت، مشرف جہاں بیگم ثروت، کلثوم بی ممتاز، سکندر بیگم ضیا، سلطان جہاں بیگم حیا او رسورج کلا سہائے سرور کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اس عہد میں بھوپال کے کئی شعرا کو جرأت، غالب، مومن، داغ اور امیر مینائی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

بھوپال کے وہ کلاسیکی شعرا جنھوں نے اپنے کلام سے ملک گیر شہرت حاصل کی اور جن کا کلام زبان زد خاص و عام رہا ہے، ان میں چند نمائندہ شعرا کے اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

سینے میں دل ہے دل میں داغ، داغ میں سوز و ساز عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں، پردہ نشیں کا رازِ عشق

(سراج میر خاں سحرؔ بھوپالی)

ہم نشیں پوچھ نہ اُس بزم کا افسانۂ ناز
دیکھ کر آئے ہیں بندے کا خدا ہوجانا

(سہاؔ مجددی)

سارا عالم آئینہ باسطؔ
جیسی نگاہیں ویسے نظارے

(باسطؔ بھوپالی)

اگر کچھ تھی تو بس یہ تھی تمنا آخری اپنی
کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی

(شعریؔ بھوپالی)

جلوؤں سے ترے کھیلتی رہتی ہیں نگاہیں
لمحاتِ محبت مرے بے کار نہیں ہیں

(منیرؔ بھوپالی)

مریضِ غم پہ توجہ کا شکریہ لیکن
فرائض نگہِ چارہ گر کچھ اور بھی ہے

(شفاؔ گوالیاری)

حیراں ہیں اب کہ وسعت کونین کیا ہوئی
اٹھنے کو اٹھ تو آئے ترے آستاں سے ہم

(حامدؔ سعید خاں)

شورِ ماتم ہے جنازے پہ نہ ہجوم احباب
کتنا خاموش غریبوں کا سفر ہوتا ہے

(محویؔ صدیقی)

آجکل بھوپال میں ہے ایسی گرمی کی بہار
نام ٹھنڈا جس کے آگے ہوگیا کشمیر کا

(حسن آراء بیگم نمکین)

اُٹھی ہوک دل میں نکل آئے آنسو
جہاں بھی کسی نے لیا نام تیرا

(ساحر بھوپالی)

قفس کو چھوڑ دوں صیّاد کی یہ خواہش ہے
قفس میں رہنے لگا میں جو آشیاں کی طرح

(وکیل بھوپالی)

جنوں کو خود نہیں معلوم اپنی کارفرمائی
ہوا کیا آستینوں کو، گریبانوں پہ کیا گذری

(سورج کلا سہائے سرور)

موت ہے بارِ غم ہستی سے گھبرانے کا نام
زندگی ہے مسکرا کر زہر پی جانے کا نام

(ارشد صدیقی)

یاد میں سات سو چھپاسی کی
ہم نے تازہ شراب باسی کی

(ڈھینڈس بھوپالی)

کچھ اس طرح ان کی یاد میں ہے غمِ جدائی سے مضطرب دل
کہ جیسے پچھلے پہر میں شب کے کوئی عبادت گذار سا ہے

(اسد بھوپالی)

عرفان پھول رت کا تقاضا بھی خوب ہے
تیشہ بدست اٹھو کبھی نغمہ بلب چلو

(مقصود عرفان)

درد کی ہر اک کسک میں چوٹ سی محسوس ہو
میری بربادی کو اتنا آسرا دے دیجیے

(شاہد بھوپالی)

بھوپال کے وہ شعراء جنھوں نے مذکورہ بالا کلاسیکی شعرا کی زیرِ تربیت یا ترقی پسند ادبی تحریک اور تحریکِ آزادی ہند سے متاثر ہوکر آزادی سے پہلے یا فوراً بعد شعر گوئی کا آغاز کیا اور اپنی انفرادیت اور پہچان قائم کر کے ادبی حلقوں میں شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے اُن میں جاں نثار اختر، کیف بھوپالی، احسن علی خاں احسن، اختر سعید خاں، اظہر سعید خاں، گوہر جلالی، محمد علی تاج، قاضی وجدی الحسینی، مقصود عمرانی، شاہد بھوپالی، عشرت قادری، عرشی بھوپالی، شہاب اشرف، ظفر نسیمی، محسن بھوپالی، رفعت الحسینی، شاہد اختر، واحد پریمی، فاطمہ قیصری ریحانہ، وفا صدیقی، شاہد ساگری وغیرہ کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔

اس عہد کے شعرا نے تبدیل شدہ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ایک خاص مقصد اور نقطۂ نظر کے تحت غزلیں کہہ کر شاعری کو شمعِ رہ گذر بنانے کی سعی کی ہے مثلاً:

یہ شمعِ رہ گذر ہے اس کو جلنے دو ہواؤں میں
تہہِ دامن نہیں رکھتے، چراغِ فکر و فن اختر

(اختر سعید خاں)

چراغِ راہ بنے شمعِ انجمن نہ رہے
خدا کرے کہ مرا فن بھی میرا فن نہ رہے

(محمد علی تاج بھوپالی)

یہ وہ زمانہ تھا جب رہنمایانِ وطن اور مجاہدینِ آزادی کے ساتھ ساتھ شعرائے اردو نے بھی غیر ملکی حکمرانوں کے جبر و استعداد کے خلاف آواز احتجاج بلند کرنا شروع کر دیا تھا۔ شعرائے بھوپال کے انقلابی تیور اور چبھتا ہوا لہجہ اس بات کا غماز ہے کہ ملک کو آزاد کرانے اور پیدا شدہ سخت حالات سے نبرد آزما ہونے میں شعرائے بھوپال کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اختر سعید خاں، تاج بھوپالی اور عشرت قادری کے یہ اشعار اس امر کا بیّن ثبوت ہیں:

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات ہے ان کی مگر صبح ہماری ہوگی

(اختر سعید خاں)

میں چاہتا ہوں نظام کہن بدل ڈالوں
مگر یہ بات فقط میرے بس کی بات نہیں
اُٹھو، بڑھو مری دنیا کے عام انسانو!
یہ سب کی بات ہے، دو چار دس کی بات نہیں

(محمد علی تاج)

خون کے سیلابوں سے گذرے آگ کا دریا پار کیا
تب کہیں جاکر زندگی تجھ سے جینے کا اقرار کیا

(عشرت قادری)

حصولِ آزادی کے بعد بھی جب داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر کا طلسم برقرار رہتا ہے تو اظہر سعید خاں، عرشی بھوپالی اور محسن بھوپالی بطور احتجاج یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

وہ روشنی ہمیں جس کے لیے سحر تھی عزیز
سحر ہوئی تو اسی روشنی کو کم دیکھا

(اظہر سعید خاں)

جن کو گلشن کا سلیقہ نہ بہاروں کا شعور
ہائے کن ہاتھوں میں تقدیر حنا ٹھہری ہے

(عرشی بھوپالی)

نیرنگئ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

(محسن بھوپالی)

آزادی کے بعد بھوپال کے جن شعرا نے صالح روایات کے التزام کے ساتھ ترقی پسندانہ نظریات سے متاثر ہو کر غزل کو نئے اور تازہ موضوعات سے ہم آہنگ کیا ہے ان میں سے چند شعرا کے اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

تم بھلا کس کس کو سولی پر چڑھاتے جاؤ گے
اب تو سارا شہر ہی منصور بنتا جائے ہے

(کیفؔ بھوپالی)

ترے بھی ناز اٹھاؤں گا اے غم جاناں
غمِ حیات کے تیور ذرا بدل جائیں

(گوہرؔ جلالی)

نیاز کیش محبت نے کر دیا وجدیؔ
جو دردِ دل ہی نہ ہوتا جہاں میں کیا کرتے

(قاضی وجدیؔ الحسینی)

خوشا کہ سازِ بے کسی میں نغمۂ امید ہے
زہے کہ چشم بے بصر میں نورِ ذوق دید ہے

(احسن علی خاں احسنؔ بھوپالی)

تمہاری بزم سے باہر بھی ایک دنیا ہے
مرے حضور! بڑا جرم ہے یہ بے خبری

(تاجؔ بھوپالی)

ستارے لاکھ بُنیں ظلمتوں کے پیراہن
جبینِ مہر سے پھوٹے گی صبحِ نو کی کرن

(اخترؔ سعید خاں)

ہر ایک غم سے برسرِ بیکار ہے حیات
اک آرزوئے صبحِ طرب آشنا لیے

(عشرتؔ قادری)

اپنا نفس نفس ہے کہ شعلہ کہیں جیسے
وہ زندگی ہے آگ کا دریا کہیں جسے

(واحد پریمی)

یا رب رفاقتوں کا سلیقہ مجھے بھی دے
ٹوٹے دلوں سے درد کا رشتہ مجھے بھی دے

(ظفر نسیمی)

یہ کشمکشِ منعم و نادار کہاں تک
سرمایہ و محنت کی یہ تکرار کہاں تک

(وفا صدیقی)

نہ جھانک اے خوابِ محشر کشتگان غم کی آنکھوں میں
یہ وہ جھیلیں ہیں جن میں درد کے سیلاب پلتے ہیں

(رہبر جونپوری)

فصیلِ شب پہ نہ اپنا چراغ رکھنا تھا
ہمیں ہواؤں کی انگلی پکڑ کے چلنا تھا

(مرتضیٰ علی شاد)

کتنے زخموں کا پتا دیتے ہیں
مری پلکوں پہ سلگتے ہوئے جگنو یارو!

(شاہد اختر)

آزادی کے بعد مدھیہ پردیش میں ایسے شعرا خاصی تعداد میں ابھر کر سامنے آئے ہیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے اثرات قبول کر کے شدّت پسندی، نعرے بازی اور کسی بھی قسم کی وابستگی کے بغیر متوازن انداز اختیار کر کے اپنے قلبی جذبات و احساسات کا اظہار فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ کیا ہے مثلاً:

دیکھئے اندھیروں کے جسم کب پگھلتے ہیں

تیرگی زیادہ ہے اور چراغ شب تنہا

(دلکش ساگری)

وہ خوش ادائی ساقی سے اب نہ سنبھلیں گے
وفورِ تشنہ لبی سے جو لڑکھڑائے ہیں

(ابو محمد سحر)

پہاڑ پر جو کھڑا ہے اُسے خبر کردو
مجھے نشیب سے وہ بھی بڑا نہیں لگتا

(وحید پرواز)

کریں کیا شکوۂ الفت کسی کے سامنے جاکر
ہمیں شاہد خود اپنی ہی خطا معلوم ہوتی ہے

(شاہد ساگری)

دادی امّاں جن کا قصہ کل سناتی تھیں ہمیں
آج کیوں ملتے نہیں ہیں ہم کو اس قصّے کے لوگ

(عابد اختر)

عرش سے سلسلۂ فکرِ رسا ملتا ہے
جب بھی فنکار اٹھاتا ہے قلم رات گئے

(کامل بہزادی)

میٹھی بولی بولو جگ سے رس ٹپکا لو ہونٹوں پر
حرفِ وفا کا کوئی دلکش پھول۔ کھلا لو ہونٹوں پر

کشید کرتا ہے سورج سے دھوپ کی ساعت
جو ایک لمحہ مجھے دیدہ ور بناتا ہے

(نصیر پرواز)

کھڑا ہوں پستہ قد لوگوں میں ورنہ
مرا قد بھی بہت اونچا نہیں ہے

(اخترؔ نظمی)

عجیب شے ہے سرابوں کی چاندنی جس نے
سلگتی ریت پہ چلنا سکھا دیا ہے مجھے

(سرفراز دانش)

اب کسی بات پہ حیرت نہیں ہوتی مجھ کو
زندگی اتنے تضادات سے ٹکرائی ہے

(عبدالمتین نیازؔ)

زخم کھاتے ہوئے مقتل میں امامت کرنا
کتنا دشوار ہے اک سچ کی حفاظت کرنا

(ظفرؔ صہبائی)

میں تیرا نام مثالوں میں پیش کرتا تھا
یہ کیا کیا کہ زمانے سے جا ملا تو بھی

(امتیاز انجم)

خبر یہ ہے کہ وہ سارا علاقہ ڈوب گیا
جہاں خریف کی فصلوں پہ خواب رکھے تھے

(احمد کمال پروازیؔ اجین)

برق گرنے کا چمن میں کیسا یہ انداز ہے
چند شاخوں کے ہمیشہ آشیاں محفوظ ہیں
وقت کے نشتر سے کوئی بچ سکتا نہیں
سب کے چہروں پر خراشوں کے نشاں موجود ہیں

(کوثرؔ صدیقی)

ہر ایک بات کتابوں کی سچ نہیں ہوتی
میں اک ورق تھا مجھے پڑھ لیا بھلا بھی دے

(وقارؔ فاطمی)

بھرے گھر میں ہے اک کونا ہمارا
نہ ہونا سا ہے اب ہونا ہمارا

احساس کی وادی سے چلو خواب نکالیں
ہم اپنی ہی تہذیب کے کچھ باب نکالیں

(اقبالؔ مسعود)

غم حیات کے سائے مہیب ہیں ورنہ
کسے پسند نہیں ہے خیالِ یار کی دھوپ

(علی عباس امیدؔ)

مجھے مکتوب اس کے نام بھیجو
مرا اپنا پتہ کوئی نہیں ہے

(حامدؔ جعفری)

ہر اک نصاب میں شامل ہر اک کتاب میں ہوں
میں لفظ لفظ میں بکھرا بڑے عذاب میں ہوں

(اجلالؔ مجید)

فریبِ ذات ہے خوش فہمیوں کا دھوکا ہے
مرا وجود مجھے آئینہ دکھاتا ہے

(مختارؔ شمیم)

ہزار وسوسے شامل مرے یقین میں ہیں
سبھی خلوص کے پیکر تو آستین میں ہیں

(نسیمؔ انصاری)

یہ جو اتنا غرور ہے مجھ میں
کوئی خامی ضرور ہے مجھ میں

(شانؔ فخری)

میں تجھ سے بڑھ کے سیاسی شعور رکھتا ہوں
مری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے

(خالدؔ محمود)

خوابوں کی انجمن میں ہر اک شے حسین تھی
جاگے تو اپنے پاؤں کے نیچے زمین تھی

دامن خزاں سے ہم نے چھڑا تو لیا مگر
پتوں کے ٹوٹنے کی صدا ساتھ ہوگئی

(شاہدؔ میر)

میں مسافر گاؤں کا ہوں اجنبی ہوں شہر میں
بھیڑ میں رہنے کا مجھ کو تجربہ کچھ بھی نہیں

(سیفیؔ سرونجی)

آنکھوں میں اب تو تپتا ہوا ریگ زار ہے
دریا کو میں نے کھو دیا، قطرہ نکال کر

(رشید امکاںؔ)

ماحولِ چمن بدلا اس سے جی خوش تو ہوا پر یہ غم ہے
پھولوں کے دہن ہیں خشک ابھی کانٹوں کے لبوں پر شبنم ہے

(کاشف الہاشمی اجین)

نہ کوئی سایہ نہ دیوار و در نہ جائے سکوں
تمام شہر مرا گھر دکھائی دیتا ہے

(بختیار ضیاؔ)

عجب رشتے نباہتے ہیں مرے بچّے الگ ہوکر
کبھی جب ملنے جاؤں تو ملاقاتی سمجھتے ہیں

(فاروق انجم)

بکھر کے رہ گئے اپنے وجود میں لیکن
کبھی دراز نہ دستِ سوال ہم نے کیا

(سلیم انصاری جبلپوری)

بے ثمر پیڑوں میں تھیں اپنی الگ سچائیاں
پھل کے دیوانے بھلا کیسے ٹھہر کر دیکھتے

(انجم بارہ بنکی)

یہ کیسے شہرِ یقیں میں قیام ہے میرا
یہاں تو جسم بھی پرچھائیوں سے ڈرتا ہے

(تاج الدین تاج)

جھیل سی گہری ہیں دل کی حسرتیں
غم سے کہہ دو اب سمندر میں رہے

(پروین صبا)

دل کے ہیں برے لیکن اچھے بھی تو لگتے ہیں
ہر بات سہی جھوٹی سچّے بھی تو لگتے ہیں

(پروین کیف)

ممتاز چلو اب تاروں سے کریں باتیں
انسان کی فطرت میں افسانہ طرازی ہے

(ممتاز صدیقی)

تم نے تہذیب کا دنیا کو پڑھایا ہے سبق
اپنی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھو

(محی الدین انجم)

غربت نے ہمیں بخشی ہے سنجید گی سیفیؔ
ہنسنے کی بھی ہو بات تو ہنس کر نہیں کہتے

(سیفیؔ سرونجی)

دیکھیے تو عمر بھر ہم کس قدر مصروف تھے
سوچیے تو زندگی بھر کیا کیا؟ کچھ بھی نہیں

(نصرتؔ مہدی)

اردو میلوں دور کھڑی ہے شنکر جی کے مندر سے
ہندی ہم نے چسپاں کردی مسجد کی دیواروں پر

(ظفرؔ سرونجی)

آپ کو کارواں سے کیا مطلب
آپ تو میرؔ کارواں ٹھہرے

(باقی صدیقی جبلپوری)

اس صدی میں ترے ہونٹوں پہ تبسم کی نمود
ہنسنے والے ترا پتھر کا کلیجہ ہوگا

(عبدالحیٔ انجم جبلپوری)

اردو شاعری میں ۱۹۶۰ء کے بعد جب ترقی پسند تحریک کی گونج مدھم ہونے لگی تھی اور جدیدیت کا سورج طلوع ہو رہا تھا، ہمارے حساس نوجوان فنکاروں نے بدلتے ہوئے حالات کے تحت ایک نئی راہ متعین کی۔ نئی نسل سے متعلق شعرا اپنی علاحدہ شناخت قائم کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ نئے مسائل، نئے رجحانات ان کی شاعری کا موضوع بن رہے تھے۔ ان کے لہجے میں قدرے تازگی، دردمندی اور گداز پیدا ہو گیا تھا۔ جدیدیت کے حامل شعرا کے کلام میں جو نئے موضوعات اشعار کے پیکر میں ڈھل رہے تھے ان میں غمِ ذات، احساسِ تنہائی، بے یقینی، بے چہرگی، عدم تحفظ کا احساس، انتشار، رشتوں کی شکست و ریخت، تہذیبی قدروں کا زوال آرزوؤں کی پامالی کا غم ایک نئے انداز میں وسیلۂ اظہار بن کر اپنے عہد و سماج و زندگی کے حالات کی عکاسی کر کے نئی بحریں، نئے مشعرات (Allusions) نئے استعارات، نئی مصطلحات کے ساتھ فن کا روپ اختیار کر رہے تھے۔ گھر، شہر، گاؤں، سمندر، ندی، شیشہ، زندگی، کھیت، سورج، شجر، حجر، دھوپ، مٹی، پرندے، روشنی، خواب، فسادات،

دوستی، دشمنی، مقتل، خوشبو، جنگل، ریت، بھوک، احساسِ محرومی، اداسی، تنہائی وغیرہ لفظوں کے استعاراتی اور علامتی استعمال نے جدید شعرا کے کلام کو ایک نئے آہنگ، نئی امیجری، نئے انداز، نئی معنویت سے روشناس کر دیا تھا۔

شعرائے مدھیہ پردیش نے بھی مذکورہ بالا نئے رجحانات ومیلانات کے اثرات قبول کر کے اپنے جذبات واحساسات وتجربات ومشاہدات کا اظہار کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

لوگ رہتے ہیں آس پاس بہت
پھر بھی رہتے ہیں ہم اداس بہت

(عمیقؔ حنفی)

ہو جائیں آپ بھی کہیں پتھر نہ دیکھیے
جادوگروں کا شہر ہے مڑ کر نہ دیکھیے

(ابو محمد سحرؔ)

ہم بھوک اگاتے ہیں کھیتوں میں ہمارے گھر
سبزی بھی نہیں بنتی چاول بھی نہیں پکتے

(مظفرؔ حنفی)

یہ جو پھیلا ہوا زمانہ ہے
اس کا رقبہ غریب خانہ ہے

(ندؔا فاضلی)

ریشہ ریشہ ادھیڑ کر دیکھو
روشنی کس جگہ سے کالی ہے

(فضلؔ تابش)

آنکھوں میں رہا دل میں اُتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

(بشیرؔ بدر)

میں ایک کانچ کا پر تولتا پرندہ تھا
اُڑان بھر نہ سکا اور چھن سے ٹوٹ گیا

(عتیق اللہ)

ریت کے گھر تو بہہ گئے نظمی
بارشوں کا خلوص جاری ہے

(اختر نظمی)

وہ دشمنوں کی طرح مجھ پہ وار کرتا ہے
مگر گروہ میں اپنے شمار کرتا ہے

(عتیق اللہ)

ہر لمحہ ٹوٹنے کا ہمیں احتمال ہے
جیسے یہ زندگی کسی جامن کی ڈال ہے

(ظفر صہبائی)

فساد شہر میں بے ضابطہ نہیں ہوتے
یہ وہ لگان ہے جو ہر سال بھرنا پڑتا ہے

(احمد کمال پروازی)

بھری پری سڑک پہ اک سوالیہ نشان سا
اس اجنبی شہر میں ٹھہرا ہوں فاہیان سا

(نجیب رامش)

خاموشیوں کے گہرے سمندر میں ڈوب جائیں
کھوجائیں اس طرح کہ پھر اپنا پتا نہ پائیں

(مختار شمیم)

نہ ان میں دھوپ ہے نہ چاندنی ہے
عجب گھر ہیں، عجب انگنائیاں ہیں

(نسیم انصاری)

مقابلہ ہو تو سینے پہ وار کرتا ہے
وہ دشمنی بھی بڑی پُروقار کرتا ہے

(خالدؔ محمود)

کروٹیں لیتے ہیں معصوم زمانے مجھ میں
جب بھی آواز لگاتا ہے کھلونے والا

(نور محمد یاسؔ)

کچھ دن سے دل بضد ہے کہ جی بھر کے رویئے
ہنس ہنس کے زندگی کا بہت سامنا کیا

(آفتابؔ عارف)

تمام عمر کا حاصل صِفر کہاں رکھوں
زمیں درار شدہ ہے یہ گھر کہاں رکھوں

(شکیبؔ نیازی)

مشہور تو یہ ہے کہ یہ گھر میرا ہی گھر ہے
اس گھر میں کہیں کوئی ٹھکانہ مجھے دیدو

(شکیلؔ گوالیاری)

بہر صورت ضمانت زندگی کی ساتھ لاتے ہیں
وہ پودے مر نہیں سکتے جو مٹّی ساتھ لاتے ہیں

(شاہدؔ میر)

دیوار، در، کواڑ کے رشتے بکھر گئے
گھر ہوگیا ہے حشر کے میدان کی طرح

(شفقؔ تنویر)

اس نے گھر دے کے مجھ کو ڈھونڈ لیا
لاپتہ تھا مرا پتہ ورنہ

(رشید امکانؔ)

ہوائیں میرے گھروندے مٹاتی رہتی تھیں
میں ایک بچّے کی مانند ہنستا رہتا تھا

(سلیم انصاری جبلپوری)

ہمارے علم نے جانے کہاں دھوکا دیا ہم کو
لغت میں گھر کا مطلب کچھ ہو، مقتل تو نہیں ہوتا

(اختر وامق)

اٹھتی ہوئی ان موجوں کے نیچے کتنی گہرائی ہے
ہم جیسے کچھ لوگ نہ ڈوبیں تو اندازہ کیسے ہو

(وقار فاطمی)

سارا سکون گاؤں کی بانہوں میں آ گیا
شہروں کی قسمتوں میں فسادات رہ گئے

(منظر بھوپالی)

آنے والی نسل کا رشتہ منزل سے کیا جوڑیں گے
بیساکھی پر چلنے والے نقش قدم کیا چھوڑیں گے

(بسمل نقش بندی رتلامی)

ہنگامے یہ کہتے ہیں اک فائل تھی دیمک چاٹ گئی
تنہائی کہتی ہے میرا، اس کا کوئی رشتہ تھا

(انصار انظر)

دریا چڑھا تو پانی نشیبوں میں بھر گیا
اب کے بھی بارشوں میں ہمارا ہی گھر گیا

(اجلال مجید)

بوڑھا حقّہ کھانس رہا ہے نیم کی ٹھنڈی چھاؤں میں
گنگوا تیلی سوچ رہا ہے کملا رانی لانے کو

(شعیب انصاری)

جدید غزل پیکر تراشی اور تجسیم کاری کے حسن سے عبارت ہے۔ فنکار کا ذہنی یا تصوراتی پیکر جب لفظوں کا لباس اختیار کرتا ہے تو خوبصورت لسانی یا شعری پیکر قلب و روح میں اہتزاز پیدا کر دیتے ہیں۔ بقولِ شمس الرحمٰن فاروقی:

"حواس کے تجربے کی وساطت سے ہمارے متخیلہ کو متحرک کرنے والے الفاظ پیکر کہلاتے ہیں۔"

مدھیہ پردیش کی نئی غزل کے جن نمائندہ شعرا نے پیکر سازی یا پیکر تراشی کے عمل کو فنکارانہ مہارت کے ساتھ برتا ہے اور لفظوں کے نگینوں سے کلام کی مرصع سازی کر کے تصور یا خیال کو جس طرح جسمانیت عطا کی ہے۔ اس سے ایک نئی معنویت نئی دلکشی ایک نیا حسن پیدا ہو گیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے چند اشعار۔

جی ہاں میں نے بھی دیکھا ہے، اس کا کوئی دوش نہیں ہے
جب شعلوں کا ناچ ہوا تھا، کافی دور کھڑا تھا پانی

(مظفر حنفی)

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دئے رات ہو گئی

(ندا فاضلی)

خوشبو اپنا جسم سمیٹے طنز کرے ہے زخموں پر
غم کے پنچھی چیخ رہے ہیں پیار کی سونی شاخوں پر

(وحید پرواز)

بند کھڑکی تو کھولیے صاحب
دھوپ چھت پر اداس بیٹھی ہے

(فضل تابش)

درختوں کے بھی سائے جل رہے ہیں
یہ کیسی دھوپ سر پر آ گئی ہے

(شہاب اشرف)

میں کسی چیخ کا انکر تھا کہ اس جنگل میں
جس جگہ پھوٹ کے نکلا ہوں وہیں شور ہوا

(عتیق اللہ)

انھیں دیکھو تو یوں لگتا ہے جیسے
نظر کے سامنے خوشبو کھڑی ہے

(شہابؔ اشرف)

ہم نے نظروں سے چھوا، پلکوں سے چوما ہے اُسے
لوگ کہتے تھے کہ خوشبو کا کوئی پیکر نہ تھا

(مرتضیٰ علی شادؔ)

میری طرح ٹرین بھی سنسان ہوگئی
اک ایک کر کے سارے مسافر نکل گئے

(احمد کمال پروازیؔ)

دیکھی جو اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی
اک دستِ ناز یاد کا شانہ دبا گیا

(خالدؔ محمود)

تیز رو، تند خو آندھیوں کے لیے راستے سارے ہموار کرتے ہوئے
اک بگولے نے جامِ شہادت پیا جنگلوں کی حدیں پار کرتے ہوئے

(شاہدؔ میر)

غموں کا اب کوئی موسم نہیں ہے
یہ میلہ سال بھر لگنے لگا ہے

(ظفرؔ صہبائی)

ناچتی، گاتی، تھرکتی، جھومتی، سُر تال میں
آسمانوں سے اترتی ہے غزل، بھوپال میں

(آفتاب عارف)

سائے اتر رہے ہیں تصور کی جھیل میں
ابھرے ہیں پھر خیال کے مستول دیکھئے

(محمد یوسف ہما)

جب چراغ جلتے ہیں چاندنی نکلتی ہے
درد جاگ اٹھتا ہے چیخ سی نکلتی ہے

(حمید گوہر اجین)

آپ کی یہ کھلی ہوئی زلفیں
دھوپ بیٹھی ہے سائبان میں کیا

(جاوید عرشی)

حصار باندھ کے مجھ میں کہا اداسی نے
کوئی نہ آئے یہاں یہ دیار میرا ہے

(نور محمد یاس)

جدید غزل گو شعرا نے اپنی بات کو مؤثر بنانے اور کلام میں تہہ داری اور تازہ کاری پیدا کرنے کی غرض سے اساطیر سے متعلق مصطلحات اور مذہبی تلمیحات کے ذریعے کلام کو پُر معنی اور معیاری بنانے کی سعی کی ہے۔ مدھیہ پردیش کے نئے لب و لہجے کے شعرا کے یہاں اس کی کامیاب مثالیں اس طرح ملتی ہیں:

محاصرہ جو کیا آستیں کے سانپوں نے
مرا عصا نہ بنا، اژدہا، فریب فریب

(مظفر حنفی)

نئے نیزے، نئے نشتر، نئی شرطیں ہیں بیعت کی
یہ کس کوفے میں ہوں مکّے، مدینے والا میں تنہا

(عشرت قادری)

ہمارے پاس کرامت نہ معجزہ کوئی
ہمیں تو تیر کے دریا عبور کرنا ہے

(ساحرؔ گلشن آبادی)

دروازے کو پیٹ رہا، چیخ رہا ہوں
اندر آ کر کھُل جا سِم سِم کہنا بھول گیا ہوں

(صادقؔ مولا)

نہ میں رسول، نہ ہادی، نہ پیشوا، نہ امام
مرے وطن سے مجھے تو نکالتا کیوں ہے

(دلکشؔ ساگری)

چلن مدینے کا اب بھول جایئے صاحب
مہاجروں کو اب انصار مار دیتے ہیں

(ظفر صہبائی)

کبھی تو ساری شکستوں کا یوں صلہ مل جائے
ہرن کو کھوجنے نکلوں شکنتلا مل جائے

(نجیبؔ رامش)

سوا نیزے پہ سورج آ گیا ہے
ہماری صف ابھی سیدھی نہیں ہے

(خالدؔ محمود)

میں پربتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کے فرہاد بن گئے

(راحتؔ اندوری)

برحق تھی موت پھر بھی رہا کر دئے گئے
ایسی سخاوتوں سے غلام آشنا نہ تھے

(شاہدؔ میر)

اکیلا ہوں رونق بھرے شہر میں
زمانہ ہے یہ میرے بن باس کا

(نور محمد یاسؔ)

گھر ہو شیشے کا تو اس دور میں جینے کے لیے
سنگریزوں کی قبا اوڑھ کے در پر رہیے

(انیسؔ سلطانہ)

کوئی بھی شئے حسیں نہیں لگتی
پیٹ جب تک بھرا نہیں ہوتا

(سلیمان آذرؔ)

ہمیں کچھ دیر میں منزل ملے گی
ہمارا راستہ سیدھا بہت ہے

(بدرؔ واسطی)

کر رہی ہیں وار سورج پر مسلسل ظلمتیں
آج سورج کے لیے فانوس ہونا چاہیے

(قاضی ملک نوید)

جس دن سے مرے سر پہ پڑی مفلسی کی دھوپ
اس دن سے دوستوں کا رویّہ بدل گیا

(عارف علی عارفؔ)

مہینے تیس کے، اکتیس کے ہیں
ہمارے پاس پیسے بیس کے ہیں

(ساجدؔ پریمی)

خوبصورت عمارات کے بیچ
ایک بوسیدہ سا چھپّر اپنا

(محمود ملک)

ان کا اشارہ پا کے گنہ گار ہوگئے
سارے اصول ریت کی دیوار ہوگئے

(آصف سعید)

'مدھیہ پردیش میں اردو غزل' ایک وسیع تر موضوع ہے۔ ابتدا سے تا حال یہاں شعرا کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ سبھی کی شعری خدمات کا جائزہ کسی ایک مقالے میں ممکن نہیں ہے کہ یہ موضوع باقاعدہ طور پر ایک ضخیم کتاب کا متقاضی ہے۔

شعرائے مدھیہ پردیش کی غزل گوئی کے اس مختصر جائزے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں کے شعرا نے تازہ ہواؤں اور صالح نئے رجحانات کا خیر مقدم کیا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی، نوکلاسیکی، رومانی، ترقی پسند اور جدید ہر رنگ سخن اور ہر طرز فکر میں شعر کہہ کر زبان وفن وعروض کے اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے زندگی، عہد وسماج کے موضوعات اور ان کے بسیط پہلوؤں کی ترجمانی کا فریضہ بطریقۂ احسن انجام دیا ہے۔

اس مختصر جائزے کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو غزل کے سفرِ ارتقا میں شعرائے مدھیہ پردیش کا بھی اہم حصہ ہے۔

نقشبند قمر نقوی بخاری، ٹلسا، امریکہ

تنقید

تنقید...... عہد حاضر میں ایک دشوار کام ہے جس کا نتیجہ ......ضرر مایہ اور شماتت ہمسایہ ہوسکتا ہے...... وہ رواداری، مصنف مزاجی اور صلاح کار کا جو شعور کبھی ہوتا تھا، قصہ پارینہ بن چکا۔ صورت حال اب ایسی بھی ہے کہ تنقید کے قابل تخلیقات کی تعداد بھی بہت محدود ہوگئی، زیادہ تر تخلیقات اس نوعیت کی ہونے لگی ہیں...... نظم ونثر دونوں...... جن کو تنقید کے لیے زیر غور لانا غیر ضروری ہے، بہت کم ایسی تخلیقات کبھی کبھی نظر آتی ہیں جن کے بارے میں غور و فکر کا امکان ہوسکتا ہے۔

بے شمار تخلیقات کا معیار ایسا ہوتا ہے، جن کے بارے میں اگر گفتگو کا آغاز کیا جائے تو نقائص کی نشان دہی کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جاسکتا اور کسی کی تخلیق میں نقص کا تذکرہ ایسا ہے جیسے اس کے خالق سے دست وگریبان ہونا۔ اس نوعیت کی تخلیقات پر تنقید کے بجائے صرف تبصرے ہی لکھے جاتے ہیں اور ان تبصروں میں غیر جانبداری کا قطعاً فقدان ہوتا ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ تبصرے قصیدہ خوانی کے زمرے میں آجاتے ہیں...... دل بدست آور کہ حج اکبر است...... چنانچہ تبصرہ نگار حج اکبر ہی کرتا رہتا ہے۔

تبصرہ نگار، خالق تخلیق کو ناراض کرنا نہیں چاہتا، خوش کرنے پر مائل ہوتا ہے،

ان کا اشارہ پا کے گنہ گار ہو گئے
سارے اصول ریت کی دیوار ہو گئے

(آصف سعید)

'مدھیہ پردیش میں اردو غزل' ایک وسیع تر موضوع ہے۔ ابتدا سے تا حال یہاں شعرا کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ سبھی کی شعری خدمات کا جائزہ کسی ایک مقالے میں ممکن نہیں ہے کہ یہ موضوع با قاعدہ طور پر ایک ضخیم کتاب کا متقاضی ہے۔

شعرائے مدھیہ پردیش کی غزل گوئی کے اس مختصر جائزے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں کے شعرا نے تازہ ہواؤں اور صالح نئے رجحانات کا خیر مقدم کیا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی، نو کلاسیکی، رومانی، ترقی پسند اور جدید ہر رنگ سخن اور ہر طرز فکر میں شعر کہہ کر زبان و فن و عروض کے اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے زندگی، عہد و سماج کے موضوعات اور ان کے بسیط پہلوؤں کی ترجمانی کا فریضہ بطریقۂ احسن انجام دیا ہے۔

اس مختصر جائزے کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو غزل کے سفرِ ارتقا میں شعرائے مدھیہ پردیش کا بھی اہم حصہ ہے۔

نقشبند قمر نقوی بخاری، ٹلسا، امریکہ

تنقید

تنقید...... عہد حاضر میں ایک دشوار کام ہے جس کا نتیجہ ...... ضرر مایہ اور شماتت ہمسایہ ہوسکتا ہے...... وہ رواداری، مصنف مزاجی اور صلاح کار کا جو شعور کبھی ہوتا تھا، قصہ پارینہ بن چکا۔ صورت حال اب ایسی بھی ہے کہ تنقید کے قابل تخلیقات کی تعداد بھی بہت محدود ہوگئی، زیادہ تر تخلیقات اس نوعیت کی ہونے لگی ہیں...... نظم ونثر دونوں...... جن کو تنقید کے لیے زیر غور لانا غیر ضروری ہے، بہت کم ایسی تخلیقات کبھی کبھی نظر آتی ہیں جن کے بارے میں غور و فکر کا امکان ہوسکتا ہے۔

بے شمار تخلیقات کا معیار ایسا ہوتا ہے، جن کے بارے میں اگر گفتگو کا آغاز کیا جائے تو نقائص کی نشان دہی کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جاسکتا اور کسی کی تخلیق میں نقص کا تذکرہ ایسا ہے جیسے اس کے خالق سے دست وگریبان ہونا۔ اس نوعیت کی تخلیقات پر تنقید کے بجائے صرف تبصرے ہی لکھے جاتے ہیں اور ان تبصروں میں غیر جانبداری کا قطعاً فقدان ہوتا ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ تبصرے قصیدہ خوانی کے زمرے میں آجاتے ہیں...... دل بدست آور کہ حج اکبر است...... چنانچہ تبصرہ نگار حج اکبر ہی کرتا رہتا ہے۔

تبصرہ نگار، خالق تخلیق کو ناراض کرنا نہیں چاہتا، خوش کرنے پر مائل ہوتا ہے،

چنانچہ تبصرہ ایسا زیر تحریر آتا ہے کہ تخلیق کے نقائص، کوتاہیاں، یا کمزوریاں تو نظر انداز ہو جاتی ہیں ان کی نشان دہی تک نہیں ہو سکتی، البتہ ایسے اوصاف بیان کیے جاتے ہیں جو واقعتاً اس تخلیق میں موجود نہیں ہوتے۔ ہر چند کہیں کہ نہیں ہیں، لیکن ہیں...... اس لیے کہ تبصرہ نگار ان اوصاف کو اپنے کمال نگارش کے ذریعے وجود بخش دیتا ہے۔

خالق تخلیق، اکثر حالات میں تبصرے یا نام نہاد تنقید کی ضرورت اس وقت محسوس کرتا ہے جب اس کی تخلیق کی حیثیت کا غیر جانبدارانہ تعین ممکن نہیں ہوتا۔ وہ اپنے سے زیادہ معروف یا مسلمہ قلم کار سے رابطہ قائم کر کے اپنی تخلیق پر تبصرے کی فرمائش کرتا ہے۔ خالق اور تبصرہ نگار دونوں کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس فرمائش سے مراد علمی اور ادبی تجزیہ نہیں بلکہ توصیف درکار ہے۔ چنانچہ تبصرہ نگار ابتدا سے ہی تخلیق میں خوبیاں تلاش کرتا ہے۔ اگر خوبیوں کا وجود نہ ہو، جو اکثر نہیں ہوتا تو وہ ان خوبیوں کو تخلیق کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

آج کل رسائل میں جو تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں، جن میں کسی کے افسانے، مضمون، یا شاعری پر لکھنے والے کے خیال کے مطابق ''تنقید'' کا اطلاق کیا جاتا ہے، وہ تنقید کے اصولی اور اصلی دائرے سے خارج، خالص ''تبصرے'' ہوتے ہیں اور تبصرے بھی وہ جو یک طرفہ زاویۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ زیادہ تعداد ان تبصروں کی ہوتی ہے جو کسی کی شاعری پر لکھے ہوئے مضامین ہوتے ہیں۔ وہ شاعری جو غزل تک محدود ہوتی ہے، یہ صنف بھی ایسی جس میں کوئی تخلیقی خوبی، یا فہم و دانش کا کوئی قابل توجہ وصف نہیں ہوتا۔

اس دور کی بیشتر شاعری ہی زیادہ تر نا قابل توجہ، خامیوں اور کوتاہیوں سے مملو، گھسے پٹے مضامین سے بھری ہوئی شاعری ہے۔ جس میں کوئی خلاقانہ وصف نہیں، اس کی ایک نمایاں وجہ تو شعرا کا عام رجحان کہ کسی مسلمہ شاعر سے مشورہ غیر ضروری، ہر شاعر کو یہ زعم ہے کہ وہ علم و کمال کے ایسے بلند مقام پر فائز اور حصول الہام کے امتیاز سے مالا مال ہے کہ شاعری کے قواعد و ضوابط سے واقفیت ہی غیر ضروری ہے۔ کسی سے مشورہ غلط اس لیے کہ وہ خود اپنے کو اس قابل سمجھنے لگتا ہے کہ اس سے مشورہ لیا جائے۔

شعرا کی کثرت تعداد حیرت انگیز بیشک ہے لیکن یہ ایک مثبت علامت ہے۔ ان شعرا کی فنی حیثیت کیسی بھی ہو، کم از کم ان کے ذریعے سے اردو کی ترویج و تبلیغ میں مدد ضرور ملتی ہے۔

اکثر شعرا کی مالی حالت مجموعے کی اشاعت کے مصارف کی متحمل نہیں ہو سکتی،

اس کے باوجود شعرا کے مجموعات کلام بکثرت شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ناشران کتب تو مجموعے کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں، شعرا اپنے ہی وسائل سے یا بعض حالات میں ہندوستان کی اردو اکیڈمیز کے تعاون سے مجموعے شائع کرتا ہے اور مفت تقسیم کر کے طبیعت خوش کر لیتا ہے۔ پاکستان میں نہ تو اکیڈمیز کا وجود ہے، نہ کوئی ایسا سرکاری ادارہ ہے جو ادیبوں اور شعرا کی تخلیقات کی اشاعت میں اعانت کر سکے، پاکستان میں ایسا ایک ادارہ بنام ''مقتدرہ قومی زبان'' ہے ضرور جس کے سربراہان ہمیشہ ایسے متکبر اور نکمے لوگ ہوتے ہیں جنھیں وزیر کے ایما سے محض پرورش یا عنایت کے لیے مقرر کر دیا جاتا ہے۔ ان سے کسی مناسب کام کی توقع ہی بیکار ہے۔

ان مجموعوں میں بیشتر جس نوعیت کا کلام ہوتا ہے، اس پر تنقید قطعاً سعی رائگاں ہو سکتی ہے۔ تنقید ایک اہم جزو ادب ہے۔ اس کے وسیلے سے تخلیقات کے معیار کا تعین کیا جاتا ہے اور خالق کی خلاقانہ اہلیت اور اس کی تخلیق کی افادیت کا ایک علمی جائزہ لیا جاتا ہے۔

ایک عجیب بات تو یہ جو قلم کار تنقید نگاری فرمانا چاہتا ہے، اس کو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگلش، فرنچ اور جرمن ادیبوں کے نام یا ان کے لکھے ہوئے مضامین سے اقتباسات ضرور اپنے بیانیے میں شامل کرے۔ ان حوالوں کے بغیر شاید تنقید کے موضوع پر کوئی مضمون موقر نہیں سمجھا جا سکتا، شاید اس کا یہ سبب ہو اردو ادب میں خصوصاً ''تنقید'' کے فن پر لکھی ہوئی کتابیں بہت کم ہیں۔

''تنقید''، کسی معقول تخلیق کار کا تجزیہ کر کے، اس کی خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی کرنے کا نام ہے، ساتھ ہی ان خامیوں یا خوبیوں کے بارے میں سیر حاصل بحث، اس کے اکثر زاویے، تحقیق کے زمرے میں آجاتے ہیں گویا ''تنقید'' اور ''تحقیق'' کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر واقعیت کی نظر سے دیکھا جائے تو ''تنقید'' دراصل ''تحقیق'' کی ہی ایک شکل ہے۔ اس کو ''رائے زنی'' سے بھی واضح کیا جا سکتا ہے۔ ایسی رائے زنی جو گہری تحقیق اور تجزیے کے نتیجے میں کی جاتی ہے۔ کامیاب تنقید کے لیے، تحقیق کا دشوار کام کیا جاتا ہے بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر، ادراک کی سرحد میں داخل ہوا جاتا ہے۔ تنقیدی بحث میں تحقیقی طریقۂ کار کی عدم موجودگی اس کی رفعت علمی سے گرا دیتی ہے۔

تنقید ایسا کام ہے جس کا کامیابی کے ساتھ انجام دینے کے لئے وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ غیر جانبدارانہ توازن اور نتائج کے اتخاذ میں ادیبانہ اعتدال قائم رکھنا لازمی ہوتا

ہے۔ اسی سے تجزیے کی حدود ملتی ہیں۔ اس سے یہ مراد ہے کہ تنقید کے دوران فنی تخلیق کے ظاہری حسن اور معنوی جمال کا تجزیہ تو کیا ہی جائے ساتھ ہی فنکار کے خیالات، رجحان طبع، افتادطبع اوران کے سارے محاسن و معائب کو نمایاں کردیا جائے۔ اس سے یہ مقصود نہیں کہ ناقد ایک جدید فن پارہ تخلیق کردے، بلکہ معمول زیرنظر کے مطالعے کے دوران ناقد ان اسباب و علل تک ضرور پہنچ جائے جواس فن پارے کی تخلیق کا باعث ہوئے تھے اور خالق کے رجحانات اور حدود خلاقیت کا اندازہ بھی کرسکے۔

نبض مضمون پر انگلیاں رکھ کراس کی صحت یا علالت کی تشخیص کرنے کا کام تنقید ہے۔ انگلیاں جو محسوس کرتی ہیں ان کو قلمبند کیا جاتا ہے۔ اس تفصیل کے ساتھ کہ نفس مضمون کا کوئی گوشہ نظرانداز نہ ہو۔ ظاہر ہے جب نباض تشخیص کا عمل انجام دیتا ہے تو اس کے ذہن میں جانبداری، تعصب، یا طرفداری کا کوئی عنصر نہیں ہوتا وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے، اس کو من وعن ویسا ہی بیان کردیتا ہے۔ اگر بیان کرنے کی ضرورت ہواوراس کے وجود کی وجوہات بھی واضح کردیتا ہے۔ ادیب یا شاعر کی شخصیت کو کاملاً سمجھنا اور اس کی جزئیات سے واقفیت پیدا کرنا ناقد کے کام کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ دراصل ناقد کے لیے لازم ہوجاتا ہے کہ ادیب یا شاعر کے فن کواس کی شخصیت کے حوالے سے سمجھنے اور اس کے مضمرات کو واضح کرنے کی کوشش کرے۔ فن اور شخصیت کوایک دوسرے سے جدا کرنا ایسا ہے کسی حقیقت کومسخ کیا جارہا ہو۔ فن پارے میں حسن، تازگی اور وازقعیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب فنکار اپنی شخصیت کو پوری طرح اپنی تخلیق میں جذب کردیتا ہے۔ ناقد کا یہ کام ہے کہ وہ ان حدود کا تعین، شخصیت کے تاثر کے ساتھ کرے اوران عناصر کی نشان دہی کرے جن کے تحت فنکار نے اپنے احساسات اور جذبات کی تصویرکشی کی۔ شخصیت کا خلوص دل اس میں شامل نظر آئے اور ناقد اس کو جان لے۔ کسی فن پارے کی انفرادیت کا تعین فنکار کی شخصیت کی ہمہ جہتی پارے کے تعین سے ہم آہنگ ہوتو فن کی معیاری حیثیت کا تعین ناقد کے لیے ممکن ہوجاتا ہے۔ کسی کا یہ کہنا بھی کچھ غلط نہیں:

''تنقید غلط راہ پر گامزن ہوسکتی ہے، ناانصافی کرسکتی ہے فن کاروں اور فن پاروں کے ساتھ معاندانہ سلوک بھی ہوسکتا ہے، ادبی ذوق کو غلط تعبیر کثرت تعبیر، غلط تشریح کے ذریعے برباد بھی کیا جاسکتا ہے اور بے جا وکالت اور طرفداری کرکے کھرے کو کھوٹا اور کھوٹے کو کھرا ثابت کیا جاسکتا ہے۔ یہ ناقد کا کام نہیں، وہ کسی فن پارے کی خرابی کا متمنی نہیں ہوسکتا۔''

تنقید کو بیشک فن کہا جاتا رہا ہے، ممکن ہے یہ کہنا درست بھی ہو لیکن اس کے ایسے کوئی ناقابل شکست، تغیر ناپذیر اور مصدقہ ومقررہ قوانین یا اصول نہیں جن کے بارے میں کہا جاسکے، انھیں پر عمل کرنے اور ان ہی کے مطابق اپنی رائے قلمبند کرنے سے تنقید کا عمل انجام پائے گا اور ان کی عدم موجودگی میں کوئی نتیجہ تنقید کے دائرے میں نہیں آئے گا۔

ناقد جس مضمون یا کلام کے بارے میں تنقید لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہے، اس کا وہ بخوبی مطالعہ کر چکا ہوتا ہے۔ اس پر غور وفکر کر چکا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ناقد کے ذہن میں اس مضمون کی ادبی حیثیت کا ایک حد تک تعین ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ اس مضمون یا کلام کے بارے میں بعض نظریات قائم کرلیتا ہے چنانچہ جب وہ نفس مضمون کے مضمرات سے بحث کا آغاز کرتا ہے تو وہ ضوابط خود ہی وجود میں آتے چلے جاتے ہیں جن پر کاربند ہونے سے ناقد کی تحریر میں حقیقت پیدا ہو جاتی ہے۔

ناقد کو تنقید کے اصولوں کی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی البتہ یہ ضرور ہے اگر وہ واقعی ناقد ہے تو اس نے متعدد ناقدوں کے رشحات قلم ونتائج فکر کا وسیع مطالعہ کیا ہوتا ہے اور اس کے ذہن میں تنقید کے طریقۂ کار کا ایک نقشہ مرتب ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ جب قلم اٹھاتا ہے تو جانتا ہے اس کو مضمون یا کلام کے اوصاف یا خامیوں کی نشان دہی کرنا ہے۔ یہ نشان دہی کسی اصول اور ضابطے کے بغیر تو نہیں ہوسکتی، اس لیے وہ خود ہی ایک منضبط، مرتب، منطقی انداز تنقید اختیار کرتا ہے اور حاصل شدہ نتائج کو ترتیب وار اس طرح لکھ دیتا ہے کہ اس کی تحریر اظہاریے کی واضح تصویر بن جائے۔

نفس مضمون کی ادبی حیثیت کے تعین کے ساتھ ساتھ ہی انداز بیان، لفظیات، تسلسل بیان، ترتیب توضیحات اور منصفانہ تحلیل کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے نقاد اپنے وضع کردہ اصولوں پر کاربند ہو کر حقیقتوں کا انکشاف کرنے لگتا ہے۔

یوں بھی کہا جاسکتا ہے، ناقد کو ایک بتکدہ تعمیر کرنا ہوتا ہے جس میں وہ اپنے تراشیدہ بتوں کو رکھ کر ان کے خدوخال کا تجزیہ کرنا شروع کرتا ہے۔ وہ ان بتوں کا پجاری نہیں بنتا، بلکہ رسم آذری کا اجرا کرتا ہے اور یکے بعد دیگرے ہر بت کو گراتا جاتا ہے۔ یہی اس کی تنقید کا مثبت دور ہوتا ہے اور ایک ایسا مضمون وجود میں آجاتا ہے جو اس کی زیر نظر تخلیق کے ہر زاویے کو روشن کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ اس میں موجود ہر موتی کی درخشندگی کی تعریف کرتا ہے، ہر ہیرے کی شناخت کرتا ہے بعض کی نادر الوجودی کی نشان دہی کرتا ہے۔ بعض کو پتھر ثابت

کرنے کے لیے قوی اور قابل قبول دلائل پیش کرتا ہے جس موتی کی آب و تاب میں کمی نظر آئے وہ اس کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کوتاہی کی وجوہات سے بھی بحث کرتا ہے۔ ناقد کی جمالیاتی حس، اس کو مضمون یا کلام کے اوصاف کو سمجھنے میں معاونت کرتی ہے، جمالیاتی حس کسی کمزور اور ابر آلود خوبی کو قبول نہیں کرتی جبکہ معمولی سی خوبی جمالیاتی حس کو متحرک کر دیتی ہے اور ذہن سے ایک کیفیت قبول بیساختہ پیدا ہو کر اعتراف کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو اس سے توصیفی کلمات رقم کراتی ہے۔

ناقد کا یہ کام نہیں کہ وہ صرف ظاہری اوصاف پر ہی توجہ مرکوز رکھے۔ ظاہر تو ایک متغیر حالت کا نام ہے تاہم یہ ممکن نہیں کہ ظاہر کو نظر انداز کر دیا جائے۔ منظر کو دیکھ کر ہی پس منظر کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ پس منظر بذات خود کوئی حقیقت نہیں رکھتا، تاوقتیکہ اس کو منظر سے مرتبط نہ کیا جائے۔ پس منظر سے کوئی منظر کی طرف نہیں آتا۔ منظر سے پس منظر کی طرف سفر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا مضمون کے معیار یا اس کے مشمولات کی افادیت اور اظہاریت کے لیے نفس مضمون کو سمجھنا اور تجزیہ کرنا لازمی ہے۔ اس ضمن میں تحقیق کا کام بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے تحقیق کی کمی کی وجہ سے تنقید بے اثر یا کم از کم نامکمل ضرور ہو جاتی ہے۔

کلیم الدین احمد نے اپنی تالیف ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں لکھا ہے:

> ''تحقیق کو تنقید سے الگ کر دیا جائے تو اس کی حالت اس گم کردہ راہ کی ہوگی جو کسی صحرا میں بھٹکتا پھرے اور جس کو اس کی خبر نہ ہو کہ وہ بھٹک رہا ہے۔''

اس موضوع کی حقیقت یوں ہے، زیر نظر تخلیق کی صداقت اور اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے اس کی صداقت و وجدانی مضمرات کا ادراک کرنا ہوتا ہے۔ ان مضمرات کا ادراک اسی وقت ہو سکتا ہے جب لسانی اور تاریخی نقطۂ نظر سے مورد نظر تخلیق کا تجزیہ کیا جائے۔

یہ بھی خیال رکھنا ضروری ہے فنکار اپنی کسی تخلیق کی تکمیل میں کبھی کبھی اپنے شعور کو ایسے موڑ دیتا ہے جو اس نے پہلے سے طے نہیں کیے ہوتے، جیسے کسی واقعے کو قلمبند کرنے کے دوران ذہن کی کسی رو نے ایک جدّتِ فکر کو وجود بخشا جس کے تحت فنکار خیال کی رو میں بہہ گیا اور ایک بیانیہ وجود میں آ گیا، جس کا فنکار کو خود بھی علم نہیں تھا۔ ممکن ہے بعد میں بھی اس

کو یہ احساس ہوا ہو، یہ کام ناقد کا ہے کہ وہ ایسی لاشعوری کیفیت کے تحت وجود میں آنے والی تحریر کو دریافت کرلے اور اس کا تجزیہ کرلے۔

کسی تخلیق کی اہمیت کا اندازہ اس کی تاریخ خلق یا اس کے دور کی ثقافتی حالت سے بھی کیا جاتا ہے یا کم از کم اس کو سمجھنے کے لیے اس دور کی ثقافتی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی حالت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ممکن ہے فنکار نے ارادی طور پر ان حالات کو پیش نظر نہ رکھا ہو، لیکن ہر فنکار لاشعوری طور پر اپنے وقت کی مختلف امواج زندگی کے اثرات قبول کرنے پر مجبور ہے۔ اس کی طبیعت اس کو ان امواج زندگی کی طرف مائل رہنے پر مجبور کرتی ہے خواہ وہ اس کو اپنے فن کا حصہ بنائے یا نہ بنائے۔ وہ اثرات اس کی تخلیق میں لاشعوری طور پر شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ صرف ناقد ہی کا منصب ہے جو ان اثرات کو دریافت کرلیتا ہے اور ان کے بارے میں سیر حاصل بحث کرتا ہے۔

یہی سبب تھا کلیم الدین نے اپنی تالیف میں کہا:

''تنقید، تحقیق سے قدر و قیمت میں زیادہ ہے۔''

ناقد بھی مفکر سے کم نہیں۔ اسی طرح تنقید بھی تحقیق سے کمتر نہیں۔ دونوں امور کی انجام دہی میں ذہن کی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لانا ہوتا ہے۔ اس کو اپنا وجود ان حالات کے سپرد کرنا ہوتا ہے جن میں رہ کر فنکار نے اپنا ادب پارہ تخلیق کیا۔

ناقد، فنکار کی خیالی دنیا کا ایک باشندہ بن کر ان حالات کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے جن کے تحت فنکار نے اپنی تخلیق کو وجود بخشا۔ اس کیفیت کے تحت وہ جو کچھ نتائج اخذ کر کے قلمبند کرتا ہے اس کا نام ''تنقید'' ہے۔

محمود ملک
۲۸/۲ بارہ محل، شاہجہاں آباد، بھوپال

وحشی سعید کا افسانہ ''میرا قاتل میرا مسیحا'' ایک جائزہ

میرے خیال میں افسانوی ادب کے لیے آجکل بے حد خوش گوار موسم اس لیے ہے کہ موجودہ وقت میں تخلیق کاروں پر کوئی تحریک ''کوئی رجحان''، ''کوئی فرمان'' مسلط نہیں ہے۔ یعنی افسانہ نگار پوری طرح سے آزاد ہے کہ اس کا تخیل جس طرح چاہے اپنے مزاج کے عین مطابق بنا کسی دباؤ کے افسانے کو صفحۂ قرطاس پر اتارے۔ یہ دور ان افسانہ نگاروں کے لیے بے حد سود مند دور ہے جو کسی خاص گروپ سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان کی اپنی فکر اپنا خیال ہی ان کے اظہار کا وسیلہ ہے اور وہ فن پارے کو بنا کسی نظریہ کی پابندی، بنا کسی ہدایت کے تخلیق کررہے ہیں۔ حالانکہ مابعد جدیدیت کے اعلانِ خاص کے بعد ہم اسے سہل پسندی کا دور بھی کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ بیانیہ کی صدائے عام کے بعد افسانہ نگاروں نے چین اور راحت کی سانس لی ہے۔ اس طرح آجکل بیشتر افسانہ نگار آسان ترین زبان و بیان کو اپنا کر قاری کا تخلیق سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے میں کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں مگر چند ہی نام ایسے ہیں جو متوازن رویہ اپنا رہے ہیں۔ یعنی ان کے افسانوں میں بیانیہ کے ساتھ ساتھ تمثیل اور علامت نگاری کے جوہر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ انگلیوں پر گنے جانے والے ایسے ناموں میں ایک اہم نام وحشی سعید کا بھی ہے۔ جیسا کہ افسانے سے دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات واقف ہیں کہ وحشی سعید کی افسانہ نگاری کی یہ دوسری پاری ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ماہنامہ شاعر جیسے موقر جریدے سے اپنی شروعات کرنے والے اس افسانہ نگار نے سن ۱۹۸۰ء کے آس پاس اچانک سنیاس لے لیا اور وہ منتھن کے لیے برفیلی گپھاؤں میں چلے گئے۔ برسوں کی تپسیا کے بعد چند برس پہلے جب وہ باہر آئے تو ان کے ہاتھ میں امرت کا پیالہ تھے اور بدن میں گیان کی گنگا ہلورے لے رہی تھی، ذہن تروتازہ تھا۔ ان کا چولہ بدلا ہوا تھا۔ لہٰذا اب وہ ایک نئے فکشن نگار کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور اس طرح ہماری ملاقات ایک نئے وحشی سعید سے ہوتی ہے جن کے افسانوں میں روایت کی بجائے

علامت کی جلوہ سامانیاں دکھائی دیتی ہیں، وہ بھی ایک نئے انداز نئے اسلوب کے ساتھ۔ادھر چند برس پہلے وہ اپنے افسانوں کا تازہ مجموعہ ''کنوارے الفاظ کا جزیرہ'' لیکرنئی سج دھج کے ساتھ ہمارے آپ کے بُک شیلف میں تشریف لائے ہیں جس کا پورے جوش وخروش کے ساتھ خیر مقدم کیا جارہا ہے۔ فکشن کے ذہین اور سنجیدہ قاری جو افسانے کی انتہائی سہل پسند اور یکسانیت سے اوب چلے تھے ان کے لیے وحشی سعید کے علامتی افسانے بہار کی ٹھنڈی اور خوشبودار ہوا کے جھونکے کے مترادف ہے۔ جی ہاں ...... وہی ''علامت'' ہے جسے طرح طرح کی ملامت سہنا پڑی۔ جدید افسانہ نگاروں کی انتہا پسندی کے سبب کئی الزامات برداشت کرنا پڑے۔ مگر وحشی سعید کا کارنامہ یہ ہے کہ ان کے علامتی افسانے قاری کو نہ صرف غور وفکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں بلکہ سمجھ میں بھی آجاتے ہیں اور قاری کامیابی کی مسرّت سے سرشار ہوتا ہے۔ اس ضمن میں وحشی سعید کے کئی افسانوں کی مثال دی جاسکتی ہے مگر میں اس وقت ان کا بہترین افسانہ ''میرا قاتل میرا مسیحا'' کی مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ ایک ایسا مختصر افسانہ ہے کہ جو اپنا علامتی پیرایہ رکھنے کے باوجود افسانے کے فن کی تمام خوبیوں کو اپنے اندر نہایت پاکیزگی کے ساتھ سمیٹے ہوئے ہے۔ اس افسانے میں قاری کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوتی ہے جسے ہم راوی کا ہمزاد بھی کہہ سکتے ہیں جو اچانک آدم قد آئینے سے باہر نکل کر راوی سے ہم کلام ہوتا ہے اور اس سے چند سوالات کے ذریعہ اپنے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے کہ ''ذرا پہچانو آخر میں کون ہوں''۔ راوی یاد داشت کی تمام پرتیں کھولتا ہے۔ ماضی کے تمام اوراق الٹتا ہے کئی واقعات یاد کرتا ہے، الماری میں رکھی تمام کتابوں کے اوراق پلٹتا ہے۔ بلندی پر فائز فانوس کی روشنیوں کو تلاش کرتا ہے مگر دھند ہے کہ چھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ وہ نیچے زمین پر بچھے قالین کے تانے بانے میں کھوجتا ہے اونچائی پر لگے گھڑیال کی ہر لمحے میں ماضی میں تبدیل کرتی ہوئی صدا میں ڈھونڈھنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ کمرے میں موجود آدم قد شیشے میں دکھائی دینے والے اپنے وجود کے عکس میں جس میں وہ خود کو رات دن نہارتا رہتا ہے کھوجتا ہے مگر...... اس کی تمام کوششیں ناکام رہتی ہیں۔ یاد کے کسی دریچے سے کوئی سراغ نہیں ملتا۔ کتاب کی تحریروں، تمام فلسفوں، تمام زبانوں، ذہن کے تمام گوشوں سے اسے ناکامی ہاتھ لگتی ہے۔ اپنی اس لاچاری اور ناکامی کے سبب وہ چیخ اٹھتا ہے مگر وہ شخص اس معمّہ کو سلجھائے بغیر اسے حیرتوں اور استعجاب کی دنیا میں تنہا چھوڑ کر بالآخر اسی آئینے میں جذب ہوجاتا ہے کہ جہاں سے نمودار ہوا تھا۔ یہ ہے اس مختصر افسانے کی اجمالی کہانی۔ مگر اس مختصر اور قطعی علامتی افسانے کو جو عنصر بڑا افسانہ بناتا ہے وہ ہے پیشکش...... وحشی سعید کی زبان وبیان کی پرقدرت نے اس افسانے کو ایک اہم افسانہ بنا دیا ہے اور اس افسانے کی اہم بات یہ ہے کہ علامتی

ہونے کے باوجود اس میں افسانے کی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو افسانے کی بنیادی شرط تصوّر کی جاتی ہیں مثلاً پلاٹ، کہانی پن، کردار، مکالمے اور منظر نگاری۔ بے حد تعجب ہوتا ہے کہ اختصار کے باوجود وحشی سعید ان تمام لوازمات کو اپنی تمام تر رعنائی اور خوبصورتی کے ساتھ برتنے میں پوری طرح سے کامیاب ہیں اور اس سے بھی بڑی بات کہ علامتی انداز کے ساتھ ساتھ اس افسانے میں روایت کی پاسداری بھی اپنی آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ یہ وحشی سعید کی افسانہ نگاری نہیں جادوگری ہے۔ میں ان باتوں کی دلیل کچھ اس طرح پیش کرتا ہوں۔ سب سے پہلے منظر نگاری کی بات کرتے ہیں۔ افسانے کا پہلا پیراگراف ملاحظہ فرمایئے۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔ کمرے کے دائیں کونے میں ایک شیشہ کی الماری میں کچھ عربی کچھ فارسی اور کچھ اردو کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کی چھت کے بیچوں بیچ ایک پرانے زمانے کا فانوس لٹک رہا تھا۔ فرش پر ایرانی قالین تھا، دائیں دیوار کے ساتھ قدیم زمانے کا ایک صوفہ سلیقہ سے سجا تھا۔ چاندی جڑی ہوئی میز پر چاندی کی تھال میں مختلف اقسام کے پھل رکھے ہوئے تھے۔ بائیں دیوار پر قدیم زمانے کا عالیشان گھڑیال لٹک رہا تھا۔ جو ہر گھنٹے بعد بجتا اور وقت کا احساس کراتا۔ صوفے کے سامنے والی دیوار پر خوبصورت فریم میں قد نما آئینہ لگا تھا۔

یہ میرا ڈرائنگ روم تھا۔

اس پیراگراف میں ڈرائنگ روم میں قیمتی اشیا کی موجودگی اور ان کے اپنے مقام پر رکھے جانے کے سلیقے وغیرہ سے قدیم زمانے کی آسودہ حال اور شان وشوکت والی زندگی کی شاہانہ روایت اور تہذیب کی خوشبو سے قاری کے دل و دماغ معتر ہو جاتے ہیں اور قاری اپنے وجود کو اس دور میں موجود پاتا ہے۔ جہاں سرمایہ دار عیش وعشرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ انسانی قدروں پر زوال نہیں آیا تھا۔ میرے خیال میں یہی کامیاب منظر نگاری کی پہچان بھی ہے کہ قاری اُس منظر میں خود کو بھی شامل محسوس کرے۔

اس افسانے میں محض دو کردار ہیں مگر ان کی مکالمے بازی ہمیں تیسرے کردار کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہونے دیتی۔ مکالموں کا انداز قطعی ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک علامتی افسانے کا ہونا چاہیے اور زبان کا بھی یہی معاملہ ہے۔ چند مکالمے دیکھئے۔

''مجھے پہچانتے ہو''

''نہیں''

''تعجب ہے تم مجھے نہیں پہچانتے''

''اچھا سنجیدہ مزاق ہے''

یہ کتابیں جو تم نے نہایت سلیقے سے الماری میں سجا کر رکھی ہیں ان ساری کتابوں میں میرا ذکر ہے۔''

تھوڑا آگے چل کر مکالموں کی گفتگو کچھ اس طرز کی ہے۔

''اب تو بتاؤ تم کون ہو''

''کیا میں کتابوں میں نہیں ملا۔''

''چلو! اب فانوس میں مجھے ڈھونڈو''

''تمہاری باتیں بھی عجیب معمہ ہیں کیا مجھے پریشان کرنے میں تمہیں لطف آرہا ہے۔''

''تم میری مٹھی میں ہو''

''ہوسکتا ہے تم صحیح کہہ رہے ہو''

علامت نگاری سے بھرپور گفتگو افسانہ نگار سے یہی لہجہ تو مانگتی ہے اور آخر میں راوی کو بے بس دیکھ وہ انجان شخص آئینے میں جذب ہو جاتا ہے۔

اس افسانے کی ایک بڑی خوبی اختصار بھی ہے جو وحشی سعید کا طرّہ امتیاز ہے آپ پورے افسانے میں ایک جملہ بھی ایسا تلاش نہیں کرسکتے جو غیرضروری ہو۔

جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں اس افسانے کے پس منظر میں ''وقت'' کارفرما ہے۔ جی ہاں......وقت...... یہ وہی وقت ہے جو انسان کو اونچ نیچ کا فرق سمجھاتا ہے جو قالین کی بنت کے نیچے زمینی حقیقت سے بھی روشناس کراتا ہے اور جگمگاتے فانوں کی بلندی اور روشنی سے بھی انسان کو اپنے ہمکنار کراتا اور ہر لمحہ گزرتے وقت کا رشتہ ماضی سے استوار کرتا ہے اور حال بن کر انسان کو اپنا مستقبل سجانے اور سنوارنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ وقت ہی ہے جس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا ذکر ہر زمانے میں ہر دور میں ہر تہذیب میں ہر فلسفے اور ہر زبان میں اوّلیت کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے اور کیا جاتا رہے گا۔ کیونکہ جو وقت کی قدر نہیں کرتا وقت اس کی قدر نہیں کرتا۔ یہی وقت ہے جو بلندی پر بھی بٹھاتا ہے یا پھر پستیوں کو مقدر بنا دیتا ہے۔ یہی وقت ''ہمارا مسیحا بھی ہے اور قاتل بھی''۔

بہرحال میں وحشی سعید کو اس مختصر مگر بہترین افسانے کے لیے مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے یہ افسانہ ان کے شاہکار افسانوں کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ اسی کے ساتھ ہی مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں کہ وحشی سعید کاشمیر کے ہی نہیں ہمارے ملک کے جدید اہم ترین افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر ظفر سرونجی

غالبؔ کا مسیحا۔ عاشقِ اردو گوپی چند نارنگ

ڈاکٹر سیفی سرونجی نے جب مجھ سے کہا کہ آپ پروفیسر گوپی چند نارنگ پر لکھو تو میں ایک دم خوش ہو گیا۔ ظاہر ہے اتنی بڑی شخصیت پر لکھنا خوشی کی بات ہے مگر جب مجھے اپنی علمی مفلسی کا خیال آیا تو اس تکلیف کا اندازہ مجھ سے زیادہ کون لگا سکتا ہے۔ یہاں حق بنتا ہے ساحرؔ کے ایک مصرعہ کا ''تجھ سے ملنا خوشی کی بات سہی'' اب دنیا کے تمام چھوٹے بڑے جانکاروں نے جس کی ذات وصفات کی شان میں اردو زبان کا ایک بھی لفظ ایسا نہیں چھوڑا جس کا استعمال نہ کیا ہو۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں میں ٹھہرا زبان و بیان سے غریب آدمی اور اب اردو زبان میں بھی ہو چکا جتنے لفظوں کا نزول ہونا تھا۔ بقول انجم جبلپوری کے ''تیرے جوڑے کے لیے پھول کہاں سے لاؤں۔''

بہر حال گوپی چند نارنگ......! ایسی بھرپور ادبی شخصیت جس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ خود زبان بن جاتا ہے۔ جب وہ بولتا ہے تو دنیا کے بڑے بڑے نقاد و ادیب صرف سنتے ہیں اور جب وہ چپ ہوتا ہے تو خاموشی پراسرار ہو جاتی ہے۔ ذہانتیں ہر وقت جنت کی حوروں کی طرح اس کی خدمت میں رہتی ہیں۔ اس کے سامنے ہنر، فن، فنکار قلم اور قلمکار جیسے لفظ بہت چھوٹے اور حقیر لگتے ہیں۔ اگر میں یہ لکھوں کہ ایسی شخصیتوں کو بنانا کسی بھی صدی کے بس سے باہر ہے تو غلط نہ ہوگا۔ بلکہ ایسے لوگ تو صدی کو اپنی جیب میں لے کر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ذات پات اور مذہبی رسہ کشی سے بہت اوپر اُٹھ کر عالم ادب کی آبیاری کرنا ہی جن کی زندگی ہوتی ہے۔ ایسے ہی صاحبِ زمانہ لوگوں میں سے ایک بڑا نام گوپی چند نارنگ کا بھی ہے۔ پتہ نہیں کیا خاص بات ہے اس نام میں۔ کسی کو اگر اپنے مقالے میں وزن پیدا

کرنا ہو نارنگ صاحب کا نام لکھتا رہے۔ کوئی شاعر اگر اپنی کتاب ادبی دنیا میں چمکانا چاہتا ہے تو گوپی چند نارنگ کی رائے ضروری ہے۔ زیادہ تر ادبی سیمیناروں میں بڑے بڑے ادیب اپنی تحریروں کو اثر دار بنانے کے لے نارنگ صاحب کے کہے ہوئے جملوں کو کوڈ کر کے اپنی ذہانت کی دھاک جماتے نظر آتے ہیں اور یہ بھی سچ ہے میدان ادب میں جتنے قسم کے اُلو ہوتے ہیں، وہ سب گوپی چند نارنگ کے نام سے ہی سیدھے کیے جاتے ہیں۔

یہاں میرا مقصد صرف نارنگ کی اہمیت ظاہر کرنا ہے ...... کچھ اور نہیں......!

وقفے۔ وقفے سے جب یہ نام میرے پڑھنے سے زیادہ بار بار سننے میں آیا اور آتا رہا تو مجھے لگا کہ مجھے گوپی چند نارنگ صاحب کو پڑھنا چاہیے اور جب میں نے گوپی چند نارنگ کو پڑھا تو اس سچائی کا انکشاف بھی ہوا کہ بڑی شخصیت کو پڑھنے کے لیے بھی بڑے علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ میرے جیسے کم علم کو نارنگ صاحب پر پڑھنا ریچھ کے پیر پکڑنے جیسا تھا۔ میں نے نارنگ صاحب کو پورا نہیں پڑھا، جیسے ہی ان کی شخصیت کی تھوڑی بہت عظمت مجھ پر کھلی میں نے جلدی سے تاش کے ''تینوں اکّے'' نہیں کے سپرد کرنے میں اپنی عافیت سمجھی اور میں خود کو بچانے میں کامیاب ہوگیا۔ بندوقوں سے تو گولیاں چلتی ہیں، آج کے گیت کاروں نے آنکھوں سے بھی گولیاں چلوادیں۔ مگر شانِ نارنگ دیکھیے وہ قلم اور زبان دونوں سے گولیاں چلاتے ہیں۔ فی الحال ان کے دماغ تک میری رسائی کہاں......! کوشش کرتا ہوں میں بھی کچھ اِدھر اُدھر سے نثری اقتباس نارنگ صاحب کے پیش کروں:

> ''میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ میرا سفرِ اردو سفرِ عشق ہے۔ عشق اثبات خودی کی نہیں تسلیم خودی کی راہ ہے جس میں 'لین' کچھ نہیں 'دین' ہی دین ہے اور میں نے تو دیا کچھ بھی نہیں میری بساط ہی کیا اور لے لیا کتنا کچھ۔ یہ کسرِ نفسی نہیں کہ میری پہچان جو بھی اور جیسی بھی ہے اردو کی بدولت ہے۔ یہ اردو کی فیاضی نہیں تو کیا ہے کہ میں تو کچھ بھی نہ دے سکا اور اس نے مجھے اتنا کچھ دیا کہ کسی کو بھی کسی نے کیا دیا ہوگا۔''

لہجے کی آگ سے مردہ لفظوں کو زندہ کرنے کا فن نارنگ صاحب سے اچھا کسے آتا ہوگا۔ بار بار کئی ادیبوں نے نارنگ صاحب کو عاشقِ اردو لکھا اور خود بھی نارنگ صاحب نے اس کا لکھ کر اقرار کیا ہے مگر سچ بات یہ ہے کہ اردو ہی گوپی چند نارنگ پر فدا ہے۔ عصر

حاضر میں اگر اردو کو گوپی چند نارنگ کا ساتھ نہ ملتا تو کم سے کم اس دور میں اردو بیوہ کی طرح بے یار و مددگار ضرور ہو جاتی۔

گوپی چند نارنگ نے کتنی کتابیں لکھیں، دنیا کے کون کون سے حصے میں تبلیغِ ادب کی اور ان کے بے شمار تنقیدی مضامینوں کا حساب بے حساب قلم کار کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ یہاں میں ایسی کوئی فضا قائم نہیں کرنا چاہتا، ویسے بھی کسی چیز کی بار بار گردان کا میں کبھی قائل نہیں رہا مگر نارنگ صاحب کا میں کیا چیز، سارا زمانہ قائل ہے۔ فنکار کی عمر چاہے جتنی ہو مگر اس کا فن کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ اس کے ذہن کی وادیاں ہمیشہ ہری بھری رہتی ہیں۔ تخلیقی صلاحیتوں کا نئے نئے ڈھنگ سے نزول جاری ساری رہتا ہے۔ لوگ یوں بھی لکھتے ہیں:

> ''میں نہیں کہتا کہ گوپی چند نارنگ کوئی فوق البشر ہیں، ان کی ذات ہر عیب سے پاک اور صاف ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں بہت سی خوبیاں ہیں تو کچھ خامیاں بھی ہوں گی۔ سب سے بڑا ان میں عیب یہ ہے کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ اردو میں ان سے زیادہ حرکتی مجھے کوئی نظر نہیں آتا۔ جب میں نارنگ صاحب کے پورے کام کا حساب لگاتا ہوں تو مجھ پر تھرتھری طاری ہو جاتی ہے۔'' (مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ سے) نصرت ظہیر
>
> ''پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تقریر ہو یا تحریر وہ ہر بات دلائل اور مکمل حوالوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس پر ان کا خوبصورت انداز کہ بات سیدھی دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ ان کی تقریر کے ایک ایک لفظ میں جادو کا اثر ہوتا ہے اور سامعین اس کے اثر میں گرفتار ہوتے چلے جاتے ہیں اور جب وہ محفل سے اٹھتے ہیں تو گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ معلومات کا خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔ جتنی پیاری اور دلفریب ان کی شخصیت ہے ایسی ہی پُرکشش ان کی تقریر کی لذت ہے جو دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی چلی جاتی ہے!''
> (ڈاکٹر سیفی سرونجی)

زمانے میں ادب کے بھی اپنے اپنے الگ راگ ہوا کرتے ہیں۔ اب وہ راگ

ایک یا ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم غالب کے زمانے سے ہی چلیں تو الطاف حسین حالی نے اپنا خونِ جگر ملا کر جب نغمۂ غالب چھیڑا اور وقفے وقفے سے مسلسل اس کی چھیڑ خانی کرتے ہی رہے۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ ساری دنیا نہ صرف غالبؔ کی طرف دیکھنے لگی بلکہ غالبؔ کی دیوانی بھی ہو گئی۔ حالیؔ نے اپنا حق شاگردی کیا ادا کیا دونوں استاد شاگرد ادبی دنیا میں مشہور اور امر ہو گئے۔ فراقؔ کے مقدر میں کوئی حالیؔ تھا ہی نہیں مگر فراقؔ کی ذات میں کئی حالی موجود تھے تو فراقؔ اپنے گانے خود ہی گاتے رہے! اور دنیا نے انہیں بھی سر آنکھوں پر بٹھایا کیوں کہ اردو کسی ایک قوم کسی ایک فرقے یا کسی ایک ملک کی زبان نہیں وہ ساری دنیا کے محنت کرنے والے زندہ دل ادیبوں اور فنکاروں کی زبان ہے۔ مگر جب گوپی چند نارنگ نے اردو راگ گایا اور اردو سے کھل کر اعلان عشق کیا تو وہ اردو کے ادیب جو اردو کو رضیہ سلطان سمجھتے تھے یا اپنی ملکیت سمجھتے تھے نارنگ صاحب کی مخالفت میں اتر آئے اور کئی چھوٹی بڑی ادبی زبانوں نے مل کر نارنگ کے خلاف نارنگ راگ الاپنا شروع کر دیا۔ کسی نے فرقہ پرست کہا تو کسی نے اردو دشمن۔ یہی وہ وقت تھا جب نارنگ صاحب نے اپنی عالمانہ اور جادو بیان تقریروں سے بڑے بڑے سمیناروں اور ادبی پروگراموں میں تہلکہ مچا کر رکھ دیا۔ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا میں جہاں جہاں اردو بولی جاتی نارنگ کا رنگ گہرے سے گہرا ہوتا گیا۔ کہتے ہیں سچے عاشق کی عشق میں کبھی ہار نہیں ہوتی مگر عاشق کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے! نارنگ صاحب نے بھی اردو سے سچا عشق کیا اور آج دنیا بھر میں مزے کر رہے ہیں!

> ایک جگہ تنقید کے بارے میں فرماتے ہیں'' : تنقید لکھنے والا خلاء میں تو نہیں لکھتا۔ میں چاہتا ہوں آپ اس پر غور کریں کہ جس طرح فنکار ادیب یا شاعر کا ذہن بنتا ہے وہ تو آپ کو خوب معلوم ہے لیکن نقاد کا ذہن کس طرح بنتا ہے وہ اپنی تربیت کس طرح سے کرتا ہے اس کو بھی اگر نظر میں رکھیں تو آپ کو یہ بات صاف صاف نظر آئے گی کہ تنقید بھی سو فیصد غیر جانبدار نہیں ہو سکتی۔ معصوم یا بے لوث ہو ہی نہیں سکتی ہاں آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ فن پارے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ انصاف کرے۔ یعنی متن کو پڑھے، متن کا تجزیہ کرے اور تجزیے کا مطالعہ کا عملی تنقید کا حق ادا کرے۔ روایت کی روشنی میں تاریخ عصری شعریات کی روشنی

میں لیکن نقاد کی اپنی اقداری نظریاتی پسند و ناپسند تو ہوگی؟ تنقید لکھنے والے کا رویہ تو اس کا اپنا رویہ ہوگا۔ وہ آپ کے ذہنی رویہ سے تو نہیں لکھے گا جیسے آپ اس کے ذہن کے غلام نہیں ہیں نقاد بھی آپ کا ذہنی غلام نہیں ہے، یہ ایک مکمل حقیقت ہے!'' (گوپی چند نارنگ مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ سے)

نارنگ صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے اردو نے دیا ہی دیا ہے یہ تو ہوا لین دین والا معاملہ اس کو نارنگ صاحب سے زیادہ کون جان سکتا ہے مگر جہاں نارنگ صاحب نے اردو میں بڑے بڑے ادبی کارنامے کیئے ہیں ان میں ایک سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پرانے غالبؔ کی رگ رگ سے خون کی ایک ایک بوند نچوڑ کر نئے غالبؔ کی تعمیر کی۔ اردو ادب کے سر پر وہ ہزار زندہ رہیں مگر انھوں نے غالبؔ کو پھر سے نئی زندگی عطا کر کے اسے اتنا طاقت ور بنا دیا کہ غالبؔ ابھی اور بہت سال تک غالبؔ ہی رہے گا! اسی موضوع پر کھل کر لکھنے کے لیے طویل وقت درکار ہے۔ آئندہ اس پر الگ سے لکھنے کے ارادے کے ساتھ آگے بڑھتا ہوں۔

''غالبؔ کے اس عویٰ سے ایک قدم آگے بڑھ کر نارنگ صاحب نے غالبؔ کے انداز فکر کے بھی سب سے جدا ہونے کی بات کہی ہے۔ ثبوت کے طور پر غالبؔ کے اردو کلام کے علاوہ ان کی فارسی مثنوی چراغ دیر سے حوالے پیش کیئے ہیں۔'' (اردو پر کھلتا دریچہ کے آئینے میں۔ کپل شرما، انتساب شمارہ ۸۴)

''گوپی چند نارنگ نے غالبؔ کی شخصیت سے برسوں کی دھول اور نظریاتی اندھیروں کے پراسرار اجالے جو اب تک کسی آنکھ کو نصیب نہ ہوئے تھے بڑی مہارت سے ہٹا کر دنیا کے سامنے ایک نیا غالبؔ پیش کیا جس کی آب و تاب آج کے زمانے کی اور تروتازہ ہے۔ کمال تو صرف کمال کے لوگوں کے حصّے میں ہی آتا ہے اور نارنگ صاحب خود ایک کمال ہیں۔''

کچھ چمکیلے اقتباس جو عشقِ اردو سے سرشار ہیں نذر کرتا ہوں:

''یہ بات بتانے یا جتانے کی نہیں کہ اردو سے میری وابستگی دیوانگی

کی حد تک ہے۔ جب لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اردو کی خدمت کررہے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بڑی زبان جس کے ذریعہ کروڑوں اپنی زندگی کو با معنی بناتے یا اپنے وجود کی شناخت کرتے ہیں۔ وہ کسی فردِ واحد کی محتاج کیسے ہو سکتی ہے۔''

اور اسی میں آگے کہتے ہیں:

''یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اترتی چلی گئی یقیناً کچھ تو جادو ہوگا۔ تاج محل کا کرشمہ مثالی ہے، میں اردو کو زبانوں کا تاج محل کہتا ہوں اور اس لذّت کو اپنے خون کی روانی میں سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے خبر و بے خبری میں محسوس کرتا ہوں۔ زبان میرے لیے رازوں بھرا بستہ ہے۔''

(گوپی چند نارنگ)

کمبخت اس دنیا نے کسی بھی زمانے میں کسی کو بھی اتنی آسانی سے کب مانا ہے۔ نارنگ صاحب میں کچھ تو ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے فی زبانِ زمانہ ایک شورِ نارنگ اُٹھ کر اب طوفان میں بدل چکا ہے۔ لوگ اس طوفان کے تھمنے کے انتظار میں بوڑھے ہو گئے۔ تھمتا ہی نہیں۔ چاہے وہ میر ہوں، غالب، حالی یا پھر مومن، فراق۔ ان بڑے بڑے ادب کے علم برداروں پر دنیا میں جہاں جہاں بھی جو کچھ لکھا جا رہا ہے بیشمار مضامین و مقالات میں جب تک گوپی چند نارنگ کی رائے یا نام کی مہر نہ ہو بمقام و بے وزن سمجھا جاتا ہے۔ اگر اردو کیا کسی بھی زبان کے ادب کی گاڑی کسی مخصوص استاد کے ہاتھوں میں ہوا کرتی تو ادب کبھی کا ٹوٹ پھوٹ گیا ہوتا۔ نہ کہیں برناڈ شاہ و شیکسپیئر کا نام ہوتا اور نہ کہیں میر و غالب کا پتہ۔ ادب کی گاڑی تو صرف وقت ہی چلاتا ہے اور پھر وقت تو استادوں کا استاد ہے۔ زبان خلق سے نقارے کے رشتے کو نظر میں رکھتے ہوئے مجھے بھی وہی لکھنا پڑے گا جو اور لوگ بھی لکھ چکے ہیں۔ ہر زمانے میں حلیہ اور شکل کوئی بھی ہو۔ ایک گوپی چند نارنگ ضرور پیدا ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا جسے وقت کی ناک میں نکیل ڈالنے کا فن آتا ہے میں آج کے اس گوپی چند نارنگ کو سلام کرتا ہوں۔

ڈاکٹر آصف سعید
ایجوکیشن کالج، بھوپال

جاں نثار اختر کی شاعری

جاں نثار اختر اردو ترقی پسند شعراء کے اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے ترقی پسندانہ نظریات کو فکرفن کی بلند سطح سے پیش کیا ہے۔ اشتراکیت واحتجاج کو اپنے خونِ جگر میں تحلیل کر ایک نئی کیفیت عطا کی ہے۔ جاں نثار اختر مدھیہ پردیش کے شہر گوالیار میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد محمد افتخار حسین ملازمت کے سلسلہ میں مقیم تھے۔ جو مضطر خیرآبادی کے نام سے مشہور ہوئے جن کا تعلق خیرآباد کے ایک ایسے خاندان سے تھا جو زمانہ قدیم سے علم وفضل میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔

جاں نثار اختر نے ۱۹۱۴ء میں گوالیار میں آنکھ کھولی لیکن ۱۴ ربرس کی عمر میں ہی وہ اپنے ذی علم باپ مضطر خیرآبادی کی سرپرستی سے محروم ہوگئے۔ باوجود اس کے علم وفضل کی وراثت جو انہیں ملی اور جو ماحول انہیں اپنے والد اور بزرگوں سے میسّر ہوا، اُس کی بدولت گوالیار کے قیام کے دوران ہی، ہائی اسکول پاس کرنے تک وہ غزل کے اساتذہ کا کلام نہ صرف از بر کر چکے تھے بلکہ غزل گوئی کی طرف مائل بھی ہوگئے تھے۔ اپنے خاندان کو متعارف کراتے ہوئے انہوں نے اپنی مشہور نظم ''آخری لمحہ'' میں بیٹی عنیدہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے، نظم کا بند ملاحظہ کیجئے:

تم ایک ایسے گھرانے کی لاج ہو جس نے
ہر ایک دور کو تہذیب و آگہی دی ہے
تمام منطق و حکمت تمام علم و ادب

چراغ بن کے، زمانے کو روشنی دی ہے
جلا وطن ہوئے آزادئ وطن کے لیے
مَرے تو ایسے کہ اوروں کو زندگی دی ہے

جاں نثار کی سفر حیات نے جیسے جیسے تیور بدلے ان کی شاعری بھی کروٹیں لیتی رہی۔ ابتداء میں کلاسکیت کی پاسداری دورانِ طالبِ علمی رومانیت کا رنگ اس کے بعد کی عمر میں اشتراکیت کا اثر داخل ہوگیا۔ زندگی کے حالات نے نہ صرف ان کی تخلیقیت کو متاثر کیا بلکہ قیام گاہوں کو داغِ ہجراں بھی دیا جس کے مابین گوالیار، بھوپال، ممبئ وغیرہ کو رہائشی سائباں تسلیم کرسفرِ حیات کے چابک سہتے رہے۔

اپنی شاعری کو انسانیت کی بقا اور استحصال کے خلاف احتجاج کا ذریعہ بنانے والی اس شخصیت نے اپنا ادبی سفر اپنی آفتادِ طبع کے مطابق رومانی رجحان کے زیراثر شروع تو کیا لیکن جوں جوں سفرِ حیات نے اپنے تیور دکھائے زندگی کے تلخ، گوار اور ناگوار تجربات کا عکس ان کی شاعری میں نمایاں ہونے لگا۔ غزلیات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر ایک روح میں ایک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بددعا لگے ہے مجھے
بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحا لگے ہے مجھے

آنکھوں میں جو بھر لوگے تو کانٹے سے چُبھیں گے
یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لیے ہیں

کس کی دہلیز پہ لے جاکے سجائیں اس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو
اپنے تاریک مکانوں سے باہر تو جھانکو
زندگی شمع لیے در پہ کھڑی ہے یارو

ان کی شاعری کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تسلیم کی جاتی ہے کہ انہوں نے رومانوی

غنائیت کو ہر مرحلے میں، ہر پہلو سے برتا ہے۔ کسی بھی عہد میں کسی بھی مرحلے پر اس کو فراموش نہیں کیا۔ یعنی یہ رومانوی شاعر، احتجاج اور اشتراکیت کے خیمے میں داخل تو ہوا۔ یہ خیمہ جو کہ ترقی پسند تحریک کا بینر لیے تخلیق کاروں کی مسافر نوازی کر رہا تھا۔ جاں نثار نے اِن سے مصافحہ تو کیا لیکن ذاتی اور نجی زندگی کے معاملات کا دامن نہیں چھوڑا۔ ان کے ذیل اشعار جیسے اس بات کا ترجمان ہیں:

روشنی کم نہ ہوئی وقت کے طوفانوں میں
دل کے دریا میں کوئی چاند اُبھرتا ہی رہا
لمحہ لمحہ رہے آنکھوں میں اندھیرے لیکن
کوئی سورج میرے سینے میں اُترتا ہی رہا

جاں نثار اختر کے ترقی پسند تحریک کے نظریہ ادب کو قبول کرنے تک ان کی شاعری جوانی کے اُس دور میں داخل ہو چکی تھی جس وقت وہ ہر آنکھ کی مرکوزِ نظر بنی ہوئی تھی۔ لیکن ان کی نظم ''خاکِ دل''، ''امن نامہ'' اور ''خاموش آواز'' نے احتجاج و اشتراکیت کے خاموش سمندر میں طوفان کی آمد کا اعلان کر دیا اور ترقی پسند تحریک کے پرچم کے زیرِ سائے اپنی شاعری کو ذاتی و نجی جذبات و محسوسات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس طرح بیان کیا کہ ان کی آواز الگ پہچانی جانے لگی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

شہر کے تپتے فٹ پاتھوں پر گاؤں کے موسم ساتھ چلیں
بوڑھے برگد ہاتھ سا رکھ دیں، میرے جلتے شانوں پر

اور تو مجھ کو مِلا کیا، مری محنت کا صلہ
چند سکّے ہیں میرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح

اُجڑی اُجڑی ہوئی ہر آس لگے
زندگی رام کا بن باس لگے
تو کہ بہتی ہوئی ندیا کے سمان
تجھ کو دیکھوں تو مجھے پیاس لگے

جاں نثار اختر کی تمام شعری تخلیقات کا جائزہ لینے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کلاسکیت کے اثرات، رومانیت کی دلکشی اور انقلابی آہنگ کے امتزاج سے عبارت ہے۔ جاں نثار کی شاعری کے اسی امتزاج نے انہیں بلندیاں بھی عطا کیں اور ان کی شاعری کو نیا رنگ و آہنگ بھی بخشا ہے۔ پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے جاں نثار اختر کے فن و شخصیت پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ملاحظہ ہو:

''جاں نثار اختر نے اپنے شعری لب و لہجہ کو کلاسکیت سے صقیل کیا، رومانیت سے چمکایا، سوز و دل اور حقیقت پسندی سے آبدار بنایا، امید و یقین سے گرمایا اور ہندوستانی روایات کے صحت مند عناصر سے اس میں حرارت و توانائی پیدا کی۔''

ان کے شعری مجموعے سلاسِل، تارِ گریباں، جاوداں، نذرِ بتاں، گھر آنگن، خاکِ دل اور پچھلے پہر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ قومی یکجہتی، وطن کی وحدت، اتحاد و اتفاق کی آرزو لیے یہ لازوال شخصیت ۱۸/اگست ۱۹۷۶ء کو ممبئی کے جسلوک اسپتال میں اس دنیا سے رخصت ہوکر ''جوہو'' کے ایک قبرستان میں یہ بشارت دے کر سپرد خاک ہوگئی کہ:

''ذہنوں کے گھٹن مٹ جائے گی انسان میں تفکر جاگے گا
کل ایک مکمل وحدت کا بے باک تصور جاگے گا''

گیت

☆ سوہن راہی، لندن

کتنے آنسو دیپ جگے تو آئی ہو، آئی ہو
پروانوں کے پنکھ جلے تو آئی ہو، آئی ہو

آئی ہو تو جاتی رینا کو روکو
نینوں سے آنسوؤں کے دھاروں کو روکو
مٹتے مٹتے مِٹ ہی نا جائیں
چندا تارے ڈوب چلے تو آئی ہو
پروانوں کے پنکھ جلے تو آئی ہو، آئی ہو

تم کیا جانو گھایل من کی گہرائی
کتنے رنگوں چھلکی ہے تنہائی
تجھ بن میرے گیت ادھورے
تو آئی تو گیت ہیں پورے
دل کے پھول جو شول بنے تو آئی ہو، آئی ہو
پروانوں کے پنکھ جلے تو آئی ہو، آئی ہو

غزلیں

یعقوب تصور رابودھابی

(۱)

تناؤ ہے بہت اعصاب میں، میں چل رہا ہوں
بہ چشم و احصار خواب میں، میں چل رہا ہوں
قدم رکھتا کہیں ہوں اور پڑتا ہے کہیں اور
کہ جیسے قریۂ مہتاب میں، میں چل رہا ہوں

ہے سورج آگ برساتا ہوا قائم سروں پر

بدن بھیگا ہے، سبیلِ آب میں، میں چل رہا ہوں

سفینے کتنے ہی غرقِ سمندر ہوگئے ہیں

مگر کشتی لیے گرداب میں، میں چل رہا ہوں

فلک پر چاند سورج بھی ستارے بھی رواں ہیں

جنونِ عالمِ بے تاب میں، میں چل رہا ہوں

زمیں گردش میں ہے پیہم شعار رقص ہے

شعور صیغۂ آداب میں، میں چل رہا ہوں

تبسّم ہے لبوں پر کیوں تصوّر دشمنوں کے

ابھی تک حلقۂ احباب میں، میں چل رہا ہوں

(۲)

اس پار جو دیکھے وہ نظر بھی تو نہیں

دیوار کی تقدیر میں در بھی تو نہیں

زہریلی شعاؤں کے برستے ہوئے تیر

سایہ سپر انداز شجر بھی تو نہیں

ہوتی ہی نہیں شہر میں اب خیر کی بات

پھر تذکرۂ آمدِ شر بھی تو نہیں

دل ٹوٹے ہوئے شہر پر آزار میں سب

مظلوم دعاؤں میں اثر بھی تو نہیں

سنسان میں آبادیاں ویراں میں دار

اجسام کی املاک میں سر بھی تو نہیں

تاحدِ نظر دہشتِ ظلمت ہے محیط

مقسوم ستاروں کا سفر بھی تو نہیں

وہ سختیٔ دوراں ہے کہ ماؤف ہیں ذہن

تخیل و تصوّر کا ہنر بھی تو نہیں

غزل

☆ نقشبند قمر نقوی بخاری، امریکہ

پیکرِ زیست کا یوں باعثِ حیرت ہونا
پھول کا کھلتے ہی رنگینی و نکہت ہونا

نرم گوشہ بھی کسی کے لیے بننا دل میں
بڑھ کے پھر اُس کا بتدریج محبت ہونا

سانحہ ایسا بھی ممکن ہے اک عرصے کے بعد
جو رفاقت ہے بدل کر اُسے فرقت ہونا

عظمتِ فکر کا خالق کی ہے یہ بھی اعجاز
سب کو اک دوسرے کی اتنی ضرورت ہونا

وہ عجیب موڑ بھی آنا ہے سفر میں اک دن
جس جگہ سے ہے مقرّر ہمیں رخصت ہونا

ایسا اک بوڑھے شکاری کے مقدّر کا لکھا
جس کے رستے میں جواں بیٹے کی تربیت ہونا

نقشبند اتنا ہی بخشش کے لیے کافی ہے
اُس شفاعت کے علمدار سے نسبت ہونا

زندگی سے دو قدم تقدیر تک
بات پہنچی ہے تری تصویر تک

ہے مری فردِ عمل اتنی قدیم
مٹ گئی ہوگی سبھی تحریر تک

میں نے شیریں کو غزل میں رکھ لیا
رہ گیا فرہاد جوئے شیر تک

خواب تو دیکھے ہیں سب نے عمر بھر
کوئی پہنچا ہی نہیں تعبیر تک

سامعین اب ہیں مرے کون و مکاں
یہ خبر پہنچائے کوئی میرؔ تک

زندگی کی قید میں گذری ہے عمر
گھس گئی ہے پاؤں کی زنجیر تک

بن ہی جائیں گے در و دیوار بھی
بحث اب آ ہی گئی تعمیر تک

مسئلے کا حل کوئی نکلا نہیں
نقشبند آنے کو ہے شمشیر تک

غزل

☆ مامون ایمنؔ، نیویارک

اے دل! خرام ناز سے اتنا سجا مجھے
دنیا میں ڈھونڈتی پھرے بادِ صبا مجھے

چھایا بنوں تو دھوپ کی صورت دکھا مجھے
روؤں اگر میں چھپ کے تو کُھل کر ہنسا مجھے

گُمِ راہی کے سراب سے یک سر بچا مجھے
اے وقت! کر شعور کا رستہ عطا مجھے

اِک بے وفا کو میں نے کہا ہے طلب کی جان
آجائے راس کاش کبھی یہ خطا مجھے

مجھ کو دِکھائے یاس کا چہرہ بھی آس ہی
ٹھہرے سزا امید میں گویا جزا مجھے

باقی رہے فنا میں بھی تا دیر زندگی
ہستی کے مَرغ زار میں، حسرت! بسا مجھے

جادو چھپا ہوا ہے جفا کے مزاج میں
دیتا ہے دلِ دِہی کا سبق بے وفا مجھے

رقصاں ہو جس میں رات دِن خوش بوئے آرزو
لے جا کے ایسے خواب کے دل میں چھپا مجھے

اتنی بھی دل لگی نہیں اچھی، سو میرے عکس!
آئینہ کے پیام سے اِک دن مِلا مجھے

اسلوب جس کا رونے سے مربوط ہے بہت
ایمنؔ! غزل وہی ذرا ہنس کر سُنا مجھے

غزل

☆ وصی مِکرانی واجدی، ملنگوا، نیپال

چاند رُخ کا ہوا دیدار غزل میں نے کہی
پیار کا جب ہوا اظہار غزل میں نے کہی

ان کے چہرے سے جب آنچل کا کنارہ سرکا
دل مرا ہوگیا بیمار غزل میں نے کہی

آپ کے جب لب و رخسار کا خیال آیا
زندگی میں کوئی شہکار غزل میں نے کہی

مسکراکر جو کسی شوخ حسینہ نے کبھی
ترچھی نظروں سے کیا وار غزل میں نے کہی

اس کی خاموش ادائیں بھی قیامت تھی مگر
جب ہوا مائل گفتار غزل میں نے کہی

حسن اور عشق کے مابین کبھی ہوتے ہوئے
دیکھا جب وعدہ و اقرار غزل میں نے کہی

جب تری یادوں کی پُروائی کا جھونکا آیا
خوبصورت کوئی دو چار غزل میں نے کہی

افسانہ

نور شاہ

اپنا اپنا دُکھ

دونوں لڑکیاں طارق علی کے رشتے میں تھیں قریب قریب اس کی ہم عمر تھیں۔ دونوں نیک صورت اور نیک سیرت تھیں، پڑھی لکھی تھیں۔ خود طارق علی بھی پڑھا لکھا تھا ایک انٹرنیشنل کمپیوٹر کمپنی میں انجینئر کے عہدہ پر تعینات تھا۔ اچھی خاصی پوسٹ تھی، تنخواہ بھی معقول تھی۔ رشتہ داری کی وجہ سے وہ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک دوسرے کے گھریلو حالات سے واقفیت تھی۔ ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بھی تھا لیکن شادی تو ایک ہی لڑکی سے کرسکتا تھا۔ طارق علی کی مشکل یہ تھی کہ اس کی دادی کو عالیہ پسند تھی لیکن اس کی ماں کو عارفہ۔ دادی عالیہ کو اپنے خاندان کی بہو بنا کر لانا چاہتی تھی اور ماں عارفہ کو اپنے بہو کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی۔ اب ساس بہو کی ضد ان کی انا بن چکی تھی۔ طارق علی کے دادا اور والد کی بے پناہ کوششیں ساس بہو کی ضد کے سامنے کام نہ آسکیں۔ ٹکراؤ بڑھتا گیا۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں ایک تناؤ سا پیدا ہوگیا۔ گھر کا امن وسکون بگڑنے لگا۔ بات اور گفتگو میں دوریاں پیدا ہونے لگیں۔ طارق علی نے اپنے والد کی وساطت سے ماں کو لبھانے کی کوشش کی۔ اپنے دادا کا سہارا لے کر اپنی دادی کی بات کو طول دینے سے روکنا چاہا۔ جب دادا اور باپ اپنی کوششوں میں آپسی بات سے حالات کو بے قابو ہونے سے بچانے کے لیے اور وقت کی رفتار کو پکڑنے میں ناکام رہے تو طارق علی نے شادی کرنے سے انکار کیا۔ اس نے انکار کے بعد خاموشی اختیار کی۔ صبح دفتر کے لیے چل پڑتا اور رات گئے کام کا بہانہ بنا کر لوٹ آتا۔ جانے کتنے شب و روز ایسے ہی گزر گئے۔ کتنی راتیں بے خواب گزر گئیں۔ خوشیوں اور مسرتوں کے لمحات جانے گھر کے کس در و دیوار میں دفن ہوگئے۔ لگ رہا تھا جیسے گھر کے مکینوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کبھی بھی نہ ٹھہری تھی جیسے آنکھیں محبت کے نور سے بے نور ہوگئی تھیں لیکن ایک دن دفتر سے آتے ہی طارق علی نے خاموشی توڑ دی۔

''میں شادی کرنے جارہا ہوں۔''

''عالیہ سے'' دادی نے پوچھا؟

''عارفہ سے'' ماں نے جاننا چاہا!

''عالیہ سے اور نہ ہی عارفہ سے'' طارق علی کا جواب تھا......

''تو پھر کس کے ساتھ'' ساس بہو کی آوازیں ایک ساتھ کمرے کی درودیواروں سے ٹکرا گئیں۔

''میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا...... ذرا صبر سے کام لیجئے...... لیکن میرا وعدہ ہے کہ آپ کی بہو کو اسی گھر میں لے آؤں گا...... آپ ہی کے گھر میں......!''

ہر سمت خاموشی طاری ہوگئی۔ نہ کوئی ہونٹ ہلا اور نہ ہی کسی لب میں حرکت ہوئی۔ پلکوں کے دیپ جگمگاتے جگمگاتے بجھ سے گئے۔

اور پھر ایک دن طارق علی واقعی اپنی نئی نویلی دلہن کو گھر لے آیا۔ کلثوم کے آتے ہی دبی دبی سی خوشیاں محسوس ہونے لگیں۔ مسرتیں بکھرنے لگیں۔ طارق علی کی دادی اور طارق علی کی ماں...... ساس اور بہو کے چہروں سے بھی مسرتوں اور خوشیوں کے رنگ بکھرنے لگے لیکن ان کی اندر کی ضد اندر کی خلش قائم و دائم رہی۔ نئی نویلی بہو نے جانے کتنے معصوم معصوم سے ارمانوں، کتنے سندر سندر سے سپنوں کے ساتھ اپنے نئے گھر میں قدم رکھے تھے لیکن اس کے ان دیکھے خواب جاگنے سے پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے۔

کلثوم کی پریشانیاں اس وقت اور بھی بڑھ جاتیں، جب گھر کا کوئی کام کرتے وقت دادی کہتی ......'' یہ کام رہنے دو۔ پہلے سبزی بناؤ......!'' اور پھر من ؛ ہی من میں سوچتی اگر عالیہ میری پسند کی بہو اس گھر میں آئی ہوتی تو شاید مجھے یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

''نہیں سبزی بعد میں بھی بن سکتی ہے، ڈھیر سارے کپڑے جمع ہوگئے ہیں۔ ان کو واشنگ مشین میں ڈال دو......'' پھر وہ من ہی من میں سوچتی اگر عارفہ میری پسند کی بہو اس گھر میں آئی ہوتی تو مجھے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ سب کچھ میری مرضی سے ہوتا۔

کلثوم کبھی دادی اور کبھی ماں کی جانب حیران سی نظروں سے دیکھنے لگتی۔

''میں سارے کام خود کرلوں گی...... مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔''

دادا اب زیادہ وقت مسجد میں گزارنے لگے۔ باپ صبح سویرے سے ہی کام کے بہانے سے گھر سے نکل جاتے اور شام گئے تھکے تھکے سے گھر لوٹ آتے۔

طارق علی یہ سب کچھ دیکھتا رہا، محسوس کرتا رہا اور ایک دن شام گئے جب وہ دفتر سے گھر لوٹ آیا تو اس نے دادا کی موجودگی میں اپنے باپ سے کہا۔

''پاپا میں اس شہر سے جا رہا ہوں، کمپنی کے ہیڈ آفس میں میرا تبادلہ ہو چکا ہے۔ مجھے فوری طور پر ہیڈ آفس میں حاضر ہونا ہے مجھے رہنے کے لیے فلیٹ بھی ملا ہے اور دفتر آنے جانے کے لیے کار بھی......''

دادا اور باپ نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا...... دونوں مسکرا دیئے۔

اور پھر طارق نے اپنی بیوی کلثوم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی میرے ساتھ جانے کی تیاری کرو......'' اچانک اسی دوران دو معصوم سی ہم عمر لڑکیاں کمرے میں داخل ہو گئیں۔

''کون ہو تم؟ ماں نے پوچھا

''کیا چاہیے تمہیں ......اندر کیسے آ گئیں'' دادی کے لہجے میں غصہ تھا۔

''یہ میرے کہنے سے یہاں آئی ہیں اور اب یہ اسی گھر میں رہیں گی...... آپ سب کے ساتھ''

''کیوں'' دادا نے جاننا چاہا۔

''کام کرنے کے لیے...... گھر کا کام کرنے کے لیے...... دادی اور امّی کے لیے......''

''لیکن ایک ساتھ دو...... دو'' باپ کے لہجے سے حیرانگی کا اظہار صاف صاف نظر آ رہا تھا۔

ہاں پاپا...... ایک دادی کے لیے ...... دوسری امی کے لیے ...... ان کی انا کے لیے مجھے یہ کرنا ہی پڑا۔ ان کی ضد کے سامنے مجھے جھکنا ہی پڑ......''

اسی کمرے کے گوشے میں ساس اور بہو ایک دوسرے کی جانب دیکھے جا رہی تھیں۔

وہ شاید سوچ رہی تھیں۔ بیٹا بہو جائیں گے تو ان کے پاس رہے گا ہی کیا۔ بیٹے کے جانے کے زخم جوان پر ہنستے رہیں گے۔ بہو کے جانے کے داغ جوان پر مسکراتے رہیں گے......!!!

''میں شادی کرنے جا رہا ہوں۔''

''عالیہ سے'' دادی نے پوچھا؟

''عارفہ سے'' ماں نے جاننا چاہا!

''عالیہ سے اور نہ ہی عارفہ سے'' طارق علی کا جواب تھا......

''تو پھر کس کے ساتھ'' ساس بہو کی آوازیں ایک ساتھ کمرے کی درودیواروں سے ٹکرا گئیں۔

''میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا...... ذرا صبر سے کام لیجئے...... لیکن میرا وعدہ ہے کہ آپ کی بہو کو اسی گھر میں لے آؤں گا...... آپ ہی کے گھر میں......!''

ہر سمت خاموشی طاری ہوگئی۔ نہ کوئی ہونٹ ہلا اور نہ ہی کسی لب میں حرکت ہوئی۔ پلکوں کے دیپ جگمگاتے بجھ سے گئے۔

اور پھر ایک دن طارق علی واقعی اپنی نئی نویلی دلہن کو گھر لے آیا۔ کلثوم کے آتے ہی دبی دبی سی خوشیاں محسوس ہونے لگیں۔ مسرتیں بکھرنے لگیں۔ طارق علی کی دادی اور طارق علی کی ماں...... ساس اور بہو کے چہروں سے بھی مسرتوں اور خوشیوں کے رنگ بکھرنے لگے لیکن ان کی اندر کی ضد اندر کی خلش قائم و دائم رہی۔ نئی نویلی بہو نے جانے کتنے معصوم معصوم سے ارمانوں، کتنے سندر سندر سے سپنوں کے ساتھ اپنے نئے گھر میں قدم رکھے تھے لیکن اس کے ان دیکھے خواب جاگنے سے پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے۔

کلثوم کی پریشانیاں اس وقت اور بھی بڑھ جاتیں، جب گھر کا کوئی کام کرتے وقت دادی کہتی ...... ''یہ کام رہنے دو۔ پہلے سبزی بناؤ......!'' اور پھر من ؛ہی من میں سوچتی اگر عالیہ میری پسند کی بہو اس گھر میں آئی ہوتی تو شاید مجھے یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

''نہیں سبزی بعد میں بھی بن سکتی ہے، ڈھیر سارے کپڑے جمع ہوگئے ہیں۔ ان کو واشنگ مشین میں ڈال دو......'' پھر وہ من ہی من میں سوچتی اگر عارفہ میری پسند کی بہو اس گھر میں آئی ہوتی تو مجھے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ سب کچھ میری مرضی سے ہوتا۔

کلثوم کبھی دادی اور کبھی ماں کی جانب حیران سی نظروں سے دیکھنے لگتی۔

''میں سارے کام خود کرلوں گی...... مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔''

دادا اب زیادہ وقت مسجد میں گزارنے لگے۔ باپ صبح سویرے سے ہی کام کے بہانے سے گھر سے نکل جاتے اور شام گئے تھکے تھکے سے گھر لوٹ آتے۔

طارق علی یہ سب کچھ دیکھتا رہا، محسوس کرتا رہا اور ایک دن شام گئے جب وہ دفتر سے گھر لوٹ آیا تو اس نے دادا کی موجودگی میں اپنے باپ سے کہا۔

''پاپا میں اس شہر سے جا رہا ہوں، کمپنی کے ہیڈ آفس میں میرا تبادلہ ہو چکا ہے۔ مجھے فوری طور پر ہیڈ آفس میں حاضر ہونا ہے مجھے رہنے کے لیے فلیٹ بھی ملا ہے اور دفتر آنے جانے کے لیے کار بھی......''

دادا اور باپ نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا...... دونوں مسکرا دیئے۔

اور پھر طارق نے اپنی بیوی کلثوم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی میرے ساتھ جانے کی تیاری کرو......'' اچانک اسی دوران دو معصوم سی ہم عمر لڑکیاں کمرے میں داخل ہو گئیں۔

''کون ہو تم؟ ماں نے پوچھا

''کیا چاہیے تمہیں...... اندر کیسے آ گئیں'' دادی کے لہجے میں غصہ تھا۔

''یہ میرے کہنے سے یہاں آئی ہیں اور اب یہ اسی گھر میں رہیں گی...... آپ سب کے ساتھ''

''کیوں'' دادا نے جاننا چاہا۔

''کام کرنے کے لیے...... گھر کا کام کرنے کے لیے...... دادی اور امّی کے لیے......''

''لیکن ایک ساتھ دو...... دو'' باپ کے لہجے سے حیرانگی کا اظہار صاف صاف نظر آ رہا تھا۔

ہاں پاپا...... ایک دادی کے لیے...... دوسری امّی کے لیے...... ان کی انا کے لیے مجھے یہ کرنا ہی پڑا۔ ان کی ضد کے سامنے مجھے جھکنا ہی پڑا......''

اسی کمرے کے گوشے میں ساس اور بہو ایک دوسرے کی جانب دیکھے جا رہی تھیں۔

وہ شاید سوچ رہی تھیں۔ بیٹا بہو جائیں گے تو ان کے پاس رہے گا ہی کیا۔ بیٹے کے جانے کے زخم جوان پر ہنستے رہیں گے۔ بہو کے جانے کے داغ جوان پر مسکراتے رہیں گے......!!!

وحشی سعید

میرا قاتل میرا مسیحا

یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔کمرے کے دائیں کونے میں ایک شیشہ کی الماری میں کچھ عربی، کچھ فارسی اور کچھ اردو کی کتابیں رکھی ہوئیں تھیں۔ کمرے کی چھت کے بیچوں بیچ ایک پرانے زمانے کا فانوس لٹک رہا تھا۔فرش پر ایرانی قالین تھا، دائیں دیوار کے ساتھ قدیم زمانے کا ایک صوفہ سلیقہ سے سجا تھا۔چاندی جڑی ہوئی میز پر چاندی کی تھال میں مختلف اقسام کے پھل رکھے ہوئے تھے۔بائیں دیوار پر قدیم زمانے کا عالیشان گھڑیال لٹک رہا تھا۔جو ہر گھنٹے بعد بجتا اور وقت کا احساس کراتا۔صوفے کے سامنے والی دیوار پر خوبصورت فریم میں قد نما آئینہ لگا تھا۔

یہ میرا ڈرائنگ روم تھا۔

ایک دن میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا کھڑکی سے ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کر رہا تھا کہ اچانک میرے قد نما آئینہ سے ایک خوبصورت شخصیت میرے سامنے آ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔

''مجھے پہچانتے ہو۔''

میں گھبرا گیا، سٹپٹا گیا۔

''نہیں۔''

''تعجب ہے۔تم مجھے نہیں پہچانتے۔''

میں نے اپنے اوسان پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''اچھا مذاق ہے۔''

وہ اب سنجیدہ ہوا۔

''یہ کتابیں جو تم نے نہایت سلیقے سے الماری میں سجا کے رکھی ہیں ان ساری کتابوں میں میرا ذکر ہے۔''

کیا میں بوڑھا ہو گیا ہوں، کیا میری یادداشت جواب دے گئی ہے۔ وہ میرے ادراک کو للکار رہا تھا۔ میں اسے اپنی شیشہ کی الماری میں رکھی ہوئی مختلف زبانوں کی مختلف کتابوں میں ڈھونڈتا رہا۔

سورج ڈوب گیا۔ رات ہوگئی۔

اور وہ شخص جو صوفے پر بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا، مجھے پریشان دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

صبح ہوگئی۔

رات بھر اس کو کتابوں میں ڈھونڈنے کے بعد بھی میری تلاش ناکام رہی۔

''اب تو بتاؤ کون ہو تم۔''

''کیا میں کتابوں میں نہیں ملا۔'' وہ ہنس پڑا۔

''چلو! اب فانوس میں مجھے ڈھونڈو۔''

میں بول پڑا۔

''تمہاری باتیں بھی عجیب معمہ ہیں۔ کیا مجھے پریشان کرنے میں تمہیں لطف آرہا ہے۔''

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''تم میری مٹھی میں ہو۔''

''ہوسکتا ہے تم صحیح کہہ رہے ہو۔''

''بہت اچھے! جس قالین پر تم کھڑے ہو اور اپنے بازو ہوا میں پھیلائے ہوئے ہو اس قالین کے مہین ڈیزائن میں..... میں رہتا ہوں۔''

میں نے قالین الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کوئی راستہ نہ ملا۔

میں تھکا ہارا صوفے پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بولا۔

''سامنے کی دیوار گھڑی کو غور سے دیکھو۔ وقت کا احساس دلانے والے اس گھڑیال کی صدا میں مجھے ڈھونڈو۔''

میں چیخ پڑا۔

''معموں میں بات نہ کر۔''

اس نے اطمینان سے کہا۔

''چیخنے سے کیا ہوگا۔تم حقیقت سے کب تک بھاگتے رہوگے۔تمہارے سامنے جو آئینہ ہے جس کے سامنے کھڑے ہوکر تم خود کو سنوارتے ہو۔ اپنی ہی تعریف میں قصیدے پڑھتے ہو۔ پہچانو..... مجھے پہچانو.....!!''

میرا ماتھا ٹھنکا۔

''میرے قریب ہوکر مجھ سے کتنے دور ہو۔''

اب وہ کھڑا ہوا۔آئینہ کی طرف قدم بڑھائے۔

''اجازت۔''

میں اس کے سامنے کھڑا ہوا۔

''تم آخر ہو کون۔''

وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''میں ہی تمہارا قاتل ہوں، میں ہی تمہارا مسیحا ہوں۔''

یہ کہتے ہی وہ آئینہ میں جذب ہوگیا۔

مختصر افسانہ

رؤف خوشتر بیجاپور

نمبرون

مرکزی حکومت کی جانب سے مقرر کردہ ٹیم کے یہ چار اراکین دوپہر کا کھانا کھا کر حکومت کی جانب سے فراہم کردہ بلٹ پروف اے ایسی کشادہ گاڑی میں گیسٹ روم کی طرف رواں تھے۔ ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ ملک کی مختلف صوبوں کے بڑے اور اہم شہروں کا تفصیلی دورہ اور معائنہ کریں۔ شہر کی سڑکوں، گلیوں، کالونیوں کمرشیل علاقوں کے صاف ستھرے اور خوبصورت ماحول کو جانچتے ہوئے اُس شہر کی درجہ بندی کریں۔ اب وہ اس صوبہ کے اس مشہور شہر میں پچھلے دو دن سے تھے۔ جس کو پچھلے دو سال سے ملک بھر کے اہم شہروں میں صاف اور خوبصورت ماحول کی بناء پر نمبرون کا درجہ دیا گیا تھا۔ جب وہ شہر کے پُر ہجوم اور معروف علاقہ سے گذر رہے تھے تبھی اِن کو شور وغُل لوگوں کے چیخنے چلاّنے کرہانے اور رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو کانوں میں آگ لگائی جارہی تھی دھویں کے بادل فضا میں بُلند ہونے لگے۔ معلوم ہوا کہ شہر میں فساد چھڑ گیا ہے لوگ ایک دوسرے پر پتھراؤ کررہے تھے چاقوزنی کی وارداتیں بھی ہونے لگی۔ پولس افسران کی کار کو دیکھتے ہی تیزی سے جانے کے لیے کہا گیا۔ کیوں کرفیو نافذ ہونے والا تھا۔ جیسے ہی کار اگلی گلی میں مڑی ایک گھبرایا ہوا شخص جس کے کپڑے خون سے بھرے ہوئے تھے سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا ہو کر کار روکنے کا اشارہ کیا۔ کار رُک گئی تو وہ مدد مدد کہتے ہوئے کار کا دروازہ تھپتھپانے لگا۔ بدحواسی میں یہ لوگ کار کا دروازہ کھولتے ہی وہ اندر آکر ان [illegible] موں میں بیٹھ گیا۔ اپنی سانسوں کو درست کرتے ہوئے گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں کو دیکھا تو اسے اطمینان ہوا کہ چاروں کی پیشانیوں پر

تِلک چمک رہا ہے اپنے خون آلودہ ہاتھ سے اس نے اپنی پیشانی پر خون سے تلک لگاتے ہوئے کہنے لگا کہ میں اور میرے ساتھیوں نے بڑی مسجد سے لگی ہوئی سبھی دو کانوں کو آگ لگا اِن کو جلا ڈالا وہاں پر کھڑے ہوئے کئی آٹو رکشا جلا ڈالے۔ جن پر ماں کی دعا ''یارب تیرا ہی آسرا لکھا ہوا تھا''۔ دو چار داڑھی والوں کو بھی چاقو سے ختم کیا گیا۔ اب یہ لوگ کاروباری لحاظ سے ہم سے دس سال پیچھے ہو گئے۔ میں آشا کرتا ہوں کہ آپ لوگ مجھے بچا لیں گے۔ یہ کہتے ہوئے وہ تھکن سے چور اُن کے قدموں میں لیٹ گیا۔

یہ سُن کر وہ چاروں مسکراتے ہوئے آپس میں دیکھنے لگے۔ کار تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ تھوڑی دور بعد اِن کو مسجد نظر آئی۔ وہاں ایک داڑھی والے صاحب جا رہے تھے۔ تبھی کار روکنے کے لیے کہا گیا۔ انھوں نے اُس بارش شخص کو بُلایا اور کہا کہ پڑوسی کے مسجد کے پاس کی دو کانیں آٹو رکشا جلانے والے اور بے گناہوں کو مارنے والوں کا لیڈر یہاں کار میں ہے۔ ہم اِس کو آپ کے حوالے کرتے ہیں۔ آپ اِس کے ساتھ جو سلوک کرنا ہے کیجئے۔ اِس دوران دوسرے لوگ بھی آ گئے اور سب نے اِس جنونی دہشت پسند لیڈر کو پہچانا۔ لوگ مشتعل ہو کر کہنے لگے مولانا اِس خبیث کو ہمارے حوالے کیجئے ہم اِس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ مولانا نے سختی سے اِن کو روکا اور کار نشین حضرات سے کہا نہیں صاحب ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیں گے۔ بلکہ ذمہ دار شہریوں کی طرح اِس کو پولس کے سُپرد کر دیں گے۔ ہمیں ہماری پولس اور عدلیہ پر اب بھی پورا بھروسہ ہے۔

''دھینہ ہے مولانا صاحب آپ جیسے فرض شناس صحیح اور حقیقی معنوں میں دیش پریمیوں کی وجہ سے ہی ہمارا یہ پیارا ملک دنیا بھر میں مثالی ملک کے طور پر مشہور ہے۔ چلیے ہم بھی آپ کے ساتھ پولس اسٹیشن چلتے ہیں اور اِس کے خلاف بیان لکھواتے ہیں۔ دریں اثنا وہ شخص بیدار ہوا اور چلّانے لگا کہ میرے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ میں معصوم ہوں مسجد کے پاس لوگوں نے مجھے مارا پیٹا اور لہولہان کر دیا میں نے کچھ نہیں کیا اور کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟ ثبوت یہ کہ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہمارا آدمی ایک طاقتور ٹیپ ریکارڈ میں تمہاری کہی گئی باتیں ریکارڈ کر رہا تھا۔ اب ہم اس ٹیپ ریکارڈ کو پولس کے حوالے کر دیں گے۔

مولانا ان کے ہمراہ کار میں سوار تھے اور وہ اپنے شہر کے جلتے ہوئے منظر کو افسردگی سے دیکھ رہے تھے۔ یہ تاریخی خوبصورت شہر اب داغدار گھنونا اور جل کر بدنما نظر آ رہا تھا۔ چند نادانوں اور وحشیوں کے ہاتھوں برسوں سے تعمیر شدہ سجایا ہوا یہ دیدہ زیب شہر تباہ ہو کر

کیا سے کیا ہو گیا۔ اِن کو یہ غم بھی ستائے جارہا تھا کہ اب اِس شہر کو کون سا نمبر ملے گا؟
ایک ہفتہ بعد مولانا کو دِلّی سے ایک سر بہم لفافہ ہم دست ہوا جس کی عبارت یوں تھی۔

''مولانا صاحب کوئی شہر صرف اپنی بلند عمارتوں کی وجہ سے خوبصورت پُرکشش نہیں کہلاتا بلکہ وہاں کے رہنے والوں کے بلند کردار بھی اِس کو حقیقی طور پر بلند رکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں جس شہر میں آپ جیسے خوب سیرت لوگ رہتے ہیں وہ شہر خوب صورت کیوں نہیں کہلائے گا؟ آپ نے اپنے بپھرے ہوئے اور مشتعل لوگوں کو صبر و ضبط کی تلقین کی، انہیں خاموش کیا یہ آپ کا بڑا کارنامہ ہے۔ ورنہ اس کے ردِّعمل کے طور پر ایک اور فساد ہو جاتا تھا۔ ہم ایک بار پھر آپ کے اِس عزیز اور بہترین شہر کو ملک کے تمام شہروں میں خوبصورتی کے لحاظ سے نمبر ون کا درجہ دیتے ہیں۔''

غزلیں

☆ ظفر صہبائی

ایسی قربت ہو کہ دن رات میں شامل ہو جاؤں
تیری دھڑکن ترے جذبات میں شامل ہو جاؤں
معجزہ ایسا کوئی کاش کہ مل جائے مجھے
تیرے ہر ذکر میں ہر بات میں شامل ہو جاؤں
سن گزارش مری دیواریں اٹھانے والے
راستہ دے کہ تری ذات میں شامل ہو جاؤں
ایسا لگتا ہے انہی میں ہے کہیں اُس کا وجود
کھلتے پھولوں میں ہرے پات میں شامل ہو جاؤں
شرم رہ جائے گی رُسوا نہیں ہوں گے آنسو
کھل کے رونا ہے تو برسات میں شامل ہو جاؤں
گھر بلاتا ہے صدا دیتے ہیں رشتے مجھ کو
پھر سے میں اپنی روایات میں شامل ہو جاؤں

☆☆☆

آگ پھر دل کی دل میں دبی رہ گئی
برف ہونٹوں پہ میرے جمی رہ گئی
کچھ نہ کہہ پائے اُس سے بچھڑتے ہوئے
بات کہنی تھی جو اَن کہی رہ گئی
دھوپ نے نوچ لی گل سے شبنم مگر
پتوں میں دکھوں کی نمی رہ گئی
وہ جو آئے تو لفظوں کو سکتہ ہوا
اپنی سب گل فشانی دھری رہ گئی
گھر میں آرائشوں کے سبھی رنگ تھے
میرے مہتاب تیری کمی رہ گئی
جو سکوں چاہیے تھا ملا ہی نہیں
گھر کے اندر بھی کچھ بے گھری رہ گئی
پھر سے بارش ظفر دے گئی دُکھ وہی
پھر سلگتی ہوئی تشنگی رہ گئی

نظمیں

(۱)

صبحِ تلاش

رات بجلی گئی
اور اندھیرا ہوا
وقت پیری نے
مطلب کے اندھیروں میں
رشتے ناطے توڑ کر
بے خوف و خطر
بنچ پر بیٹھی ہوئی
ایک صبحِ تلاش کی
مفلسی دور کر لینے کے بعد
جاتے جاتے
سوئچ اون کر گیا!

(۲)

بھرا پُرا شہر

بھرا پرا وہ میرا ریشمی شہر
مجھ کو لوٹا دو؟
وہ شہر
جس سے
عظمت ہندوستان تھی قائم
وہ شہر
جس نے
اپنے کمزور ہاتھوں سے
کرگھے کو زندگی دی تھی!

☆نسیم اختر، دھنباد

(۳)

(برادرم شہود عالم آفاقی کی موت سے متاثر ہو کر)

روشنی

روشنی، روح کے اندر صدا چمکتی ہے
روشنی، تمہاری یادوں کی
روشنی، تمہاری غم آشنائی کی
روشنی، تمہاری ہمدردیوں کی
روشنی، تمہارے فہم وادراک کی
روشنی، تمہاری حرمت انسانیت کی
روشنی، تمہاری گنگناتی غزلوں کی
روشنی، تمہارے طلسماتی کردار کی
روشنی، فن کے پہچان کی
روشنی، قلم کے خوشبوؤں کی
روشنی، غاروں سے نکل کر
تمہارے دیمک زدہ جسم کے اندر
برسوں جگمگاتی رہی
اور تم ہمیں
اندھیرے میں چھوڑ کر چلتے بنے!

☆ ہرش برہم بھٹ

بیتے ہوئے دنوں کا سایہ نظر میں مت رکھ
اک اجنبی کو ایسے تنہا نگر میں مت رکھ
تجھ کو ہی ورنہ اک دن کھاجائیں گے اندھیرے
سورج کو قید کر کے اپنے ہی گھر میں مت رکھ
حسرت، تمنّا، عشرت، امّید، آس، نسبت
سامان اتنا زیادہ چھوٹے سفر میں مت رکھ
ہر انقلابی جذمت اپنے عمل میں آ
محدود اس کو اپنے دل میں جگر میں مت رکھ
یہ جان لے تو اب تو پھولوں کی ہے طلب تو
اس کی ڈگر کے کانٹے اس کی ڈگر میں مت رکھ

☆

لپٹتا ہوں میں جب اس سے جدا کچھ اور ہوتا ہے
مناتا ہوں میں جب ان کو خفا کچھ اور ہوتا ہے
نہ کچھ مطلب اذانوں سے نہ پابندی نمازوں کی
محبت کرنے والوں کا خدا کچھ اور ہوتا ہے
ہزاروں شکوے کرتے ہیں مرے ملنے پہ وہ مجھ سے
نہیں ملتا تو پھر ان کو گلہ کچھ اور ہوتا ہے
اجالا بھیک میں جو مانگتے ہیں ان سے یہ کہہ دو
کہ تاریکی میں جینے کا مزا کچھ اور ہوتا ہے
میری دیوانگی جب انتہائے حد کو چھوتی ہے
بجھاتا ہوں میں جب کچھ بھی جلا کچھ اور ہوتا ہے

غزلیں

☆ حنیف ساحلؔ

شامِ ہجراں یہی صورت ہوگی
پھر تجھے میری ضرورت ہوگی

کچھ اثر بھی ہے ترے لمس کا اور
کچھ بدن میں بھی حرارت ہوگی

اس طرح تو نہ جھلستا چہرہ
کچھ ہوا میں بھی تمازت ہوگی

زندگی کو وفا پرست بنا
یہی تفسیرِ محبت ہوگی

کچھ دھڑکتا ہے میرے سینے میں
کیا خبر یہ ہی محبت ہوگی

کس طرح اس کو مناؤں ساحل
کیسے تجدید رفاقت ہوگی

شعر کہنا بھی ہے نزولِ حنیف
یہ غزل ایک عبادت ہوگی

☆ بدر محمدی

اُس کی آنکھوں کو کہیے سرنامہ
اس کا چہرہ ہے گر خبر نامہ

ایسی نامہ بری بھی آئے اُسے
خود لیے پہنچے وہ نظرنامہ

دونوں پلکیں ہیں دو ورق اس کے
جانیے آنکھ کو اگر نامہ

طفل ہوں درس گاہِ منزل کا
مجھ کو پڑھنے دے رہگذر نامہ

یوں سرِ راہ گامزن میں رہا
پہنچا گھر گھر مرا سفرنامہ

نہ اسے پڑھنا عیب ہے پیارے
شعر گو کا ہے یہ ہنر نامہ

بدر مصرعہ غزل کا لکھ بھیجو
کوئی چاہے جو مختصر نامہ

غزلیں

☆ اختر کاظمی، فتح پور، یو. پی.

(۱)

میری حق گوئی پہ مقتل میں بلایا جائے گا
اور یہ ہوگا کہ سر نیزے پہ رکھا جائے گا

یہ نہیں معلوم تھا مجھ سے نہ پوچھا جائے گا
میری خاموشی کو میرا جرم سمجھا جائے گا

بے سبب یوں ہی خلاؤں میں نہ پتھر مارئے
ورنہ بیچارہ پرندہ کوئی مارا جائے گا

تشنہ لب ہی دشت و صحرا کا سفر جاری رہا
آس تھی دل میں کہیں ساحل نظر آجائے گا

عہدِ کہنہ کی کمانوں کا بھروسا کچھ نہیں
ٹوٹ جائیں گی اگر اب اِن کو کھینچا جائے گا

ہم نے بچپن میں سنا تھا ایک دن وہ آئے گا
آدمی میزان میں سکوں سے تولا جائے گا

توشۂ اعمال اختر ساتھ لے کر جائیے
آپ کا بھی نام محشر میں پکارا جائے گا

(۲)

زندگی میں ہر کسی کو ایک گھر بھی چاہئے
ہو ہَوا کا بھی گزر وہ بام و در بھی چاہئے

پھول نرگس کے چمن میں جا بہ جا ہیں منتظر
جو انہیں پہچان لے وہ دیدہ ور بھی چاہئے

حوصلہ کتنا بھی ہو اونچی اُڑانوں کیلئے
بال و پَر کے ساتھ طائر میں ہنر بھی چاہئے

پھول سبزہ اور سائے پر نہیں ہے اکتفا
اک شجر سے نوعِ انساں کو ثمر بھی چاہئے

ہم نے ظاہر پر نظر رکھی اگر تو کیا کیا
ہر کسی کو اپنے باطن کی خبر بھی چاہئے

عزم ہو دل میں تو صحرا کا سفر آسان ہے
ہاں مگر ہمراہ کچھ زادِ سفر بھی چاہئے

صرف تجدیدات سے اختر نہیں ہوتا ہے کچھ
آپ کے اشعار میں تھوڑا اثر بھی چاہئے

غزل

☆ مدہوش بلگرامی، ہردوئی

کوئی ہم سایہ جب میرا نشیمن چھین لیتا ہے
مہکتا ہے جو خوشبو سے وہ آنگن چھین لیتا ہے

میں شاعر ہوں مری کیا ہے حقیقت اس کی نظروں میں
جو آذر کا ہنر فنکار کا فن چھین لیتا ہے

بتائے کون اب تعبیر اس خوابِ پریشاں کی
جو آنکھوں میں اتر کر دل کی دھڑکن چھین لیتا ہے

وہ عصرِ حال کا پیکر بھی ہے میری نگاہوں میں
جو ماضی کی حسیں یادوں کا درپن چھین لیتا ہے

فریبِ رنگ و بو دیکر خزاں کے دور میں اکثر
وہ دل سے جذبۂ تعمیرِ گلشن چھین لیتا ہے

اُسے رہزن کہوں یا راہبر جو ہم سفر بن کر
کسی دوشیزہ کے ہاتھوں سے کنگن چھین لیتا ہے

جسے کہتے ہو تم مدہوشؔ میرِ کارواں اپنا
وہ سامانِ سفر بھی بن کے رہزن چھین لیتا ہے

غزل

☆ ابرار نغمی، رائسین

تری تصویر اور خط گنبدِ بے در میں چھوڑ آئے
جنہیں نہ لانا تھا منظر میں پس منظر میں چھوڑ آئے

سکون و چین کے لمحے دوار و در میں چھوڑ آئے
لب و رخسار و زلف و قد ہم اپنے گھر میں چھوڑ آئے

یہ گھر ہے گھر کی ذمہ داریاں کاندھوں پہ رکھی ہیں
تھیں جتنی اُلجھنیں دفتر کی وہ دفتر میں چھوڑ آئے

وجہ اندیشۂ افتاد کل شب ہم شتابی میں
بچی تھی جو بھی مے ٹوٹے ہوئے ساغر میں چھوڑ آئے

عہد اپنا براہیمی صدی ممکن نہیں ہرگز
کمالِ بُت تراشی تیشۂ آزر میں چھوڑ آئے

قبول اُفتد بہ عزو شرف ہو گر تو زہے قسمت
نشاں سجدوں کے ہم محراب اور منبر میں چھوڑ آئے

حصار غم کسی کو حرصِ مال و زر تھی اے نغمی
سفر میں ہم تھے سب گذرے ہوئے منظر میں چھوڑ آئے

غزلیں

☆ زبیر گورکھپوری، ممبئی

جس نے میری غزلوں کو انفرادیت دے دی
اُس کے غم کو دنیا پہ میں نے فوقیت دے دی

جو بھی کچھ تھا پاس اپنے راہِ عشق میں ہم نے
چاہتوں کی قربانی حسبِ حیثیت دے دی

شہرِ دل سے غم اُس کا اب کہیں نہ جائے گا
ہم نے اِس مہاجر کو آج شہریت دے دی

غیر کا تصور بھی اب گناہ لگتا ہے
ہم کو تیری چاہت نے وہ صلاحیت دے دی

زندگی میں وہ جس نے زہر بھر دیا میری
میں نے خانۂ دل میں اُس کو عافیت دے دی

....

☆ فاروق راہب

مجھ کو تو بے سوال ملا بے طلب ملا
ایسے بھی تھے کہ جن کا دعا سے نہ کچھ ہوا

اتنا کہا تھا! دولتِ احساس ہو عطا
سارے جہاں کا غم مجھے داتا نے دے دیا

یہ رقص و رنگ میری تباہی کا جشن ہے
ڈوبا ہے میرے خون میں دامن بہار کا

دشتِ وفا میں ہم تو بہت دور تک گئے
راہوں سے بس غبار ہی اٹھتا ہوا ملا

میرے بھی گھر کے خون سے رنگیں ہوئی زمیں
میرا ہی گھر شمار کے قابل نہیں ہوا

بزمِ عرب پہ چھایا ہوا موت کا سکوت
سازِ غمِ حیات پہ راہب غزل سرا

کتابوں کی دنیا

کتاب کا نام : سیفؔی سرونجی کی ادبی وصحافتی خدمات
مرتب : محمودؔ ملک
مبصّر : ڈاکٹر محمد صادق

ڈاکٹر سیفی سرونجی اردو ادب وصحافت میں وہ نام ہے جسے اردو ادب کے تمام ملکی اور غیر ملکی رسائل نہ صرف جانتے ہیں بلکہ ان سے بخوبی واقف بھی ہیں اور کیوں نہ ہوں تمام رسائل میں سیفی سرونجی کا نام ان کی تخلیقات اس رسالے کی زیب وزینت ضرور بنتی ہیں۔

ہمارے بعض سیاسی اور سماجی اکابروں اور کارکنوں کا یہ ماننا ہے کہ اصل ہندوستان گاؤں میں بستا ہے اور مختلف ادیب بھی گاؤں میں ہی پیدا ہوئے جیسے پریم چند، اختر الایمان، سیفی سرونجی، ان کی جائے پیدائش گاؤں ہیں اور ان کی زندگی اور تصانیف میں گاؤں کے حقیقی واقعات نظر آتے ہیں۔ وہ خیالی دنیا کی تفریح نہیں کراتے بلکہ حقیقت سے روبرو کراتے ہیں۔ سچے ادیبوں کے یہاں مبالغہ آرائی نہیں ہوتی ہے کیونکہ وہ سچ کو اپنی تخلیق میں پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سیفی سرونجی نے بھی اپنی شعری اور نثری تخلیقوں میں اس سچائی کو بے باک طریقے سے پیش کیا ہے۔ وہ ایک سیدھے اور سچے انسان ہیں۔ ان کا یہ رنگ ان کی لکھی ہوئی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں عزم اور لگن دونوں موجود ہیں جو ان کے رسالہ انتساب کی مسلسل اشاعت کا ضامن ہے۔ کسی رسالے کا وقت پر شائع ہونا آج بہت مشکل کام ہے اور ان کا یہ ادبی رسالہ جو عالمی شہرت یافتہ ہوگیا ہے وہ اس کی ادارت کو بخوبی نبھا رہے ہیں اور اس کا گذشتہ سال ۱۰۰واں شمارہ منظر عام پر آکر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ میں یہ امید کرتا ہوں کہ اس سیفی لائبریری میں ان کے اوّل سے ابھی تک کے شمارے کو بالترتیب رکھا جائے تو یہ ادب داں حضرات کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہونگے اور ان سے ادب داں

حضرات فیض حاصل کر سکیں گے۔ اسی طرح ان کے ذریعے لکھی گئی کتابیں جو ابھی تک تقریباً ۶۰ کتابوں کے وہ مصنف ہیں انہیں بھی جمع کرر کھا جائے تو ڈاکٹر سیفی سرونجی کا ادبی سفرنامہ اور صحافتی رفتار لوگوں کو ایک جگہ ایک وقت میں حاصل ہونگی۔ ان کے اس ادبی سفرنامے پر انتساب کے ۱۰۰ واں شمارے کے موقع پر دو روزہ ملکی سیمینار کے موقع پر ڈاکٹر سیفی سرونجی کی خدمات پر جشنِ سیفی سرونجی کا کل ہند سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک کے مختلف اردو داں ادیبوں کے مقالات پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں ''سیفی سرونجی'' (نعیم کوثر)، ''سیفی سرونجی اور ۱۰۰ واں شمارہ انتساب عالمی'' (پروفیسر آفاق حسین صدیقی)، ''کچھ سیفی سرونجی کے بارے میں'' (پروفیسر مختار شمیم)، ''ڈاکٹر سیفیؔ سرونجی کا دائرہ صفات''، (رشید انجم)، ''گلزارِ سیفی کا نغمہ خواں'' (اقبال مسعود)، ''اخلاص وعمل کا پیکر، مجاہد سیفی سرونجی'' (محمد نعمان خاں)، ''ایک قاری سے مکالمہ'' (پروفیسر علی احمد فاطمی)، ''یہ بھی سچا قصہ ہے''، (انجم عثمانی)، ''سیفی سرونجی اور مشاہیرِ ادب'' (ضیا فاروقی)، ''ایک بحر سو غزلیں'' (ڈاکٹر محمد مستمر)، ''سیفیؔ سرونجی کا نظمیہ رنگ و آہنگ'' (ڈاکٹر اجے مالوی)، ''ادب کا تابندہ ستارہ'' (مہتاب عالم)، ''سیفیؔ سرونجی اور سہ ماہی انتساب'' (ڈاکٹر نفیس نقی)، ''سیفیؔ سرونجی بحثیت ایک منفرد شاعر'' (ڈاکٹر نوشاد عالم)، ''سیفیؔ سرونجی کی غزل گوئی'' راقم الحروف، ''انتساب کا ۳۳ سالہ سفر'' (محمد متین ندوی)، ''زبان و ادب کا سفیر سیفیؔ سرونجی'' (ڈاکٹر آصف سعید)، ''سیفی سرونجی دشوار راستوں کا کامیاب مسافر'' (محمود ملک)، ''پورا سیفی'' (ڈاکٹر ظفر سرونجی)، ''سیفیؔ سرونجی اردو ادب کا اہم فنکار'' (عبدا لصبور خاں)، ''انتساب کی بیرونی ممالک میں پذیرائی'' (ڈاکٹر صمد اقبال)، ''اردو کے انمول گہر سیفیؔ سرونجی'' (نجم النساء ناز) جیسے نایاب تحقیقی مقالے ڈاکٹر سیفی سرونجی پر پیش ہوئے۔ ان تمام تحقیقی مقالوں کو بہت ہی خوبی کے ساتھ یکجا کیا ہے کتاب میں م.ناگ کا انٹرویو بھی شامل کیا ہے جس میں ڈاکٹر سیفی سرونجی ایک شاعر اور مدیر انتساب کی تفصیلی (بات چیت) گفتگو کو پیش کیا ہے۔ منظوم خراج تحسین کوثر صدیقی، محی الدین انجم، سلیمان آذر، عبدالسلام مضطر اور ڈاکٹر آصف سعید کا رپورتاز کو محمود ملک نے ترتیب دیکر ڈاکٹر سیفی سرونجی کی ادبی وصحافتی خدمات کا بیش قیمتی ذخیرہ مرتب کیا ہے جو ابھی کتابی شکل میں منظرعام پر آیا ہے۔

یوں تو ڈاکٹر سیفی سرونجی کی ادبی اور صحافتی خدمات سے اردو ادب کے تمام دانشور اور اردو داں واقف ہیں لیکن اس کتاب میں ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کو محمود ملک نے جس انداز میں پیش کیا ہے اس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ڈاکٹر سیفی سرونجی کی ادبی و

صحافتی خدمات کو یکجا کیا ہے اور یہ امید ہے کہ سیفی سرونجی کی ادبی وصحافتی خدمات کا سفر مسلسل جاری ہے جس کے اور دیگر گوشے منظر عام پر شائع ہوتے رہیں گے اور اردو داں ان سے فیض حاصل کرینگے اور یہ کتاب اردو ادب میں مقبولیت حاصل کرے گی۔ خاص طور پر نہایت بے باک انداز میں محمود ملک کا پیش لفظ ضرور موضوع بحث رہے گا۔

....

کتاب کا نام : ادبی جائزے
مصنف : ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی
ناشر : ہماری طاقت پبلی کیشنز۔ ٹونک
مبصّر : سیفی سرونجی

ڈاکٹر عزیز شیرانی راجستھان کے مشہور ادیبوں میں ایک نمایاں نام ہے۔ اس سال ان کی ادبی خدمات کے لیے بہار اردو اکادمی نے انعام سے بھی نوازا ہے۔ عزیز اللہ شیرانی کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ خاص طور پر ان کی کتاب راجستھان میں اردو تراجم بے حد مقبول ہوئی۔ ادبی جائزے ان کے مختلف اوقات میں کئے گئے تبصرے ہیں جو کئی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ تبصرہ نگاری بھی ایک فن ہے اور اس میں کتاب کی تمام خصوصیات اور خامیوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ لکھنے والے کی رائے اور اس کی سوچ اس کا ایماندارانہ غیر جانب دارانہ رویہ سب کچھ سامنے آجاتا ہے۔ عزیز اللہ شیرانی نے شعری مجموعوں پر جو تبصرے کئے ہیں ان میں انھوں نے اپنے تبصرے میں توازن برقرار رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ خود کہتے ہیں۔

> ''تبصرہ نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں دریا کو کوزے میں بند کئے جانے کا عمل ہوتا ہے۔ کسی بھی تخلیق تصنیف تالیف یا ادبی پارے کی اشاعت و ترتیب کے بعد اس پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے اس کا جامع تعارف پیش کرنا تبصرہ کا روایتی مقصد ہوتا ہے۔ گویا تبصرہ کسی بھی کتاب کا تعارف اس کی اہمیت و افادیت اور اس کے معیار کو تنقیدی کوٹی پر پرکھنے کا نام ہے۔''

عزیز اللہ شیرانی کی اس تحریر کی روشنی میں جب ہم ان کے تبصروں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے ہر کتاب پر کھل کر اور دلائل سے لکھا ہے۔ نہ تو کسی کی بے جا تعریف کی ہے اور نہ تنقیص کی ہے بلکہ کتاب کے متن سے بحث کرتے ہوئے گفتگو کی ہے۔ زیر نظر کتاب میں پچھتر کتابوں کے لگ بھگ تبصرے ہیں جن میں شاعری افسانوی ناول اور دیگر موضوعات کی کتابوں پر کئی چھوٹے بڑے ادیبوں، شاعروں کی کتابوں پر ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے تبصرے کیے ہیں۔ تبصرہ نگاری کے فن میں واقعی مہارت رکھتے ہیں کہ ہر کتاب پر تفصیل سے نہ سہی لیکن کتاب کی خصوصیات وہ چند لائنوں میں ہی بتا دیتے ہیں۔ شاہد میر، علیم صبا نویدی، موسیٰ رضا، شباب للت، سید شکیل دسنوی، ڈاکٹر ایم شمیم آعظمی خدا داد مونس، مختار ٹونکی، محمد حسن پرکار کے علاوہ کئی معتبر شاعروں ادیبوں کی کتابوں پر تبصرے موجود ہیں۔ بہت پہلے جائزے کے نام سے مظفر حنفی نے تبصروں کا ایک انتخاب پیش کیا تھا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ایسی کتابیں آتی رہیں۔ مظہر امام دیپک بدکی کے بعد ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی یہ کتاب یقیناً ادبی دنیا میں پسند کی جائے گی۔ اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی نے لکھا ہے اور حرف معتبر کے عنوان سے محمد صدیق خاں صاحب ٹونکی نے لکھا ہے۔

....

کتاب کا نام : امکان نظر

مصنف : بدر محمدی

ناشر : ایجوکیشنل پبلشر ہاؤس

مبصّر : سیفی سرونجی

بدر محمدی ایک اچھے شاعر اور نثر نگار ہیں ان کی نثری تحریریں یعنی ارمغان نظر اس کا زندہ ثبوت ہے۔ یہ بدر محمدی کے وہ تبصرے ہیں جو اکثر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان تبصروں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمام تبصرے ہندوستان سے شائع ہونے والے موقر جرائد پر ہیں اور وہ بھی خاص نمبروں پر مثلاً ماہنامہ انعکاس کے فراق گورکھپوری نمبر زبان و ادب کے حفیظ بنارسی نمبر ماہنامہ انشاء کا گفتن نمبر، بیباک کا افسانہ نمبر، زبان و ادب احمد یوسف نمبر، نیا دور کے شکیل بدایونی نمبر، انشا کا شکیل الرحمٰن نمبر، رنگ کے گوپی چند نارنگ نمبر،

انشا کا سلور جبلی نمبر مژگان کا نئی نسل نمبر کے علاوہ آج کل فکر و تحقیق، کتاب نما وغیرہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو رسائل کے یہ تمام خصوصی نمبر ایک یادگار دستاویزی نمبر ہیں۔ یوں تو تبصروں پر مشتمل کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ حال ہی میں دیپک بدکی اور عزیز اللہ شیرانی کی کتابیں آئی ہیں اس سے قبل مظفر حنفی کے جائزے بھی کئی سال قبل آچکے ہیں لیکن اردو ادب میں بدر محمدی کی یہ کتاب میرے خیال سے پہلی کتاب ہے جو صرف رسائل کے خصوصی نمبروں پر ہے حالانکہ وہ چاہتے تو کچھ خصوصی نمبروں پر مضامین شامل کر کے اسے اور بھی دستاویزی بنا سکتے تھے پھر بھی موجودہ رسائل پر یہ ایک یادگار کتاب ہوگئی ہے۔ اس کتاب میں رسائل کے خاص نمبروں کے بتصروں کے علاوہ حرف آغاز کے تحت مصنف کی تحریر ہے اور انور الحسن وسطوی، سہل انجم کے مضامین بھی شامل ہیں۔ بدر محمدی کے یہ تمام تبصرے مقامی اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ حرف آغاز میں بدر محمدی نے لکھا ہے:

''شامل کتاب تبصرے عظیم آباد بہار کے موقر روزناموں قومی تنظیم پندار راشٹریہ سہارا، سنگھم اور فاروقی تنظیم میں شائع شدہ ہیں۔ ان اخبارات کا میں ممنون ہوں کہ انھوں نے قاری سے میرا رشتہ استوار کیا اور مجھے جو جلا بخشی قارئین بسا اوقات میرے مضامین کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ میں نے ایسے چند مضامین کو کتاب میں جمع کر کے مجموعی مطالعہ کی سہولت فراہم کی ہے۔ لوگ اخبارات، رسائل کے پڑھنے کی بات کرتے ہیں۔ میں نے بھی اردو رسائل کے مطالعہ کی بات کی ہے مگر ان کی خوبیاں بتاتے ہوئے ان مضامین میں زیر بحث شماروں کی خصوصیات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بدر محمدی کی یہ تحریر پڑھنے کے بعد جب ہم ان کے تبصرے پڑھتے ہیں تو اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ بدر محمدی نے بہت جامع تبصرے کئے ہیں۔ تمام رسائل کے مزاج اور خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اپنا نظریہ بھی واضح کیا ہے۔ ویسے بھی بدر محمدی کے تبصروں کے علاوہ جن کا دیگر تنقیدی تحریر میں بہت اہم ہوتا ہیں اور خاص طور سے نئے موضوعات پر بدر محمدی نے واقعی ان رسائل پر تبصرے شائع کر کے کم از کم ان کی خدمات کا تو اعتراف کیا ہے ورنہ رسائل کے مدیران کو سوائے تعریفی خطوط کے اور ملتا بھی کیا ہے۔

یادِ رفتگاں پر یادگار سمینار منعقد

بھوپال کی اہم شخصیات نے کی شرکت، محمود ملک کی نظامت نے سماں باندھا

"راستوں کیا ہوئے وہ لوگ جو آتے جاتے
میرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے"

بھوپال۔۲۹ رمئی ۲۰۱۶ء کو ہندی بھون کے شاندار شامیانے میں جیسے ہی ناظم محمود ملک کی آواز اس خوبصورت شعر کے ساتھ سامعین کی سماعتوں تک پہنچی ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے دیر تک گونجتا رہا۔ موقع تھا بھوپال کی ادبی، صحافتی اور تعلیمی ہستیوں کو یاد کرنے کا۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی اور مدھیہ پردیش اردو رابطہ کمیٹی کے اشتراک سے ایک یادگار سمینار اور کُل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ صبح کے اجلاس میں سمینار اور دیر رات تک چلے مشاعرے کا سامعین لطف اٹھاتے رہے۔ سمینار کی صدارت سابق چیئرمین حقوقِ انسانی جناب خلیل اللہ ایڈوکیٹ نے فرمائی جبکہ مہمانِ خصوصی تھے محسنِ اردو، بھوپال کی ادبی اور ثقافتی، تہذیبی یادگاروں کی سنگِ بنیاد رکھنے والے سابق منسٹر، ممبر آف پارلیمنٹ اتراکھنڈ کے گورنر عزت مآب جناب عزیز قریشی صاحب۔ بطور مہمانِ اعزازی وزیر داخلہ جناب بابولال گور صاحب، مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی سکریٹری ڈاکٹر نصرت مہدی، سیفیہ ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر جناب ملاّ احسان حسین، جرنلسٹ علیم بزمی موجود تھے۔ اس سمینار کا انعقاد سیفیہ کالج کے بانی ملاّ سجاد حسین کی بیش بہا تعلیمی خدمات کے اعتراف میں کیا گیا تھا جنھوں نے اپنی تمام زندگی زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے میں وقف کر دی تھی۔ پروگرام کی شروعات جناب محمد یوسف خاں، شعیب علی خاں، ساجد پریمی، پرویز اختر، سلیم قریشی، ملک نوید، ڈاکٹر آصف سعید، ڈاکٹر مبارک خان کے ذریعہ سبھی مہمانوں کو ہار پہنا کر کی گئی۔ پروگرام کے روحِ رواں اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے صدر جناب ڈاکٹر یونس فرحت صاحب نے اغراض و مقاصد تفصیل سے پیش کیے۔ جناب سلیم قریشی نے ان ۹۵ رفتگاں کے ناموں کی فہرست پڑھ کر سنائی جن کا ذکر مقالات میں کیا گیا۔ ابتدا میں اقتدار افسر نے ملاّ سجاد حسین اور ملاّ فخر الدین (فخرو بھائی) سے متعلق نظم پیش کی۔ علیم بزمی نے اپنی تقریر میں خاص طور سے ان ہندو حضرات کا ذکر کیا جو تا زندگی بھوپال کی ترقی اور تہذیبی

پاسداری کے لیے اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر نصرت مہدی نے اس پروگرام کو بھوپال کے رفتگان کو یاد کرنے کا بہترین سلسلہ قرار دیا۔ اب باری تھی مدھیہ پردیش کے سابق چیف منسٹر اور موجودہ اسمبلی میں وزیر داخلہ بابولال گور صاحب کی۔ ناظم محمود ملک نے گور صاحب کے اردو شعدائی ہونے کا ایک دلچسپ واقعہ سنایا جس سے پورا ماحول قہقہ زار ہوگیا۔ جناب گور صاحب نے فرمایا کہ اردو صرف مسلمانوں کی ہی نہیں ہم سب کی زبان ہے۔ اردو ایک میٹھی زبان ہے یہ دلوں کو جوڑتی ہے۔ بھوپال کی گنگا جمنی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ یہاں کے مسلمانوں نے کبھی کسی کو ایک کنکری بھی نہیں ماری میں اس کا گواہ ہوں۔ بھوپال شہر ہمیشہ سے یکجہتی میں یقین رکھتا آیا ہے جو اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔

مہمانِ خصوصی عزت مآب جناب عزیز قریشی صاحب نے بھوپال کے ان لوگوں کو بڑے جذباتی انداز میں یاد فرمایا کہ جن سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ انھوں نے ان رفتگان کے علمی، ادبی کاموں کو شرمندۂ خواب ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آپ نے ایک ایک کا نام لیکر ان کے کارناموں کو سامعین کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اس طرح کے پروگرام منعقد ہوتے رہنا چاہیے۔ جس کے لیے میں ہر طرح کے تعاون کے لیے موجود ہوں۔ بعد ازاں مقالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے عارف علی عارف کو دعوت دی گئی انھوں نے ظفر صہبائی کا مقابلہ پڑھ کر سنایا جو سید قمر الحسن، اشتیاق عارف، محمود الحسینی اور اے.آر. رشدی کی صحافت پر مبنی تھا۔ ڈاکٹر اعظم نے شعری بھوپالی، باسط بھوپالی اور کیف بھوپالی وغیرہ کو ان کی شاعری کے حوالے سے یاد کیا۔ اس کے بعد زحمت دی گئی نامور ادیب، محقق پروفیسر محمد نعمان خاں صاحب کو۔ آپ نے سیفیہ کالج سے متعلق اہم شخصیات ملاّ سجاد حسین، فخرو بھائی، عبدالقوی دسنوی کے کارہائے نمایاں کو اس طرح یاد کیا کہ ملاّ احسان حسین اور ان کے خاندان کے افراد کے ساتھ تمام سامعین کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔ محمد نعمان خاں کے اس معیاری مقالہ میں متذکرہ شخصیات کے علاوہ ایم.اے. شاد کی شخصیت اور ان کی شعری صلاحیتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ استاد شاعر ظفر نسیمی نے عشرت قادری پر اچھا مقالہ پیش کیا۔ ابرار نعمی صاحب نے مقصود عرفانی کی خدمات کا بھرپور احاطہ کیا۔ ضیاء فاروقی نے نسیم انصاری وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مقالہ سے سامعین کو متاثر کیا۔ سمینار کا آخری مقالہ مشہور شاعر اور کامیاب فلمی گیت کار جاں نثار اختر کی شخصیت اور فن پر نوجوان ادیب ڈاکٹر آصف سعید نے پیش کیا۔ مقالہ جامعہ اور معیاری ہونے کے سبب کافی پسند کیا گیا۔

اس بیحد کامیاب سمینار میں سینکڑوں معزز شخصیات کے علاوہ رفتگان کے خاندان کے افراد نے بھی شرکت فرمائی۔ جلسہ کی نظامت کے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور دلچسپ انداز میں محمود ملک نے انجام دیئے جس کے چرچے پروگرام کے بعد بھی ادبی حلقوں میں سنائی دیئے۔ شکریہ کے الفاظ ڈاکٹر یونس فرحت صاحب نے ادا کیے۔

رات کو محفلِ مشاعرہ کا انعقاد ہوا جو کامیابی کے ساتھ دیر رات تک چلتا رہا۔ مشاعرہ کی نظامت شفیق عابدی اور صدارت محترمہ ملکہ نسیم صاحبہ نے فرمائی۔ مشاعرہ کی شروعات جلال میکش کی نعت پاک سے ہوئی۔ جن شعرا و شاعرات نے اپنا کلام سنایا ان کے نام اس طرح ہیں: محترمہ ملکہ نسیم، ڈاکٹر نصرت مہدی، محترمہ مینا نقوی، محترمہ پروین صبا، محترمہ قمر سرور، جناب نظر بجنوری، اسلم فرشوری، اسلم چشتی، ڈاکٹر اعظم، ملک نوید، شعیب علی خاں، پرویز اختر، وجے تواری وغیرہ۔

☆ ڈاکٹر آصف سعید

....

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی کتاب ''اردو درس و تدریس''
کو بہار اردو اکادمی کا انعام

ٹونک راجستھان کے محقق، افسانہ نگار اور شاعر ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی سکریٹری ٹونک ادبی سوسائٹی کی درسی کتاب ''اردو درس و تدریس'' کا تیسرا جدید ایڈیشن ۲۰۱۴ء میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔ اس کتاب سے ہندوستان کے بی ایڈ (اردو)، بی ایس ٹی سی (اردو) کے طلباء، اساتذہ اور تعلیمی ادارے مستفید ہو رہے ہیں۔ علاوہ ازیں بی ایس سی سیکنڈ گریڈ اور اردو ٹیچر امتحان میں شرکت کرنے والے امیدوار بطورِ خاص استفادہ کر رہے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کو ''بہار اکادمی'' نے سالِ رواں میں انعام سے نوازا ہے۔ انعام کی شکل میں ۱۵ (پندرہ) ہزار روپے نقد، سپاس نامہ اور سند پیش کر کے سرفراز کیا ہے۔ اس موقع پر ادبی سوسائٹی کے صدر طنز و مزاح نگار جناب مختار ٹونکی، جوائنٹ سکریٹری مسعود اختر خاں، ترجمان ڈاکٹر سید بدر احمد خازن عبدالغفار صاحب سید عابد شاہ اور اہل راجستھان نے ڈاکٹر شیرانی کو ان کی گراں قدر کاوش پر مبارکباد پیش کی ہے۔

پنچکولہ ہریانہ میں آل انڈیا مشاعرہ اور کوی سمیلن کا انعقاد

گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار احساس ادبی سوسائٹی پنچکولہ کی جانب سے پنچکولہ ہریانہ میں مشاعرہ اور کوی سمیلن کا انعقاد لیفٹیننٹ جنرل بی کے این چھبّر سابق گورنر پنجاب کی صدارت میں ۳ / اپریل ۲۰۱۶ء کو منعقد ہوا۔ مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے ڈاکٹر آمود گپتا سابق پی جی آئی ہریانہ نے شرکت فرمائی۔

احساس ادبی سوسائٹی کے صدر بی. ڈی. کالیا ہمدم نے ہماچل پردیش پنجاب، ہریانہ اور ٹونک راجستھان سے آئے شعراء کا تعارف کرایا۔ اس موقع پر سابق گورنر صاحب نے ہندی اور اردو کی دو کتابوں کا اجراء فرمایا۔

(۱) آبشارِ ادب (اردو سفرنامہ) کا ہندی ترجمہ ''ساہتیہ پرپات'' مصنف بی ڈی کالیا ہمدم۔

(۲) ''ادبی جائزے'' مصنف ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی۔ (ہندوستان کے شعراء، ادبا، محققین و ناقدین کی اردو کتابوں پر تبصرے جائزے)

مشاعرہ کی ابتدا میں قبلِ مشاعرہ بزم موسیقی کے تحت غزل سرائی کا پروگرام ہوا جس میں چنڈی گڑھ ہریانہ کی محترمہ گرمیت کور اور آر ڈی کیلیے نے اردو کی مشہور غزلیں پیش کیں۔ خصوصاً کیلیے صاحب نے بی ڈی کالیا ہمدم کی غزلیں سنائیں۔ مشاعرہ اور کوی سمیلن میں ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی ٹونک راجستھان، زاہد ابرول اونا ہماچل پردیش، ضمیر علی ضمیر، مالیہ کوٹلہ، بی. ڈی. کالیہ ہمدم ہریانہ، وجیندر غافل ہریانہ، کراپ دانش، ترورّاں وششٹ، کشور کمار ودِروہی، گرومیت کور، سنجیو بخشی، ڈاکٹر دنیش داد دھیچ پنچکولہ ہریانہ، نے اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ چند پسندیدہ اشعار۔

چھوڑ آیا ہے جانے تو کہاں میری ہنسی کو
میں بیٹھا ہوں آنکھوں میں پرو کر ترے آنسو

زاہد ابرول

جذبات کی آندھی کا سفر اب نہ کریں گے
اس ملک کو دہشت کی نذر اب نہ کریں گے

ڈاکٹر شیرانی

راستے کو کاٹ کر نکلا ہے ہمدم آدمی
یہ شگن اچھا نہیں ہے کہہ رہی ہیں بلّیاں

بی ڈی کالیا ہمدم

وہ ہی اُٹھاتے ہیں اوروں پہ انگلیاں اکثر
جو لوگ اپنے گھروں کی خبر نہیں رکھتے

ضمیر

خود میرا ہی دل جس کی نہیں دیتا گواہی
دنیا جو کہے ٹھیک تو کیا ٹھیک رہے گا

دنیش دادھیچ

ہم سر پھرے جو یہ خدا سے الجھ پڑے
حشر کے اہتمام میں تاخیر دیکھ کر

وجیندر غافل

صاحبِ دیوان تو ہمدم بہت مل جائیں گے شہر میں
شاعری لیکن کہاں ہے شاعری کے شہر میں

ہمدم

تم مرے ذہن و تصور پر کچھ اس قدر چھائے ہو
جب بھی کوئی آہٹ ہوتی ہے تو لگتا ہے تم آئے ہو

کشور کمار ودروہی

بنالیا ہے آدمی نے خود کو اتنا اپاہج
اور پھر کہتا ہے کہ وقت کی رفتار بہت ہے

سنجیو بخشی

سابق گورنر پنجاب جناب چھتبر صاحب نے مشاعرہ کے اختتام پر خطبہ صدارت میں فرمایا کہ ہریانہ اور پنجاب میں ہندی پنجابی اور اردو کا خوش گوار سنگم ہے۔ بغیر کسی مذہبی

فرق کے یہاں شاعری ہوتی ہے۔ الطاف حسین حالی پانی پتی کی یہ زمین آج بھی شعراء ادباء کی آبیاری کررہی ہے۔

اس مشاعرہ میں خصوصی طور پر ندیشک دوردرشن جالندھر (پنجاب) جناب ادم گوری دت شرما مع اپنی دوردرشن ٹیم کے ساتھ موجود تھے۔ اس مشاعرہ کو دوردرشن جالندھر نے 16-5-4 کو نشر کیا۔ ابھینو ابروز (دہلی) اور 'جہاں نما' گنگوہ کے مدیر جناب زیڈ اختر صاحب کے نمائندے اس مشاعرہ میں موجود رہے۔

آخر میں جناب شام سندر بنسل چیئر مین پر لینس ورلد اسکول پنچکولہ ہریانہ جو اس مشاعرہ کے میزبان تھے انہیں کے عالیشان اسکول کے حال میں یہ مشاعرہ منعقد ہوا تھا انھوں نے سبھی شعراء وشرکاء کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ بی ڈی کالیا ہمدم مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے استاد ڈاکٹر ادم پرکاش اگروال زار علامتی قوم اور اپنے مرحوم بیٹے منیش کالیا کی یاد میں ہر سال یہ مشاعرہ منعقد کرتے ہیں۔

....

"امعان نظر" کی رسم رونمائی

متعدد رسائل و جرائد کے خصوصی شماروں کے تبصرے پر مشتمل بدر محمدی کی حالیہ کتاب "امعان نظر" کا اجراء بہار اردو اکادمی پٹنہ کے سمینار ہال میں گذشتہ ۲۹ رنومبر ۲۰۱۵ء کی شام سکریٹری بہار اردو اکادمی جناب مشتاق احمد نوری کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ علمی مجلس بہار کے زیر اہتمام منعقد اس تقریب کی صدارت معروف ادیب و نقاد پروفیسر علیم اللہ حالی نے فرمائی۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر اسرائیل رضا اور ڈاکٹر عبدالصمد جبکہ مہمانان اعزازی کی حیثیت سے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر منظر اعجاز اور نوشاد مومن شریک محفل ہوئے۔ نظامت کے فرائض فرد الحسن فرد نے انجام دئے۔ خورشید اکبر نے اپنے کلیدی خطبے میں امعان نظر کے مختلف پہلوؤں پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کتاب اور مصنف کتاب سے متعلق جامع گفتگو کی۔ بعد ازاں کہکشاں توحید، کامران غنی صبا، رضوانہ پروین اور عفت ممتاز نے پرمغز مقالات پیش کئے۔ امان ذخیروی کے منظوم تبصرہ اور ظفر صدیقی کے تہنیتی قطعات کی سامعین نے خوب خوب پذیرائی کی۔ نوشاد مومن نے امعان نظر کو تاریخی اہمیت کا حامل قرار

دیتے ہوئے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ سرزمین بہار علم وادب کے حوالے سے دوسری ریاستوں سے زیادہ فعال ہے۔ ڈاکٹر منظر اعجاز نے امعان نظر کو انہی نوعیت کی پہلی کتاب بتاتے ہوئے اسے تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مفید اور کارآمد ٹھہرایا۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے تبصرے کو ادب کی اہم صنف گردانتے ہوئے امعان نظر کو ایمانداری اور دیانت داری سے قلم بند کئے گئے تبصروں کا گلدستہ بتایا۔ ڈاکٹر عبدالصمد نے کہا کہ شہر سے دور رہنے اور وسائل کی کمی کے باوجود بدر محمدی کا ادب کی خدمت انجام دینا غیر معمولی عمل ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ دلائل وشواہد سے پر، محمدی کے تبصرے عمیق مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ پروفیسر اسرائیل رضا کی تقریر کتاب کی رسم اجراء پر مصنف اور تقریب کے مہتمم کو مبارکباد دینے پر محیط رہی۔ مشتاق احمد نوری نے اپنے خطاب میں امعان نظر کے تبصروں کو لائق مطالعہ ٹھہراتے ہوئے حوصلہ افزا کلمات پیش کئے۔ صدارتی تقریر میں پروفیسر علیم اللہ حالی نے تبصرے کو تنقید کا زینہ بتاتے ہوئے بدر محمدی کے تبصروں کو جداگانہ اور قابل ستائش قرار دیا۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ بدر محمدی تنقید کے میدان میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلانے میں کامیاب و کامران ہونگے۔ علمی مجلس کے سکریٹری پرویز عالم کے اظہار تشکر کے ساتھ تقریب رونمائی کا اختتام ہوا۔ اس محفل اجراء میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف، عطا عابدی، انور الحسن وسطوی، قوس صدیقی، ناشاد اورنگ آبادی، منیر سیفی، احسن راشد، معین کوثر، اشرف استھانوی، اسرار جامعی، خورشید کاکوی، آصف سلیم، افتخار عاکف، فرحان غنی، عبدالودود قاسمی، پرویز انجم، قاسم ہدایت پوری، میر سجاد، بشر رحیمی، مظہر وسطوی، عابدہ پروین، زرنگار یاسمین سمیت کثیر تعداد میں باذوق سامعین موجود تھے۔ برائے اشاعت

پرویز عالم، پٹنا

بھوپال میں یادِ رفتگاں کے تحت قومی سیمینار

بھوپال۔ ۱۰ر جولائی کو صبح ۱۰ بجے، دن سیمینار کے پہلے اجلاس کا انعاد کیا گیا۔ جس کی مسجد صدارت پر عالی جناب پروفیسر اختر الواسع صاحب سابق صدر قومی اقلیتی لسانی کمیشن حکومتِ ہند رونق افروز تھے۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر عزیز قریشی صاحب سابق گورنر اترا کھنڈ رونق

افروز تھے۔ کلیدی خطبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد نعمان خاں صاحب استاد NCERT دہلی نے پیش کیا۔

سابق گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی صاحب نے یادِ رفتگاں کے عنوان سے منعقد سمینار میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ مدھیہ پردیش بننے کے بعد بھوپال میں فرقہ وارانہ فساد کے جوایک دو واقعات ہوئے ان کے بارے میں بھی بتایا۔ جہاں غیر بھوپالی آباد تھے انھوں نے ہی شہر کا ماحول خراب کیا تھا۔ بھوپال تہذیب اور بھائی چارہ کی ایک مثال ہے۔ یہاں کے لوگ امن پسند ہیں اور وقتاً فوقتاً اس کے ثبوت بھی سامنے آئے ہیں۔ بھوپال میں نواب اور بیگمات ضرور مسلمان تھے لیکن ان کے وزیر اعظم بااختیار ہندو ہوا کرتے تھے لیکن سب کی جان اور مال کی حفاظت ہوتی تھی۔ انھوں نے رفتگاں کو یاد کیے جانے کو خوش آئند قرار دیا۔

پروفیسر اختر الواسع نے اپنی صدارتی تقریر میں مدھیہ پردیش میں زبان وادب کی قدامت اور اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ہا کہ بھوپال نے کئی میدانوں میں تاریخی کام کیے، یہ شہر ''بغداد الہند'' کہلایا۔ یہاں ایک کے بعد ایک چار بیگمات نے نہایت کامیاب طریقے سے حکومت کی اور دنیا کی سب سے پہلی مسلمان خاتون چانسلر نواب سلطان جہاں بیگم بھی اسی علاقہ کی حکمراں تھیں۔ انھوں نے کہا کہ سعدیہ خان نے ''یادِ رفتگاں'' منعقد کر کے اسی سنہری روایات کی تجدید کی ہے۔

سمینار کے آغاز میں پروفیسر محمد نعمان خاں صاحب نے کلیدی خطبہ میں مدھیہ پردیش کے مختلف علاقوں بالخصوص گوالیار، اندور، اجین، کھنڈوہ، جبلپور، ساگر، سرونج اور بھوپال کی شعری خصوصیات پر شعرا کے اشعار کے وسیلے سے پُر زور طریقہ سے روشنی ڈالی اور داد و تحسین حاصل کی۔ اس موقع پر یادِ رفتگاں کے عنوان سے ایک سوینئر (Souvenior) کا اجرا بھی ہوا۔ نگر نگم کے سابق کمشنر دیوی سرن جی نے بھوپال اور مالوہ کی شخصیات پر روشنی ڈالی اور ان کی خدمات بے مثال قرار دیں۔ پروفیسر ڈاکٹر شافع قدوائی صدر شعبہ ماس کمیونیکیشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے صارف دور میں اپنی تہذیب، ادب اور معاشرت کے تاریخی پہلوؤں کو یاد کرنے کی ضرورت واہمیت واضح کرتے ہوئے یادِ رفتگاں کے عنوان سے انعقاد کو نہایت اہم قرار دیا اور مذکورہ عنوان کے تحت سر سید اور علی گڑھ تحریک میں بھوپال کے حصہ پر گفتگو کی، انھوں نے نواب سکندر جہاں بیگم کے عہد سے نواب حمید اللہ خاں کا اس تحریک

میں جو اہم کردار رہا اس پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ شاہجہاں بیگم کے زمانہ میں بھوپال سرسید آئے تھے۔

ہندی کے سینئر صحافی اور سرکاری قومی ایکتا کمیٹی کے نائب صدر رمیش شرما نے یادِ رفتگاں انعقاد کو سراہا اور بھوپال کی قدامت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ دنیا کے جو بیس بائیس قدیم علاقے شناخت کیے گئے ہیں اور جہاں سے انسان نے جینا سیکھا، تہذیب سے آراستہ ہوا اس میں بھوپال شامل ہے۔ جہاں موریہ عہد کے نقوش بھی ملتے ہیں اس لیے ہمیں اپنی اس وراثت کو نہ صرف خود جاننا بلکہ دوسروں کو بھی اس سے متعارف کرانا چاہیے۔ انھوں نے اردو شاعری سے اپنی گہری دلچسپی کے واقعات سنائے اور وقت کے ساتھ صنف میں جو ترقی و تبدیلی ہوئی ہے اس کے جائزے پر زور دیا اور اپنے ادارے قومی ایکتا کمیٹی کی طرف سے ہر ممکن تعاون کی پیشکش کی۔ سینئر صحافی اور قلم کار دیوی سرن صاحب نے بھوپال کی گنگا جمنی تہذیب اور اس کے اثرات کے تعلق سے اپنے تجربات پیش کیے اور بتایا کہ ہم جیسے نوجوانوں کی ذہن سازی میں ان کا اہم حصہ رہا اور آگے کی زندگی میں یہ ہمارے بہت کام آئے۔

ابتداء میں سوسائٹی کے صدر جناب حیدر یار خاں صاحب اور سوسائٹی کے دوسرے عہدے کے ممبران نے مہمانوں کا پھول اور ہار سے گل پوشی کی۔ اس کے بعد سوسائٹی کی سکریٹری سعدیہ خان نے شکریے کے ساتھ استقبالیہ تقریر میں سوسائٹی کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے اور خواتین کا تعلیم یافتہ ہونا سب سے اہم بتایا۔ ایک ماں اور ایک عورت کا تعلیم یافتہ ہونا سماج سدھار کی ایک کڑی ہے۔

انھوں نے کہا کہ یادِ رفتگاں کا خاص مقصد اردو سے آنے والی نسل کو یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ ہمارے اہم شعراء، ادباء اور فنکاروں کو یاد کرنا۔ سماج سدھاروں اور جنگِ آزادی کے مجاہدین کی قربانیوں کو نئی نسل تک سمینار، پروگراموں کے ذریعہ پہنچانا اور یادِ رفتگاں کے عنوان سے مزید پروگرام منعقد کرائے جائیں گے۔

سمینار کے دوسرے سیشن میں اقبال مسعود نے صدارت کی۔ انھوں نے اس موقع پر کہا کہ ہم نے سمینار کے تمام مقالات کو ایک کتابی شکل میں بہ عنوان ''یادِ رفتگاں'' شائع کر دیا ہے، جس کا آج عزت مآب عزیز قریشی صاحب نے افتتاح کیا تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ سمینار میں پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے مقصود عمرانی پر، پروفیسر مختار شمیم نے کوثر صدیقی نے تاج بھوپالی پر، ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں نے باسط بھوپالی پر، ضیا

افروز تھے۔ کلیدی خطبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد نعمان خاں صاحب استاد NCERT دہلی نے پیش کیا۔

سابق گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی صاحب نے یادِ رفتگاں کے عنوان سے منعقد سمینار میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ مدھیہ پردیش بننے کے بعد بھوپال میں فرقہ وارانہ فساد کے جو ایک دو واقعات ہوئے ان کے بارے میں بھی بتایا۔ جہاں غیر بھوپالی آباد تھے انھوں نے ہی شہر کا ماحول خراب کیا تھا۔ بھوپال تہذیب اور بھائی چارہ کی ایک مثال ہے۔ یہاں کے لوگ امن پسند ہیں اور وقتاً فوقتاً اس کے ثبوت بھی سامنے آئے ہیں۔ بھوپال میں نواب اور بیگمات ضرور مسلمان تھے لیکن ان کے وزیر اعظم بااختیار ہندو ہوا کرتے تھے لیکن سب کی جان اور مال کی حفاظت ہوتی تھی۔ انھوں نے رفتگاں کو یاد کیے جانے کو خوش آئند قرار دیا۔

پروفیسر اختر الواسع نے اپنی صدارتی تقریر میں مدھیہ پردیش میں زبان و ادب کی قدامت اور اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ہا کہ بھوپال نے کئی میدانوں میں تاریخی کام کیے، یہ شہر ''بغداد الہند'' کہلایا۔ یہاں ایک کے بعد ایک چار بیگمات نے نہایت کامیاب طریقے سے حکومت کی اور دنیا کی سب سے پہلی مسلمان خاتون چانسلر نواب سلطان جہاں بیگم بھی اسی علاقہ کی حکمراں تھیں۔ انھوں نے کہا کہ سعدیہ خان نے ''یادِ رفتگاں'' منعقد کر کے اسی سنہری روایات کی تجدید کی ہے۔

سمینار کے آغاز میں پروفیسر محمد نعمان خاں صاحب نے کلیدی خطبہ میں مدھیہ پردیش کے مختلف علاقوں بالخصوص گوالیار، اندور، اجین، کھنڈوہ، جبلپور، ساگر، سرونج اور بھوپال کی شعری خصوصیات پر شعرا کے اشعار کے وسیلے سے پُر زور طریقہ سے روشنی ڈالی اور داد و تحسین حاصل کی۔ اس موقع پر یادِ رفتگاں کے عنوان سے ایک سوینئر (Souvenior) کا اجرأ بھی ہوا۔ نگرنگم کے سابق کمشنر دیوی سرن جی نے بھوپال اور مالوہ کی شخصیات پر روشنی ڈالی اور ان کی خدمات بے مثال قرار دیں۔ پروفیسر ڈاکٹر شافع قدوائی صدر شعبہ ماس کمیونیکیشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے صارف دور میں اپنی تہذیب، ادب اور معاشرت کے تاریخی پہلوؤں کو یاد کرنے کی ضرورت و اہمیت واضح کرتے ہوئے یادِ رفتگاں کے عنوان سے انعقاد کو نہایت اہم قرار دیا اور مذکورہ عنوان کے تحت سر سید اور علی گڑھ تحریک میں بھوپال کے حصہ پر گفتگو کی، انھوں نے نواب سکندر جہاں بیگم کے عہد سے نواب حمید اللہ خاں کا اس تحریک

میں جو اہم کردار رہا اس پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ شاہجہاں بیگم کے زمانہ میں بھوپال سرسید آئے تھے۔

ہندی کے سینئر صحافی اور سرکاری قومی ایکتا کمیٹی کے نائب صدر رمیش شرما نے یادِ رفتگاں انعقاد کو سراہا اور بھوپال کی قدامت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ دنیا کے جو بیس بائیس قدیم علاقے شناخت کیے گئے ہیں اور جہاں سے انسان نے جینا سیکھا، تہذیب سے آراستہ ہوا اس میں بھوپال شامل ہے۔ جہاں موریہ عہد کے نقوش بھی ملتے ہیں اس لیے ہمیں اپنی اس وراثت کو نہ صرف خود جاننا بلکہ دوسروں کو بھی اس سے متعارف کرانا چاہیے۔ انھوں نے اردو شاعری سے اپنی گہری دلچسپی کے واقعات سنائے اور وقت کے ساتھ صنف میں جو ترقی و تبدیلی ہوئی ہے اس کے جائزے پر زور دیا اور اپنے ادارے قومی ایکتا کمیٹی کی طرف سے ہر ممکن تعاون کی پیشکش کی۔ سینئر صحافی اور قلم کار دیوی سرن صاحب نے بھوپال کی گنگا جمنی تہذیب اور اس کے اثرات کے تعلق سے اپنے تجربات پیش کیے اور بتایا کہ ہم جیسے نوجوانوں کی ذہن سازی میں ان کا اہم حصہ رہا اور آگے کی زندگی میں یہ ہمارے بہت کام آئے۔

ابتداء میں سوسائٹی کے صدر جناب حیدر یار خاں صاحب اور سوسائٹی کے دوسرے عہدے کے ممبران نے مہمانوں کا پھول اور ہار سے گل پوشی کی۔ اس کے بعد سوسائٹی کی سکریٹری سعدیہ خان نے شکریے کے ساتھ استقبالیہ تقریر میں سوسائٹی کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے اور خواتین کا تعلیم یافتہ ہونا سب سے اہم بتایا۔ ایک ماں اور ایک عورت کا تعلیم یافتہ ہونا سماج سدھار کی ایک کڑی ہے۔

انھوں نے کہا کہ یادِ رفتگاں کا خاص مقصد اردو سے آنے والی نسل کو یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ ہمارے اہم شعراء، ادباء اور فنکاروں کو یاد کرنا۔ سماج سدھاروں اور جنگِ آزادی کے مجاہدین کی قربانیوں کو نئی نسل تک سمینار، پروگراموں کے ذریعہ پہنچانا اور یادِ رفتگاں کے عنوان سے مزید پروگرام منعقد کرائے جائیں گے۔

سمینار کے دوسرے سیشن میں اقبال مسعود نے صدارت کی۔ انھوں نے اس موقع پر کہا کہ ہم نے سمینار کے تمام مقالات کو ایک کتابی شکل میں بہ عنوان ''یادِ رفتگاں'' شائع کر دیا ہے، جس کا آج عزت مآب عزیز قریشی صاحب نے افتتاح کیا تا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ سمینار میں پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے مقصود عمرانی پر، پروفیسر مختار شمیم نے کوثر صدیقی نے تاج بھوپالی پر، ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں نے باسط بھوپالی پر، ضیا

فاروقی نے سہا مجددی پر، پروین کیفؔ نے اپنے والد کیف بھوپالی پر، ساجد پریمی نے اپنے والد واحد پریمی پر اور محمود ملک نے وقار فاطمی پر بھرپور مقالات ان کے فن و شخصیت پر پڑھے اور داد و تحسین حاصل کی۔ سمینار کے دونوں سیشنوں کی نظامت بدر واسطی نے بحسن و خوبی ادا کی، جس کی کافی تعریف کی گئی۔

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی تصنیف
''ادبی جائزے'' کی رسم اجرا

احساس ادبی سوسائٹی پنچکولہ ہریانہ کی جانب سے اپریل ۲۰۱۶ء کو منعقدہ آل انڈیا مشاعرہ کے موقع پر ٹونک راجستھان کے ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی تصنیف ''ادبی جائزے'' کی رسم اجرا لیفٹیننٹ جنرل بیؔ کے این چھبّر سابق گورنر پنجاب اور احساس ادبی سوسائٹی کے صدر مشہور شاعر بی ڈی کالیا ہمدمؔ نے فرمائی۔ اس موقع پر گورنر صاحب نے فرمایا کہ ہریانہ اور پنجاب میں اردو ہندی، پنجابی کا خوش گوار سنگم ہے یہاں بغیر کسی مذہبی فرق کے اردو کی آبیاری ہورہی ہے۔حاؔلی پانی پتی کی یہ زمین ادبی سرگرمیوں کو پروان چڑھارہی ہے۔ اس سرزمین پر ڈاکٹر شیرانی کی تصنیف ''ادبی جائزے'' کا اجراء عمل میں آیا ہے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

''ادبی جائزے'' ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کے ادبی تبصروں اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ۲۷ ادبی کتب پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ان کا ادبی اور فنی جائزہ لیا ہے۔ ادبی جائزے میں مندرجہ ذیل اصنافِ نثر و نظم کی کتب پر جائزے اور تبصرے کئے گئے ہیں۔

تحقیقی تنقیدی رسائل و جرائد، دبستان، فن تعمیر و سائنس، شکاریات، سوانح، تاریخ، ثقافت، تدریس، افسانے، ناول، منظوم مجموعے، نعتیہ مجموعے غزلوں کے مجموعے، سلام، مرثیے، رباعیات اور قطعات وغیرہ۔

مکتوبات

اقبالؔ مسعود کا کھلا خط سیفیؔ سرونجی کے نام

محترم سیفی سرونجی صاحب آداب

میری عادت نہیں ہے کہ رسائل و جرائد کے مدیران محترم کی غیر ضروری ستائش کروں کہ وہ میری ہر الٹی سیدھی تحریر یا تخلیق کو شائع کریں۔ اس ریا کاری کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مدیرانِ اکرام اپنے آپ کو کوئی ادبی عجوبہ سمجھنے لگتے ہیں۔ جن کے قدم نہ زمین پر ہوتے ہیں نہ وہ آسمان بن پاتے ہیں اب ایسے معلق حضرات کی کیا تعریف وتوصیف کی جائے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ اگر کوئی واقعی اچھا کام کر رہا ہے تو اس کی ستائش کی جانی چاہئے۔ اردو والوں کی طرح عمدہ کام پر مجرمانہ خاموشی اختیار کرنا جرم ہے۔ لوگ یہ سوچ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ ٹھیک ہے یہ ان کا کام ہے یا پھر غلطیاں تلاش کرتے ہیں کہ یہ کیوں نہیں ہے۔ فلاں پر فلاں سے کیوں نہیں لکھوایا۔ ظاہر ہے کہ یہ مدیر پر ظلم ہے۔ اچھا مدیر اپنی تمام صلاحیتوں اور کوششوں کو بروئے کار لا کر خوب سے خوب تر کی جستجو کرتا ہے اور وہ جب مدیر خود تخلیق کار ہو تو اس کا کہنا ہی کیا ہے۔ جیسا کہ سیفیؔ سرونجی ہیں۔ دنیا بھر کی بستیوں میں معروف، ہر جگہ ومقام سے نکلنے والے اخبارات، رسائل و جرائد میں ان کی تخلیقات، تنقید، مضامین موجود ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سہ ماہی انتساب جو ایک قصبہ سے نکلتا ہے عالمی بن گیا ہے۔ آپ کا سوواں شمارہ اور شمارہ ۱۰۲ اس وقت پیشِ نظر ہیں۔ ان رسائل میں جن حضرات کے گوشے نکالے گئے ہیں وہ ان رسائل و جرائد کے مدیران کو آئینہ دکھانے کے قابل ہیں جو صرف رقم لیکر ہر کچی پکی شخصیت پر نمبر نکالتے ہیں، گوشہ سجاتے ہیں اور جانے کیا کیا کرتے ہیں۔ عصری نظم نگاری پر جو نظمیں آرہی ہیں وہ سیفی سرونجی کی معلومات، مطالعہ، علم اور سخن فہمی کی مثال ہیں۔ شمارہ نمبر ۱۰۲

فاروقی نے سہا مجددی پر، پروین کیف نے اپنے والد کیف بھوپالی پر، ساجد پریمی نے اپنے والد واحد پریمی پر اور محمود ملک نے وقار فاطمی پر بھرپور مقالات ان کے فن و شخصیت پر پڑھے اور داد و تحسین حاصل کی۔ سمینار کے دونوں سیشنوں کی نظامت بدر واسطی نے بحسن وخوبی ادا کی، جس کی کافی تعریف کی گئی۔

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی تصنیف
''ادبی جائزے'' کی رسم اجرا

احساس ادبی سوسائٹی پنچکولہ ہریانہ کی جانب سے اپریل ۲۰۱۶ء کو منعقدہ آل انڈیا مشاعرہ کے موقع پر ٹونک راجستھان کے ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی تصنیف ''ادبی جائزے'' کی رسم اجرا لیفٹیننٹ جنرل بی کے این چھبر سابق گورنر پنجاب اور احساس ادبی سوسائٹی کے صدر مشہور شاعر بی ڈی کالیا ہمدم نے فرمائی۔ اس موقع پر گورنر صاحب نے فرمایا کہ ہریانہ اور پنجاب میں اردو ہندی، پنجابی کا خوش گوار سنگم ہے یہاں بغیر کسی مذہبی فرق کے اردو کی آبیاری ہورہی ہے۔ حالی پانی پتی کی یہ زمین ادبی سرگرمیوں کو پروان چڑھارہی ہے۔ اس سرزمین پر ڈاکٹر شیرانی کی تصنیف ''ادبی جائزے'' کا اجراء عمل میں آیا ہے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

''ادبی جائزے'' ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کے ادبی تبصروں اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ۷۲ ادبی کتب پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ان کا ادبی اور فنی جائزہ لیا ہے۔ ادبی جائزے میں مندرجہ ذیل اصنافِ نثر و نظم کی کتب پر جائزے اور تبصرے کئے گئے ہیں۔

تحقیقی تنقیدی رسائل و جرائد، دبستان، فن تعمیر و سائنس، شکاریات، سوانح، تاریخ، ثقافت، تدریس، افسانے، ناول، منظوم مجموعے، نعتیہ مجموعے غزلوں کے مجموعے، سلام، مرثیے، رباعیات اور قطعات وغیرہ۔

مکتوبات

اقبالؔ مسعود کا کھلا خط سیفیؔ سرونجی کے نام

محترم سیفی سرونجی صاحب آداب

میری عادت نہیں ہے کہ رسائل و جرائد کے مدیران محترم کی غیر ضروری ستائش کروں کہ وہ میری ہر الٹی سیدھی تحریر یا تخلیق کو شائع کریں۔ اس ریا کاری کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مدیرانِ اکرام اپنے آپ کو کوئی ادبی عجوبہ سمجھنے لگتے ہیں۔ جن کے قدم نہ زمین پر ہوتے ہیں نہ وہ آسمان بن پاتے ہیں اب ایسے معلق حضرات کی کیا تعریف وتوصیف کی جائے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ اگر کوئی واقعی اچھا کام کر رہا ہے تو اس کی ستائش کی جانی چاہئے۔ اردو والوں کی طرح عمدہ کام پر مجرمانہ خاموشی اختیار کرنا جرم ہے۔ لوگ یہ سوچ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ ٹھیک ہے یہ ان کا کام ہے یا پھر غلطیاں تلاش کرتے ہیں کہ یہ کیوں نہیں ہے۔ فلاں پر فلاں سے کیوں نہیں لکھوایا۔ ظاہر ہے کہ یہ مدیر پر ظلم ہے۔ اچھا مدیر اپنی تمام صلاحیتوں اور کوششوں کو بروئے کار لا کر خوب سے خوب تر کی جستجو کرتا ہے اور وہ جب مدیر خود تخلیق کار ہو تو اس کا کہنا ہی کیا ہے۔ جیسا کہ سیفیؔ سرونجی ہیں۔ دنیا بھر کی بستیوں میں معروف، ہر جگہ ومقام سے نکلنے والے اخبارات، رسائل و جرائد میں ان کی تخلیقات، تنقید، مضامین موجود ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سہہ ماہی انتساب جو ایک قصبہ سے نکلتا ہے عالمی بن گیا ہے۔ آپ کا سوواں شمارہ اور شمارہ ۱۰۲ اس وقت پیشِ نظر ہیں۔ ان رسائل میں جن حضرات کے گوشے نکالے گئے ہیں وہ ان رسائل و جرائد کے مدیران کو آئینہ دکھانے کے قابل ہیں جو صرف رقم لیکر ہر کچی پکی شخصیت پر نمبر نکالتے ہیں، گوشہ سجاتے ہیں اور جانے کیا کیا کرتے ہیں۔ عصری نظم نگاری پر جو نظمیں آ رہی ہیں وہ سیفی سرونجی کی معلومات، مطالعہ، علم اور سخن فہمی کی مثال ہیں۔ شمارہ نمبر ۱۰۲

میں پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر مختار شمیم اور ڈاکٹر سید یحیٰ نشیط کے مضامین قابل ذکر ہیں۔ دلوی صاحب نے اپنے مضمون میں سرقہ کے سلسلے میں جو سوال اٹھائے ہیں ان کا جواب دینا دشوار نظر آتا ہے۔ البتہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔

خصوصی مطالعہ کے تحت وحشی سعید پر کچھ اچھے مضمون سامنے آتے ہیں۔ تاہم وحشی سعید پر مزید اور اچھا کام کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ سیفی سرونجی کا حج و زیارت پر منظوم سفرنامہ ان کے دلی جذبات کا عکاس ہے۔ اشعار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آمد کا دریا بہہ رہا ہے۔ یا جھوم کر بادل آتے ہیں اور برس رہے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر فتح پوری کی خواب بیتی بیحد دلچسپ ہے۔ شعر و سخن کے حصہ میں ڈاکٹر فراز حامدی جیسے عہد ساز دانشور کی شرکت اور عبدالاحد ساز، بلراج بخشی، غلام مرتضیٰ راہی کے کلام نے اس گوشہ کو جگمگا دیا ہے۔ نئے لوگوں میں محمود ملک کا ندا فاضلی پر مضمون بھرپور ہے اور ان کی مکمل شعری شخصیت کا احاطہ کرنے کی سعی کی عمدہ مثال ہے۔ نئے لوگوں کو رسائل و جرائد میں جگہ ملنا چاہئے۔ نئی نسل کی آبیاری کرنا اور ان کو پروان چڑھانا مدیروں اور بزرگ ادیبوں کی نہ صرف ذمہ داری ہے بلکہ ان کا فرض ہے۔ سیفی سرونجی صاحب اس تبصرہ سے آپ کی ستائش کرنا میرا شیوہ نہیں ہے تاہم سونے کو سونا کہنا چاہئے۔ عنقریب یا قریب میں آپ کو کوئی مضمون یا تخلیق بھیجنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ مبادا اس بے لوث خط کو خوش آمد تصور نہ کر لیا جائے۔ خوش رہیں، کام کرتے رہیں۔ فیصلے وقت پر چھوڑ دیں کہ وقت خود زمانے کا خدا ہے۔

اقبال مسعود

بھوپال

مکرمی سیفی صاحب، سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میری ذہنی حالت ایسی ہوگئی ہے کہ اب یاد نہیں آپ کو عمرے کی سعادت حاصل کر کے آنے پر تبریک لکھی تھی یا نہیں۔ ایک غیر واضح خیال سا ہے شاید ایک خط لکھا۔ اگر نہیں تو اب میں آپ کو دلی مبارک و تہنیت پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ آپ کی عبادت کو شرف قبول عطا فرمائے اور دین و دنیا کی سعادتوں سے سرفراز فرمائے۔

کچھ عرصہ ہوا۔ میرا چھوٹا بیٹا، عارف انچاس سال عمر، یکبارگی دل کا دورہ پڑنے سے ایک گھنٹے میں فوت ہوگیا۔ اس کو بچانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا گیا لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی موت کا کوئی علاج نہیں۔

آپ میرے غم واندوہ کا اندازہ بھی شاید ہی کرسکیں، اس واقعے کو تین ماہ ہوگئے لیکن زخم ہنوز تازہ ہے۔

ایک مضمون ''تنقید'' اور دو غزلیں بھی منسلک ہیں۔

اس عرصہ میں ''انتساب'' تو نہیں ملا لیکن مجھے یقین ہے جلد ہی ملے گا انشاء اللہ میں ہندوستان آنے کا ارادہ کررہا ہوں۔ اگر ارادہ محکم ہوگیا تو اطلاع کروں گا انشاء اللہ۔ ممبئی میں ایک صاحب مشاعرہ کرنے والے ہیں مجھے فون کیا تھا میں نے اقرار تو کیا ہے اب وہ تاریخ مقررہ کی اطلاع کریں گے تو میں اپنا پروگرام مکمل کروں گا انشاء اللہ۔ وہاں سے فراغت کے بعد بھوپال آنا ہوگا انشاء اللہ۔

دعاؤں اور بہترین خواہشات کے ساتھ۔

مخلص

نقشبند قمر نقوی بھوپالی، یو۔ایس۔اے۔

(U.S.A.)

بھائی سیفی صاحب

السلام علیکم

آپ کے موقر جریدے انتساب عالمی کا فروری تا اپریل ۲۰۱۶ء کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ سب سے پہلے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے گھر کی زیارت کرآئے اور عمرہ ادا کیا۔ یہ سعادت انہیں کے حصے میں آئی ہے جنھیں اللہ اپنا مہمان بناتا ہے۔

رسالہ میں شامل منظومات اور مقالے و نیز افسانے ایسے ہیں جن پہ اہلِ علم حضرات ہی قلم اٹھا سکتے ہیں۔ میرے جیسا ادب کا طالب علم تو صرف پڑھتا ہے اور مزہ لیتا ہے۔ میں اس کا شکرگذار ہوں کہ آپ مجھ جیسے لکھنے والے کا بھی کلام تواتر سے شائع کرتے۔

میں پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر مختار شمیم اور ڈاکٹر سید یحیٰ نشیط کے مضامین قابل ذکر ہیں۔ دلوی صاحب نے اپنے مضمون میں سرقہ کے سلسلے میں جو سوال اٹھائے ہیں ان کا جواب دینا دشوار نظر آتا ہے۔ البتہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔

خصوصی مطالعہ کے تحت وحشی سعید پر کچھ اچھے مضمون سامنے آتے ہیں۔ تاہم وحشی سعید پر مزید اور اچھا کام کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ سیفی سرونجی کا حج و زیارت پر منظوم سفر نامہ ان کے دلی جذبات کا عکاس ہے۔ اشعار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آمد کا دریا بہہ رہا ہے۔ یا جھوم کر بادل آتے ہیں اور برس رہے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر فتح پوری کی خواب بیتی بیحد دلچسپ ہے۔ شعر وسخن کے حصہ میں ڈاکٹر فراز حامدی جیسے عہد ساز دانشور کی شرکت اور عبدالاحد ساز، بلراج بخشی، غلام مرتضیٰ راہی کے کلام نے اس گوشہ کو جگمگا دیا ہے۔ نئے لوگوں میں محمود ملک کا ندا فاضلی پر مضمون بھرپور ہے اور ان کی مکمل شعری شخصیت کا احاطہ کرنے کی سعی کی عمدہ مثال ہے۔ نئے لوگوں کو رسائل و جرائد میں جگہ ملنا چاہئے۔ نئی نسل کی آبیاری کرنا اور ان کو پروان چڑھانا مدیروں اور بزرگ ادیبوں کی نہ صرف ذمہ داری ہے بلکہ ان کا فرض ہے۔ سیفی سرونجی صاحب اس تبصرہ سے آپ کی ستائش کرنا میرا شیوہ نہیں ہے تاہم سونے کو سونا کہنا چاہئے۔ عنقریب یا قریب میں آپ کو کوئی مضمون یا تخلیق بھیجنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ مبادا اس بے لوث خط کو خوش آمد تصور نہ کرلیا جائے۔ خوش رہیں، کام کرتے رہیں۔ فیصلے وقت پر چھوڑ دیں کہ وقت خود زمانے کا خدا ہے۔

اقبال مسعود

بھوپال

مکرمی سیفی صاحب، سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میری ذہنی حالت ایسی ہوگئی ہے کہ اب یاد نہیں آپ کو عمرے کی سعادت حاصل کرکے آنے پر تبریک لکھی تھی یا نہیں۔ ایک غیر واضح خیال سا ہے شاید ایک خط لکھا۔ اگر نہیں تو اب میں آپ کو دلی مبارک و تہنیت پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ آپ کی عبادت کو شرف قبول عطا فرمائے اور دین و دنیا کی سعادتوں سے سرفراز فرمائے۔

کچھ عرصہ ہوا۔ میرا چھوٹا بیٹا، عارف انچاس سال عمر، یکبارگی دل کا دورہ پڑنے سے ایک گھنٹے میں فوت ہوگیا۔ اس کو بچانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا گیا لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی موت کا کوئی علاج نہیں۔

آپ میرے غم واندوہ کا اندازہ بھی شاید ہی کرسکیں، اس واقعے کو تین ماہ ہوگئے لیکن زخم ہنوز تازہ ہے۔

ایک مضمون ''تنقید'' اور دو غزلیں بھی منسلک ہیں۔

اس عرصہ میں ''انتساب'' تو نہیں ملا لیکن مجھے یقین ہے جلد ہی ملے گا انشاء اللہ میں ہندوستان آنے کا ارادہ کررہا ہوں۔ اگر ارادہ محکم ہوگیا تو اطلاع کروں گا انشاء اللہ۔ ممبئی میں ایک صاحب مشاعرہ کرنے والے ہیں مجھے فون کیا تھا میں نے اقرار تو کیا ہے اب وہ تاریخ مقررہ کی اطلاع کریں گے تو میں اپنا پروگرام مکمل کروں گا انشاء اللہ۔ وہاں سے فراغت کے بعد بھوپال آنا ہوگا انشاء اللہ۔

دعاؤں اور بہترین خواہشات کے ساتھ۔

مخلص

نقشبند قمر نقوی بھوپالی، یو.ایس.اے.

(U.S.A.)

بھائی سیفی صاحب

السلام علیکم

آپ کے موقر جریدے انتساب عالمی کا فروری تا اپریل ۲۰۱۶ء کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ سب سے پہلے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے گھر کی زیارت کرآئے اور عمرہ ادا کیا۔ یہ سعادت انہیں کے حصے میں آئی ہے جنھیں اللہ اپنا مہمان بناتا ہے۔

رسالہ میں شامل منظومات اور مقالے و نیز افسانے ایسے ہیں جن پہ اہلِ علم حضرات ہی قلم اٹھا سکتے ہیں۔ میرے جیسا ادب کا طالب علم تو صرف پڑھتا ہے اور مزہ لیتا ہے۔ میں اس کا شکرگذار ہوں کہ آپ مجھ جیسے لکھنے والے کا بھی کلام تواتر سے شائع کرتے

ہیں۔ کتابوں پر تبصرے اور آپ کے مقالات آپ کی علمی بصیرت کے عکاس ہیں۔ اپنی کتاب ''روشنی کا سفر'' پر تبصرہ کا منتظر ہوں جو میرے لیے مشعلِ راہ ہوگا۔

آئندہ شمارے کے لیے کچھ غزلیں ارسال کر رہا ہوں۔ کسی کام کی ہوں تو شامل اشاعت فرمادیں۔

طالب دعا ہوں اللہ آپ کو صحت و توانائی دے اور عالمی انتساب کو نکھار عطا فرمائے۔

مخلص

مہدی پرتاپ گڑھی

محترم سیفی صاحب آداب

''انتساب'' کا تازہ شمارہ مل گیا شکریہ۔ اس بار سرورق پہ جن فنکاروں کی تصویریں دی گئی ہیں یہ بڑی اہم تصویریں ہیں اور ان سبھی کا اردو ادب میں بڑا کنٹری بیوشن ہے۔ یہ وہ تصویریں ہیں جن کے نام کا ذکر کیے بغیر اردو ادب کے قدیم و جدید ادب پر آپ کی گہری نظر ہے اور اسی نظر کے کمال سے آپ کا رسالہ مزین ہے۔ آپ نے میرے خط کو اتنی اہمیت دی کہ اپنے گراں قدر مضمون کا اختتام میرے خط پر کیا یہ میرے لیے بڑی بات ہے۔

آپ کا منظوم سفرنامہ بہت اچھا لگا۔ میں چاہتا اس منظوم نامہ کو ایک کتابچے کی شکل میں نکال کر اپنے چاہنے والوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ ان کو بھی ذہنی سکون ملے۔

ندا فاضلی کے چلے جانے کا غم ہے مگر وہ ہمیشہ ہم لوگوں میں شامل رہیں گے۔ میری ان سے پہلی ملاقات اپریل ۱۹۶۶ء میں ہوئی تھی جب وہ پہلی بار ایک سیمینار میں اودے پور آئے تھے پھر ان سے کئی ملاقاتیں رہی۔ وہ اکثر میرے خطوط رسالوں میں پڑھتے اور مجھے فون کرتے۔ ایک جملہ وہ ضرور بولا کرتے تھے ''اب کس کی پھاڑ رہے ہو'' وہ اودے پور کئی بار آئے اور میرے ساتھ تو وہ بہت رہے۔ وہ مشاعروں کی نظامت بھی خوب کیا کرتے تھے۔ مگر دو بڑے مشاعرے بھی ان کی نظامت کی وجہ سے عوام کی نظر ہوگئے۔ ایک مشاعرہ عقیل شاداب کا کوٹہ میں بگاڑا اس مشاعرے میں وہ باقر مہدی کا مزاق بناتے بناتے خود عوام کا مزاق بن گئے اور ایک مشاعرہ خواتین کا اودے پور میں بگاڑا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ندا شراب بہت پیا کرتے تھے اور فری رنسر تھے۔ نئی نظم میں ندا کا ایک اہم نام ہے مگر وہ نئی نظم کے علم بردار نہیں کہے جا سکتے کیونکہ محمد علوی کا کہنا ہے کہ:

نئی نظم تو لے اڑے چھوکرے
میں بوڑھی غزل ہی سے دل خوش کروں

اور یہ چھوکرے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان ابھر کے آئے تھے اور ان چھوکروں میں ایک نام شاہد عزیز کا بھی ہے۔ ندا فاضلی 'محمد علوی' زبیر رضوی اور بہت سے ان کے ہم عصر لوگ چور دروازے سے نئی نظم کی عمارت میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں ان کو نئی نظم نگاروں میں شامل نہیں کرتا کیونکہ ان سب کے پاس چوری کا مال ہے۔ میں ۱۹۶۰ء کے بعد لکھی گئی نثری نظم کو بھی نئی نظم میں شامل نہیں مانتا کیونکہ نثری نظم ''نظم'' نہیں نثر ہے۔ اگر نثر کو ہی نظم مان لیا جائے تو میں نثری نظم کا سب سے بڑا اور پہلا شاعر کرشن چندر کو کہوں گا کہ اس سے بہتر شاعرانہ نثر کسی اور ادیب یا شاعر نے نہیں لکھی ہے۔ ابھی تو آپ کو بہت کچھ لکھنا ہے اس لیے اگر ممکن ہو تو میری باتوں پر بھی دھیان رکھئے گا۔ آپ کی دوسری قسط میں تختی کی کچھ کمی لگی۔ کیوں کہ دو چار نظمیں لکھ دینے سے کوئی نظم نگار نہیں ہو جاتا۔ آپ کا مضمون مجھے ان کی باتیں لکھنے پر مجبور کرتا ہے اور یہی مضمون نگار کی کامیابی کہ وہ اپنے قاری کو سوچنے پر مجبور کردے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کی نئی نظم پر جس نے بھی لکھا جانبدارانہ مضمون لکھا کیونکہ لکھنے والوں نے جان بوجھ کر لوگوں کو نظر انداز کیا ہے۔ مگر آپ سے ایسی امید نہیں ہے مجھے۔

دعا گو ہوں کہ آپ صحتیاب ہوں۔

آپ کا
شاہد عزیز

برادرم سیفی صاحب بلکہ ڈاکٹر سیفی سرونجی صاحب!

سلام مسنون

اب خط نگاری کو تین طلاق دئے جا چکے ہیں۔ نہ خیریت پوچھنے والا کوئی نہ اپنی عافیت کی خبر دینے والا کوئی۔ ہلو کیسے ہو، پرچہ مل گیا۔ لیکن اس بار بس آپ نے میری غزل شائع نہیں کی۔ آپ کو ہی میری غزلیں بحر سے خارج لگتی ہیں ورنہ آج کل ہر رسالہ اور اخبار

ہیں۔ کتابوں پر تبصرے اور آپ کے مقالات آپ کی علمی بصیرت کے عکاس ہیں۔ اپنی کتاب ''روشنی کا سفر'' پر تبصرہ کا منتظر ہوں جو میرے لیے مشعلِ راہ ہوگا۔

آئندہ شمارے کے لیے کچھ غزلیں ارسال کر رہا ہوں۔ کسی کام کی ہوں تو شامل اشاعت فرمادیں۔

طالب دعا ہوں اللہ آپ کو صحت و توانائی دے اور عالمی انتساب کو نکھار عطا فرمائے۔

مخلص

مہدی پرتاپ گڑھی

محترم سیفی صاحب آداب

''انتساب'' کا تازہ شمارہ مل گیا شکریہ۔ اس بار سرورق پہ جن فنکاروں کی تصویریں دی گئی ہیں یہ بڑی اہم تصویریں ہیں اور ان سبھی کا اردو ادب میں بڑا کنٹری بیوشن ہے۔ یہ وہ تصویریں ہیں جن کے نام کا ذکر کئے بغیر اردو ادب کے قدیم و جدید ادب پر آپ کی گہری نظر ہے اور اسی نظر کے کمال سے آپ کا رسالہ مزین ہے۔ آپ نے میرے خط کو اتنی اہمیت دی کہ اپنے گراں قدر مضمون کا اختتام میرے خط پر کیا یہ میرے لیے بڑی بات ہے۔

آپ کا منظوم سفرنامہ بہت اچھا لگا۔ میں چاہتا اس منظوم نامہ کو ایک کتابچے کی شکل میں نکال کر اپنے چاہنے والوں میں تقسیم کردیا جائے تاکہ ان کو بھی ذہنی سکون ملے۔

ندا فاضلی کے چلے جانے کا غم ہے مگر وہ ہمیشہ ہم لوگوں میں شامل رہیں گے۔ میری ان سے پہلی ملاقات اپریل ۱۹۶۶ء میں ہوئی تھی جب وہ پہلی بار ایک سمینار میں اودے پور آئے تھے پھر ان سے کئی ملاقاتیں رہی۔ وہ اکثر میرے خطوط رسالوں میں پڑھتے اور مجھے فون کرتے۔ ایک جملہ وہ ضرور بولا کرتے تھے ''اب کس کی پھاڑ رہے ہو'' وہ اودے پور کئی بار آئے اور میرے ساتھ تو وہ بہت رہے۔ وہ مشاعروں کی نظامت بھی خوب کیا کرتے تھے۔ مگر دو بڑے مشاعرے بھی ان کی نظامت کی وجہ سے عوام کی نظر ہوگئے۔ ایک مشاعرہ عقیل شاداب کا کوٹہ میں بگاڑا اس مشاعرے میں وہ باقر مہدی کا مزاق بناتے بناتے خود عوام کا مزاق بن گئے اور ایک مشاعرہ خواتین کا اودے پور میں بگاڑا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ندا شراب بہت پیا کرتے تھے اور فری رنسر تھے۔ نئی نظم میں ندا کا ایک اہم نام ہے مگر وہ نئی نظم کے علم بردار نہیں کہے جاسکتے کیونکہ محمد علوی کا کہنا ہے کہ:

نئی نظم تو لے اڑے چھوکرے
میں بوڑھی غزل ہی سے دل خوش کروں

اور یہ چھوکرے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان ابھر کے آئے تھے اور ان چھوکروں میں ایک نام شاہد عزیز کا بھی ہے۔ ندا فاضلی، محمد علوی، زبیر رضوی اور بہت سے ان کے ہم عصر لوگ چور دروازے سے نئی نظم کی عمارت میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں ان کو نئی نظم نگاروں میں شامل نہیں کرتا کیونکہ ان سب کے پاس چوری کا مال ہے۔ میں ۱۹۶۰ء کے بعد لکھی گئی نثری نظم کو بھی نئی نظم میں شامل نہیں مانتا کیونکہ نثری نظم ''نظم'' نہیں نثر ہے۔ اگر نثر کو ہی نظم مان لیا جائے تو میں نثری نظم کا سب سے بڑا اور پہلا شاعر کرشن چندر کو کہوں گا کہ اس سے بہتر شاعرانہ نثر کسی اور ادیب یا شاعر نے نہیں لکھی ہے۔ ابھی تو آپ کو بہت کچھ لکھنا ہے اس لیے اگر ممکن ہو تو میری باتوں پر بھی دھیان رکھئے گا۔ آپ کی دوسری قسط میں سختی کی کچھ کمی لگی۔ کیوں کہ دو چار نظمیں لکھ دینے سے کوئی نظم نگار نہیں ہو جاتا۔ آپ کا مضمون مجھے ان کی باتیں لکھنے پر مجبور کرتا ہے اور یہی مضمون نگار کی کامیابی کہ وہ اپنے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کی نئی نظم پر جس نے بھی لکھا جانبدارانہ مضمون لکھا کیونکہ لکھنے والوں نے جان بوجھ کر لوگوں کو نظر انداز کیا ہے۔ مگر آپ سے ایسی امید نہیں ہے مجھے۔

دعا گو ہوں کہ آپ صحتیاب ہوں۔

آپ کا
شاہد عزیز

برادرم سیفی صاحب بلکہ ڈاکٹر سیفی سرونجی صاحب!

سلام مسنون

اب خط نگاری کو تین طلاق دئے جا چکے ہیں۔ نہ خیریت پوچھنے والا کوئی نہ اپنی عافیت کی خبر دینے والا کوئی۔ ہلو کیسے ہو، پرچہ مل گیا۔ لیکن اس بار بس آپ نے میری غزل شائع نہیں کی۔ آپ کو ہی میری غزلیں بحر سے خارج لگتی ہیں ورنہ آج کل ہر رسالہ اور اخبار

میری غزل پہلی اشاعت میں شامل کرتا ہے۔'' بس اس نوعیت کی باتیں موبائل سے ہوتی ہیں اور سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔

آپ کا رسالہ اور کتابیں کبھی موصول ہوتی ہیں کبھی محروم رہتا ہوں۔ آپ بھی کتابوں کی تالیف وتصنیف میں ہمالیہ کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ بس قلم اٹھایا کاغذ سنبھالا اور کتاب تیار۔ جو لوگ کتاب کنوارے ہوتے ہیں وہ ہماری کثیر کتابوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ سال بھر میں چار چار چھ چھ کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں۔ اس سلسلے میں مناظر عاشق ہرگانوی تو سب کے امام ہیں۔ سال بھر میں دس بارہ کتابیں۔ متنوع موضوعات پر خوبصورت کتابیں۔ بعض لوگ اپنا اکلوتا شعری مجموعہ بغل میں دبائے پھرتے ہیں۔ الٹ پلٹ کر اپنی ہی غزلیں پڑھتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گہرائی سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ وحشی سعید کے فکروفن پر آپ نے عمدہ کتاب لکھی ہے۔ وحشی سعید کا دوسرا ادبی جیون سرعت کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ان کے افسانے اور ناولٹ قابلِ مطالعہ ہوتے ہیں۔ زبان کی صفائی ان کا خاص وصف ہے۔ آپ نے ان کے فکروفن پر صراحت کے ساتھ لکھا ہے مبارکباد۔ آپ کو بھی اور وحشی سعید کو بھی۔ انتساب مل گیا خواب بیتی (۲) کی اشاعت کا شکریہ! اس طرح یہ کام بھی مکمل ہو جانے کا رستہ نکل آیا۔ ہم اپنی ابتدائی ادبی زندگی کو یاد کرتے ہیں تو آج کی کامیابی پر خود ہی جھوم جاتے ہیں۔ کیا اسباق اور کیا انتساب۔ کیا سیفؔی اور کیا نذیرؔ۔ ایک بیڑی بنانے والا دوسرا بقول ابراہیم اشک دیواروں پر چونا پوتنے والا۔ سارے ذہن معطل ہو گئے۔ ہمارا مذاق اڑانے والے خود ہی پرزہ پرزہ ہو کر اڑ گئے۔ خدا نے محنت کا صلا دیا۔ قلم کی عزت تخت و تاج کی عزت سے بڑی ہوتی ہے۔ کتاب کتاب دار اور کتاب نویس کو باوقار بناتی ہے۔ مئی ۱۹۸۱ء میں جب پونہ سے اسباق جاری ہوا تو ایک صاحب نے فتویٰ صادر فرما دیا تھا کہ یہ پہلا اور آخری شمارہ ہے۔ اسباق نے کتنے ہی نامقبول ناموں کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ کتنے ایسے ہیں جن کا پہلا افسانہ اور پہلی غزل اسباق میں شائع ہوئی۔ انتساب کے ساتھ بھی ایسا ہی بہت کچھ ہوا ہوگا۔ آپ تو بھول بھی گئے ہونگے۔ لیکن مجھ سے برا سلوک بھلایا نہیں جاتا۔ ایک ایک زخم یاد آتا ہے۔ حالانکہ قلم کو خار کی نوک بنانے والے اپنے انجام کو جا پہنچے۔ دیوار سے لگ گئے۔ اپنے ہی پھٹے کردار کے دامن میں الجھ کر زمین چاٹنے لگے۔ انتساب اب عالمی رسالہ

بن گیا۔ محنت خلوص اور مسلسل ریاضت ضائع نہیں ہوتی۔ دلی مبارکباد۔

خوشی ہوتی ہے آپ کو ایک متین ندوی مل گئے۔ میں تو یہاں اکیلا ہوں۔ اتنا بڑا شہر اور تنہا مسافر۔ چلتے چلتے جب پیر میں کانٹا لگ جاتا ہے تب خود ہی رک کر جھک کر اور پلٹ کر کانٹا نکالنا پڑتا ہے۔

آپ نے اپنے جشن میں شمولیت کے لیے ایک بار فون کیا پھر خاموش ہو گئے۔ کبھی کبھی خاموشی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ متین ندوی صاحب کو سلام۔ ان کے کسی رسالے پر رنگ و بو کے حالیہ شمارے میں مناظر صاحب کا تبصرہ دیکھا۔ مبارک

نذیر فتح پوری، پونے

....

محترم سیفی صاحب

آداب

امید ہے بخیر ہوں گے۔ انتساب ایک عرصہ بعد شمارہ نمبر ۱۰۲ کی صورت میں دستیاب ہوا۔ معلوم نہیں کیوں انتساب کا تاریخی ۱۰۰ واں شمارہ ملا، اس کے بعد کا شمارہ نمبر ۱۰۱ سے میں محروم رہا۔ اس سلسلے میں آپ کو میں نے ایک خط غالباً تین ماہ قبل تحریر کیا تھا۔ اس بات کا یقین ہے کہ آپ نے شمارہ ضرور روانہ کئے ہوں گے مگر شاید محکمہ ڈاک یا پھر کسی محب اردو کی عنایت ان پر ہوگئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرا زرتعاون ختم ہو گیا ہے۔ میں نے مذکورہ خط میں بھی اس امر کی جانب اشارہ کیا تھا مگر آپ کی جانب سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ البتہ شمارہ نمبر ۱۰۲ نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ بھی حسب روایت وسیع ہے۔ مضامین، افسانہ، غزلیں، نظمیں اور خصوصی مطالعہ غرض کہ کس کس کی تعریف کی جائے۔ شمارہ ۱۰۰ جو تاریخی نوعیت کا شمارہ ہو گا ملا اس کی دستاویزی اہمیت ہوگی اور اس کے بعد شمارہ ۱۰۱ جس پر ۱۰۰ ویں شمارہ کا عکس بھی یقیناً موجود ہوگا۔ ان سے محرومی کی ٹیس بہرحال باقی رہے گی۔

خدا آپ کا عزم جوان رکھے۔

میں نے ایک مضمون جتیندر بلّو پر ارسال خدمت کیا تھا غالباً آپ کے معیار کے مطابق نہیں ہوگا اس لیے جگہ نہ پا سکا۔ انتساب کے لیے سالانہ زرتعاون روانہ کر رہا ہوں۔

شکریہ

احمد طارق

برادرم سیفی سرونجی

سلام ورحمت!

امید ہے بخیر و عافیت ہونگے۔محمود ملک صاحب کا مرتب کردہ آپ کے متعلق لکھے گئے مقالات و مضامین کا مجموعہ موصول ہوا جس کے لیے نہایت شکر گزار ہوں۔مشاہیر ومعاصرین کی گراں قدر نگارشات آپ کی ادبی وصحافتی خدمات کو فروزاں کر رہی ہیں اور آپ کے ادبی قد و قامت کا اعتراف بھی۔انشاء اللہ اطمینان سے اور بالا ستیعاب پڑھوں گا۔

برادرم محمود ملک صاحب کو بھی میری جانب سے حرفِ تحسین پیش کیجئے۔محمود ملک صاحب سے ملاقات کی یاد تازہ ہوگئی جب میں آپ کے مشاعرے میں سرونج آیا تھا۔ساتھ ہی سرونج کے اور احباب بھی یاد آئے۔انتساب کے تازہ دوشمارے بھی مل گئے جن میں جستہ جستہ پڑھ رہا ہوں۔بھابھی اور بچوں کو سلام فرمایئے۔

آپ کا

عبدالاحد سازؔ، ممبئی

عزیز القدر سیفی سرونجی صاحب تسلیمات

امید ہے آپ بخیر ہونگے۔

عرض یہ کہ گہربار سہ ماہی انتساب میں بغرض اشاعت ایک تازہ ترین نظم اور دو تازہ ترین غزلیں جو غیر مطبوعہ و معیاری ہیں ارسال خدمت ہیں۔امید قوی ہے کہ آپ انہیں کسی قریبی شمارے میں شائع فرما کر شکریہ کا موقع مرحمت فرمائیں گے۔کرم بخشی ہوگی۔

مزید برآں! ایک عدد کینرا بینک کی چیک جو مبلغ -/500 روپیہ کی ہے منسلک ہے۔رسیدگی کی اطلاع سے نوازیں مہربانی ہوگی۔والسلام مع الاکرام۔

محمد ہارون سیٹھ سلیم بنگلوری

محترم و مکرم ڈاکٹر سیفی صاحب

السلام علیکم

طالبِ خیریت بخیر۔مبلغ پانچ سو روپئے بطور زرِ سالانہ ارسالِ خدمت ہیں۔میں

اور بھی خدمت کروں گا اور میرا قلمی و مالی تعاون 'انتساب' کے لئے انشاء اللہ جاری رہے گا۔ یہ ڈاک ملتے ہی مجھے اس کی رسیدگی سے مطلع کیجئے گا۔

اِس لفافے میں جو شعری تخلیقات میں نے ارسال کی ہیں ان میں حالاتِ حاضرہ کی عکاسی بھی ہے اور ان کو میں نے وقت کی ضرورت اور تقاضے کے مطابق بھی لکھا ہے۔ ان کے زیرِ اشاعت آنے سے ''انتساب عالمی'' کے وقار اور مقبولیت میں انشاء اللہ اضافہ ہی ہوگا اور اس میں کسی طرح کی کمی ہونے کا خدشہ اس میں نہیں ہے۔ ان کو اپنے دفتر میں کسی فائل میں محفوظ جگہ پر رکھ دیجئے تاکہ وقتاً فوقتاً زیرِ اشاعت آسکیں اور میں اپنی تخلیقات میں ایسا کیوں لکھتا ہوں اسکی وجہ میں نے اپنے اس شعر میں لکھی ہے۔ دل میں نہ درد ہو تو کہاں شاعری بھی ہو۔

کیا درد ہی سرمایۂ اشعار نہیں ہے۔ میں اپنا یہ درد ''انتساب عالمی'' کے ہمعصر قارئین کے ساتھ بانٹنا چاہتا ہوں۔ مگر اس کا ذریعہ تو آپ ہی بن سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اس بارے میں ناامید نہ کریں گے۔

''انتساب عالمی'' کا تازہ شمارہ فروری تا اپریل ۲۰۱۶ء مل گیا۔ اس کے لیے شکریہ اور اس میں آپ نے میرے پانچویں شعری مجموعے ''رموزِ زندگی'' پر بھرپور تبصرہ بھی شائع فرمایا ہے۔ اس کے لیے تہہ دل سے مزید شکریہ۔ یہ پڑھ کر سچ تو یہ ہے کہ میرے دل کی گہرائیوں سے بصد خلوص آپ کے لیے دعائیں نکلیں۔ آپ کی اپنی ادبی خدمات اور شعر و ادب و انسانیت کے لیے آپ کی قدردانی و حوصلہ افزائی ایسی چیزیں ہیں جو واقعی لائقِ تحسین ہیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

باقی باتیں انشاء اللہ فون پر ہوں گی۔

بشیر احمد بشیر کاشمیری

جناب سیفی سرونجی صاحب!

اسلام علیکم

کچھ دن پہلے ایک چیک ۵۰۰ روپئے کا تعاون کے سلسلہ میں روانہ کیا تھا جو غالباً